READING SECTION
Online Library For Pakistan
WWW.PAKSOCIETY.COM
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
www.paksociety.com
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

www.paksociety.com

07 سرگزشت
متنازع قلمکار
ادارہ
ایک صفحہ میں مکمل، مختصر، مختصر
ایک نادر روزگار کا تعارف

08 گفت و شنید
شہرِ خیال
مدیر اعلیٰ
آپ کی باتیں، آپ کے خیال، آپ
کے مشورے اور آپ کے سوال

16 شخصیت
سردارِ سخن
ڈاکٹر ساجد امجد
اس شاعر کا زندگی نامہ
جس نے غربت کو ترجیح دی

53 معلومات
قلمکاروں کا ڈان
شکیل صدیقی
تاریخ کے دریچے سے
معلومات کا خزانہ

61 تحقیق
لیلیٰ حرفِ شیریں
ایاز رامی
اس شہزادی کا تذکرہ
جس کی زندگی مشعلِ راہ ہے

65 واقعات
باغی
زویا اعجاز
دبے کچلے عوام جب آواز
اٹھاتے ہیں تو باغی کہلاتے ہیں

79 کھیل کھلاڑی
ابھرتے ستارے
زریاب وصلی
کرکٹ کی دنیا کے چند
کھلاڑیوں کا ذکرِ خاص

83 سفرکہانی
شمشال سے ٹورنٹو
ندیم اقبال
جاپانی کا شہکار ایک
الگ انداز کی داستان

109 حادثہ
رقصِ آتش
امجد رئیس
ایسے حادثات
ہمیشہ یاد رہ جاتے ہیں

113 تحریرِ خاص
اپریل کی شخصیات
صائمہ اقبال
اس ماہ سے جڑی اہم
شخصیات کا ذکرِ خاص

125 نفسیات
خواب
منظر امام
خواب کی حقیقت کیا ہے
ہم خواب کیوں دیکھتے ہیں؟

129 ذکرِ خاص
شہروں کے نام
رانا محمد شاہد
معلومات کے شائقین
کے لیے مختصر سی تحریر

ماہ نامہ سرگزشت میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے جملہ حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لئے اس کے کسی بھی نئے کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

● تمام اشتہارات نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کئے جاتے ہیں۔ ادارہ اس معاملے میں کسی بھی طرح ذمے دار نہ ہوگا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

www.paksociety.com

133 قلم نگری
دو نگینے
انور فرہاد
پاکستانی فلمی دنیا کے دو انمول رتن

149 جرم و سزا
دانا بینا
سلیم فرخی
مغرب سے ایک جرم کا دلچسپ واقعہ

154 معاشرت
ناسور
ڈاکٹر عبدالرب بھٹی
ایک معصوم نوجوان کی خون رنگ لہو گرما دینے والی داستان

194 پہلی سچ بیانی
راندۂ درگاہ
غلام رضا جعفری
اس کی زندگی کو اکثروں نے تباہ کر دی

207 دوسری سچ بیانی
سزا
نجمہ نعیم
انا کو قربان کر کے اس نے بیٹے کو پالیا

223 تیسری سچ بیانی
موت کا کنواں
ناصر حسن
جرم کی سزا ہر حال میں ملتی ہے

235 چوتھی سچ بیانی
انصاف
غفران انصاری
اس نے اپنے باپ سے بدسلوکی کی اور بیٹے نے اس سے

241 پانچویں سچ بیانی
فیصلہ
نسیم ریحان
ایک فیصلہ اس نے کیا جس نے سب کو حیران کر دیا

253 چھٹی سچ بیانی
ممتا
سلمیٰ اعوان
ممتا کا جذبہ ہر جذبے پر بھاری ہے

261 ساتویں سچ بیانی
نیکی
جمیل بٹ
نیکی کبھی بھی برباد نہیں ہوتی پھل ضرور دیتی ہے

267 آٹھویں سچ بیانی
ناجو
شمیم الدین غوری
اس کی زندگی نے اسے کیا کیا رنگ دکھائے

273 نویں سچ بیانی
راہ پر خار
آصفہ ضیا احمد
ایک البم نے اس کی زندگی میں طوفان لا دیا

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

Downloaded From Paksociety.com

متنازع قلمکار

11 مئی 1912ء کو گاؤں پیرو دی، سمرالا ضلع لدھیانہ مشرقی پنجاب میں پیدا ہونے والے اس شیر خوار کے بارے میں کسے پتا تھا کہ وہ شہرت کی اتنی بلندی پر پہنچ جائے گا۔ جبکہ اس کا گھرانا تعلیم یافتہ تھا، اس کے والد کشمیری تھے مگر پنجاب نے انہیں اس طرح سے مرعوب کیا تھا کہ وہ پنجاب کے ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ مقامی عدالت میں جج کے عہدے پر تھے۔ اسی لیے ہوش سنبھالنے کے بعد اسے ابجد سے واقفیت گھر میں کرائی گئی پھر اسے امرتسر کے مسلم ہائی اسکول میں داخلہ دلوایا گیا۔ ابتداء میں تو اس نے پڑھائی میں خوب دلچسپی لی مگر میٹرک تک پہنچتے پہنچتے وہ پڑھائی سے اوب گیا۔ دو بار کی کوشش سے اس نے میٹرک پاس کی۔ ان دنوں اس کا ایک ہی شوق تھا، انگریزی ناولیں پڑھنا۔ اپنے شوق کو پورا کرنے کے لیے اس نے امرتسر انگلیشن کے بک اسٹال سے کتابیں بھی چرائیں۔ 1931ء میں وہ اسکول سے پاس آؤٹ ہوا اور ہندو سبھا کالج امرتسر میں داخل ہوا۔ کالج میں سیاسی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ اس نے زندگی کا پہلا افسانہ ''تماشا'' لکھا۔ یہ افسانہ جلیانوالہ باغ میں ہوئے قتل عام پر لکھا گیا تھا۔ حکومت حرکت میں آ گئی لیکن افسانہ قلمی نام پر تھا اس لیے وہ گرفتاری سے بچ گیا۔ اسی دوران 1933ء میں جب وہ اکیس سال کا تھا، اس کی ملاقات باری علیگ سے ہو گئی۔ اس ملاقات نے اس کی زندگی بدل دی۔ باری علیگ نے اسے مشورہ دیا کہ وہ روسی اور فرانسیسی ناول نگاروں کو پڑھے۔ اسی مشورے پر اس نے ویکٹر ہوگو کا شہرآفاق ناول کا ترجمہ ''سرگزشت اسیر'' کے نام سے کیا۔ پھر کچھ دنوں کے بعد وہ لدھیانہ کے روزنامہ ''مساوات'' کے ادارتی عملے میں شامل ہو گیا۔ 1934ء میں اس نے آسکر وائلڈ کے ناول کا ترجمہ کیا تو ادبی حلقے میں کافی مشہور ہو گیا۔ باری علیگ کے مشورے پر اس نے ایک اور مجموعے کی تدوین کی جس کا عنوان تھا ''روسی افسانے'' یہ مجموعہ بھی ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اب اس نے گریجویشن کے لیے علی گڑھ کا رخ کیا۔ اسی دوران وہ انڈین پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن سے جڑا۔ اسی IPWA میں اس کی ملاقات علی سردار جعفری سے ہوئی۔ اس ملاقات نے اس کی زندگی پر گہرا اثر ڈالا اور اس نے ترقی پسند ادیبوں کے ہمراہ ہو جانا پسند کیا۔ مارچ 1935ء میں اس نے علی گڑھ میگزین کے لیے ایک معرکتہ الآرا افسانہ ''انقلاب پسند'' لکھا۔ اس افسانے نے علمی حلقوں میں پسندیدگی کا ریکارڈ قائم کر دیا۔ کسی فنکار کا دوسرا افسانہ ایسی ہلچل مچا دے یہ معمولی واقعہ نہ تھا۔ اسی دوران 1941ء میں اسے ''آل انڈیا ریڈیو'' کی لکھنو شاخ میں اسکرپٹ لکھنے کی نوکری مل گئی۔ اس نے ریڈیو کے لیے لکھے اسکرپٹ سے مزید شہرت حاصل کر لی۔ صرف اٹھارہ مہینے کی اس نوکری میں اس نے جتنے اسکرپٹ لکھے اسے چار مجموعے میں پیش کیا گیا۔ ''آؤ! منٹو کے ڈرامے، جنازہ اور تین عورتیں'' اس کے بعد اس نے کہانیوں کا ایک اور مجموعہ ''دھواں'' کے نام سے لایا۔ لکھنو ریڈیو کے اسٹیشن ڈائریکٹر نون میم راشد تھے ان سے بنی نہیں اور اس نے نوکری سے استعفیٰ دے کر بمبئی فلم نگری کی راہ لی۔ 1942ء میں اس نے بمبئی کی فلم نگری کو آٹھ دن، چل چل رے نوجوان اور مرزا غالب جیسی لازوال فلم کا اسکرپٹ دیا۔ اسی درمیان اس نے کئی چھوٹے افسانے بھی دیئے۔ کالی شلوار (1941ء)، دھواں (1941ء) اور بو (1945ء) جو قومی جنگ بمبئی میں شائع ہوئے۔ 1945ء میں بمبئی فلم نگری میں رہتے ہوئے ایک اور معرکتہ الآرا کہانی ''باپو گوپی ناتھ'' پیش کی۔ سیاسی حالات بہت بگڑ چکے تھے۔ بمبئی کی سڑکوں پر مسلمانوں کا خون بہایا جا رہا تھا اس لیے وہ 1948ء میں لاہور آ گیا۔ یہاں آ کر اس نے اردو ادب کے خزانے میں مزید اضافہ کیا۔ وہ بہت کچھ کرنا چاہتا تھا لیکن زندگی نے وفا نہ کی اور 18 جنوری 1955ء کو وہ لاہور کی مٹی اوڑھ کر ہمیشہ کے لیے سو گیا۔ اس ادیب کو ہم سعادت حسن منٹو کے نام سے پہچانتے ہیں جس کی متنازع کہانیوں نے اسے کبھی چین لینے نہیں دیا۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

جلد 27 ❖ شمارہ 03 ❖ اپریل 2017ء

ماہنامہ سرگزشت کراچی

مدیرہ اعلیٰ : عذرا رسول

شعبہ اشتہارات

منیجر اشتہارات	محمد شہزاد خان	0333-2256789
نمائندہ کراچی	محمد رمضان خان	0333-2168391
	رانا محمد حمید	0323-2895528
نمائندہ لاہور	افراز علی نازش	0300-4214400

قیمت فی پرچہ 60 روپے ❖ زرسالانہ 800 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول

مقامِ اشاعت: C-63' فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ' کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone :35804200 Fax :35802551
E-mail: jdpgroup@hotmail.com

MEMBER APNS CPNE

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قارئین کرام!

السلام علیکم!

یہ چھوٹی چھوٹی منی کہانیاں اکثر مجھے سوچ کے سمندر میں دھکیل دیتی ہیں۔ جیسے یہ کہانی ''لطیف صاحب اپنی بیٹی ثریا کو ایئر پورٹ پہنچا کر آئے۔ ان کی بیٹی نے ایم بی اے کرنے کے بعد کراچی میں ایک فرم میں نوکری کرلی تھی۔ اس نوکری نے گھر کے حالات یکسر بدل دیے تھے کیونکہ وہ کراچی سے ہر ماہ چالیس ہزار کا ڈرافٹ بھیجتی تھی جس کی وجہ سے وہ خاندان بھر میں سب سے خوش حال تسلیم کرلیے گئے تھے۔

ایئر پورٹ سے واپس آکر وہ چائے پی رہے تھے کہ انہیں خیال آیا کہ چھوٹی بہن کو فون کرلیں۔ بھانجے نے اسی سال ایم بی اے کا امتحان دیا تھا۔ رزلٹ کیا رہا یہ جاننے کے لیے انہوں نے فون کیا۔ چھوٹی بہن نے ہی فون اٹھایا تھا۔ لطیف صاحب نے پہلا سوال کیا۔ ''رزلٹ کیا رہا؟''
بہن نے رندھے گلے سے جواب دیا۔ اس نے محنت تو بہت کی تھی۔ پھر بھی نمبر بہت کم آئے ہیں۔ فیل ہوگیا ہے۔'' اوہ کہہ کر انہوں نے ریسیور رکھ دیا۔ ان کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا تھا۔ وہ سوچ رہے تھے۔ یہ بہت اچھا ہوا اگر وہ پاس کر جاتا تو ہمارے برابر آجاتا۔

ایسی ہی سوچوں نے معاشرے کو تباہ کر رکھا ہے۔ جب کہ اسلام نے حسد جلن سے منع کیا ہے۔ میں ایک فرد کی حیثیت میں خود کو نہیں سنبھالتا اور برا ''سسٹم'' کو کہتا ہوں جب تک میں خود سدھروں گا نہیں معاشرہ کیسے سدھر پائے گا؟ فرد کی حیثیت میں ہم سب کی بہت بھاری معاشرتی ذمے داری ہے۔

معراج رسول

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

شہرِ خیال

☆ سدرہ بانو ناگوری نے ملیر کراچی سے لکھا ہے۔ ''کرسی، کرسی، کرسی جدھر دیکھو ادھر کرسی۔ کاش یہ کرسی ایجاد ہی نہ ہوتی زمین پر بیٹھنے والے نہ جانے کیوں زمین کو ہی بھول جاتے ہیں۔ ملک کے حالات کس قدر ابتر ہیں مسجد، مندر، مزار کچھ محفوظ نہیں لوگ مر رہے ہیں، لاشیں اٹھ رہی ہیں، قبرستان بے گناہوں سے بھر رہے ہیں مگر کسی کو پروا ہی نہیں۔ ''شہرِ خیال'' میں ہمارے بھائی شجاع نے بہت پیارا تبصرہ فرمایا۔ اچھا لگا۔ رانا شاہد آپ نے میری تجویز کو پسند کیا اس تجویز کو اگر معراج انکل بھی پسند کرلیں تو مزہ ہی آجائے دیگر ساتھیوں کا بھی تبصرہ کی پسندیدگی کا شکریہ۔ ''شاعرِ اخلاق'' اسماعیل میرٹھی جن کی نظمیں درسی کتابوں میں اور بچوں کے رسالوں میں بہت پڑھیں۔ شرمیلا اور سیدھا سادہ سایہ شاعر بلاشبہ اپنے عمدہ اخلاق اور خوب صورت شاعری کی بدولت ایک کامیاب شاعر ٹھہرا۔ ڈاکٹر صاحب نے شخصیت کے حوالے سے موضوع خوب چنا۔ ''مردِ آہن'' ایک عظیم ہیرو عظیم لیڈر جو جیا تو اوروں کے لیے اور مرا تو دنیا کو یہ فن سکھا گیا کہ ہے جینے کا مقصد اوروں کے کام آنا۔ ''بے چارہ'' انور فرہاد کی دلچسپ رہی۔ نیر صاحب نے کمال کی گلوکاری کی، کانوں میں رس گھولتی میٹھی سی آواز، سننے والوں کو مدہوش کردیتی ہے۔ ''ناسور'' میں رانا بشیر کی آمد کا راز کھل ہی گیا مگر شاید وہ اس قابل نہیں تھا کہ اسے معاف کیا جاتا۔ بے گناہ کو پھانسی چڑھانے والے اس شخص کو نشانِ عبرت بنانا چاہیے تھا۔ میرے خیال میں ڈاکٹر صاحب نے اس کردار کے ساتھ انصاف نہیں کیا اور یہ جملہ کہ ''میں سڑک پر گرا تھا تو کار کے اگلے دونوں ٹائر میری گردن کو چھو رہے تھے اور بونٹ تقریباً میرے سر کے اوپر تھا'' جملے کو بغور پڑھیے کہ ہمارے ہیرو کی گردن اونٹ جیسی لمبی ہے کہ کار کے ٹائروں کے پاس پہنچ گئی۔ ''وہ اک تارا'' محبتوں کی جانشی میں ڈوبی لمحہ لمحہ رنگ بدلتی تحریر کے کتنے ہی انداز اور ہر انداز ہی خوب۔ کبھی سچ بولنا جرم ٹھہرا تو کہیں اپنی ہی ذات کی فراموشی، کبھی محبوب کا انتظار اور ان کی بدلتے رنگوں میں گولی کا نشانہ بننے تک زندگی کی آخری آہ۔ سلمیٰ اعوان نے لفظوں کے تانے بانے اس سلیقے سے بنے کہ آنسوؤں پر قابو پانا مشکل ہوگیا۔ ویلڈن سلمیٰ جی۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' میں اس دفعہ سر جی کچھ زیادہ ہی شرارتوں کے موڈ میں تھے۔ بے چارہ شہباز ٹھیک ہی کہتا ہے کہ سر جی واقعی معصوم بننے کی اداکاری کرتے ہیں۔ اتنے معصوم ہیں نہیں جتنے نظر آتے ہیں۔ ''کھڑکی'' ایک دلچسپ کتھا کاشف زبیر کی زبانی اچھی لگی۔ نینا چالاک ہی نہیں تھی بلکہ احسان فراموش بھی تھی۔ جس نے محبت کرنے والی آنٹی انکل اور اپنے چھوٹے بھائی کا دل دکھایا۔ عجیب بے قدرلڑکی تھی جو ڈھیر ساری چاہتوں کی قدر ہی نہ کرسکی۔ ''سری ادب کی ملکہ اگاتھا کرسٹی'' کا جتنا بڑا نام ہے اس حوالے سے تحریر بڑی ہی مختصر رہی۔ پہلی سچ بیانی میں نجمہ کے ساتھ قسمت نے چال خوب چلی، جس ذلت پر وہ آنسو بہایا کرتی تھی اسی نے اسے عزت کی اونچی مسند پر لا بٹھایا۔ ایک چھوٹی سی نیکی کے بدلے عمر بھر کی خوشیاں تو مقدر بنی مگر اسے اپنوں کی بے حسی نے رلایا بھی بہت۔ تھکن نے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ انسان بھی کتنا مجبور ہوجاتا ہے کبھی، پائی پائی جوڑ کر اپنوں کے لیے خوشیاں خریدتا ہے اور اپنی خوشیوں پر ڈاکا پڑ جائے تو جیتے جی مر جاتا ہے۔ اشتیاق کی بے بسی پر ہم صرف آنسو ہی بہا سکتے ہیں کیونکہ ہم بھی بے بس ہی ہیں بہت بے بس۔ ''پچھتاوا'' میں عامر نے جو کچھ کیا وہ سراسر اس کی اپنی غلطی تھی۔ وہ جانتے بوجھتے ایک عورت سے تنہائی میں ملا اور عورت بھی ایسی جو عورت کہلانے کے قابل ہی نہیں تھی۔ ''اس ہاتھ دے'' ہمارے ہاں سڑکوں پر روزانہ ہی کتنے موٹر سائیکل کے حادثات ہوتے ہیں، کچھ مر جاتے ہیں کچھ بچ جاتے ہیں مگر اکبر جیسے باپ کا ظرف کسی کسی کو ہی مل پاتا ہے جو اپنے اکلوتے لاڈلے اور جان سے پیارے بیٹے کے قاتل کو معاف کردے۔ صرف اسی وجہ سے کہ وہ کسی اور کو اس تکلیف اور اس اذیت میں نہیں دیکھ سکتا جو اس کا مقدر بنی تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اس شخص کے لیے یقیناً اللہ کے ہاں بہت اجر ہے کیونکہ خدا بھی معاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔''

☆ اعجاز حسین سٹھار کا تجزیہ نور پور تھل سے۔ ''ہر ماہ ہم کتنے اہتمام سے کہانیوں پر تبصرہ کرتے ہیں۔ کرداروں کے رویے، نشست و برخاست اور کمزوریوں کو موضوع بنا کر مناسب اور حالات کے مطابق مشورہ دیتے اور رہنمائی کرتے ہیں۔ جو لوگ اچھے برے وقت کا جبر سہہ چکے انہیں سراہتے ہیں اور کچھ واقعات کو دوسروں کے سامنے آئینہ بنا کر رکھتے ہیں۔ ساتھ چلنے والے دوستوں سے سرگوشیاں اور کبھی دکھ سکھ شیئر کرتے ہیں۔ ایسی بے ضرر مصروفیات میں سال گزر جاتا ہے۔ خوشگوار یادوں سے دل بہلاتے رہنا مشغلہ بن گیا ہے۔ کوئی مہربان پورے سال کا تجزیہ کرتا ہے تو تعریف کے چند الفاظ سرمایہ بن جاتے ہیں لیکن اب کی بار حسرت سے نظریں پرچے کے صفحات الٹتے ہوئے مایوس ہو گئیں کہ یہ روایت دم توڑ گئی ہے۔ وحید ریاست بھٹی یہ ذمہ داری نبھاتے آ رہے تھے۔ مصروفیات یا ذاتی پریشانیوں کی کیسی چکی ہے جو انہیں جکڑے ہوئے ہے اس راز سے وہ خود ہی پردہ اٹھا سکتے ہیں۔ (میں خود بھی منتظر رہا اور اپریل کے شمارے کی باری آ گئی)۔ طاہر گلزار بہنا آپ نے یاد کیا۔ شکریہ قبول کیجیے۔ ''مارچ کی شخصیات'' میں کافی بھاری بھرکم نام تھے۔ مستنصر حسین تارڑ کو ہم سفر ناموں کے حوالے سے جانتے تھے۔ وہ ناول نگار ہیں یہ کسی انکشاف سے کم نہیں۔ انہوں نے جتنے سفر نامے تحریر کیے ہیں گویا پوری زندگی حالتِ سفر میں رہے۔ پھر پہاڑوں کو فتح کیا۔ بڑھتی عمر اور گھٹتی توانائی کے ساتھ کمال کیا ہے۔ ''ناسور'' کے واقعات پڑھتے ہوئے ہر لمحہ دل میں ہول اٹھتے رہتے ہیں کہ اب کوئی سانحہ ہونے جا رہا ہے۔ یوں وقفے دے کر قسط ختم کی ہے۔ نعمان ایک غیرت مند، باہمت اور اصول پسند جوان ہے۔ اس کے سینے میں بارود بھرا ہوا ہے لیکن ذمہ داریاں اور مجبوریاں پاؤں میں زنجیر ڈال دیتی ہیں۔ وہ کئی محاذوں پر برسرِ پیکار ہو چکا ہے۔ زندہ رہنے کے لیے یہ جدوجہد ضروری ہے تو بہن بھائی کو کسی محفوظ ٹھکانے پر پہنچا کر اس میدان میں قدم رکھے وگرنہ سانحات تاک میں رہتے ہیں۔ دشمن کے کسی بردلانہ وار کے جواب میں ایسا محاذ کھل گیا تو تخت یا تختہ والی صورتِ حال بن جائے گی۔ اس کے حمایتی سیکڑوں نکل آئیں گے لیکن سب کے مفاد الگ الگ ہوں گے یوں وہ اپنی جنگ لڑنے کے ساتھ دوسروں کا آلہ کار بن جائے گا۔ سچ بیانیوں کی پہلی کہانی ''شطرنج کی چال'' گھریلو رشتوں اور اپنوں کے رویوں کی اونچ نیچ کی عکاس ہے۔ کتنے حیرت کی بات ہے کہ اپنے مفاد، مالی فوائد اور من پسند نتائج حاصل کرنے کے لیے ماں جائے بھی خود غرض بن جاتے ہیں اور بہن بھائی کے علاوہ قریبی رشتے داروں کے جذبات کو کچل کر اپنی منزل پانے کے لیے سارے اصول پس پشت ڈال دیئے جاتے ہیں۔ ایک چار دیواری کے اندر رہنے والے مکینوں کی بے حسی اور خود غرضی پر ماتم کے سوا کیا کیا جا سکتا ہے۔ ''تھکن'' میں آج کے سفید پوش طبقہ کی جو تصویر پیش کی گئی ہے اس نے وقتی طور پر بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے لیکن ہم سانحات کو جلد بھول جاتے ہیں اور اپنے مسائل کے خود ساختہ خول میں بند ہو کر اردگرد کے حالات سے بے خبر ہو جاتے ہیں۔ یہاں اشتیاق کی اس بات نے دل چیر دیا ہے کہ زخم مندمل ہو جاتے ہیں لیکن وہ بچیوں کا یقین اور باپ کی طرف سے تحفظ کا احساس واپس نہیں لوٹا سکتے۔ شہروں میں رہتے ہوئے مشکلات، مہنگائی اور لوگوں کی بے مروتی کا مقابلہ کرنے کے لیے پہاڑ جتنا حوصلہ چاہیے وگرنہ ایک جیتا جاگتا انسان بھی پھٹیچر گاڑی کی طرح سڑک پر پرزہ پرزہ ہو کر بکھر جائے گا جیسا سائرہ کا انجام ہوا، حالانکہ یہ مسائل کا حل نہیں ہے اب ظالم معاشرہ اس کے بچوں کو نرم گھاس کی طرح نگل جائے گا۔ ''انعام'' کا ولی محمد مرد کامل تھا۔ سادہ اور اَن پڑھ ہونے کی وجہ سے جمع تفریق سے ناواقف تھا۔ اسے رب کی ذات پر یقین تھا اس لیے ہر حال میں خوش تھا لیکن جائز طریقے سے رزقِ حلال کا حصول اوّلین ترجیح تھی یوں اس بھولپن کو دیکھ کر قسمت کی دیوی مہربان ہو گئی اور سارے مسائل حل ہو گئے۔ ایسا مزاج اپنانا جتنا مشکل ہے معاوضہ کئی گنا بڑھ کر ہے۔ ''میں ہوا کافر'' میں حیرانی والی بات نہیں ہے۔ پتھر پر ایک جگہ مسلسل پانی کا قطرہ گرتا رہے تو سوراخ ہو جاتا ہے۔ زکریا سلمان انسان ہے اگر معمولی تبدیلی آ گئی ہے تو کون سی قیامت آ گئی، ہمیں اپنے گریبان میں جھانکنے کے بعد دوسرے کا احتساب کرنا چاہیے۔''

☆ عبدالحمید (جانی) کا بہاولپور سے تبصرہ۔ ''میں تہہ دل سے دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ جناب معراج رسول اور سرگزشت کے دیگر لکھاریوں کو صحت کاملہ عطا کرے (آمین)۔ اس بار فروری کا شمارہ دو ہفتے بعد ملا۔ میں نے قاسم رضا کا تحریر کردہ ''ایک صدی کا قصہ'' پڑھا، قاسم رضا نے شباب پروڈکشن کے بارے میں لکھا کہ حزیں صدیقی کافی عرصہ تک شباب پروڈکشن سے وابستہ رہے۔ دراصل حزیں صدیقی کا نام یہ نہیں بلکہ حزیں قادری تھا۔ جو فلمی کہانیاں، گیت اور مکالمے وغیرہ شباب پروڈکشن کے لیے لکھتے تھے۔ فلم انڈسٹری میں ان کا بڑا نام تھا۔ اسی طرح ایک نام جی اے چشتی کا آتا ہے جو پنجابی کے مانے ہوئے موسیقار تھے۔ انہوں نے فلم ''ہیر'' (پنجابی پرانی) جس میں سورن لتا، عنایت حسین بھٹی تھے ان کا گانا ''کیوں رول دتے دو ہیرے..... کی کیتا تقدیر'' کی دھن ایک ماچس کی ڈبی پر تیار کی تھی اور ایک دن میں چھ گانے ریکارڈ کرائے تھے۔ یہ جی اے چشتی کی انتھک کوشش اور محنت کا صلہ تھا کہ اب تک زمانہ ان کو یاد کرتا ہے۔ حزیں قادری اور جی اے چشتی دونوں باکمال لوگ تھے۔ اب وہ بہاریں کہاں، اب تو صرف ان کی یادیں رہ گئی ہیں۔ اسی طرح آفاقی صاحب

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

بھی ایک زندہ دل انسان تھے۔ان کی یاد الف لیلہٰ کی صورت میں نقش ہے۔میں مدیر اعلیٰ سے گزارش کرتا ہوں کہ آفاقی کی یاد کو زندہ رکھنے کے لیے نیا سلسلہ شروع کریں آپ کی عنایت ہوگی۔اس کا عنوان ''یادِ آفاقی'' رکھا جائے۔تاکہ نئے پڑھنے والے پرانے فنکاروں سے روشناس ہوسکیں۔''

☆منظر علی خان کا اظہاریہ لاہور سے۔''تازہ شمارہ بروقت ملا۔وقت کم ملتا ہے۔کچھ بھی لکھنے کا ارادہ ہو بھی تو لکھ نہیں پاتے۔''شہرِ خیال'' میں عبداللہ شجاع صاحب نے سرگزشت کے ماخذ و مصدر کی جو بات کی ہے وہ غیر ضروری اور غیر متعلقہ ہے۔گزشتہ رفتہ سے سرگزشت کو گزشتہ سے پیوستہ جوڑنا مناسب ہے۔اعجاز حسین ستھار کے خطوط ماہنامہ پر رواں تبصرہ ہوتے ہیں۔طاہرہ گلزار صاحبہ قارئین سے خصوصی ربط رکھتی ہیں اور ہر تعلق کو نبھاتی ہیں۔غالباً محرومیوں کا شکار یہ خاتون اچھے دل کی مالک ہیں۔فقیر غلام حسین ضیاء ''میں ماہی بے آب کی مانند تڑپنے لگا'' یہ عمومی جملہ ہے شاعری نہیں۔مولوی اسماعیل میرٹھی کا تذکرہ خوب رہا۔آپ اردو شاعری کا ایک خصوصی باب تھے۔بچوں کے ادب پر ان کی کہی ہوئی نظمیں ہمیشہ زندہ رہیں گی۔فیڈل کاسترو دنیا بھر میں ایک منفرد شخصیت تھے،تاریخ انہیں ہمیشہ یاد رکھے گی۔سفرنامہ ''شمشال سے ٹورنٹو'' خوب صورت اور دلکش ہے۔سفرناموں کا سلسلہ جاری رکھیے گا۔عبدالرب بھٹی صاحب کی تحریر ''ناسور'' کاشف زبیر صاحب کی ''سراب'' کی جگہ پُر نہیں کرسکی۔''سراب'' جتنی ولولہ انگیز پُرجوش اور دلکش نہیں ہے،کاشف زبیر کو جنت نصیب فرمائے۔ولی انفرادیت اور سنسنی خیزی کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔''سچ بیانیاں'' سبق آموز اور خوب صورت تھیں۔''

☆وہاب احمد نے لاڑکانہ سے لکھا ہے۔''کہتے ہیں نا دیر آئے درست آئے،سلمیٰ اعوان پچھلے مہینے غیر حاضر تھیں،اس مہینے آئیں تو پورے ڈائجسٹ پر چھا گئیں۔زبردست موضوع تھا۔''مارچ کی شخصیات'' میں مستنصر حسین تارڑ صاحب کو دیکھ کے بچپن کے دن یاد آگئے۔واراب بھائی پٹیل،حبیب جالب،انضام صاحب،آفریدی اور مولانا عبیداللہ پسند آئے۔سرپہلے بھی ایک شکایت کی تھی موبائل پر جی سرگزشت ڈائجسٹ آنے کے بعد دو یا تین دن میں نکل جاتے ہیں۔پھر پورے لاڑکانہ سٹی میں نہیں ملتے۔اب چوبیس تاریخ کو گیا مگر پورے سٹی میں نہیں ملا۔دوسرے سٹی سے منگوایا ہے۔(آپ اپنے قریبی بک اسٹال والے کو تاکید کریں کہ وہ زیادہ منگوائے) سر میں نے ایک جگ بیتی کہانی بھیجی تھی ''یہ کیسی محبت ہے'' سر یہ ان دنوں کی بات ہے جب بلاول بھٹو نے کئی مہینے پہلے کراچی میں جلسہ کیا تھا۔سکندر اور قلندر کا قصہ میرا آنکھوں دیکھا ہے۔سر مہربانی کیجئے بتائیے سرگزشت میں شامل ہو سکتی ہے یا نہیں۔(ابھی پڑھی نہیں گئی ہے)۔''

☆اویس شیخ نے ٹوبہ ٹیک سنگھ سے لکھا ہے۔''ماہر کا تذکرہ اداس کر گیا۔پے در پے اموات کی وجہ سے افغانی کی زندگی اجیرن اور الجھنوں کا شکار رہی۔قدرت کے سامنے ہم سب بے بس ہیں۔''اداریہ'' میں اس بار اہم موضوع کے ساتھ حاضر ہوئے۔خدا جانے یہ مفاد پرستی کا بت کب ٹوٹے گا؟''شہرِ خیال'' کی کرسی صدارت پر عبداللہ لفظ ''سرگزشت'' پر نکتہ چیں تھے۔طاہرہ گلزار سے اتفاق کرتا ہوں۔''میں کھلونا نہیں'' سچ بیانی مجھے بھی افسانہ لگی۔وضاحت مصنف خود فرما سکتے ہیں۔انکل غلام حسین! آپ تو محفل کی بزرگ شخصیت ہیں۔ماشاء اللہ ویری گریٹ۔ڈاکٹر روبینہ صاحبہ! محکمۂ ڈاک کی کارکردگی پر نالاں تھیں،ایسا بھی ہو جاتا ہے۔روحی اور نزاکت کا بھی مشکور ہوں۔ستھار صاحب،اشرفی اور رانا شاہد نے بھی بہت اچھے خیالات شیئر کیے۔''شاعر اخلاق'' کی پوری زندگی خاص بنو اور عام رہو کی تفسیر بنی رہی۔اللہ نے ان کو تخلیقی سوچوں سے نوازا۔انہوں نے شاعری کو ایک جہت دی۔شاعری اور مصوری یہ ایسے فنون ہیں جس کا ہر کوئی ماہر نہیں بن سکتا۔خداداد صلاحیتوں کے بغیر ان میں کامیابی ممکن ہی نہیں ہوتی۔سری ادب کی ممتاز اور عظیم ادیبہ کے مختصر حالاتِ زندگی بہت اچھے لگے۔ان کے نام کے ساتھ کرسٹی کیسے جڑا اس سے واقف نہیں تھا۔''مروآہن'' کی جدید داستانِ حیات پڑھی۔مصنفہ بڑی سخت کوشی،عرق ریزی اور انتھک محنت کے ساتھ ان کی زندگی سے جڑے ایک ایک واقعے کو اکٹھا کر کے قارئین کے سامنے لائیں جو ہرگز معمولی کام نہیں ہے۔اس ماہ کا بہترین آرٹیکل تھا ''فیڈل کاسترو'' رزم حق باطل کا نڈر اور بے باک سپاہی تھا۔کاش! ہمارے حکمران بھی ان سے کچھ سیکھتے۔''وہ ایک تارا'' کی خوب صورت کتھا اور دردناک انجام روح کو گھائل کر گئی۔صحافت بہت ہی نازک اور حساس پیشہ ہے۔''مارچ کی شخصیات'' سبھی پسند آئیں۔''شکاگو'' کے بارے میں جان کر اچھا لگا۔''سچے لیڈر'' کا تعارف اور ملک کی جغرافیائی روداد معلومات افزا تھیں۔''کھڑکی'' روداد پڑھی۔والدین کا دنیا سے رخصت ہونے کے بعد اولاد کا تربیتی اور اخلاقی شیرازہ کیسے بکھرتا ہے اس پر پُراثر اسٹوری تھی۔''ناسور'' کی دوسری قسط بھی زبردست ہے۔کہانی کا ہر صفحہ سحر انگیزی میں مرتفع ہے۔قاتل آخر کون تھا؟ جاننے کے لیے شدت سے انتظار ہے۔سچ بیانیوں میں ''شطرنج کی چال'' پڑھی۔محبت سے تہی دست دوشیزہ کی کہانی بہت تلخ تھی۔زندگی میں ایک آدھ شخص ایسا

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ضرور ہوتا ہے جس کا نام انسان کے لیے دعا کی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔ نجمہ کے دل میں شارق کے لیے یہی جذبہ عود آیا تھا۔ ''شکن'' پڑھی۔ ایسا لگتا ہے کہ دنیا جیسے ان تنگ دست لوگوں کے لیے بنائی گئی ہے، دولت اور بے حسی کا جال ہر سو پھیلا ہوا ہے۔ ''انعام'' مہنگائی کے ہاتھوں ہراساں شخص کی داستان ناامید لوگوں کے لیے اُمید کی کرن تھا۔ اعلیٰ ظرفی کی ایسی مثالیں ڈھونڈنا بہت مشکل ہیں۔ ''میں ہوا کافر'' کمال کی نفسیاتی داستان تھی۔ زکریا جیسے راسخ العقیدہ نوجوان کو انجم زیر بار کرنے میں کامیاب ہو چکی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کا اثر پکڑ چکے تھے۔ ''ڈھلتے سائے'' پڑھی۔ ذیشان کی محبت بری طرح مجروح ہوئی تھی جس کی تمازت وہ تو سہہ گیا لیکن حنا کو بھی اپنے کیے کی سزا مل چکی تھی۔ یہ شاید اس کے صبر کا پھل تھا کہ وہ آج بہتر طریقے سے زندگی بسر کر رہا ہے۔ ''اس ہاتھ دے'' کا ایک لفظ بھی پلے نہیں پڑا۔ ''ٹیوشن'' پڑھی۔ منظر امام! آپ ہمیں بھی ایک دو ٹیچر ایسے ڈھونڈ دیں۔ ''پالش والے بابا'' میں کچھ خاص نظر نہیں آیا۔ ''پچھتاوا'' پڑھی ہے۔ کسی نے سچ کہا تھا۔ ''حسن ایک جال ہے جو عقلوں کا شکار کرتی ہے'' عامر کے ساتھ بدقسمتی سے ایسا ہی ہوا۔''

☆ عریشہ نے سمندری سے لکھا ہے۔ ''عرصہ دراز سے جے ڈی پی کے رسائل کی قاری ہوں لیکن آج ایک خاص مقصد کے تحت قلم اٹھایا ہے۔ مارچ کا سرگزشت مجھے خلافِ توقع بائیس فروری کو ملا۔ فہرست پر نظر دوڑاتے ہی سرشاری طاری ہونے لگی کیونکہ خاصا من پسند مواد جھلک دکھا رہا تھا۔ ''عکسِ خیال'' کے باسی حسبِ معمول ڈائجسٹ کے مندرجات کی بجائے دیگر لوازمات میں الجھے نظر آئے۔ ویسے انکل جی! میں نے ایک بات نوٹ کی ہے ہمارے ''عکسِ خیال'' کے باسی آپسی گفتگو اور چند ایک سچ بیانیوں پر ہی تبصرہ کرکے ہاتھ جھاڑ کر سائیڈ پر ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ ڈائجسٹ کا ابتدائی حصہ جگ بیتیاں زیادہ محنت طلب اور قابلِ تعریف ہیں۔ جگ بیتیاں لکھنا میری ذاتی رائے میں ایک مشکل اور چیلنجنگ کام ہے کیونکہ اس میں تخیل کی پرواز بہت کم ہوتی ہے۔ پھر ایسی کیا بات ہے کہ چند ایک تبصرہ نگاروں کے سوا اس پورشن پر کوئی رائے نہیں دیتا۔ میرا یہ سوال پلیز ضرور شائع کیجیے گا کیونکہ میں ان سب کا ذہن پڑھنا چاہتی ہوں۔ اب آتی ہوں ڈائجسٹ کی طرف۔ ابتداء ہر دلعزیز مصنف کاشف زبیر سے کی۔ بہت سادہ با مقصد اور پُراثر تحریر تھی۔ ''سری ادب کی ملکہ'' میں اگاتھا کرسٹی کے بارے میں معلومات بھی بہت اچھی تھیں۔ ''شاعر اخلاق'' ابھی پڑھی نہیں ہے۔ ''مردِ آہن'' ایک طویل تحریر لیکن بالکل بور نہیں ہونے دیا۔ زویا اعجاز نے جے ڈی پی کی تبصرہ نگار سے مصنفہ تک کا سفر بہت کم وقت میں کامیابی سے طے کیا ہے۔ فیڈل کاسترو جیسی بے باکی اگر مسلم حکمرانوں میں بھی پیدا ہو جائے تو اور کیا چاہیے؟ سلمیٰ اعوان کی ''وہ ایک تارا'' نے دل چھو لیا۔ سچائی اور حق گوئی کی یہی سزا ہوتی ہے۔ سلمیٰ صاحبہ کے اندازِ تحریر نے باندھے رکھا۔ ''مارچ کی شخصیات'' میں مولانا عبیداللہ سندھی اور داراب بھائی پٹیل سے مل کر اچھا لگا۔ ''شکاگو'' اور ''سچا لیڈر'' بھی معلومات سے بھرپور تھیں۔ اے نیر سے ملاقات بھی خوب رہی۔ ان سے ہمارے کچھ رشتے داروں کی شناسائی ہوا کرتی تھی۔ وہ آج بھی ان کے مزاج کو بہت یاد کرتے ہیں۔ ''ناسور'' فی الحال بالکل متاثر نہیں کر سکی۔ مصنف کے اندازِ بیان اور ٹریٹمنٹ میں کوئی کشش نظر نہیں آ رہی۔ ''شطرنج کی چال'' ایک ایوریج سچ بیانی تھی ''شکن'' میں اختر شہاب نے دل گداز کر دیا۔ ''انعام'' ایک با مقصد اور بہت اچھی سچ بیانی تھی۔ ''ڈھلتے سائے'' بھی بس سو سو رہی۔ منظر امام کی ''ٹیوشن'' میں رخسانہ کا ٹیوٹر واقعی عقل سے پیدل تھا۔ پالش والے بابا جیسے کتنے ہی کردار ہمارے اردگرد بکھرے ہیں۔ ''پچھتاوا'' میں عامر کی قسمت اچھی تھی جوان خواتین کے چنگل سے بچ گیا۔''

☆ عبدالحفیظ گوجرانوالہ سے رقم طراز ہیں۔ ''اُمید ہے آپ اپنے تمام عملے کے ساتھ بخیریت ہوں گے۔ آج ایک بار پھر سالوں بعد آپ سے مخاطب ہو رہا ہوں۔ فروری 2017ء کا شمارہ پڑھا۔ جس مضمون نے خط لکھنے کی طرف توجہ مبذول کرائی وہ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب کا ''ناسور'' ہے۔ ''ناسور'' کی اٹھان بتا رہی ہے کہ یہ سلسلہ دلچسپ ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب نے بہت اچھے کرداروں کو لے کر کہانی کا تانا بانا بُنا ہے۔ سرگزشت کا اداریہ ہر بار ہی با مقصد ہوتا ہے لیکن یک صفحہ سرگزشت پر توجہ دینے کی ضرورت ہے (کیا پہلے کی طرح یورپی اور یونانیوں کی حالاتِ زندگی بیان کی جائے؟ پاکستانیوں، اردو ادب سے تعلق رکھنے والوں پر تحریر نہ دی جائے؟) ڈاکٹر ساجد امجد صاحب بہت اچھی تحقیق کرتے ہیں لیکن ان کا لکھا ہوا حمید اختر پر مضمون بہت پھیکا رہا۔ انور فرہاد بھی اس بار رنگ نہ جما سکے۔ جب کہ قاسم رضا زبردستی ہر فنکار کو ملتان کا رہائشی بناتے رہے۔ ایک اور سلسلہ ''شمشال سے ٹورنٹو'' بہت شاندار جا رہا ہے۔ آگے جا کر پتا چل سکے گا کہ شہباز فخری کس طرح کے حالات کا شکار ہوئے۔ سچ بیانیوں میں میری اجالا، قسمت کا کھیل، رنگِ دوستی نے دل پر اثر کیا۔ آپ کو شاید یاد آ جائے تقریباً پندرہ سال پہلے میں نے تجویز دی تھی جب ''سراب'' مکمل ہو جائے تو اس کو کتابی صورت میں شائع کر دیا جائے (ادارہ کتابیں شائع نہیں کرتا۔ یہ کام دوسروں کے ہیں)۔''

☆ نجمی رحمٰن کا تجزیہ برٹ لیٹ یو ایس اے سے۔ ''اداریہ تو ہمیشہ ہی دلسوز ہوتا ہے آپ اپنی شمع اردو کی روشن رکھیے پروانے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

آپ کے گرد منڈلاتے رہیں گے۔ طاہرہ گلزار میرا تبصرہ مختصر نہیں ہوتا۔ شاید ہمیں لکھنا نہیں آتا۔ رانا شاہد آپ کی فرمائشیں سوچ بچار کے مراحل میں ہیں۔ سال کا آخری پرچے کی بھی کہانیاں بہت اچھی ہیں۔ کرکٹ کے کیا شاندار محبِ وطن بندے تھے جو پاکستان کا نام اونچا رکھتے تھے اور اب؟ ''دسمبر کی شخصیات'' میں پہلا نام تو قائداعظم کا ہے۔ گل جی، چوہدری محمد علی، معین اختر، روشن آراء، ثقلین مشتاق، اپنا نام جاوداں کر گئے۔ بھگوان داس بہت کھرے جج تھے ان کی ہمیشہ تعریف ہی پڑھی ہے۔ انور فرہاد اچھا لکھ رہے ہیں۔ پرانی فلموں اور اداکاروں کا ذکر بہت اچھا لگتا ہے، تب فلموں میں بامقصد کہانیاں ہوتی تھیں اور کام کرنے والے اپنے کام کو عبادت سمجھ کر سرانجام دیتے تھے۔ جن کے گانے آج بھی کانوں کو بھلے لگتے ہیں۔ عنایت علی کا گل فروش والا مزے کا لطیفہ ہے۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' بہت دلچسپ جارہی ہے۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔ ''ادھورا آدمی'' نفسیاتی کہانی ہے۔ اللہ کی مرضی جب وہ دینے پر آتا ہے تو انعام خوب صورت ہی ملتا ہے۔ جب ڈھاکا فال ہوا تو بہت سی کہانیوں نے جنم لیا۔ ''آتش گزیدہ'' لرزا دینے والی کہانی ہے۔ کبھی ایسا.... مذاق کرنا نہیں چاہیے جو دوسرے کے لیے روگ بن جائے۔ ''انوکھی جیت'' نے دل خوش کر دیا۔''

☆ رانا محمد شاہد بورے والا سے رقم طراز ہیں۔ ''پہلی دفعہ شمارہ ملنے کے دو دن بعد تبصرہ بھیج رہا ہوں۔ بیگم اور بچوں کو لینے میانوالی جانا ہے۔ بچوں سے جدائی کو چھ ماہ سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے ایک ہفتہ سے زیادہ وہاں لگ سکتا ہے سو حاضری کے پیشِ نظر تبصرہ بھیج رہا ہوں۔ یک صفحی سرگزشت میں ایک قادر الکلام شاعر ماہر افغانی کے بارے میں پڑھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ایسے گمنام اور بہترین شاعروں سے آگہی بھی سرگزشت کی بدولت ہی ہوتی ہے۔ ورنہ ان گمنام شاعروں پر کون لکھتا اور شائع کرتا ہے۔ ماہر افغانی کی زندگی کے غم دیکھ کر بہت دکھ ہوا۔ باپ، بھائی، ماں، بہن اور پھر بیوی کا بچھڑ جانا، اتنے دکھوں کے بعد بندہ کہاں حواس میں رہتا ہے کہ اپنی شاعری بھی سنبھال سکے۔ اس دفعہ بھی اداریہ ایک اجتماعی ناسور کی نشاندہی کر رہا تھا۔ معراج رسول صاحب نے صحیح لکھا کہ آج ہم سب اپنے اپنے مفادات کے لیے جی رہے ہیں۔ عام، غریب شخص کے نہ دن پھرتے ہیں اور نہ حالات بدلتے ہیں۔ ''مشہرِ خیال'' میں عبداللہ شجاع سندھی کرسی صدارت پر تھے۔ تبصرہ اچھا تھا۔ آفتاب احمد نصیر اور اعجاز حسین سٹھار نے بھی خوب لکھا۔ اللہ تعالیٰ حکیم رضا شاہ کی والدہ کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ دے اور انہیں صبر دے (آمین)۔ طاہرہ جی، نزاہت افشاں کو ہم نے بھی لڑکی ہی سمجھا تھا۔ تحریم کی تجویز اچھی ہے۔ محی الدین نواب، علیم الحق حقی، کاشف زبیر اور سلیم فاروقی کی زندگیوں پر تحاریر ضرور دیں۔ سدرہ بانو ناگوری اصل میں ہم مردہ پرست لوگ ہیں۔ اسی لیے زندہ انسانوں کی قدر نہیں کی جاتی۔ ہم کسی غریب و مجبور بیٹی کے سر پر چادر نہیں رکھتے جب کہ مزار پر چادر چڑھا دیتے ہیں۔ حالانکہ مزار والے کو اس چادر کی ضرورت نہیں جتنی ضرورت اس زندہ بچی کو ہے۔ ہم تو ایوارڈ بھی مرنے کے بعد ہی دینا پسند کرتے ہیں۔ یہ بے قدری ہی تھی جس کی وجہ سے بہت سے لوگ ہمیں چھوڑ گئے۔ انور عباس شاہ دعاؤں کے لیے شکر گزار ہوں۔ ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری! ''مشہرِ خیال'' مل بیٹھنے کا بہانہ ہے ورنہ ٹائم تو واقعی کسی کے پاس کسی کے لیے بھی نہیں اور انسان تو اب ویسے بھی ٹائم مشینوں کو دینا پسند کرتا ہے۔ خواہ موبائل ہو، کمپیوٹر ہو یا کیبل۔ جدید ترقی نے انسان کو انسان سے دور کر دیا، باقی وقت کی تو یہی سب سے اچھی خوبی ہے کہ جیسا بھی ہو گزر جاتا ہے۔ پروفیسر راشد احمد غوری نے لکھا کہ وہ پچھلے چالیس سال سے پڑھ رہے ہیں جب کہ سرگزشت کی تو عمر شاید 27 سال ہے۔ نزاہت افشاں! آپ کی طرح ہم بھی سرگزشت کے اچانک غائب ہونے والے دوستوں بشریٰ افضل، منشی محمد عزیز میمن اور دوسرے سبھی ساتھیوں کو ''مشہرِ خیال'' میں واپسی کا کہتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ محمد اسماعیل میرٹھی نے اردو شاعری کو ایک نئی سمت، ایک نئی جہت عطا کی۔ ڈاکٹر ساجد امجد نے ان کی زندگی کے بہت سے گمنام گوشوں سے پردہ اٹھایا۔ مقبول لکھاری اگاتھا کرسٹی کی مختصر سرگزشت فرزانہ نگہت کی زبانی پڑھی۔ تحریر اچھی تھی مگر تھوڑی اور تفصیلات ہوتیں تو زیادہ دلچسپ ہوتی۔ زویا اعجاز نے فیڈل کاسترو پر تفصیلی اور جامع تحریر لکھی۔ فیڈل کاسترو پر بہت لکھا گیا تاہم چند ماہ پہلے انتقال کی وجہ سے موقع کی مناسبت سے آپ نے اچھا کیا کہ ان کے بارے میں تحریر لگا دی ایک طویل عرصے تک دنیا کی واحد سپر پاور سے ٹکر لینا، فیڈل کاسترو جیسی شخصیت کا کام تھا وہ واقعی مردِ آہن تھے۔ ''مارچ کی شخصیات'' میں کرکٹ کی کچھ شخصیات کا تذکرہ تھا۔ تاہم سر ویوین رچرڈز جو اس وقت کوئٹہ گلیڈی ایٹرز کے کوچ بھی ہیں کا ذکر نہ تھا، ان کی تاریخ پیدائش 3 مارچ 1952ء ہے۔ اسی طرح انور عباس شاہ کی پسندیدہ گلوکارہ مالا کے بارے میں بھی کچھ نہ تھا۔ تاہم ایک مہینا، دو شخصیات والا فارمیٹ زبردست ہے۔ ہمیشہ کی طرح ندیم اقبال کا سفرنامہ دلچسپ مراحل طے کرتا جارہا ہے۔ یہ سچ ہے کہ بعض واقعات کے انسانی زندگی پر گہرے اثرات ہوتے ہیں۔ کاشف زبیر کی ''کھڑکی'' ایسی ہی دلچسپ تحریر تھی۔ کاشف زبیر کی لکھی تحریریں نہ صرف سرگزشت کا اثاثہ ہیں بلکہ قارئین سرگزشت بھی انہیں کبھی نہیں بھلا سکتے۔''

☆ عبدالرحمٰن کی فیصل آباد سے تشریف آوری۔ ''بندہ آپ کے ماہنامہ سرگزشت کا باقاعدہ قاری ہے اور ہر ماہ اسے پڑھتا ہے۔ آپ کا ماہنامہ گوناگوں معلومات اور پُرمغز حقائق سے بھرپور ہوتا ہے۔ آپ ہر ماہ ایک تاریخی و علمی ادبی یا کسی معتبر شخصیت کے متعلق

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

لکھتے ہیں۔ میری آپ سے گزارش ہے کہ آپ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے متعلق ڈاکٹر ساجد امجد جیسے کہنہ مشق لکھاری سے ایک تحقیقی مضمون قارئین سرگزشت کے لیے منتخب کریں جس سے تمام لوگ استفادہ کرسکیں۔ اس سے کچھ حد تک یہ بھی اندازہ ہو جائے گا کہ اگر خلافت راشدہ کا نظام چلتا رہتا تو ارتقائی طور پر اس کی آخری شکل ایسی ہی ہوتی جیسی حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانے میں سامنے آئی۔ اگرچہ انہیں حکومت کرنے کا بہت کم وقت ملا۔ آپ کو اور آپ کے رفقائے کار نیز ماہنامہ سرگزشت کے معزز اسٹاف کو بہت بہت سلام اور تسلیمات۔''

☆ نزابت افشال کی آمد مبہورہ فتح جنگ سے۔ ''ماہر القادری کا نام اور کارنامے تو پڑھے تھے لیکن ماہر افغانی سے ہمیں سرگزشت نے روشناس کرایا۔ ماہر افغانی کے مجموعہ کلام کا نام بتا دیتے تو ہم بھی مستفید ہو جاتے ایسے کئی ہیرے گمنامی کے صحرا میں دفن ہیں۔ بس انہیں منظر عام پر لانا چاہیے۔ ڈاکٹر صاحب نے بہت بھرپور انداز میں اسماعیل میرٹھی کا ذکر کیا۔ بہت معلوماتی تحریر تھی۔ اسماعیل میرٹھی اپنے دور کے نامور شاعر اکبر الہ آبادی کی اگر بہت عزت کرتے تھے تو حیرت کیسی کہ اقبال جیسی ہستی بھی اکبر کی مداح تھی۔ اکبر بہت دور اندیش آدمی تھے۔ میرے پاس ''کلیات اکبر'' کا سب سے قدیم اور مستند نسخہ موجود ہے جو کہ فرزند اکبر، سید عشرت حسین نے اگست 1931ء میں نامی پریس لکھنو سے شائع کرایا تھا۔ سری ادب کی ملکہ، مرد آہن، وہ ایک تارا، شکاگو اور سچا لیڈر بہت تحقیقی تحریریں تھیں۔ کاش ہمیں بھی کوئی سچا لیڈر مل جائے۔ اے نیر کے کارناموں سے آگاہی ہوئی اور اہل دنیا کی بے حسی پر رونا آیا۔ ''شطرنج کی چال'' واقعی بہت گہرائی والی کہانی تھی۔ نجمہ کی بہن شاہدہ تو بہت لالچی اور موقع پرست عورت نکلی۔ شارق بھی اس کے جال میں پھنس گیا۔ ارشد نے بحیثیت شوہر اسے عزت دی پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ ''ناسور'' بہت اچھے انداز میں آگے جا رہی ہے۔ اب دیکھئے آگے کیا ہوتا ہے؟ ''شمشال سے ٹورنٹو'' اس بار خوب رہی۔ ندیم صاحب نے کلام اقبال سے مزہ دوبالا کردیا۔ ویسے اس انگریز نے ٹھیک کہا اقبال بہت بڑے مفکر تھے۔ میرے پاس اقبال کی لکھائی کے نمونے بھی موجود ہیں۔ علامہ صاحب بہت ہی خوش خط لکھتے تھے مگر ہم سے فارسی چھین لی گئی تاکہ اقبال سے مکمل آگاہی نہ ہو سکے۔ میرا مشورہ ہے کہ ان کا فارسی کلام بھی پڑھیں خاص کر ''اسرار و رموز'' اور ''جاوید نامہ''۔ میں خود شیدائی اقبال ہوں۔ ''مارچ کی شخصیات'' میں اس بار افتخار عارف، جالب اور تارڑ صاحب کا ذکر تھا۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری، جمال الدین افغانی، ناصر کاظمی، یزدانی، جالندھری، ایم ایم عالم، نسیم حجازی اور اصغر گونڈوی بھی مارچ ہی سے تعلق رکھتے تھے مگر ان کا ذکر نہیں ہوا۔ میں ہوا کا فر، ٹیوشن، پالش والے بابا اور اس ہاتھ دے سب بھرپور تحریریں تھیں۔ تھکن، انعام اور پچھتاوا بھی بہترین تھیں۔ ''بیت بازی'' میں اس بار عمدہ اشعار پڑھنے کو ملے۔ ''شہر خیال'' میں اس بار نئے نام بھی آئے، خوشی ہوئی۔ پروفیسر راشد اور ڈاکٹر خواجہ حنیف ادیب کے مختصر تبصروں سے پتا چل رہا ہے کہ دونوں صاحبان کی سرگزشت پر گہری نظر ہے۔ آپ کی گل آپ کی اعلیٰ ظرفی ورنہ بندہ ناچیز تو کچھ بھی نہیں ہاں اردو شاعری کا کافی حصہ مجھے حفظ ہے، کثرت مطالعہ کی وجہ سے۔ انور عباس شاہ جی یاد کرنے کا بہت شکریہ۔ مسرت رضوی صاحب خوش رہیں۔ اویس شیخ صاحب اقبال اور فیض کے بعد ناقدین کی اکثریت نے ناصر کاظمی کو غزل کا منفرد اور عظیم شاعر مانا۔ ویسے اپنی اپنی رائے ہوتی ہے۔ ڈاکٹر روبینہ سسٹر اتنی محبت کا بہت بہت شکریہ۔ میری طرف سے شادی کی سالگرہ مبارک ہو۔ سدرہ بانو ناگوری بھی بہت اچھے انداز میں حاضر تھیں لیکن مجال جو ہم کو یاد کیا ہو۔ آخر میں معراج رسول صاحب سے ایک فرمائش کہ جناب آپ تو جون ایلیا کے بہت قریب رہے ہیں براہ مہربانی ان پر بھرپور تحریر دیں۔ ان جیسی جامع العلوم ہستی شاید اب اردو ادب کو کبھی نصیب نہ ہوگی۔ آخر میں سب کو سلام عقیدت۔''

☆ سیف اللہ نے ملک وال سے لکھا ہے۔ ''سلمیٰ اعوان صاحبہ کی تحریر وہ ایک تارا پڑھی۔ پُراثر اور دل میں داخل ہونے والی تحریر لگی جس نے شروع سے آخر تک اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ یقیناً یہ لکھنے والی کا کمال ہے۔ اینا کی موت اور ہیرو، ہیروئن کا دائمی بچھڑنا دل کو دکھی کر گیا۔ وہیں اس وقت کے روس کے اندر ظلم و دہشت کا بھی پتا چلا۔ زویا اعجاز صاحبہ نے ایک بہادر، اپنی مثال آپ اور حالات کا رخ بدلنے والے آدمی فیڈل کاسترو سے متعارف کرایا جس کی ساری زندگی تگ و دو، محنت، مشقت مشکلات کا سامنا کرنا اور ان پر قابو پالینا، امریکا جیسے ملک کو آنکھیں دکھانا، اس کی پالیسیوں کے سامنے ڈٹ جانا، ہمیں بھی خود دار زندگی کی راہ دکھاتا ہے۔ ڈاکٹر ساجد نے شاعر اخلاق کے نام سے میرٹھی صاحب کا ذکر سنا کر پرانا وقت یاد دلا دیا جب گنگنایا جاتا تھا کوے ہیں سب دیکھے بھالے۔ ایک نظم غالباً ریلوے گاڑی یا انجن والی بھی ہوتی تھی۔ آگاتھا کرسٹی کا مختصر سا تذکرہ فرزانہ نجمہ نے لکھا جو کہ مختصر ضرور ہے مگر جامع ہے اس لیے پسند آیا۔ صائمہ اقبال سے عرض ہے کہ ایک مذہبی شخصیت، ایک سائنسداں اور ایک صنف نازک کا بھی ذکر کیا کریں۔ سلیم شاہد صاحب کی شکاگو کی سیر اچھی لگی۔ ندیم اقبال صاحب کا سفرنامہ سرجی کی جلیبیوں اور شہباز کے سیاپے لیے ہوئے تھا۔ آخر میں سیٹو جاب کی زندگی

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کے آخری الفاظ نے ہلچل مچادی اور دہلا دیا لیکن حقیقت یہی ہے۔ کاشف زبیر کی تحریر ''کھڑکی'' پُراثر ہے۔ آخر میں انسان کو سبق دیتی ہوئی نظر آئی۔''

☆ رضا احمد اعوان کی آمد دریا خان بھکر سے۔ ''ڈاکٹر ساجد امجد کی تحریر ''شاعرِ اخلاق'' خاصے کی چیز تھی۔ بے حد پسند آئی۔ زویا اعجاز کی تحریر ''مردِ آہن'' لاجواب تحریر تھی۔ ''مارچ کی شخصیات'' مستنصر حسین تارڑ، افتخار عارف، حبیب جالب اور عاطف اسلم جیسے ستاروں کے ہمراہ جلوہ گر تھی۔ ''شکاگو'' سیاحت پر بہترین تحریر تھی۔ ''سچا لیڈرز'' کوئی خاص تاثر نہ چھوڑ سکی۔ بلکہ اس کو شامل کر کے سرگزشت کے قیمتی صفحات ضائع کیے گئے۔ انور فرہاد اس بار ''بے چارہ'' کے عنوان سے اے تیر پر مضمون لائے۔ اگر دیکھا جائے تو اپنے خراب حالات کے یہ فنکار خود ذمہ دار ہیں۔ یہ اپنے عروج کے زمانے میں لاکھوں، کروڑوں کماتے ہیں اور ان کی گردن میں سریا آجاتا ہے۔ یہ شائقین کو انسان ہی نہیں سمجھتے اور اپنے آپ کو علیحدہ مخلوق سمجھتے ہیں اور کروڑوں روپے اپنی عیاشیوں پر اڑاتے ہیں۔ جب ان کا عروج ختم اور زوال کا سورج ابھرنا شروع ہوتا ہے تو یہ تہہ دست ہو چکے ہوتے ہیں۔ وحید مراد، مہدی حسن، ادیب راگنی اور دیگر کئی نامور فنکاروں کی مثالیں آپ کے سامنے ہیں۔ جن کے لیے امدادی شو منعقد کروانے پڑے۔ سوال یہ ہے کہ یہ نوبت کیوں آتی ہے؟ جن فنکاروں نے اپنے عروج کے زمانے میں دانش مندی کا ثبوت دیا۔ آنے والے وقت کے لیے منصوبہ بندی کی اور سائیڈ بزنس اختیار کیے وہ کسی امداد کے بغیر بہت اچھی خوش حال زندگی گزار رہے ہیں۔ محمد علی (مرحوم)، اداکارہ فردوس بیگم، نرگس اور دیگر کئی فنکاروں کی مثالیں آپ کے سامنے ہیں۔ دیگر سچ بیانیوں میں، میں ہوا کافر، شطرنج کی چال اور انعام اچھی کہانیاں تھیں۔ ''ناسور'' کی دوسری قسط زیرِ مطالعہ ہے۔ اٹھان اچھی ہے۔ اُمید ہے بہترین کہانی بنے گی۔''

☆ ظہیر احمد تبسم ناظم آباد کراچی سے لکھتے ہیں۔ ''مارچ کا شمارہ 21 تاریخ کو مل گیا تھا جس میں اپنا خط اور شعر کو شاملِ اشاعت دیکھ کر خوشی ہوئی۔ یک کی تعارف میں ماہر افغانی کے بارے میں مفید معلومات حاصل ہوئیں۔ اداریہ میں حکیم صاحب کو تو ہوش آگیا پر پتا نہیں پاکستانی قوم کو کب ہوش آئے گا۔ ''مشہرِ خیال'' میں عبداللہ شجاع ٹاپ پر نظر آئے۔ مبارک قبول کریں عبداللہ بھائی۔ طاہرہ آپا کا تبصرہ گزارے لائق رہا اس بار۔ احمد رضا انصاری، پروفیسر راشد غوری مختصر مگر اچھا لکھا۔ نزاہت افشال آپ مرد ہیں، میرے پوچھنے سے پہلے معلوم ہو گیا ورنہ باقی لوگوں کی طرح شرمندگی اٹھانی پڑتی۔ اس بار ڈاکٹر روبینہ نفیس ثاقب تھیں۔ پہلے تو انصاری تھیں یہ وہی ہیں یا کوئی اور (وہی ہیں)۔ مارچ کی تمام شخصیات زبردست تھیں۔ خاص کر میرے فیورٹ سنگر عاطف اسلم۔ ''شکاگو'' بھی اچھی تحریر لگی۔ ویلڈن علیم شاہد۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' کو ایک سال ہو گیا۔ وقت کا پتا بھی نہیں چلا۔ ''ناسور'' بہت اچھی جارہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ ہیرو اس بار صرف ذہین ہے اور لڑائی وغیرہ سے دور ہے ابھی تک۔ آگے کیا ہوتا ہے اگلی قسط کا انتظار رہے گا۔ ''شطرنج کی چال'' میں راشد کا کردار منفرد لگا۔ مسز راشد نے تمام فیصلے درست کیے۔ ''تھکن'' اختر شہاب زیادہ متاثر نہ کر سکے۔ ''پچھتاوا'' میں صفحہ 280 پر املا کی غلطی نظر آئی یا تو مصنف یا پھر آپ سے رائٹنگ میں غلطی ہوئی جو یہ ہے۔ مفکر کا قول یاد آگیا کہ جب دو برائیوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہو تو ''چھوٹی برائی'' کی بجائے ''چھوٹی بڑائی'' لکھا ہے۔ ''شطرنج کی چال'' میں صفحہ 217 پر نجمہ کا باس راشد اسے ڈانٹتا ہے غلط ڈاک کی وجہ سے تو نجمہ کہتی ہے سوری سر میں اسے ابھی ڈسپیچ کر دیتی ہوں۔ راشد کہتا ہے کہ وہ تو تم کر دو گی۔ وہ بھناتے ہوئے بولی۔ ''کی جائے'' وہ بھناتے ہوئے بولا۔ ''درست ہے۔''

☆ انور عباس شاہ کا تجزیہ دریا خان بھکر سے۔ ''مشہرِ خیال'' میں عبداللہ شجاع سندھی کرسی صدارت کی زینت بنے ہوئے تھے۔ بہت بہت مبارک ہو بھائی، تبصرہ بھی خوب تھا۔ رانا محمد شاہد، آفتاب احمد نصیر اشرفی اور اعجاز حسین سحار کے تبصرے بھی پسند آئے۔ طاہرہ گلزار باجی جب بھی آتی ہیں خوب آتی ہیں اور چھا جاتی ہیں۔ آپ نے حکیم رضا شاہ نقوی کی والدہ کی وفات کی خبر دی خداوندِ کریم حکیم صاحب کی والدہ ماجدہ کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے (آمین)۔ سید مسرت حسین رضوی اور سدرہ بانو ناگوری ہمیشہ کی طرح اپنے منفرد اور نرالے انداز کے ساتھ حاضر تھے۔ اپنے ہی علاقے کی بزرگ شخصیت فقیر غلام حسین ضیا بھی مختصر لیکن دلکش تبصرے کے ساتھ حاضر تھے۔ ڈاکٹر روبینہ نفیس ثاقب دھڑلے کے ساتھ بھرپور اور دلکش تبصرے کے ساتھ ''مشہرِ خیال'' کی زینت بنی ہوئی تھیں۔ اب ان کے بارے میں تھوڑی سی تشنگی یہ رہ گئی ہے کہ انہوں نے اپنی قابلیت اور خداداد صلاحیتوں کو بند کر کے رکھا ہوا ہے۔ کہانیاں اب نظر نہیں آتیں۔ احسان سحر کا خط مختصر لیکن ایک ایک لفظ خلوص میں ڈوبا ہوا تھا۔ نزاہت افشال معذرت بھائی جان۔ ''پالش والے بابا'' ایک سبق آموز تحریر تھی۔ میں تو یہی کہوں گا کہ خدا کی کسی بھی مخلوق کو تکلیف نہیں دینی چاہیے اور خاص طور پر انسانوں کو کیونکہ کون جانے کون خدا کے کس قدر قریب ہے۔ ''ٹیوشن'' ایک بڑے قلم کار کی اچھوتی تحریر تھی لیکن لگتی خیالی تھی۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' دلچسپی سے اپنے سفر کی جانب رواں دواں ہے یہ ایک ایسی تحریر ہے جسے بار بار پڑھنے کو دل کرتا ہے۔ اے تیر کے بارے میں مضمون بھی

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

بے مثال تھا۔ ''مارچ کی شخصیات'' سے کافی آگاہی حاصل ہوئی لیکن اس مضمون میں گلوکارہ، مالا بیگم ہر دفعہ شامل ہونے سے رہ جاتی ہیں کیونکہ ان کا انتقال مارچ ہی میں ہوا تھا۔''

☆ڈاکٹر روبینہ نفیس ثاقب انصاری نے بھکر سے لکھا ہے۔ ''سرگزشت کا لاسٹ پیج دیکھ کر منہ میں پانی بھر آیا۔ کیا خوب جب سرگزشت کے ساتھ بر گر بھی ملنے لگے۔ ''شہرِ خیال'' میں قیصر خان، خالد شفیع، فقیر غلام حسین ضیاء، انور عباس بھکر سے حاضر تھے۔ انور عباس دیکھ رہے ہیں نا مجھ پر کتنا ظلم ہو رہا ہے۔ عبدالجبار اور نزاہت افشاں بس جی شکریہ کہ آپ لوگوں نے میرے دکھ کو محسوس کیا۔ لو جی! بے چارے سعید احمد چاند اس بار دیر سے آئے خطوط میں بنام نامی شامل تھے۔ فیس بک پر بھی نظر نہیں آرہے ہیں کہاں گم ہیں۔ کہانیوں میں ''تھکن'' اور ''پالش والے بابا'' سبق آموز کہانیاں تھیں۔ ''میں ہوا کافر'' سب سچ بیانیوں سے ہٹ کر تھی۔ میرا مطالبہ ہے کہ سرگزشت میں ہر بار ایک مزاحیہ سچ بیانی بھی ہونی چاہیے۔ تمام لوگ میری آواز میں آواز ملاؤ تاکہ میرا مطالبہ جلد مان لیا جائے۔''

☆اختر عباس شاہ جہلم سے رقمطراز ہیں۔ ''یک مُنی ماہر نے جذبات میں ہلچل مچادی۔ بالکل ایک درد بھری کہانی لگی۔ صحیح کہا گیا ہے کہ درد ہی شاعری کرواتا ہے۔ شاعر اخلاق بھی پسند آئی۔ اسماعیل میرٹھی کا نام محتاجِ تعارف نہیں۔ بچپن میں درسی کتابوں میں ان کی نظمیں خوب پڑھی ہیں۔ سری ادب کی ملکہ اتنی مختصر تحریر تھی کہ مزہ نہیں آیا۔ ''مردِ آہن'' خوب لکھا۔ ''وہ ایک تارا'' کا تو جواب نہیں۔ ''مارچ کی شخصیات'' بھی دل کو چھو گئی۔ ''سچا لیڈر'' بھی پسند آئی لیکن اور بڑی تحریر ہوتی تو مزہ آتا۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' کا تو جواب نہیں۔ زبردست جا رہی ہے۔ میں ہر قسط کو دوبارہ پڑھتا ہوں۔ ''شطرنج کی چال'' بہترین سچ بیانی تھی۔ ''پچھتاوا'' بھی اچھی لگی لیکن ''انعام'' کی بہت زیادہ تعریف کروں گا۔ ''تھکن'' گزارے لائق تھی۔ ''ٹیوشن'' بالکل پسند نہیں آئی۔''

☆احسن راٹھور نے لاہور سے لکھا ہے۔ ''مارچ کا شمارہ وقت سے بہت پہلے مل گیا۔ انتظار میں وقت ضائع نہیں ہوا۔ شاعر اخلاق کو پڑھ کر بچپن کے ایام لوٹ آئے۔ بچپن میں ہم سب مل کر زور و شور سے یک زبان ہو کر ان کی نظمیں پڑھا کرتے تھے۔ ''وہ ایک تارا'' بہت محنت سے لکھی گئی داستان ہے اسی طرح ''مردِ آہن'' کی بھی تعریف نہ کرنا زیادتی ہوگی۔ ''بے چارہ'' نے بھی مجھے ماضی میں دھکیل دیا۔ نیر کی آواز کا میں شیدائی ہوں۔ ''سچا لیڈر'' بھی اچھی تحریر تھی۔ کاش ہمیں بھی کوئی ایسا لیڈر مل جائے۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' کی تعریف کتنی کروں یہ تو مجھے پہلی قسط سے پسند آرہی ہے۔ سچ بیانیوں کی تمام سچ بیانیاں دلچسپ تھیں۔''

☆آفتاب احمد خان العین یو اے ای سے آئے ہیں۔ ''ہمیں کل سرگزشت ملا۔ ہر بار تو اتنی دیر ہو جاتی تھی کہ چاہ کر بھی تبصرہ نہیں لکھ پاتا تھا۔ (ممالک غیر سے آئے خطوط کو ہم تلف نہیں کرتے آئندہ ماہ لگا دیتے ہیں) اس بار ''وہ ایک تارا'' بہت پسند آئی۔ روس میں کتنا ظلم و جبر عام تھا یہ اب پتا لگ رہا ہے۔ ''مردِ آہن'' بھی بہت محنت سے لکھی تحریر ہے۔ ''سچا لیڈر'' کچھ اور طویل ہوتی تو مزہ آجاتا۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' اپنے شباب پر ہے۔ ''ناسور'' کی اٹھان بھی دلچسپ ہے۔ شطرنج کی چال، تھکن اور انعام بھی اچھی لگیں۔ ''اس ہاتھ دے'' بھی اچھی تھی۔ ''پالش والے بابا'' پڑھ کر لگا کہ اب تک اس دنیا میں کچھ اچھے لوگ باقی ہیں جو اللہ والے ہیں۔''

☆اختر ہمایوں اختر کراچی سے شاملِ اشاعت ہیں۔ ''اس بار سرگزشت 21 فروری کو ہی مل گیا۔ وقت سے پہلے پرچا ملنے کی خوشی دیدنی تھی۔ سچ بیانیاں اس بار ایک کے علاوہ سب معیاری تھیں۔ ''شطرنج کی چال'' کا تو کہنا ہی کیا۔ شاعرِ اخلاق، مردِ آہن، وہ ایک تارا اور سچا لیڈر عزم و حوصلے بڑھانے والی جگ بیتیاں ہیں۔ سرگزشت کی یہی بات مجھے پسند ہے کہ وہ ایسی ہستیوں کی زندگی کا عکس پیش کرنے میں کوتاہی نہیں برتتا۔ ''مارچ کی شخصیات'' میں مختصر مختصر تعارف اچھا لگتا ہے۔ سفرنامے کی تو بات ہی دیگر ہے۔ اتنا پیارا، دلچسپ سفرنامہ میں نے پہلی بار پڑھا ہے۔ ابن انشاء کے بعد کسی کے سفرنامے مجھے اچھے لگے ہیں تو وہ ندیم اقبال ہیں۔ ''بیت بازی'' میں اس بار اشعار بہت عمدہ تھے۔ اس بار بھی میں نے ''علمی آزمائش'' میں صحیح جواب دیا ہے۔ شاید کبھی قرعہ اندازی میں میرا نام بھی آجائے۔''

(ممالک غیر سے افضال احمد، ٹورنٹو کینیڈا۔ ذیشان ملک، دبئی یو اے ای۔ افسر خان، جدہ سعودی عرب۔ فیاض ہاشمی، بیڈفورڈ یو کے۔ ناصر محمود، العین، یو اے ای)۔

تاخیر سے موصول خطوط: عباس علی بوترابی، لاہور۔ شائستہ جبیں، سیالکوٹ۔ اشرف خان، ڈی آئی خان۔ ناصر جمیل، اسلام آباد۔ فیض مشتاق، روہڑی سندھ۔ یاور علی، سکھر۔ انتظار حسین، دینہ جہلم۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

سردارِ سخن

ڈاکٹر ساجد امجد

ایسے وقت میں جب گلے میں غلامی کا طوق تھا اور زندگی دشوار تر تھی۔ برصغیر کے ہر قریہ میں ناامیدی پھیل چکی تھی اور دانشور طبقہ بھی خاموش تھا۔ ادب کو جذباتی ہیجان کے لیے مختص کردیا گیا تھا۔ شاعری کو حسن و عشق کے قصوں میں بدل دیا گیا تھا۔ ایسے پُرآشوب دور میں اردو شاعری کو بامقصد بنانے کے لیے ترقی پسند تحریک اٹھی، یہ منفی بھر نوجوانوں کی تحریک تھی اس کا انہیں سرخیل قرار دیا گیا۔ وہ خود بھی بااثر خاندان کا فرد تھا۔ کئی گائوں پر محیط زمینداری تھی لیکن وہ مزدوروں، دبے کچلے عوام کو اوپر لانے میں دلچسپی لے رہا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ برصغیر کے ہر قریہ کی ایک ہی کہانی ہے۔ زنگ آلود جذبے اور پرانی قدریں آگے بڑھنے نہیں دیتیں۔ ہر جا مُلّا و برہمن مخل ہیں جو شے کی حقیقت کو سمجھنے نہیں دیتے۔ وہ غفار کی بخشش کا ذکر نہیں کرتے، صرف جبار کی دہشت کا پرچار کرتے ہیں۔ اس لیے حقیقت کا ادراک کرانا ضروری ہے۔ پیٹ روٹی کا طالب ہے اسے افسانوں کے الجھائو سے دلچسپی نہیں اس لیے وہ زرداروں کے خلاف قلمی جہاد کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

اردو کے ایک بڑے شاعر کا زندگی نامہ

اس نے گلاب اور موگرے کی روشوں کو پار کیا اور مخمل کی طرح بچھی ہوئی گھاس پر قدم رکھ دیا۔ اب وہ اس آنگن میں آگیا جس کے درمیان قصبے کا سب سے قدیم نیم کا درخت لگا ہوا تھا۔ اس کی جڑ کے اردگرد اینٹوں کا گول دائرہ بنا کر پھولوں کے گملوں سے آراستہ کردیا گیا تھا۔ نیم کا درخت اتنا اونچا تھا کہ پورے آنگن اور کوٹھی کی چھت تک چھایا ہوا تھا۔ کوٹھی کے اردگرد قریبی رشتہ داروں کے مکانات تھے۔ اس درخت کی قوی ہیکل شاخیں ان مکانات کو بھی اپنی پناہ میں لیے ہوئے تھیں۔ اس کی شرارتوں کا یہ عالم تھا کہ ان مکانوں تک جانے کے لیے وہ ان شاخوں کا سہارا لیتا تھا۔ دروازے موجود تھے لیکن وہ ان شاخوں کے ذریعے ہی ان کے مکانوں تک پہنچتا تھا۔ یہ مشغلہ باپ کی موجودگی میں نہیں ہوسکتا تھا لیکن باپ کے گھر سے نکلتے ہی اپنے دوست کے ساتھ نیم کے پیڑ پر سوار ہوتا اور ہم عمر دوستوں کے ساتھ کھیلنے کے لیے شاخوں پر جھول جاتا اور کسی بھی مکان کے آنگن میں اتر جاتا۔ اس وقت بھی وہ پیڑ کے پیچھے چھپا، باپ کے آفس جانے کا انتظار کررہا تھا اور بڑی حسرت سے اونچی شاخوں کو تک رہا تھا جو اس کے انتظار میں بانہیں پھیلائے ہوئی تھیں۔

اس نے درخت کی جڑ کے پیچھے سے سر نکالا۔ دیکھا کہ والد صاحب دو ملازموں کے ہمراہ کوٹھی کے احاطے سے نکل کر بڑے پھاٹک کی طرف جارہے ہیں۔ اب میدان صاف تھا۔ اس نے درخت پر چڑھنا شروع کردیا۔

پھاٹک کے باہر دو گھوڑوں کی بگھی تیار کھڑی تھی۔ جعفر طیار جعفری نے کوچوان کے سلام کا جواب دیا اور بگھی میں پاؤں رکھ دیا۔ ان کے بیٹھتے ہی دونوں ملازم بگھی کے پیچھے محافظت کے لیے کھڑے ہو گئے۔ کوچوان باگیں چھوڑنے ہی والا تھا کہ جعفر صاحب کو کوئی کام یاد آگیا۔ انہوں نے کوچوان کو حکم دیا کہ بگھی کو موڑ کر اس پھاٹک کی طرف لے چلے جو باغی کے گزرنے کے لیے بنایا گیا تھا۔ یہ راستہ نیم کے درخت کے قریب سے ہو کر گزرتا تھا۔ پیڑ پر لٹکے ہوئے علی سردار کے وہم و گمان بھی نہیں تھا کہ والد واپس

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

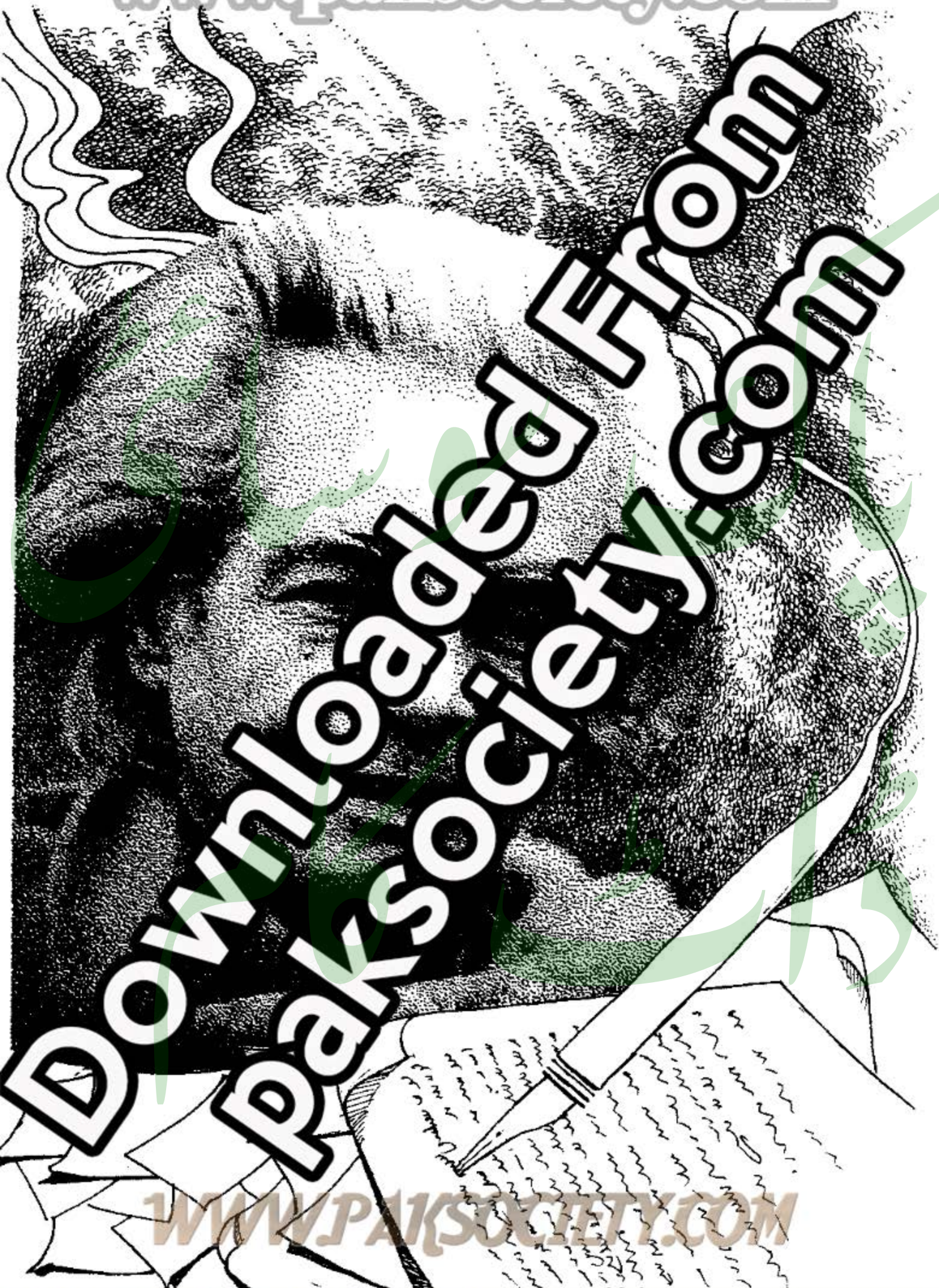

Downloaded From
paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

Downloaded From Paksociety.com

آجائیں گے۔ بیٹھک میں بیٹھے ہوئے جعفر صاحب نے اسے دیکھ لیا تھا لیکن ملازموں کے سامنے ڈانٹنا مناسب نہ سمجھا اور گزرتے چلے گئے۔ ایک جگہ بیٹھک رکوائی اور برآمدہ پار کر کے کمرے میں پہنچ گئے۔

''یا مولا خیر! آپ واپس کیوں آگئے؟'' زوجہ محترمہ نے تشویش ظاہر کی۔

''کچھ ضروری کاغذات بھول گیا تھا وہ لینے آیا ہوں۔''

''پھر بھی آپ کو واپس نہیں آنا چاہیے تھا۔ بزرگوں کا کہنا ہے کہ گھر سے قدم نکال کر پلٹنا نہیں چاہیے۔''

''آپ نے غلط سنا ہے۔ روایت یہ ہے کہ جاتے ہوئے کو آواز نہیں دینا چاہیے۔'' جعفری صاحب نے کہا اور وہ کاغذ اٹھا لیے جو ساتھ لے جانا تھے۔ کاغذ اٹھا کر پلٹے ہی تھے کہ انہیں علی سردار یاد آگیا۔ ''اور یہ آپ کے صاحبزادے نیم کے درخت پر لٹکے ہوئے کیا کر رہے ہیں۔''

''علی سردار ہوگا۔''

''جی ہاں وہی تھے۔''

''یہ کوئی آج کا قصہ تھوڑی ہے۔ اس کی شرارتوں کا عالم تو یہ ہے کہ کہیں جانا ہوتا ہے تو دروازے کی بجائے درخت کی شاخوں سے ہو کر جاتا ہے۔''

''اس سے پہلے تو آپ نے مجھے نہیں بتایا۔''

''میں آپ کو بتا کر کیا پریشان کرتی۔''

''بچوں کی شرارتوں کو چھپانا نہیں چاہیے۔ کسی دن ہڈی پسلی تڑوا بیٹھیں گے اور کچھ نہیں ہوگا۔ اس وقت تو میں جلدی میں ہوں۔ واپس آکر دیکھتا ہوں۔''

ان کے جاتے ہی علی سردار کی ماں نے ملازم کو دوڑایا کہ علی سردار کو بلا کر لائے۔ ملازم منہ لٹکا کر چلے آئے۔ وہاں علی سردار کا سایہ بھی نہیں تھا۔

☆.....☆

اتر پردیش کے شمال مشرق علاقے میں گونڈہ ضلع واقع ہے۔ اس ضلع کے شمال اور ترائی کے علاقے میں بلرام پور واقع ہے۔ جو چھتری راجاؤں کی جاگیرداری رہی ہے۔

علی سردار کا خاندان آگرہ کا تھا۔ اس خاندان کے کوئی بزرگ بلرام پور آگئے تھے۔ بلرام پورہ کوہ ہمالیہ کے دامن میں آباد ہے۔ وہاں کے جنگلات اور ندیاں بہت خوب صورت ہیں۔ جب برسات کے موسم میں گھنگور گھٹائیں چھائی تھیں تو بارش کے بعد ہمالیہ کی برف پوش چوکیاں بادلوں کے کناروں پر ستاروں کی طرح جھلملاتی تھیں۔ اس وقت وہاں کے جاگیردار تھے ان کو علی سردار کے کسی بزرگ نے مہاراجا بلرام پور کا خطاب دلوایا تھا۔ اس احسان کے بدلے میں مہاراجا نے ان کو اپنی ریاست کا مینیجر بنا دیا اور رہنے کے لیے بڑی سی کوٹھی دی جس کو خاندانی حیثیت مل گئی۔

علی سردار کے دادا کو ریاست کی جانب سے چار گاؤں ملے تھے۔ اس میں ضرورت کی ہر چیز پیدا ہوتی تھی اور باغات تھے جو موسمی پھلوں سے لدے رہتے تھے۔ دادا کے انتقال کے بعد اس کے والد بلرام پور کے اسلحہ خانے اور توشہ خانے کے آفیسر ہو گئے۔ منجھلے چچا مینیجر اور آنریری مجسٹریٹ تھے۔ چھوٹے چچا اس وقت کے بہترین فوٹو گرافر اور مہاراجا بلرام پور کے ولی عہد کے اتالیق تھے۔ گویا پورا گھرانا سورج کی روشنی کی طرح جگمگا رہا تھا۔

یہ خاندان بے حد مذہبی اور ایماندار تھا۔ کسی نے رشوت کا ایک پیسا نہیں لیا لہٰذا مہاراجا سے لے کر پورے بلرام پور کے لوگ عزت و قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

ریاست کی طرف سے ملنے والی کوٹھی، کوٹھی کیا تھی چھوٹا موٹا کوئی شہر تھا۔ درمیان میں بڑا سا ہال تھا اور اس کے گرد کئی کمرے اور غسل خانے وغیرہ تھے۔ ان کے چاروں طرف نہایت کشادہ برآمدے بنے ہوئے تھے۔ ایک برآمدے کے سامنے بڑا سا چبوترا بنا ہوا تھا۔ اس کے قریب پانی کا ایک کنواں اور دو حوض تھے۔ قریب ہی پیتے کے درخت لگے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان گلاب، موگرے اور دوسرے خوشبو دار پھولوں کی روشیں بنی ہوئی تھیں اور درمیان میں ہری ہری دوب لگی ہوئی تھی جو دیکھنے میں سبز مخمل کا فرش معلوم ہوتی تھی۔ باقی کے چاروں برآمدے پھولوں کے گملوں سے سجے رہتے تھے۔ آنگن کے درمیان نیم کا درخت لگا ہوا تھا۔

☆.....☆

جعفر طیار کا کام نمٹا کر واپس آئے اور نیم کے درخت پر نظر پڑی تو بے اختیار علی سردار کا خیال آیا۔

''صاحبزادے درخت سے اتر آئے یا ابھی تک لٹکے ہوئے ہیں۔'' انہوں نے علی سردار کی ماں سے پوچھا۔

''آپ بھی کمال کرتے ہیں دھوپ گھر سے چلی گئی۔ شام ہونے کو آئی۔ وہ کیا ابھی تک درخت پر ہوگا۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''پھر ہیں کہاں۔ ذرا بلائیے تو۔''

''بس اب ڈانٹ ڈپٹ زیادہ مت کیجیے گا، بچے ایسی شرارتیں کرتے ہی ہیں۔''

''آپ کے لاڈ پیار نے ہی اسے بگاڑ دیا ہے۔''

زاہدہ خاتون نے ملازمہ سے کہا اور علی سردار جعفری معصوم صورت بنائے باپ کے پاس حاضر ہو گیا۔

''ہمیں آپ کی شکایت ملی ہے۔''

''کیسی شکایت ابا جان؟''

''یہی کہ تم سات سال کے ہو گئے ہو اور ابھی تک پڑھنا شروع نہیں کیا۔''

''مجھے تو بہت شوق ہے مگر اماں کہتی ہیں میں چھوٹا ہوں۔''

''تم چھوٹے ہو مگر نیم کا پیڑ بہت بڑا ہے لہٰذا اب تم نیچے بیٹھ کر منشی جی سے حساب اور انگلش پڑھا کرو، قرآن شریف میاں جی سے پڑھا کرو گے۔''

''نیم کا پیڑ تو پھر بھی رہے گا۔''

''فکر مت کرو۔ ہم اسے کٹوا دیں گے۔''

''اسے مت کٹوایئے گا۔''

''یہ ہو گا تو آپ اس پر چڑھیں گے بھی۔''

''نہیں اب میں اس پر نہیں چڑھوں گا۔''

''اب جاؤ کل سے پڑھنے بیٹھنا ہے۔''

اس کی خوشی کی انتہا نہیں تھی۔ پڑھنے کی اجازت کیا ملی روشنی کو اندر آنے کی اجازت مل گئی۔ اس نے کمرے سے باہر نکلتے ہوئے نیم کے پیڑ کو حقارت سے دیکھا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔

دوسرے دن کی صبح نمودار ہوئی تو وہ عربی قاعدہ لے کر میاں جی کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس کے چچازاد بھائی اور دوسرے رشتہ دار لڑکے پہلے ہی سے میاں جی سے پڑھ رہے تھے۔ میاں جی کے شاگردوں میں ایک شاگرد کا اور اضافہ ہو گیا۔ انہوں نے اس نئے شاگرد کو سبق دیا اور ہدایت کی کہ سر جھکا کر یاد کرتا رہے۔ کچھ دیر بعد اس نے یہ کہہ کر میاں جی کو حیران کر دیا کہ اس نے سبق یاد کر لیا ہے۔

''لگتا ہے تمہارا دل قطعی نہیں لگ رہا ہے۔ اس لیے سبق یاد کرنے کا بہانہ کر رہے ہو۔''

''میں سچ کہہ رہا ہوں۔ آپ کو یقین نہیں تو سن لیں۔''

میاں جی نے سبق سنا۔ ان کی حیرانی اور بڑھ گئی۔ اس نے نہ صرف یاد کر لیا تھا بلکہ بغیر دیکھے پڑھ لیا تھا۔ میاں جی نے آگے سبق دے دیا۔ میاں جی کے جانے کا وقت ہوا تو وہ نیا سبق بھی یاد کر چکا تھا۔ میاں جی نے چلتے چلتے سبق اور دے دیا۔ ''یہ گھر سے یاد کر لینا۔''

میاں جی کے چلے جانے کے بعد ہندو منشی جی حساب اور انگلش پڑھانے کے لیے آ گئے۔ سب بچے کوٹھی کے پیچھے کے حصے میں جو برآمدہ تھا اس میں جمع ہو گئے۔ علی سردار نو وارد تھا۔ لہٰذا منشی جی نے بڑے پیار سے اسے اپنے پاس بٹھایا۔ وہ گنتی وغیرہ ماں کے پاس بیٹھ کر سیکھ چکا تھا۔ اب جمع تفریق کے سوالوں کا مرحلہ تھا لہٰذا منشی جی نے یہیں سے آغاز کیا۔

اس کی تعلیم کا باقاعدہ آغاز ہو چکا تھا۔

نیم کے درخت پر چڑھنے کا وقت ہی نہیں ملا اور شام ہو گئی۔ سات بجتے ہی کوٹھی کی حفاظت کے لیے سرکاری پہرے دار آ گئے۔ ان میں خاکی وردی پہنے ہوئے چھ سپاہی اور ایک حوالدار تھا۔ سپاہی خاکی وردی کے ساتھ خاکی رنگ کی ٹوپی پہنے ہوئے تھے اور حوالدار کے سر پر پگڑی بندھی ہوئی تھی جس میں مور کے پر لگے ہوئے تھے۔ یہ پہرے دار روزانہ اس سج دھج سے آتے تھے۔ نیم کے نیچے سپاہیوں کے رہنے کے لیے تین دروازوں کا ایک دالان بنا ہوا تھا۔ بھری بندوقوں سے وہ تمام رات پہرہ دیتے تھے۔

یہ کوئی آج کا معمول نہیں تھا لیکن کل اور آج میں فرق یہ ہو گیا تھا کہ اسے بھائی بہنوں کے ساتھ محفل جمانا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ والدہ اور والد اوپر کے حصے میں سوتے تھے۔ نیچے بھائی بہنوں کی محفل جمتی تھی اور آدھی رات تک رت جگا رہتا تھا لیکن آج اس محفل میں اس کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ اسے میاں جی کا دیا ہوا سبق یاد کرنا تھا۔ منشی جی نے جو حساب کے سوال دیئے تھے انہیں حل کرنا تھا۔

دس بج گئے تھے۔ کوٹھی کے پھاٹک میں تالا ڈال دیا گیا تھا۔ اب بغیر اجازت کوئی اندر نہیں آ سکتا تھا۔ اس نے بڑے پھاٹک میں تالا ڈالنے کی آواز سنی تو وہ وہاں سے چپکے سے کھسک گیا اور ایک گوشے میں بیٹھ کر اپنا سبق یاد کرنے لگا۔

صبح چھ بجے گارڈ واپس چلے گئے۔ وہ بھی دیر کا سویا ہوا جلد ہی جاگ گیا۔ اسے ماں کے ساتھ کھڑے ہو کر فجر کی نماز ادا کرنی تھی۔ نماز ادا کرنے کے بعد وہ کمرے سے برآمدے میں آیا۔ پھر روشوں پر چلتا ہوا نیم کے درخت کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

قریب آیا اور اپنے اس دوست کو حسرت سے دیکھنے لگا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو وہ ایک آدھ شاخ پر جھول چکا ہوتا لیکن وہ عہد کر چکا تھا کہ اب پیڑ کے نیچے نیچے ہی رہے گا۔ کچھ دیر چڑیوں کی چہکاریں سنتا رہا اور پھر کمرے میں چلا گیا۔

تعلیم کا سلسلہ چلتا رہا۔ میاں جی اور ہندو منشی پڑھانے کے لیے آتے رہے۔ میاں جی چونکہ قرآن و دینیات کی تعلیم دیتے تھے اس لیے شوخی دکھانے کا موقع نہیں ملتا تھا لیکن ہندو منشی کے سامنے اس کی شوخیاں خوب کھل کر سامنے آتی تھیں۔ اب وہ حساب کے سوال خوب حل کرنے لگا تھا لیکن اس نے عجیب عادت اپنائی تھی۔ تمام لڑکے منشی جی کے قریب بیٹھ کر پڑھتے تھے اور علی سردار قریب لگے امرود کے پیڑ کی کسی شاخ پر بیٹھ کر اپنا کام کرتا۔ بے چارے منشی جی چلاتے۔ ''ارے تم ہمرے کپار پر کا ہے چڑھے ہو۔ نیچے اترو۔''

وہ اوپر ہی سے جواب دیتا۔ ''جناب! تازہ ہوا میں حساب کے سوال جلد ہو جاتے ہیں۔'' اور واقعی حساب کے سوال جلد حل ہو جاتے تھے۔ تب وہ وہیں سے چھلانگ لگاتا اور حل شدہ سوال منشی جی کے سامنے رکھ دیتا۔ اس کی ذہانت کو دیکھتے ہوئے منشی جی نے بھی کہنا چھوڑ دیا تھا۔ نیم کا درخت نہ سہی امرود کا درخت سہی۔ وہ اوپر بیٹھا رہتا اور سوال حل کرتا رہتا۔ شاید اس طرح اس کے اس جذبے کو تسکین ملتی تھی کہ وہ سب سے بلند ہے۔

حاضر جوابی اور سرکشی اس کے مزاج میں تھی لیکن اس میں کسی بدتمیزی کا دخل نہیں تھا۔ بات چیت نہایت تمیز سے کیا کرتا تھا۔

ایک روز وہ اپنے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ ٹینس کھیل رہا تھا کہ اسی وقت ایک صاحب جو عربی اور فارسی کے عالم سمجھے جاتے تھے تشریف لائے۔ گھر کا دستور تھا کہ بزرگوں کو آتا دیکھ کر بچے کھیل بند کر دیا کرتے تھے لہٰذا سب بچوں نے کھیل بند کر دیا اور ان کے قریب آ کر سلام کیا۔ علی سردار نے دور ہی سے کہا۔ ''آداب عرض ہے جناب۔''

مولانا نے ڈپٹ کر کہا۔ ''تم نے پاس آ کر سلام کیوں نہیں کیا۔''

اس نے برجستہ جواب دیا۔

محروم میں نہیں ہوں سلام حضور سے
پاس ادب یہی ہے کہ مجرا ہو دور سے

شعر سنتے ہی مولانا کو ایک جھٹکا سا لگا۔ یہ عمر اور ایسا جواب انہیں حیرت ضرور ہوئی لیکن انہوں نے ظاہر نہیں ہونے دیا اور اندر چلے گئے۔ والد سے ملاقات ہوئی تو پورا واقعہ سنایا اور علی سردار کی تعریف کی۔

''آپ کے گھر میں تو شاعر پیدا ہو رہا ہے۔''

''جی ہاں! میں خود حیران ہوں۔ اتنی سی عمر میں اس نے پانچ سو اشعار یاد کر لیے ہیں۔ کوئی شخص کسی قسم کا سوال کرتا ہے وہ اس کا جواب شعر میں دیتا ہے۔ انگریزی کا یہ حال ہے کہ ابھی اسکول جانا شروع نہیں کیا ہے اور انگریزی بولنا سیکھ گیا ہے۔''

''نہایت ذہین بچہ ہے۔'' مولانا نے کہا۔ ''لیکن ذہین بچے بگڑ بھی بہت جلد جاتے ہیں۔ اس کی بہتر تعلیم کا بندوبست کیجیے۔''

''ابھی آٹھ سال کا ہے۔ گھر پر ٹیوشن پڑھ تو رہا ہے۔''

''میرا مشورہ تو یہ ہے کہ اسے سند اجتہاد حاصل کرنے کے لیے مذہبی تعلیم دلائی جائے۔ اگر اسے آپ نے مجتہد بنا دیا تو پورے خاندان کی عاقبت سنور جائے گی۔''

مولانا یہ مشورہ دے کر چلے گئے۔ ان کے چلے جانے کے بعد جعفر طیار نے اس مشورے پر سنجیدگی سے غور کرنا شروع کر دیا۔ دوسرے بھائیوں اور خاندان کے لوگوں سے بھی مشورہ کیا اور طے پایا کہ اسے لکھنو کے سلطان المدارس میں داخل کرا دیا جائے۔

سلطان المدارس میں عربی فارسی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ پھر کچھ سال بعد عراق بھیج دیا جاتا تھا۔ وہاں سے وہ باقاعدہ سند حاصل کر کے مجتہد بن جاتے تھے۔

اس کی عمر ایسی نہیں تھی کہ اپنے لیے کوئی راستہ تجویز کرتا۔ بڑوں نے جو راستہ دکھایا اس نے قبول کر لیا اور پڑھنے کے لیے لکھنو چلا گیا۔ مدرسے کی اقامت گاہ ہی میں رہتا تھا وہیں تعلیم حاصل کرنی تھی۔ مدرسے کی پابند زندگی اور عربی فارسی کا سامنا اس کی ذہانت کو نے کھدرے میں چھپ گئی۔ وہ ایک غبی طالب علم کی حیثیت سے سامنے آیا۔ حافظے نے جیسے ساتھ ہی چھوڑ دیا جو کچھ یاد کرتا ذہن کا صفحہ سادہ ہی رہتا۔ کچھ ہی دن گزرے تھے کہ وہ یہاں کے ماحول سے اکتا گیا۔ طبیعت میں خودسری تو تھی ہی۔ ایک دن کسی کو بتائے بغیر مدرسے سے نکل کھڑا ہوا۔ اندازے سے چلتا رہا اور پھر راستہ پوچھتے ہوئے اسٹیشن پہنچ گیا۔ اکیلا گاڑی میں سوار ہوا اور بلرام پور پہنچ گیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

بلرام پور محدود آبادی کا علاقہ تھا۔ سب ایک دوسرے کو پہچانتے تھے اور پھر وہ جس خاندان سے تعلق رکھتا تھا وہ کسی کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ تانگے والا اسے دیکھتے ہی چونک پڑا۔ ''سرکار آپ! اکیلے۔''

''میں پڑھنے کے لیے لکھنو گیا تھا۔ وہیں سے آرہا ہوں۔''

''بڑے لوگوں کی بڑی باتیں۔ اتنا سفر اکیلے ہی طے کرلیا۔'' تانگے والے نے کہا اور اسے کوٹھی تک پہنچا دیا۔

ٹرین نے اسے اس وقت پہنچایا تھا جب اس کے والد اور چچا گھر سے آفس کے لیے روانہ ہو چکے تھے۔ یہ بھی اس کے حق میں خیریت ہی ہوئی۔ پھاٹک پر کھڑے ہوئے پہرے دار نے اسے سلام کیا۔ وہ اندر چلا گیا۔ ماں نے اسے دیکھتے ہی ہاتھ آگے بڑھا دیئے۔

وہ ابھی تک یہی سمجھ رہی تھیں کہ وہ ملنے آیا ہے لیکن جب اس نے ڈرتے ڈرتے یہ بتایا کہ وہ ہمیشہ کے لیے آگیا ہے تو ماں نے سر پیٹ لیا۔

''خوش بخت! تم کیوں چلے آئے۔ تمہارے باپ تو تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ رشتے دار کیا کہیں گے کہ جعفر طیار کا بیٹا ان پڑھ رہ گیا۔''

''اماں، اب آپ ہی ابا جان کا غصہ ٹھنڈا کیجیے گا۔ میں تو آگیا۔''

ماں نے اسی وقت ایک ملازم کو دوڑایا۔ اطلاع ملتے ہی اس کے والد اور دونوں چچا وقت سے پہلے ہی گھر آگئے۔ جو کچھ سنا تھا سچ تھا۔

اس کے والد بچوں کے سلسلے میں سختی سے کام نہیں لیتے تھے لیکن اس حرکت پر وہ خاموش نہ رہ سکے۔ جب ڈانٹ ڈانٹ کر تھک گئے تو سمجھانے بیٹھ گئے اور ایک آدمی کو ساتھ کر کے لکھنو واپس بھیج دیا۔

کچھ دن نہیں گزرے تھے کہ وہ لکھنو سے دوبارہ بھاگ کر بلرام پور آگیا۔ اس مرتبہ والد نے کوئی سختی نہیں کی بلکہ پاس بٹھا کر پیار سے پوچھا۔ ''تم وہاں نہیں پڑھنا چاہتے؟''

''قطعی نہیں۔''

''تم کیا پڑھنا چاہتے ہو؟''

''میں انگریزی پڑھوں گا۔ مدرسے میں میرا دل نہیں لگتا۔''

کئی رشتے داروں نے مخالفت کی لیکن جعفر طیار کی رائے یہ تھی کہ بچے پر اپنی مرضی مسلط نہیں کرنی چاہیے۔ اس کو تعلیم وہ دینی چاہیے جس میں اسے دلچسپی ہو۔

اس وقت قاعدہ یہ تھا کہ جب تک تیسری کلاس تک کا حساب اور انگریزی بچے کو نہ آجائے اسکول میں داخلہ نہیں ملتا تھا۔ لہٰذا اس کے والد نے اسے بشیر نام کے ایک استاد

سوانحی خاکہ

نام: علی سردار جعفری
والد کا نام: سید جعفر طیار جعفری
والدہ: زاہدہ خاتون جعفری
بھائی: سید ظفر عباس جعفری
بہنیں: زبیدہ خاتون، جعفری خاتون، قمر النساء، رباب بانو، ستارہ جعفری، سادات جعفری
تعلیم: ایم اے (انگریزی نامکمل)
زوجہ: سلطانہ منہاج
اولاد: علی ناظم جعفری، حکمت جعفری
پیدائش: 26 نومبر 1913ء
وطن: بلرام پور (اودھ)
وفات: یکم اگست 2000ء
تدفین: سانتا کروز قبرستان، بمبئی

مجموعہ ہائے کلام

پرواز، نئی دنیا کو سلام، خون کی لکیر، امن کا ستارہ، ایشیا جاگ اٹھا، پتھر کی دیوار، ایک خواب اور پیراہنِ شرر، لہو پکارتا ہے، تر انہ جمہور۔

نثری تصانیف

منزل (افسانے) تین مختصر ڈرامے، یہ خون کس کا ہے (ڈراما)، پیکار (ڈراما)، ترقی پسند ادب، لکھنو کی پانچ راتیں، اقبال شناس، پیغمبر ان سخن، سرمایہ سخن، ترقی پسند تحریک نصف صدی۔

مرتب تصانیف

دیوان غالب، دیوان میر، کبیر بانی، میر اوانی۔

صحافت

مدیر ''نیا ادب''، رکن مجلس ادارت ''قومی جنگ''، مدیر ''گفتگو''۔ مدیر ہندوستانی بک ٹرسٹ، بمبئی۔ مہمان مدیر رسالہ، کتاب نما، نئی دہلی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کے سپرد کر دیا۔ بشیر صاحب کا جنرل اسٹور تھا۔ اس اسٹور پر بیٹھ کر وہ بچوں کو پڑھایا کرتے تھے۔ علی سردار بھی وہاں جانے لگا۔ کچھ تو اس کی خداداد ذہانت کچھ یہ خیال کہ اس کی پسند کا مضمون اسے پڑھنے کو مل گیا تھا۔ اس نے خوب دل لگا کر پڑھنا شروع کر دیا۔ اس نے ایسی اہلیت کا مظاہرہ کیا کہ یہ نئے استاد بھی تعریف کرنے پر مجبور ہو گئے۔

اس کی تعلیمی صلاحیتیں اپنی جگہ لیکن شرارتوں میں کمی نہیں آئی تھی۔ نیم کا درخت اب بھی اس کی پناہ گاہ بننے لگا تھا۔ اس کی شرارتوں کو دیکھتے ہوئے والد نے بھی مناسب سمجھا تھا کہ اسے زیادہ سے زیادہ اپنے ساتھ رکھیں۔ شہر سے باہر جانا ہوتا تھا تو ضرور اپنے ساتھ لے جاتے تھے کہ ان کے پیچھے نہ جانے کیا قیامت ڈھائے۔ ایک مرتبہ کسی خاص چیز کی خریداری کے لیے انہیں ایک شہر ''درجنگہ'' جانا پڑا۔ حسبِ معمول علی سردار بھی ان کے ساتھ تھا۔ جس دکان سے سامان خریدنا تھا اس کا مالک انگریز تھا۔ یہاں انہیں ایک ہفتہ رہنا پڑا۔ جب علی سردار بہت تنگ آ گیا تو اس نے انگریز کو دیکھ کر انگریزی میں کہا۔ ''مجھے اپنی ماں کی بہت یاد آ رہی ہے۔ جلدی معاملہ طے کیجیے تاکہ میں اپنی ماں کے پاس جا سکوں۔''

اس انگریز کے لیے اتنے چھوٹے بچے کا انگریزی میں بات کرنا تعجب خیز بات تھی۔

اس انگریز نے والد سے پوچھا۔ ''یہ تمہارا بیٹا ہے۔''

''جی ہاں، یہ میرا بیٹا ہے۔''

انگریز نے دو چار سوال علی سردار سے مزید کیے۔ ان سوالوں کا جواب بھی اس نے انگریزی میں دیا۔ وہ انگریز بہت متاثر ہوا۔

''بہت ذہین اور ہوشیار بچہ ہے۔'' اس انگریز نے کہا اور فوراً معاملہ طے کر دیا۔

والد نے اسے ساتھ لیا اور پہلی ٹرین سے بلرام پور واپس آ گئے۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب اس نے اسکول جانا بھی شروع نہیں کیا تھا۔

جعفر طیار اپنے اس بیٹے پر فخر کرتے تھے۔ انہیں اُمید تھی کہ علی سردار بڑا ہو کر انگریزی ملازمت میں ان کا نام روشن کرے گا کچھ نہیں تو تحصیل دار تو ضرور بن جائے گا۔

انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ قدرت انہیں کیا بنانے والی ہے یا وہ کیا بننے والا ہے۔

جب وہ انگریزی اور حساب میں طاق ہو گیا تو اسے بلرام پور کے اسکول ''لائل کالجیٹ'' میں داخل کرا دیا گیا۔

اب وہ بچپن کی سرحدوں سے نکل کر لڑکپن کی حدود میں داخل ہو رہا تھا۔ اپنی ذہانت کی وجہ سے پورے گھر کی آنکھوں کا تارا بنا ہوا تھا۔ خاص طور پر اس کے چھوٹے چچا جو چھوٹے بابا کہلاتے تھے اس پر خاص مہربان تھے۔ ان کے پاس بہترین نسل کے گھوڑے، عمدہ بندوقیں اور کیمرے تھے۔ شکار کے نہایت شوقین تھے۔ انہوں نے اپنے ساتھ علی سردار کو بھی لگا لیا۔ وہ بندوق اٹھائے گاؤں گاؤں، جنگل جنگل مارا پھرتا اور ریاست کی تحصیلوں اور ذیلداریوں میں ٹھہرتا تھا۔ اس سیر سپاٹے میں وہ نئی نئی جگہوں سے بھی آشنا ہوا اور ان مظاہر سے بھی جن سے وہ اب تک آشنا نہیں ہوا تھا۔ گرمیوں کی چلچلاتی ہوئی دھوپ میں جھکے ہوئے کسان جن کی پیٹھوں پر اینٹیں لدی ہوتی تھیں۔ ان کے جوتے مارے جا رہے تھے اور وہ دہائیاں دے رہے تھے۔ اس نے پیڑ کی شاخوں میں بالوں سے لٹکی ہوئی عورتیں بھی دیکھیں۔ پتلی پتلی سوکھی ہوئی ٹانگوں اور باہر نکلے ہوئے پیٹوں والے بچے دیکھے۔ ایک بار تو اس کے سامنے ایک کسان عورت ننگی کر دی گئی۔

ان دیہاتوں میں جا کر اسے پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ لاکھوں آدمی چوبیس گھنٹوں میں صرف ایک بار کھانا کھاتے ہیں۔

اس نے پہلی مرتبہ یہ معلومات جمع کیں کہ ان کسانوں کے پاس اپنی زمین اور اپنا گھر نہیں ہوتا۔ یہ زمینداروں اور ٹھیکے داروں کے کھیتوں پر کام کرتے ہیں اور فصل کٹنے کے بعد موٹے اناج کی شکل میں ان کی مزدوری دی جاتی ہے۔ جو اتنی قلیل ہوتی ہے کہ ان کا پیٹ نہیں بھرتا۔ پیٹ بھر جائے تو زمیندار کی بات کون مانے۔ ان کی نسلوں کی نسلیں زمینداروں اور ٹھیکے داروں کے کھیتوں کے ساتھ بندھی ہوتی ہیں۔ ان کی جان، مال اور عزت و آبرو پر زمیندار کا پورا پورا حق تھا۔

ان مناظر کو دیکھ دیکھ کر اس کے احساسات نے انگڑائی لی۔ وہ ابھی اسکول میں پڑھ رہا تھا لیکن اس کا ذہن اس کی عمر سے آگے چل رہا تھا۔ چند سوالات اس کے ذہن میں ایسے اٹھے کہ وہ بے چین ہو گیا۔

وہ سوچا کرتا تھا کہ یہ مخلوق کہاں سے آئی ہے۔ یہ مظالم کیوں ہو رہے ہیں۔ اس کا خاندان اس پر قانع تھا کہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

سب کچھ خدا کی دین ہے۔ امیر اور غریب ہمیشہ سے ہیں۔ یہ ظلم ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے جب کہ وہ خود سے یہ سوال کیا کرتا تھا کہ ان مظالم پر کوئی احتجاج کیوں نہیں کرتا۔

اور پھر یہی کھیل اس نے اپنے آنگن میں دیکھا۔ ایک کسان عورت اس کے گھر میں اناج صاف کرنے آتی تھی۔ وہ چاول صاف کرتی جاتی تھی اور ایک مٹھی کچے چاول اپنے منہ میں ڈال لیتی تھی۔ یکا یک علی سردار کے بہنوئی کی نظر اس پر پڑ گئی۔ انہوں نے ڈانٹ کر پوچھا کہ منہ میں کیا ہے۔ کسان عورت یہ سن کر گھبرا گئی اور جلدی جلدی کچے چاول چبانے لگی۔ علی سردار نے لپک کر اس عورت کے منہ پر ایک گھونسا مارا۔ اس عورت نے خون کی ایک کلی کے ساتھ کچے چاول تھوک دیئے۔

بھوک نے اسے چاول تو نگلنے نہیں دیئے خون اگلوا دیا۔

ان ہی سوالوں اور جوابوں کی کشمکش کے دوران اس کے ذہن سے تخلیق کے سوتے پھوٹنے شروع ہوئے۔ اس نے اپنے لکھنے پڑھنے کے لیے ایک الگ کمرا لے لیا۔ وہ نہایت خوش مزاج، نفاست پسند اور خوب صورت چیزوں کا دلدادہ تھا۔ اپنی کوئی چیز بے ترتیب نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس نے فیروزی رنگ کی دیواروں پر سرخ رنگ کی پینسل سے چاروں طرف اقبال اور دوسرے پسندیدہ شاعروں کے اشعار لکھے تھے۔ کھلی الماریوں میں ادبی کتابیں سجا دیں، کھڑکی کے قریب لکھنے کی میز ڈال لی۔ اسکول جاتے وقت کمرے کے دروازے میں تالا ڈال جایا کرتا تھا تاکہ کوئی چیزوں کو خراب نہ کردے۔ ان دنوں وہ بڑے زور و شور سے افسانے لکھ رہا تھا۔ ایک روز وہ ایک افسانہ نامکمل چھوڑ کر چائے پینے کے لیے گیا۔ اس کی غیر موجودگی میں اس کی بہن اس کے کمرے میں چلی گئی۔ اس کی نظر اس افسانے پر پڑی جس کا عنوان تھا ''آتشیں قمیص'' اس کی بہن نے اس افسانے کو کہیں کہیں سے پڑھا۔ وہ چھپی ہوئی کتابیں تو بہ آسانی پڑھ لیتی تھی لیکن ہاتھ کا لکھا ہوا پڑھنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ وہ بھاگ کر اس کے پاس آئی۔

''سردار بھائی آتشیں قمیص پڑھنے کو دے دیجیے۔''

''تم نے کہاں دیکھا۔'' علی سردار نے گھبرا کر پوچھا۔

''آپ کی میز پر رکھا ہوا ہے۔''

''وہ تمہارے پڑھنے کی چیز نہیں۔ جاؤ بھاگو یہاں سے۔''

اس کی بہن کہاں ماننے والی تھی۔ خوشامد پر اتر آئی۔ یہ دھمکی بھی دے دی کہ وہ ابا جان کو بتا دے گی کہ وہ افسانے لکھتا ہے۔ علی سردار ڈر گیا اور دوسرے دن اس وعدے کے ساتھ افسانہ پڑھنے کو دے دیا کہ وہ ابا جان کو نہیں بتائے گی۔

اس نے یہ افسانہ لیا اور اپنی چچازاد بہن قدسیہ کے پاس پہنچ گئی جو اردو اچھی طرح پڑھ لیتی تھی۔ دونوں بہنوں نے مل کر وہ افسانہ پڑھا۔

ابھی تک اس نے راشد الخیری کے افسانوں کی روتی پیٹتی عورتیں دیکھی تھیں۔ اس افسانے میں ایک نئی دنیا آباد تھی۔ اب وہ تاک میں لگی رہتی تھی کہ کب اس کا بھائی کمرے سے باہر ہو اور کب وہ کمرے میں جائے۔ جب موقع ملتا وہ کمرے کی تلاشی لیتی۔ اس مسلسل تلاش کے دوران اس کے ہاتھ ایک افسانہ اور لگ گیا پھر تو جیسے چسکا ہی لگ گیا۔ مہینے دو مہینے میں کئی افسانے پڑھ ڈالے۔ یہ وہ افسانے تھے جن میں غلامی اور محکومی کی زنجیروں کے ساتھ سماجی برائیوں اور بندھنوں کو توڑ دینے کی بات کہی گئی تھی۔

اس نے اب افسانوں کے ساتھ ساتھ کچھ نظمیں بھی کہنا شروع کر دی تھیں۔

نکال دوں تمہیں اس طرح دل کے گوشے سے
کہ جیسے کھلتا ہوا پھول توڑ دے کوئی
مری حسین ثریا یہ ہو نہیں سکتا

☆.....☆

اس کی زندگی میں ایک اہم موڑ اس وقت آیا جب اس کے بڑے بھائی سید ظفر عباس جعفری اپنی تعلیم مکمل کر کے بلرام پور آئے۔ وہ کچھ دنوں تو علی سردار کے ساتھ آوارہ گردی میں مشغول رہے جیسے پاؤں سیدھے کر رہے ہوں اور پھر دونوں بھائی کمرے میں بند ہو گئے۔ اسی کمرے میں جس میں بیٹھ کر علی سردار لکھنے پڑھنے کا کام کرتا تھا۔ بہنیں اور چچازاد بہنیں ابھی اپنے بڑے بھائی کو جی بھر کر دیکھ بھی نہیں سکی تھیں کہ وہ گوشہ نشیں ہو گئے۔ انہیں یہ تشویش ہو رہی تھی کہ دونوں کمرے میں بند ہو کر کیا منصوبہ بندی کر رہے ہیں۔ چھوٹے بچوں کو پیچھے لگایا گیا کہ بہانے بہانے سے دیکھ کر آئیں اندر کیا ہو رہا ہے۔ اکثر تو کمرا بند ہی ملتا اور اگر کبھی اندر جانے کا موقع مل بھی جاتا تو باتوں کے سوا کچھ سننے کو نہ ملتا اور باتیں بھی ایسی جو بچوں کی سمجھ سے بہت دور

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ہوتی تھیں۔ باتیں سمجھ میں نہ آتیں۔ اس کی ایک بہن شہر بانو جس کا نام انہوں نے ستارہ جعفری رکھ دیا تھا اس کے مزاج کو سب سے زیادہ سمجھتی تھی اور سمجھنے لگی تھی کہ اس کا بھائی بغاوت کے راستے پر گامزن ہے۔ وہ سب سے زیادہ فکرمند تھی۔ اس نے اپنی تمام بڑی بہنوں کو جمع کیا اور یہ انکشاف کیا۔

''بھائی جان اور سردار بھائی مل کر حکومت کے خلاف بغاوت کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔''

''تمہیں کیسے معلوم ہوا۔'' بڑی بہن زبیدہ خاتون نے کہا۔

''مجھے سب معلوم ہے۔ پوری معلومات کر کے ہی بتا رہی ہوں۔''

''حکومت کے خلاف بغاوت کرنا کوئی آسان کام ہے، دو آدمی مل کر بغاوت کیسے کر سکتے ہیں۔ تجھے ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہوگی۔'' دوسری بہن فخر النساء نے سرگوشی کی۔

''جی نہیں مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی ہے۔ ان کے ساتھ اور لوگ بھی ملے ہوئے ہوں گے۔'' دیکھ نہیں رہی ہو بھائی جان کانپور میں رہ کر آئے ہیں۔''

''تو۔'' فخر النساء نے کہا۔

''تو یہ کہ یہ سازش کانپور میں تیار ہوئی ہوگی اور اب وہ سردار بھائی کو اپنے ساتھ ملانے کے لیے بلرام پور آئے ہیں۔''

''بغاوت کے لیے تو اسلحے کی ضرورت پڑتی ہے۔'' فخر النساء نے کہا اور دوسری بہن رباب بانو نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

''یہ تو بڑی تشویش کی بات ہے۔'' تمام بہنوں نے یک زبان ہو کر کہا۔

''اگر یہ بات سچ ہے تو ہمیں فوراً ابا جان کو بتانا چاہیے۔''

''اور نہیں تو کیا۔ سردار بھائی کو اللہ نہ کرے کچھ ہو نہ جائے۔''

تمام بہنوں نے متفقہ طور پر طے کر لیا کہ مناسب موقع دیکھ کر ابا جان کے کانوں میں یہ بات ڈال دی جائے گی لیکن اس غبارے سے دوسرے ہی دن ہوا نکل گئی جب اس نے ابا جان کے سامنے اپنا پلان رکھ دیا۔

''میں نے ایک ہفتہ وار اخبار ''ہم صفیر'' نکالنے کا پروگرام بنایا ہے۔'' ظفر عباس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''تم بی ایس سی کر کے لوٹے ہو۔ یہ تمہیں اخبار نکالنے کی کیا سوجھ گئی۔''

''جب تک کسی اچھی ملازمت کا بندوبست نہیں ہو جاتا یہ شغل اچھا ہے۔''

''شغل تو اچھا ہے لیکن اس اخبار میں چھاپنے کے لیے مواد کہاں سے لاؤ گے۔ یہ کوئی آسان کام ہوگا۔''

''آپ کو شاید معلوم نہ ہو ایک شاعر اور ادیب تو ہمارے گھر ہی میں موجود ہے۔ آدھا اخبار تو وہی بھر دے گا۔''

''میں سمجھا نہیں۔ تم کس شاعر کا ذکر کر رہے ہو۔''

''علی سردار نظمیں اور مضامین لکھتا ہے۔''

''علی سردار۔''

''جی ہاں۔ علی سردار۔ وہی اس اخبار کا ایڈیٹر ہوگا۔''

''مجھے خوشگوار حیرت ہوئی۔ اس کی ذہانت کوئی بھی گل کھلا سکتی ہے۔''

باپ کی طرف سے اجازت ملتے ہی ظفر عباس نے ہفتہ وار اخبار ''ہم صفیر'' نکالنا شروع کر دیا۔ علی سردار کو تو جیسے تخلیقی جوہر دکھانے کے لیے میدان مل گیا۔ وہ پابندی سے افسانے، نظمیں اور مضامین لکھنے لگا۔

اب اس کے ذوق مطالعہ کی تسکین بھی ہونے لگی تھی۔ نیرنگ خیال اور ساقی جیسے رسالے تبادلے میں آنے لگے تھے جو برابر اس کی نظر سے گزر رہے تھے۔

اس زمانے میں اس نے دو نہایت اہم کتابیں پڑھیں ان کتابوں نے اس کی نظریاتی زندگی پلٹ کر رکھ دی۔ ایک مہاتما گاندھی کی کتاب ''تلاش حق'' اور دوسری پلوٹارک کی کتاب ''مشاہیر یونان و روما'' گاندھی جی کی کتاب وہ پوری طرح نہ سمجھ سکا اس لیے کہ وہ انگریزی میں تھی۔ پلوٹارک کی کتاب اردو ترجمہ تھی اس لیے اس کا اثر زیادہ گہرا پڑا۔

ان کتابوں میں جو کچھ لکھا تھا وہ اس کے ان مضامین میں بھی ڈھلنے لگا جو اس وقت ''ہم صفیر'' میں شائع ہو رہے تھے۔ سمجھنے والے سمجھ رہے تھے کہ ان مضامین کے تیور کیا ہیں۔

ایک روز اس کے والد کے دوست التجا حسین تشریف لائے۔ چھٹی کا دن تھا لہٰذا چچا اور والد سب گھر پر ہی تھے۔ نیم کے درخت کے نیچے مونگرے اور گلاب کی روشوں کے قریب کرسیاں ڈال دی گئیں۔ التجا حسین صاحب نے کسی

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

تمہید کے بغیر علی سردار کا ذکر چھیڑ دیا۔

''آپ ''ہم صفیر'' کا مطالعہ فرما رہے ہیں؟'' انہوں نے والد سے پوچھا۔

''جی ہاں کبھی کبھی دیکھ لیتا ہوں۔ بچے اچھی کوشش کر رہے ہیں۔''

''اس کوشش کے پیچھے جو طوفان چھپا ہوا ہے اسے آپ نے محسوس کیا؟''

''آپ کس طوفان کی بات کر رہے ہیں۔''

''علی سردار کے مضامین باغیانہ نوعیت کے ہیں۔ برٹش حکومت کے خلاف باغیانہ خیالات ملتے ہیں۔ اس کی نظموں میں لادینی اثرات بھی ملتے ہیں۔ اگر اس گھر سے باغیانہ چیزیں لکھی جاتی رہیں تو بڑی بدنامی ہوگی۔ آپ کے سارے خطابات اور مراعات چھن جائیں گی۔ خطرے کی گھنٹی بج چکی ہے۔ ابھی صاحبزادے نوعمر ہیں اور ابتداء ہے آپ کوشش کریں تو یہ آسانی قابو پایا جاسکتا ہے۔''

''آپ کے خیال میں مجھے کیا کرنا چاہیے۔''

''جعفر صاحب، یہ حقیقت ہے کہ دریا کے بہاؤ اور چلتی ہوئی ہوا کو نہیں روکا جاسکتا۔ ہمیں کوئی ایسا راستہ اختیار کرنا چاہیے کہ علی سردار کی صلاحیتیں بھی ضائع نہ ہوں اور آپ کی سماجی حیثیت پر بھی آنچ نہ آئے۔''

گھر کے بزرگ سر جوڑ کر بیٹھے اور ایک ایسی حکمت عملی تیار کی گئی جس کے تحت اسے راضی کرلیا گیا کہ وہ ہر شب جمعہ کو منعقدہ ہونے والی مجلس کو خطاب کیا کریں۔

اس نے پہلی مجلس کی حدیث بڑے جوش و خروش کے ساتھ جوش ملیح آبادی کے ان بندوں سے شروع کی۔

جو جواں بیٹے کی محبت پر نہ رویا وہ حسین
جس نے سب کچھ کھو کے پھر بھی کچھ نہ کھویا وہ حسین

اس کی حدیث خوانی کو سب نے بے حد پسند کیا۔ پھر شب جمعہ کی ہر مجلس وہ پڑھنے لگا۔ خاندان کے بزرگ اپنی کامیابی پر بہت نازاں تھے کہ انہوں نے علی سردار کی زندگی کا رخ موڑ دیا۔

اس سال تیرہ رجب کا جشن منانے کے لیے باہر سے شعراء بلائے گئے تھے۔ سب سے پہلے علی سردار کو منبر پر بٹھایا گیا۔ اس نے تازہ کہے ہوئے اشعار پڑھے۔

کعبہ کی رات کتنی نشاط آفریں ہے آج
صحنِ حرم نمونۂ خلد بریں ہے آج

وہ جیسے ہی منبر سے اترا اس وقت کے استاد شاعر

خراج

علی سردار کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ بڑے بے نفس اور بے نیاز انسان ہیں اور جماعت کی بہبود اور ترقی اور اس کے ذریعے عوام الناس کی بہتری ان کے دل کی تمنا آرزو ہے۔ ترقی پسند شعراء کی جماعت میں علی سردار اور مخدوم محی الدین صرف دو ہستیاں ایسی نظر آتی ہیں جن کی شاعری میں دور تک کہیں انفرادیت کی مہک محسوس نہیں ہوتی، ان لوگوں کا سارا فن غیر شخصی ہے۔

(مجنوں گورکھپوری)

خراج

سردار جعفری کا اسلوب نہ حالی کا اسلوب ہے نہ شبلی کا۔ ان کی زبان کی گرمی ہائی اسکول کے اس تقریری مقابلے کی یاد دلاتی ہے جس میں نوخیز اور نوعمر طالب علم اپنے ہیرو کے کارناموں کا بیان کرتے وقت اس قدر تمتما اٹھتا ہے کہ پوری کلاس ہنس پڑتی ہے۔ ان کا اسلوب معجزے بیان کرنے والوں اور عود و لوبان کے دھوئیں میں بسا ہوا اسلوب ہے۔

اعزاز و اکرام

نہرو ایوارڈ، پدم شری، نہرو فیلوشپ، سجاد ظہیر ایوارڈ، اردو اکیڈمی ایوارڈ، اقبال میڈل (پاکستان)، مخدوم ایوارڈ، میر تقی میر ایوارڈ، ہند روس دوستی میڈل (خصوصی تمغۂ ماسکو)، اقبال سمان (بھوپال)، بین الاقوامی اردو انعام (کینیڈا)، گنگا دھر مہر ایوارڈ، میر ایوارڈ (لکھنو)، مولانا آزاد ایوارڈ، ظ انصاری ایوارڈ، گیان پیٹھ ایوارڈ۔ ممبر سینٹ بمبئی یونیورسٹی، پروڈیوسر ایمرلیٹس، ریڈیو اور ٹی وی صدر کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین (77ء تا 90ء)، جنرل سیکریٹری کل ہند صد سالہ جشن اقبال کمیٹی (70ء)، وزیٹنگ پروفیسر جموں یونیورسٹی، نائب صدر مہاراشٹر اردو اکیڈمی (94ء)، صدر فلم رائٹرز ایسوسی ایشن بمبئی (92ء، 93ء)، کورٹ ممبر جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

تاباں بدایونی نے اسے گلے سے لگالیا۔

''ابھی تک میں سمجھتا ہوں میرا فن میرے ساتھ دفن ہو جائے گا لیکن آج مجھے ایسا قابل لڑکا ملا ہے جس کے سینے میں اپنا سارا علم بھر دوں گا۔''

اسی حوصلہ افزائی کا نتیجہ تھا کہ صرف پندرہ سولہ سال کی عمر میں مرثیہ نگاری کا آغاز کر دیا۔ آنکھ کھلتے ہی گھر میں انیس کے مرثیوں کا چرچا سنا تھا لہٰذا پہلا مرثیہ اسی رنگ میں لکھا۔ تشبیہہ، استعارے، ترتیب ہر چیز انیس کی تھی۔

آتا ہے کون شمع امامت لیے ہوئے
اپنی جلو میں فوج صداقت لیے ہوئے

اور جب وہ ان مصرعوں پر پہنچا تو سب کو رلا دیا۔

اکبر کو اپنے پہلوئے غم میں سلاؤں گی
اصغر کو اپنی گود میں جھولا جھلاؤں گی

اس کامیابی سے ہمت بہت بڑھی۔ پندرہ بیس دن میں ایک مرثیہ کہہ لیا۔

آتا ہے ابن فاتح خیبر جلال میں
ہلچل ہے شرق و غرب و جنوب و شمال میں
اک تہلکہ ہے وادی و دشت و جبال میں
بھاگا ہے آفتاب بھی برج زوال میں
کروٹ بدل رہی ہے زمیں درد و کرب سے
ہلتا ہے دشت گھوڑے کی ٹاپوں کی ضرب سے

اس کی نوعمری کو دیکھتے ہوئے کسی کو یقین نہیں آتا تھا کہ یہ مرثیہ اس نے لکھا ہوگا۔ بعض لوگوں کو اس نے یہ کہتے سنا کہ وہ کسی سے لکھوا کر پڑھ دیتا ہے۔ اسے یہ بات اتنی ناگوار گزری کہ اس نے نیا مرثیہ ان مصرعوں سے شروع کیا۔

اے بلبل ریاض بیاں نغمہ بار ہو
اے نو عروس طبع جواں ہم کنار ہو
اے خامۂ شگفتہ زباں لالہ کار ہو
اے حاسد دریدہ دہاں شرم سار ہو
کیا اس میں مجھ سے ہیچ مداں کا قصور ہے
یہ تو عطائے رحمت رب غفور ہے

کہنے والے بھی غلط نہیں کہہ رہے تھے۔ اس عمر میں ایسا پختہ کلام، شک تو ہونا ہی تھا۔ وہ بھی غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ ''یہ تو عطائے رب غفور ہے۔'' ابھی اسکول میں پڑھ رہا تھا اور زبان پر ایسی قدرت تھی کہ مرثیہ جیسی صنف میں قدم رکھ دیا تھا۔

شاعری کے ساتھ ساتھ مضامین نگاری بھی جاری تھی۔ یہ مضامین ''ہمدم'' میں تو شائع ہونے ہی تھے۔ دوسرے اخباروں میں بھی لکھ رہا تھا۔ لکھنو کے ایک اخبار میں مولوی مبارک علی نام کے ایک صاحب نے عقد بیوگان کے خلاف ایک مضمون تحریر کیا تھا۔ علی سردار نے یہ مضمون پڑھا تو غصے سے بے قابو ہو گیا اور فوراً اس تحریر کے خلاف مضمون لکھ کر سپرد ڈاک کر دیا۔ مولوی مبارک کا مضمون نہایت مدلل اور فاضلانہ تھا۔ علی سردار نہ مولوی تھا۔ نہ پختہ کار لیکن گھر میں موجود مذہبی کتابیں پڑھ پڑھ کر اتنی مذہبی معلومات ہو گئی تھیں کہ احادیث، روایات اور قرآنی آیات کا سہارا لے کر ایک مضمون تیار کر سکے۔ یہ مضمون اخبار میں شائع ہوا تو سب گھر والوں کی خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا لیکن اگلے ہی شمارے میں مولوی مبارک نے اس کا جواب دے دیا۔ یہاں بھی کیا دیر تھی علی سردار نے پھر ایک جواب تحریر کر دیا۔ مولوی مبارک کا جواب پھر آیا اور پھر یہ بحث، بہت دن تک چلتی رہی۔ مولوی مبارک کے پاس جب بحث کے لیے کوئی راستہ باقی نہ بچا اور دلیلیں ختم ہو گئیں تو انہوں نے علی سردار جعفری نامی کسی بزرگ سے ملاقات کرنی چاہی اور علی سردار سے ان کا پتا دریافت کیا۔ اس نے اپنے گھر کا پتا بھیج دیا۔ ایک دن ملازم نے آکر بتایا کہ کوئی مولوی مبارک تشریف لائے ہیں۔ علی سردار کے والد کو بڑی حیرت ہوئی کہ یہ کون صاحب ہیں۔ پھر یہ سوچ کر کہ مولوی ہیں، چندے وغیرہ کے لیے تشریف لائے ہوں گے انہیں اندر بلا لیا لیکن انہوں نے آتے ہی علی سردار قبلہ کے بارے میں دریافت کیا۔ ملازم گیا اور انہیں بلا کر لے آیا۔

''یہی میرا بیٹا علی سردار جعفری ہے۔''

''میں تو ان کو سن رسیدہ شخص سمجھتا تھا۔ کہیں آپ مجھ سے مذاق تو نہیں کر رہے ہیں؟''

''جناب مولوی صاحب، ہم آپ سے مذاق کی جرأت کیسے کر سکتے ہیں۔ یہی وہ سردار جعفری ہے جو اخبار میں آپ سے بحث کیا کرتا تھا۔''

''کمال ہے صاحب۔'' مولوی صاحب نے کہا۔ ''اتنی کمسنی میں عقدہ بیوگان پر ایسی بحث کہ میں ملاقات کے لیے مجبور ہو گیا۔ سوچا اتنی قابل اور بزرگ ہستی سے مل کر زبانی بات چیت کرنی چاہیے۔ کمال ہے صاحب، کیا دماغ پایا ہے۔ خدا نظر بد سے بچائے۔ اپنے وقت پر تو یہ لڑکا خدا جانے کیا ہوگا۔ یہ بات سن کر تو اور خوشی ہوئی کہ یہ لڑکا آپ کے خاندان کا چشم و چراغ ہے۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اس واقعے کے بعد اس کا احترام کیا جانے لگا لیکن اس کے دل کی دنیا بدل چکی تھی۔ اس میں کیا تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں اس سے کوئی بھی واقف نہیں تھا۔ اب اسے ہر اس چیز سے نفرت ہوگئی جس سے امارت کی ذرا سی بھی بو آتی ہو۔ اس نے اچھی چیزیں کھانا چھوڑ دی تھیں۔ ٹینس کھیلنا اور شکار کھیلنا بھی تقریباً ترک کر دیا تھا۔ اب وہ اپنا زیادہ تر وقت کتابیں پڑھنے میں صرف کرتا تھا۔

جو باتیں چھپی ہوئی تھیں اچانک وہ بھی ظاہر ہوگئیں۔ واقعہ یہ ہوا کہ ایک گاؤں کے کسانوں نے بغاوت کر دی۔ ریاست کی فوج نے جواب میں پورے گاؤں میں آگ لگا دی اور کسان عورتوں کو بے عزت کیا۔ اس پر بڑا ہنگامہ ہوا۔ اخباروں میں خبریں چھپیں۔ کانگریس کی طرف سے پنڈت جواہر لال نہرو اس معاملے کی تحقیقات کرنے آئے۔ ریاست کا عملہ نہیں چاہتا تھا کہ نہرو وہاں پہنچیں۔ انہوں نے راستے کی کچی سڑک میں جا بہ جا گڑھے کھود دیئے تاکہ پنڈت نہرو کی کار وہاں تک نہ پہنچ سکے۔ پنڈت نہرو نے راستے ہی میں جلسہ کرنے کا ارادہ کر لیا۔

اس کے گھر میں عید غدیر کا جشن منایا جاتا تھا۔ اس تقریب میں پڑھنے کے لیے اس نے نیا قصیدہ لکھا تھا لیکن عین وقت پر وہ گھر سے غائب ہو کر پنڈت نہرو کی تقریر سننے کے لیے جلسے میں پہنچ گیا۔

اس کی تلاش میں نوکروں کو دوڑایا گیا۔ انہوں نے آکر ایک عجیب خبر سنائی۔

''سردار بھیا تو جواہر لعل کے جلسے میں بولت ہیں اور کہت ہیں انگریج سفید ہاتھی ہے۔ ان کا نکال دیو۔''

وہ اس وقت گھر پہنچا جب تقریر ختم ہو چکی تھی۔

نوکروں کے ذریعے یہ بات سب عزیزوں میں پھیل گئی۔ کئی لوگ بہت خفا ہوئے۔

''اگر ابھی سے نہیں روکا گیا تو لڑکا ہاتھ سے نکل جائے گا۔''

یہی کیا کم تھا کہ ایک واقعہ اور ظہور پذیر ہوگیا۔ بلرام پور کے شکرمل میں اس کے خاندانی گاؤں سے بھی گنا آتا تھا۔ گنا اتارنے والے مزدوروں نے اپنی اُجرت بڑھانے کے لیے کہا۔ اس کے چھوٹے چچا اس پر تیار نہیں ہوئے۔ مزدوروں نے برہم ہو کر ہڑتال کر دی۔

ہڑتال توڑنے کے لیے پولیس بلائی گئی۔

یہ بات سردار جعفری کو معلوم ہوئی۔ شام کو گھر میں کسی کو بتائے بغیر شکرمل کے جلسے میں چلا گیا۔ نہ صرف وہاں گیا بلکہ تقریر بھی کی۔

''جب تک تمہارا حق نہ ملے ہرگز گنا مت اتارنا اور نہ پولیس سے ڈرنا۔ پولیس تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی میں تمہارے ساتھ ہوں۔''

جلسہ ختم ہوا تو مزدوروں میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔

''اب بتاؤ ہم کا کری، چچا آوت ہیں تو کہت ہیں ایک ڈبل نیس بڑھائیں گے اور بھتیجا کہت ہیں جب تک پیسا نہ بڑھے گنا نہ اتارو۔''

آخر کار مزدوروں کی فتح ہوئی اور چھوٹے چچا کو اُجرت بڑھانی پڑی۔

اس پر بھی بہت لے دے ہوئی لیکن اس کے والد کی نرم دلی نے ایک مرتبہ پھر اسے معافی دلا دی۔ وہ بچوں کے معاملے میں جبر کے قائل نہیں تھے۔

پے در پے واقعات اس کی دلی کیفیات کو گھر والوں پر ظاہر کرتے جا رہے تھے۔

برسات شروع ہونے والی تھی۔ کھیتوں میں چاول کی بوائی کا کام شروع ہوا تو اس سال اس کے والد نے اسے گاؤں جانے کا حکم دیا۔

''بوائی کے وقت گھر کا کوئی نہ کوئی فرد گاؤں جاتا ہے۔ اس مرتبہ تم جاؤ گے۔''

''میں؟ مگر مجھے تو کوئی تجربہ نہیں۔''

''وہاں منشی امام علی موجود ہوں گے۔ تمہیں صرف اس لیے بھیج رہا ہوں کہ تم کام سیکھ لو۔ آئندہ چل کر یہ کام تمہی کو سنبھالنے ہیں۔''

اس میں انکار کی جرأت نہیں تھی۔ وہ باپ کے کہنے پر چلا تو گیا لیکن وہاں پہنچتے ہی مزدوروں کی تنخواہ بڑھا دی اور پرانے قرضے معاف کر کے گھر واپس آگیا۔

منشی امام علی نے تمام تفصیل لکھ کر سردار کے والد اور چچا کو بھجوا دی۔ اس واقعے نے سب کے کان کھڑے کر دیے۔ اب تک اس کا جو احترام گھر میں قائم ہوگیا تھا اس میں کمی آگئی۔ اب وہ جس سے ملتا تھا مفلسی اور امارت، ظلم اور ناانصافی کی باتیں کیا کرتا تھا۔

وہ اب جوانی کی حدود میں قدم رکھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ بڑی ہونے والی خاندان کی لڑکیاں اس کے قریب آنے کی کوشش کر رہی تھیں لیکن اب تو اس کی دنیا ہی کوئی اور

WWW.PAKSOCIETY.COM

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف

ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ

کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ

ایڈ فری لنکس

ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر

ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety

پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بُک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بُک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

http://paksociety.com

Downloaded From Paksociety.com

ہو گئی تھی۔ وہ کسانوں پر ہونے والے مظالم کا ذمہ دار صاحبان اقتدار کو سمجھتا تھا۔ جن کے نوکر اس کے باپ اور چچا تھے۔ گھر میں جتنے بھی عیش وعشرت کے سامان تھے ان سے اسے نفرت ہونے لگی تھی۔ وہ جب اپنی کوٹھی کو دیکھتا اور پھر کسانوں کی جھونپڑیوں کا خیال آتا تو وہ اس ناانصافی پر پریشان ہو جاتا۔ خاندان کی کوئی لڑکی اس کے قریب آنے کی کوشش کرتی تو اس کے ہونٹوں پر کسانوں، مزدوروں کی باتوں کے سوا کوئی بات نہ ہوتی۔ وہ آہستہ آہستہ گھر والوں سے بھی دور ہوتا جا رہا تھا۔

رشتے کی ایک بہن تھی جو اس کے ان غیر رومانی خیالات سے اتفاق کرتی تھی۔ اسے بھی کسی ہم خیال کی ضرورت تھی۔ اس کے پاس بیٹھ کر دل کی باتیں کر لیا کرتا تھا کچھ عرصے بعد ہی اس پر انکشاف ہوا کہ ہم دونوں کے درمیان کچھ نازک اور لطیف رشتے پیدا ہو گئے ہیں۔ وہ اب تک سوالوں کی آگ میں جلتا رہا تھا۔ پہلی مرتبہ اسے احساس ہوا کہ دنیا میں دوسروں کے علاوہ وہ خود بھی ہے اور اس کے جذبات بھی ہیں۔ وہ ہر بات گھما پھرا کر کہنے کے بجائے براہِ راست کہنے کا عادی تھا۔ اس نے اس لڑکی سے براہِ راست پوچھ لیا۔ ''مجھ سے شادی کرو گی۔''

لڑکی نے گردن جھکائی اور جواب مل گیا۔ اس نے اس لڑکی سے شادی کرنا چاہی۔ والدین کو اس کا نام بھی بتا دیا لیکن لڑکی کے باپ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ لڑکا اول جلول آوارہ گرد نہ رہنے کا ٹھکانا ہو گا نہ کھانے کا۔ ہماری لڑکی کہاں بھاڑ جھونکے گی۔

اس گھرانے کی لڑکی میں اتنی ہمت کہاں تھی کہ ڈٹ کر کھڑی ہو جاتی۔ چپ ہو کر بیٹھ گئی۔ ملنے پر بھی پابندی لگ گئی۔

ایک مرتبہ پھر بلرام پور کا کنواں تھا اور وہ۔

وہ اس لایعنی زندگی سے تنگ آ چکا تھا اور بلرام پور سے نکل جانے کا خواہاں تھا۔ اتفاق سے اخبار میں چھپی ایک خبر نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کر لی۔ اس خبر سے معلوم ہوا کہ جہاز رانی کی ٹریننگ کے لیے اب ہندوستانی بھی لیے جائیں گے۔ اس نے تفصیلات وغیرہ نوٹ کر لیں اور والد سے جہاز رانی میں جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ انہوں نے اجازت دے دی۔ شاید اس لیے کہ کچھ تو ہو جو وہ کر سکے۔ اجازت ملتے ہی مہینوں امتحان کی تیاری کرتا رہا۔ امتحان دینے کے لیے لکھنو جانا تھا وہ لکھنو بھی گیا امتحان بھی دیا اور کامیاب بھی ہو گیا۔ وہ بلرام پور میں تھا اور بمبئی سے بلاوا آنے کا منتظر تھا۔ ایک دن بمبئی سے بلاوا بھی آ گیا۔ وہ بے انتہا خوش تھا۔ سفر کی تیاری کر رہا تھا کہ اچانک اس کے خواب خاک میں مل گئے۔ ایک مجتہد صاحب جو ہر سال تشریف لایا کرتے تھے۔ روانگی میں ایک دو دن ہی رہ گئے تھے کہ وہ مجتہد تشریف لائے۔ ان کے سامنے لامحالہ ذکر آیا کہ سردار جعفری جہاز رانی کے امتحان میں کامیاب ہو گیا ہے اور اب بمبئی روانہ ہونے والا ہے۔

''کمال ہے! آپ جوان لڑکے کو ایک تو انگریز کی ملازمت میں بھیج رہے ہیں۔ دوسرے استخارہ بھی نہیں کیا۔'' ان مجتہد نے کہا۔

''بس کچھ خیال ہی نہیں آیا۔''

''استخارے کے بغیر اسے اس سفر پر نہیں جانا چاہیے۔''

''پرسوں تو وہ روانہ ہو رہا ہے۔''

''استخارے میں کتنی دیر لگتی ہے۔ صاحبزادے کو بلائیے۔ ان کے سامنے ہی استخارہ نکالتے ہیں تاکہ انہیں بھی تسلی ہو جائے۔''

اسے بلایا گیا۔ مجتہد صاحب نے ایک دو سوال بھی کیے۔ پھر استخارہ نکالا گیا اور استخارہ منع آ گیا۔ اب جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

اسے جھنجلاہٹ بھی ہوئی تھوڑا بہت دکھ بھی ہوا لیکن یہ کہہ کر دل کو تسلی دے لی کہ چلو اچھا ہوا۔ میں خوامخواہ انگریزوں کی ملازمت کرنے جا رہا تھا۔ خدا جو کرتا ہے اچھا کرتا ہے۔

ایک مرتبہ پھر بلرام پور کا کنواں تھا اور وہ۔ سوالات اور پیچیدہ ہو گئے۔ اسی زمانے میں اسے پہلی بار معلوم ہوا کہ اسلام میں زمین کی ملکیت کا کوئی تصور نہیں۔ اس نے پہلی بار اپنے والد اور چچا کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا اور اسے پہلی بار معلوم ہوا کہ سماجی زندگی اور ذاتی عقائد کی زندگی کے درمیان ایک اونچی دیوار ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جو سوالات اسے پریشان کر رہے ہیں وہ دوسروں کو پریشان نہیں کرتے۔ کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ذہنی الجھنیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ گھر والے اس کی حالت دیکھ کر افسوس کر رہے تھے۔ اسی دوران اس نے میٹرک پاس کر لیا تھا۔ لیکن عمر بیس سال ہو گئی تھی عربی فارسی تعلیم کی وجہ سے بہت سا وقت ضائع ہو گیا تھا۔ اس کے ہم عمر تو گریجویشن کر

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

چکے تھے اور اس نے ابھی میٹرک پاس کیا تھا۔ اس کے رزلٹ نے والدین کو ایک نیا راستہ دکھا دیا۔ اس کے والد کی دلی خواہش تھی کہ وہ بیرسٹر بنے، لہٰذا مزید تعلیم کے لیے علی گڑھ بھیج دیا گیا۔ اس نے بھی سکھ کا سانس لیا کہ وہ بلرام پور سے نکل رہا ہے۔ ہوسکتا ہے علی گڑھ یونیورسٹی اس کے سوالوں کا جواب دے سکے۔

اس کی ذہنی کیفیت ابتر ہو رہی تھی کہ وہ 1934ء میں علی گڑھ پہنچ گیا۔ یہ زمانہ ہندوستان کی تاریخ میں اہم تھا۔ پورا ہندوستان غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا لیکن ذہنی بیداری شروع ہو چکی تھی۔ اس تبدیلی سے صرف تاریخ متاثر نہیں ہو رہی تھی۔ اردو ادب اور علی گڑھ کی تاریخ بھی تبدیل ہو رہی تھی۔ ادب اور سیاست مل کر ایک ہو رہے تھے۔ جدید ادب کی بنیادیں رکھی جا رہی تھیں۔ اختر رائے پوری، سبط حسین، حیات اللہ انصاری، منٹو، مجاز، جاں نثار اختر سب یہاں کے طالب علم تھے۔ یہ سب جدید اردو ادب کے نہایت ہوش مند معمار ثابت ہوئے۔

وہ جس ذہنی کیفیت میں گیا تھا اس کا تقاضا تھا کہ وہ سیدھا لائبریری کا رخ کرتا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ ذہن میں اٹھنے والے سوالات کے جوابات ڈھونڈنے کے لیے علم بہت ضروری ہے جس سے وہ اب تک محروم رہا تھا۔ اس کا علم تو گھر میں رکھی کتابوں تک محدود تھا۔ اس نے لائبریری کا رخ کیا۔ یہ عجیب اتفاق تھا کہ اس نے اپنے مطالعے کے لیے سیاست کا نہیں ادب کا شعبہ ڈھونڈا۔ ان ادبی کتابوں کا اثر تھا کہ کچھ عرصہ کے لیے بلرام پور میں پیدا ہونے والے سوالات دب گئے۔ اس نے آسکر وائلڈ کو بڑے غور سے پڑھا۔ اس کا اثر تھا کہ اس نے ایک ڈراما ''دیوانے'' لکھا۔ اس کا یہ ڈراما علی گڑھ میگزین میں شائع ہوا۔ آسکر وائلڈ کی سوانح پڑھتے پڑھتے وہ گوئٹے کی طرف مائل ہو گیا۔ پھر ایک ایک کر کے اس نے اردو اور انگریزی ادب کی سیکڑوں کتابیں پڑھ ڈالیں۔ اس مطالعے نے اسے ادب کی حقیقی بلندی اور عظمت سے آشنا کیا۔

اس مطالعے کے دوران لینن کی سوانح عمری اس کے ہاتھ لگی جو سیاسی اصطلاحات وہ اپنے اردگرد سن رہا تھا، ان کے معنی اس پر کھلتے چلے گئے۔ گاندھی جی کی کتاب ''تلاش حق'' اور نہرو کی تقریریں سن سن کر جو دروازے اس پر کھلے تھے اور پھر بند ہو گئے تھے اب پورے کھل گئے۔ بہت سے سوالوں کے جواب معلوم ہو گئے۔ بہت سی یادیں تازہ ہو

ایک نظم

رواں ہیں وقت کے پر ہول ریگزاروں پر
ہزاروں سال کے درماندہ رہروانِ حیات
نہ کوئی منزل آسودگی نہ راہِ نجات
طویل ظلم کا صحرا طویل جبر کا دشت
یہ آفتاب سرِ آسماں پہ آگ کا طشت
افق سے تا بہ افق ہے ہوائے گرم کا گشت
نہ کوئی سایہ کہیں ہے نہ کوئی پرچھائیں
شجر ہوا میں اڑے جاتے ہیں دھواں ہو کر
ہر ایک سمت صدا دے رہے ہیں سناٹے
خموشی بولتی ہے خوف کی زباں ہو کر

(سناٹا)

دو شعر

نورِ نظر احمد مختار ہوں میں
لختِ جگر حیدر کرار ہوں میں
ہیں فتح و ظفر قوت بازو سردار
یعنی پسرِ جعفر طیار ہوں میں

گئیں۔ پیڑوں پر لٹکی ہوئی کسان عورتوں کو نیچے اتار کر ان کا کھویا ہوا وقار واپس دینے کا طریقہ معلوم ہو گیا۔ اب اسے اچھی کتابوں کے ساتھ ساتھ اچھے دوستوں کی تلاش ہوئی۔ ایسے دوستوں کی تلاش جو انقلاب کی صدائیں بلند کر رہے تھے۔ پہلی ملاقات مجاز سے ہوئی۔ یہ ملاقات یونین کے ایک مشاعرہ میں ہوئی جس میں مجاز نے اپنی نظم ''انقلاب'' پڑھی اس نظم کے ہر مصرعے میں اسے اپنے دل کی دھڑکن سنائی دی۔ اس نے بھی اس مشاعرے میں اپنی نظم ''سماج'' سنائی۔

تمناؤں میں کب تک زندگی الجھائی جائے گی
کھلونے دے کے ایک مفلسی بہلائی جائے گی
نیا چشمہ ہے پتھر کے شگافوں سے ابلنے کو
زمانہ کس قدر بے تاب ہے کروٹ بدلنے کو

اس نظم کے ذریعے اس نے خود کو انقلابی نوجوانوں میں شامل کر لیا۔

وہ اس مشاعرے سے باہر نکلا ہی تھا کہ ایک طالب علم اسے یہ کہہ کر اپنے کمرے میں لے گیا کہ میں انقلابی

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ہوں اس کے کمرے میں وکٹر ہیوگو کی بڑی سی تصویر لگی ہوئی تھی اور میز پر اس کی تصویر رکھی تھی۔ یہ طالب علم کوئی اور نہیں سعادت حسن منٹو تھا۔

منٹو سے دوستی کے بعد نہ صرف اس کے خیالات بدلے بلکہ بہت سے سوالات کے جواب بھی مل گئے۔ وہی خیالات جو کچھ بعد میں ترقی پسند تحریک کی صورت میں ظاہر ہونے والے تھے۔ یہ زمانہ یورپ میں فاشزم کے عروج کا زمانہ تھا۔ انسانوں کی آزادی کے لیے جو کوششیں وہاں ہو رہی تھیں ان سے ہندوستان کے نوجوان بھی متاثر ہو رہے تھے۔ انقلاب کی صدائیں یہاں بھی گونجنے لگی تھیں۔ اس کی ملاقات ایک طالب علم فرحت اللہ انصاری سے ہوئی تو اس کا شوقِ تقریر جاگ اٹھا۔ اس دوران منٹو کی معرفت اسے بھگت سنگھ پر مضامین پڑھنے کو ملے اور وکٹر ہیوگو اور گورکی سے آشنا کیا۔ اس کا مطالعہ اظہار کے بہانے ڈھونڈ رہا تھا۔ فرحت اللہ انصاری انگریزی میں تقریریں کرتے تھے اس نے اردو میں تقریریں شروع کر دیں۔ اس کی شعلہ بیانی سے یونیورسٹی کے در و بام گونجنے لگے۔ اس کے باغیانہ خیالات اساتذہ کی نظروں میں آنے لگے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب سجاد ظہیر لندن سے واپس آ گئے تھے اور انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد رکھ دی تھی۔ انگریز کو یہاں سے نکالنے کی کوشش تیز تر ہو گئی تھیں۔ سوشلسٹ خیالات کا پرچار کیا جا رہا تھا۔ ادیب اس تحریک سے متاثر ہو رہے تھے۔ اردو ادب ترقی پسندی سے متاثر ہو رہا تھا۔ علی گڑھ میں ایسے طلبہ اور اساتذہ موجود تھے جو اس تحریک کے لیے ایندھن فراہم کر رہے تھے۔ علی سردار اپنے گھر میں مزدوروں کا استحصال دیکھتا رہا تھا۔ ناممکن تھا کہ وہ اس تحریک سے متاثر نہ ہوتا جب کہ اس وقت جو کتابیں اس کے زیرِ مطالعہ تھیں وہ بھی انہی خیالات کی حامل تھیں۔ اس نے اپنا تمام علم ان تقریروں میں شامل کر دیا۔ اس کی شعلہ بیانی کے چرچے ہونے لگے۔ طلبہ میں اس کی مقبولیت بڑھنے لگی۔ فرحت اللہ انصاری انگریزی کے مقرر تھے اس لیے ان کی تقریروں کا اتنا اثر مرتب نہیں ہو رہا تھا لیکن علی سردار کی فصیح و بلیغ تقریریں اور نظمیں طلبہ کے دلوں میں اتر رہی تھیں۔ وہ طلبہ کو پکار رہا تھا۔

کس سے ممکن ہے تمناؤں کے زخموں کا حساب
آستینوں کو پکاریں گے کہاں تک آنسو
اب تو دامن کو پکڑتے ہیں لہو کے گرداب
دیکھتی پھرتی ہے ایک ایک کا منہ خاموشی
جانے کیا بات ہے شرمندہ انداز خطاب
در بہ در ٹھوکریں کھاتے ہوئے پھرتے ہیں سوال
اور مجرم کی طرح ان سے گریزاں ہیں جواب
سرکشی، پھر میں تجھے آج صدا دیتا ہوں
یہ ترا شاعر آوارہ و بے باک و خراب
جو پھینک پھر جذبۂ بے تاب کی عالم پہ کمند
ایک خواب اور ابھی ہمتِ دشوار پسند

وہ اس وقت نوجوان تھا لیکن اس وقت بھی رنگ شباب سے زیادہ رنگ انقلاب کی باتیں کر رہا تھا جو اس کے خلوص کی عکاس تھیں۔

زمانے کا ستم ہر دم رہا ہے رازداں میرا
بھرا ہے ایسے ہی کانٹوں سے سارا گلستاں میرا
زمانے پھر میں تنہا راز داں ہوں لذتِ غم کا
سراپا درد ہو کر بھی ہوں درماں سارے عالم کا
حقیقت سے مری کیوں بے خبر دنیائے فانی ہے
بغاوت میرا مسلک میرا مذہب نوجوانی ہے

☆

ماں ہے ریشم کے کارخانے میں
باپ مصروف سوتی مل میں ہے
کوکھ سے ماں کی جب سے نکلا ہے
بچہ کھولی کے کالے دل میں ہے
جب یہاں سے نکل کے جائے گا
کارخانوں کے کام آئے گا

☆

یہ جسم جو کارخانہ داروں کی بھٹیوں میں ابل رہے ہیں
یہ ہاتھ لوہے کے دانت جن کو چبا رہے ہیں
یہ عورتیں جن کے ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے ہیں
جو اونچے پیڑوں پر اپنے بالوں کی پھانسیوں میں لٹک رہی ہیں

☆

ہے زمانے میں تشدد ہی تشدد کا جواب
جبر سے ظلم کی ہستی کو مٹانا ہو گا
بوڑھے ہونٹوں سے جوانوں کو دعا ملتی ہے
انگلیاں پیار سے بندوقوں کو سہلاتی ہیں

اس کے شوق تقریر ہی نے اسے ایک المیے سے دوچار کر دیا۔ انتظامیہ نے ایک طالب علم کے خلاف تادیبی کارروائی کی۔ اس سزا کے خلاف طلبہ نے احتجاج کیا اور اسٹرائیک کر دی۔ ڈاکٹر سر ضیاء الدین اس وقت وائس

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

چانسلر تھے۔ ان کی بعض انتظامی کارروائیوں کی وجہ سے طلبہ کی بڑی تعداد ان سے خوش نہیں تھی لہٰذا یہ احتجاج براہِ راست ان کے خلاف ہونے لگا۔ علی سردار جعفری ظاہر ہے طلبہ کا نمائندہ تھا اور شعلہ بیان مقرر تھا۔ اس کی تقریروں نے اک آگ سی لگا دی۔ اس نے اسٹرائیک کے حق میں یونیورسٹی انتظامیہ کے خلاف ایسی مدلل اور جذباتی تقریریں کیں جن کے باعث طلبہ مشتعل ہو گئے۔ یہ اسٹرائیک پوری یونیورسٹی میں پھیل گئی بلکہ طلبہ کی جانب سے بھوک ہڑتال کا اعلان کر دیا گیا، انتظامیہ کو معلوم تھا کہ طلبہ کو مشتعل کرنے میں علی سردار جعفری کی تقریروں کا بڑا عمل دخل ہے۔ اگر اس کی آواز خاموش کر دی جائے تو طلبہ کا اشتعال رفتہ رفتہ ختم ہو جائے گا۔ لہٰذا انتظامیہ نے اس کے خلاف کارروائی کی۔ چند اور طلبہ کے ساتھ اسے بھی یونیورسٹی سے نکال دیا گیا۔

یہ حادثہ اس وقت ہوا جب وہ بی اے پریوس میں تھا۔

وہ اچانک بلرام پور واپس آیا تو سب کو حیرت ہوئی اس لیے کہ چھٹیاں نہیں ہوئی تھیں۔ والد نے اس سے تو کچھ نہیں کہا لیکن اس کی والدہ سے اس اندیشے کا اظہار کر دیا۔

''یقیناً یہ کالج میں کچھ گڑبڑ کر کے آئے ہیں۔'' اس سے پوچھا تو وہ کوئی واضح جواب نہ دے سکا۔ واپس آنے کا سبب اپنی بیماری کو بتایا۔ عقدہ تو اس وقت کھلا جب اس کے چچا کے نام ڈاکٹر ضیاء الدین کا خط آیا۔ اس کے چچا ڈاکٹر ضیاء الدین کے کلاس فیلو اور دوست تھے۔ اسی رشتے سے انہوں نے خط لکھا تھا۔

''سردار نے برٹش گورنمنٹ کے خلاف اور کانگریس کی حمایت میں رات کو بارہ بجے پندرہ منٹ کی تقریر میں ہمارے کئی ہزار لڑکوں کے خیالات بدل دیے ہیں لہٰذا اس جرم میں ان کو تین سال کے لیے کالج سے نکال دیا گیا ہے حالانکہ اتنے ذہین اور قابل لڑکے کو نکالتے ہوئے مجھے دلی تکلیف ہوئی ہے۔''

ایک مرتبہ پھر اس کے مستقبل کا سوال سامنے آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کے بڑوں کے سامنے دو راستے تھے یا تو تین سال انتظار کیا جائے اور سزا کی مدت پوری ہونے کے بعد دوبارہ علی گڑھ بھیج دیا جائے یا پھر وقت ضائع نہ کیا جائے اور اسے کسی دوسرے ادارے میں بھیج دیا جائے۔ سوال پھر بھی یہ آتا تھا کہ کس ادارے میں بھیجا جائے۔ بڑے غور کے بعد قرعہ فال اینگلو عربک کالج دہلی کے نام نکلا۔

اسے دہلی پہنچا دیا گیا اور وہ عربک کالج میں داخل ہو گیا۔ بے پناہ مطالعہ اور تقریری مقابلوں میں حصہ لینا یہاں بھی اس کا مشغلہ رہا۔ یہاں رہ کر اس نے ادب، سوشلزم اور کمیونزم کی بہت سی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ وہ رات کو دیر تک پڑھتا رہتا تھا اور صبح کو دیر سے اٹھتا تھا جس کی وجہ سے ایک طرف تو ہوسٹل کا باورچی اس کے لیے ناشتا لیے بیٹھا رہتا تھا حالانکہ مقررہ وقت کے بعد اس کا ناشتا دینے کی ذمہ داری ختم ہو جاتی تھی دوسری طرف اس کا پہلا پیریڈ ہمیشہ نکل جاتا تھا لیکن اس کی قابلیت کی ایسی دھوم تھی کہ اس کے ساتھ دوسرے لڑکوں کے مقابلے میں امتیازی سلوک روا رکھا جاتا تھا۔ کالج سے باہر بھی قدر آور شخصیات سے تعلقات کا یہ عالم تھا کہ اس کے پاس قیام کے لیے جان نثار اختر، مجاز اور جوش ملیح آبادی جیسے شعراء ہوسٹل کے چھوٹے سے کمرے میں اس کے مہمان ہوا کرتے تھے۔ اس موقع پر وہ کمرے کا فرنیچر کمرے سے نکال کر گیلری میں رکھ دیتا تھا اور فرش پر بستر لگا لیا کرتا تھا۔

وہ ابھی طالب علم ہی تھا کہ اس نے وہ مقام حاصل کر لیا تھا کہ جوش جیسا قادرالکلام شاعر جو اس وقت ہندوستان میں انقلاب کی علامت بنا ہوا تھا اور تمام بڑے مشاعروں کی جان تھا جو دلی میں جس کا چاہتا مہمان بنتا، سب کو چھوڑ کر سردار جعفری کا مہمان ہوتا تھا۔

سردار جعفری اور اس کے مہمانوں میں زیادہ تر ترقی پسند تحریک کے متعلق باتیں ہوتی تھیں۔

وہ جب تک علی گڑھ میں رہا تھا اپنی خطابت کے جوہر دکھاتا رہا تھا۔ عربک کالج میں آنے کے بعد بھی اس کا یہ شوق ماند نہیں پڑا۔ کالج انتظامیہ نے بہت جلد اس کی صلاحیتوں کو بھانپ لیا اور کل ہند مقابلوں میں اسے بھیجا جانے لگا۔ وہ ہمیشہ اپنے کالج کو فاتح ٹیم کی ٹرافی دلا کر لوٹتا۔ ذاتی مقابلوں میں اوّل انعام سے کم اس نے کبھی نہیں لیا۔

اس کی اہلیت ہی کا نتیجہ تھا کہ اس نے کبھی کورس کی کتابیں نہیں خریدیں۔ کلاس روم میں لیکچر سن کر امتحان کی تیاری کر لیتا تھا اور ہمیشہ امتیازی نمبروں سے پاس ہوا۔

1938ء میں جب کہ بی اے کا امتحان قریب تھا پوسٹ مین علی سردار جعفری کے نام رجسٹرڈ خط لایا۔ اس نے لفافہ کھول کر خط پڑھا۔ ایک پھیکی ہنسی کے ساتھ وہ اسے چاک کرنے ہی والا تھا کہ قریب بیٹھے ہوئے اس کے دوست نے خط اچک لیا۔ ''اگر کوئی راز کی بات نہ ہو تو میں اسے پڑھ لوں۔'' اس نے اجازت دے دی۔ یہ کوئی عام

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

خط نہیں تھا بلکہ علی سردار جعفری کے بطور تحصیل دار تقرری کا پروانہ تھا۔

''جعفری! یہ خط کیوں پھاڑ رہے ہو۔ کیا تمہیں اتنی اچھی ملازمت پسند نہیں۔ یو پی کا گورنر تمہیں خود آفر کر رہا ہے اور تم اسے ٹھکرا رہے ہو۔ اس زمانے میں کسی مسلمان کو چالیس روپے ماہوار کی کلرکی مل جائے تو بہت ہے اور تم تحصیل داری کو ٹھکرا رہے ہو۔''

اس نے پھر ایک طنزیہ مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر بکھیری اور اپنے دوست تصور حیدر سے کہا۔ ''تصور، تم اتنے عرصے سے میرے روم میٹ ہو۔ میرے ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہو اور یہ نہ سمجھ سکے کہ میں زندگی میں کیا بننا چاہتا ہوں۔ تحصیل داری میرا منصب نہیں میری منزل تو کچھ اور ہی ہے۔ میں تو غریبوں کے ساتھ غریب رہنا چاہتا ہوں۔''

تصور حیدر اس عجیب و غریب آدمی کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ تحصیل داری کے لیے بی اے ہونا شرط تھا اور اس نے ابھی بی اے کا امتحان نہیں دیا تھا لیکن اس مفروضے کے تحت یہ ملازمت اسے مل رہی تھی کہ وہ ضرور پاس ہو جائے گا۔ اس کے والد ریاست بلرام پور میں ایک اہم عہدے پر فائز تھے اور وہاں کا راجا ان کی فرض شناسی اور دیانت داری کی وجہ سے ان کی بڑی عزت کرتا تھا۔ غالباً ان کی سفارش پر ہی یو پی کے گورنر نے یہ آفر کی تھی۔ علی سردار اس سفارش کو سمجھ گیا ہوگا اس کی خودداری کسی کا احسان اٹھانے کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔

اسی شام وہ اپنے اسی دوست کے ہمراہ باہر نکلا اور اِدھر اُدھر پیدل گھومنے کے بعد ایک سستے سے چائے خانے میں جا کر بیٹھ گیا۔ جہاں گندی پیالیوں میں چائے پیش کی جا رہی تھی۔ اس کا دوست جانتا تھا کہ وہ کس خاندان سے تعلق رکھتا ہے اور اس کی مالی حیثیت کیا ہے یہ جگہ ہرگز اس کے لائق نہیں۔

''یہ تم مجھے کہاں لے آئے۔ ہم کسی اوسط درجے کے ہوٹل میں بیٹھ سکتے تھے۔''

''میں عام لوگوں کی حالت دیکھنے اور ان کی باتیں سننے کے لیے یہاں آتا ہوں۔ آج سوچا اپنے دوستوں سے تمہاری ملاقات بھی کرا دوں۔''

''غریبوں کے حالات تو آپ کتابوں میں بھی پڑھ سکتے ہیں۔''

''پھر وہی کتابیں، بھئی حقیقت کے جو رنگ میری نظموں میں تم دیکھتے ہو۔ اسی کا نتیجہ ہے۔''

اگر اس نے بلرام پور میں کسانوں کی حالت زار نہ دیکھی ہوتی اور سستے چائے خانوں میں بیٹھ کر غریبوں کا حال نہ جانا ہوتا اور اس اُمید میں ترقی پسندی کے قریب نہ گیا ہوتا تو ہرگز ایسی نظمیں نہ لکھ سکتا۔

مرے تصور میں ساتھیوں کا خرام رنگیں نہ جام و نیا کی گردشیں ہیں
نہ میکدے ہیں نہ شورشیں ہیں
میں چھوٹے چھوٹے گھروں کی چھوٹی سی زندگی میں گھرا ہوا ہوں
اندھیرے قصبوں کو یاد کر کے تڑپ رہا ہوں
وہ جن کی گلیوں میں میرے بچپن کی یادیں
اب تک بھٹک رہی ہیں
جہاں کے بچے پرانے کپڑے کی میلی گڑیوں سے
کھیلتے ہیں
وہ ہاتھ بڑھ کے سنبھالیں گے کائنات کی باگ
بنا چکے ہیں مشقت کے جو پسینے سے
جراحت دل و جاں مندمل کریں گے وہ ہاتھ
نشاں ہیں جن کی ہتھیلی پہ تخت کوشی کے

☆

وہ ہاتھ جن کو پہنائی گئی ہیں زنجیریں
وہ ہاتھ چھید چکی ہے جنہیں صلیب کی کیل
وہ ہاتھ شعلہ حق بن کے ہو رہے ہیں بلند
اندھیری رات میں روشن ہے صبح نو کی دلیل

ہنرمند ہاتھوں کی تعظیم کا ہنر اس نے اسی چائے خانوں اور مزدوروں کی قربت سے حاصل کیا اور اسے تخلیقی جوہر عطا کیا۔

اعجاز ہے یہ ان ہاتھوں کا، ریشم کو چھوئیں تو آنچل ہے
پتھر کو چھوئیں تو بت کر دیں کالک کو چھوئیں تو کاجل ہے
مٹی کو چھوئیں تو سونا ہے چاندی کو چھوئیں تو پائل ہے
ان ہاتھوں کی تعظیم کرو
ہیں زخم ہمارے ہاتھوں کے یہ پھول جو ہیں گل دانوں میں
سوکھے ہوئے پیاسے چلو تھے جو جام ہیں اب میخانوں میں
ٹوٹی ہوئی سوا نگڑائیوں کی محرابیں ہیں ایوانوں میں
ان ہاتھوں کی تعظیم کرو
عریک کالج میں اس وقت تک ایم اے کی کلاسیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

نہیں ہوتی تھیں جب کہ علی سردار کو ایم اے انگریزی کرنے میں دلچسپی تھی لہٰذا اسے مجبوراً لکھنو جانا پڑا۔ اس وقت تک وہ بطور انقلابی شاعر مشہور ہو چکا تھا۔ لہٰذا لکھنو یونیورسٹی میں اس کا آنا تازہ ہوا کا جھونکا ثابت ہوا۔ لکھنو کے ادبی حلقوں نے اس کا استقبال کیا۔

اس کے والد کی خواہش تھی کہ وہ ایل ایل بی کرلیں۔ اس نے اس خواہش کا احترام کیا بھی لیکن ایک سال قانون پڑھنے کے بعد یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ میرا دل اس مضمون میں نہیں لگتا۔ سجاد ظہیر، مجاز، جان نثار اختر، سبط حسن، مخدوم، حیات اللہ انصاری اور ڈاکٹر رشید جہاں وغیرہ ترقی پسند مصنفین میں شامل تھے اور ادیب برائے زندگی پر بڑے جوش وخروش سے نظمیں اور افسانے لکھے جارہے تھے۔ وہ بھی اس گروپ میں شامل ہوگیا۔

لکھنو کی فضا میں دلی سے زیادہ چہل پہل تھی۔ بڑے بڑے ترقی پسند ادیب یہاں موجود تھے۔ کانگریس کی پہلی وزارت بنی تھی۔ کھدر کے کپڑوں کی وقعت بڑھ گئی تھی۔ ترچھی گاندھی ٹوپی سروں کی زینت بن گئی۔

جب علی سردار دہلی سے لکھنو آیا تو مجاز وہاں پہلے سے موجود تھا۔ اس کے والد نے ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد لکھنو میں گھر بنالیا تھا۔

روز بروز ترقی پسندوں کا حلقہ وسیع ہوتا جارہا تھا۔ ڈاکٹر علیم اور احمد علی لکھنو یونیورسٹی میں پڑھاتے تھے۔ ڈاکٹر رشید جہاں بھی یہیں موجود تھیں۔ کبھی کبھی الہ آباد سے سجاد ظہیر آجاتے تھے جو پنڈت نہرو کی سرپرستی میں انڈیا کانگریس کمیٹی کے آفس میں کام کررہے تھے۔ ان کے علاوہ نوعمر ادیبوں کی ٹولی تھی جن میں ایک علی سردار بھی تھا۔ یہ ٹولا ایک طرف تو اس بیرونی حکومت کے خلاف تھا جس نے ہندوستان کو غلام بنا رکھا تھا اور دوسری طرف خاندانی رسم و رواج کے خلاف تھا۔ یہ باغی ٹولہ اپنی من مانی کرنے کے لیے انفرادی آوارہ گردی کا راستہ اختیار کیے ہوئے تھا۔ وہ سب کچھ کرتا تھا جو اس کی خاندانی شرافت کے لیے قابلِ اعتراض تھا۔ ایک غصہ تھا ایک جھنجلاہٹ تھی جس کا اظہار ادب میں بھی ہورہا تھا (کہیں نعروں کی شکل میں کہیں سنجیدہ تخلیقی تصور کی صورت میں) اور انفرادی زندگی میں بھی۔

اس کی خاندانی شرافت بہت سے کاموں میں مانع تھی لیکن کھدر کے کرتے تو پہن سکتا تھا۔

وہ جب لکھنو سے بلرام پور آتا تو اپنے ساتھ کوئی نہ کوئی تحفہ ضرور لاتا تھا۔ ایک مرتبہ آیا تو ہاتھ سے بنا ہوا کھدر کا تھان لے کر آیا۔ یہ کپڑا نہایت موٹا، بھدا اور کھدر کھردرا

خدارا۔ خدارا
حضرات
بے اولاد
مایوسی اختیار نہ کریں
کیونکہ خدا کی رحمت سے مایوس ہونا تو سخت گناہ ہے۔ آج بھی ہزاروں گھرانے اولاد کی نعمت سے محروم سخت پریشان ہیں۔ ہم نے دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک خاص قسم کا بے اولادی کورس تیار کرلیا ہے۔ خدا کی رحمت سے آپکے گھر بھی چاند سا خوبصورت بیٹا پیدا ہوسکتا ہے۔ خواتین کے پوشیدہ مسائل ہوں یا مردانہ کمزوری یا مردوں میں جراثیم کا مسئلہ ہو۔ آپ پریشان ہونے کی بجائے آج ہی فون پر اپنی تمام علامات سے آگاہ کرکے بے اولادی کورس منگوالیں۔ خدا کے لئے ایک بار ہمارا بے اولادی کورس آزما کر تو دیکھ لیں۔ خدا کی رحمت سے آپ کے آنگن میں بھی خوشیوں کے پھول کھل سکتے ہیں۔
المُسلم دارالحکمت (رجسٹرڈ)
(دیسی طبی یونانی دواخانہ)
ضلع وشہر حافظ آباد پاکستان
0300-6526061
0301-6690383
فون پر رابطہ صبح 10 بجے سے رات 8 بجے تک

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

تھا۔اس نے اپنی رازدار بہن ستارہ جعفری سے کہا۔''تم اس کے پاجامے سی دو، کرتے تو ہم نے لکھنو میں سلوا لیے ہیں۔''

''اس نالائق کپڑے کو کون پہنے گا۔'' ستارہ جعفری نے حیرت سے پوچھا۔

''ہم پہنیں گے۔مگر یہ بات بھابی جان کو مت بتانا۔ ان سے یہی کہنا کہ کسی کے لیے سلوا رہے ہیں۔یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ پاجامے وہی کاٹیں گی۔انہیں معلوم ہوا کہ میں پہنوں گا تو ہزار باتیں بنائیں گی۔''

''سردار بھائی آپ کو کیا ہو گیا ہے۔آپ تو نہایت قیمتی کپڑے پہنتے رہے ہیں۔بوسکی سے کم بات نہیں کرتے تھے۔سوٹ اور ٹائی پہنتے تھے۔اب کیا جوگی بن رہے ہیں۔''

''ہم غلامی کی طویل رات سے گزر رہے ہیں۔ بدیسی کپڑے پہننا ہمیں زیب نہیں دیتا۔یہ ایک قسم کا احتجاج ہے جو ہم پہن رہے ہیں۔بس اب کوئی سوال مت کرنا، خاموشی سے پاجامے سلوا دو۔''

ستارہ کو پاجامے کاٹنے نہیں آتے تھے لہٰذا لامحالہ اسے اپنی بھابی کے پاس جانا پڑا۔

''دلہن کیا بچوں کے لیے کھدر کی بچھونیاں بنانی ہیں؟'' والدہ نے اس کپڑے کو دیکھ کر کہا۔بھابی کیا جواب دیتیں خاموش ہو گئیں۔

''یہ آیا کہاں سے؟''

''سردار بھائی لکھنو سے لائے ہیں۔اپنے کسی دوست کے لیے پاجامے سلوا رہے ہیں۔''

''اے ہے جو پہنے گا اس کا تو بدن چھل جائے گا۔''

''اماں کو کیا معلوم تھا کہ ان کا نازوں کا پلا بیٹا کانگریسی ہو گیا ہے اور یہ پاجامے وہی پہنے گا۔''

مجاز اور علی سردار جعفری ہی کیا کم تھے کہ لکھنو کو تہہ و بالا کرنے کے لیے سبط حسن بھی لکھنو آ گئے اور پھر دوسری جنگ عظیم سر پر کھڑی تھی۔ان تینوں نے مل کر ماہنامہ ''نیا ادب'' اور ہفت روزہ ''پرچم'' لکھنو سے جاری کیا۔نیا ادب انجمن ترقی پسند مصنفین کا ترجمان تھا۔

اس رسالے نے جلد ہی ادبی حلقوں میں اپنا مقام پیدا کر لیا۔یہ سب نتیجہ تھا علی سردار کی صلاحیتوں اور محنت کا۔ اس کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ اس وقت کے تمام اہم ترقی پسند ادیبوں نے اس پرچے کو اپنی تحریروں سے نوازا۔منشی پریم چند کا ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس کا خطبہ صدارت اور ان کی مشہور کہانی ''کفن'' پہلی بار اسی رسالے میں شائع ہوئی۔ منٹو کی کہانی ''نیا قانون'' بھی اسی رسالے میں شائع ہوئی۔

سردار جعفری نے ادب کو زندگی کے تقاضوں سے کبھی جدا نہیں سمجھا۔مشق سخن بھی جاری تھی اور سیاسی سرگرمیاں بھی۔اس نے اپنی شہرت اور ذہانت کی بدولت بہت جلد یونیورسٹی میں اپنی دھاک بٹھالی۔اس کی ہر دلعزیزی یہاں تک بڑھی کہ بائیں بازو کے طلبہ نے اسے یونین کے الیکشن میں سیکریٹری شپ کے لیے نامزد کیا۔وہ یہ الیکشن جیت بھی گیا۔اب یونین اس کا اوڑھنا بچھونا ہو گیا۔اس کی اس مصروفیت کا نزلہ ''نیا ادب'' پر گرا۔مجاز میں انتظامی صلاحیتیں نہ ہونے کے برابر تھیں۔نتیجہ یہ ہوا کہ پرچا ایک مہینے چھپتا تو دو مہینے ناغہ ہوتا۔

اس مصروفیت میں ایک مصروفیت کا اور اضافہ ہو گیا اور وہ ''نیا ادب'' کی طرف سے غافل ہو گیا۔اس کی ملاقات ایک لڑکی سے ہوئی جو یونیورسٹی کی سب سے خوب صورت لڑکی کہلائی جاتی تھی۔ممکن ہے اس میں کچھ مبالغہ ہو لیکن وہ تھی بہت خوب صورت۔علی سردار بھی کچھ کم خوبرو نہیں تھا۔اس کی روشن چمک دار آنکھیں اس کے چہرے کے گرد نور کا ایک ہالہ بنائے رکھتی تھیں۔اس کی مسکراہٹ میں بلا کی جاذبیت تھی اور پھر اس کی شہرت مستزاد تھی۔وہ لڑکی اس سے ملتے ہی اس کی گرویدہ ہو گئی۔اس لڑکی کا نام سلطانہ منہاج تھا اور وہ پولیٹیکل سائنس میں ایم اے کر رہی تھی۔اس ملاقات کا ہونا تھا کہ دونوں ہر جگہ ایک ساتھ دیکھے جانے لگے۔

نسیم تیری ضیاء، بوئے گل ہے پیراہن
حیا کا رنگ ردائے بہار اڑھاتا ہے
ترے بدن کا چمن ایسے جگمگاتا ہے
کہ جیسے سیل شجر جیسے نور کا دامن
ستارے ڈوبتے ہیں چاند جھلملاتا ہے

ایک دن سردار نے سلطانہ کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔''آپ بالکل وینس کی طرح لگتی ہیں۔''

سلطانہ سن کر خاموش ہو گئی۔چند روز بعد اس نے سردار سے کہا۔''آنکھیں بند کیجیے۔''

''کیوں بھئی آنکھیں کیوں بند کریں؟''

''آپ کو ہماری قسم آنکھیں بند کیجیے نا، ہم آپ کے لیے ایک چیز لے کر آئے ہیں۔''

علی سردار نے آنکھیں بند کر لیں۔سلطانہ نے ایک

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

پیکٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور پیکٹ کھول کر دیکھا۔ اس میں ''ویش'' کا مجسمہ تھا۔

سردار نے شاد عظیم آبادی کا یہ مصرعہ پڑھا اور مجسمہ لے لیا۔

''کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں''

''اس تمنا کا بھی تو ذکر کیجیے جس کا ذکر شاد عظیم آبادی نے اس شعر کے پہلے مصرعے میں کیا ہے۔''

''تمناؤں میں الجھایا گیا ہوں''

یہ سنتے ہی علی سردار سنجیدہ ہوگیا۔ کچھ دیر ٹکٹکی باندھ کر اس کی طرف دیکھتا رہا پھر وہی سوال کیا جو چند سال پہلے اس نے بلرام پور میں اپنی ایک عزیز لڑکی سے کیا تھا۔ ''سلطانہ مجھ سے شادی کروگی؟''

''اس کا جواب میں آپ کو کل دوں گی۔''

اس نے دوسرے دن کا وعدہ کیا تھا لیکن دوسرے دن یونیورسٹی نہیں آئی۔ پھر تیسرے دن بھی نہیں آئی۔ چوتھے دن آئی تو اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کئی دن کی بیمار ہو۔

''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

''آپ نے ایک سوال کیا تھا۔''

''کیا تو تھا۔''

''اس کا جواب ڈھونڈ رہی تھی۔''

''کیا جواب آیا؟''

''نہیں۔''

''تمہارے والدین نے بھی یہی کہا ہوگا کہ میں اول جلول آوارہ گرد ٹھہرا۔ نہ رہنے کا ٹھکانا ہوگا نہ کھانے کا۔ لڑکی کہاں بھاڑ جھونکے گی۔''

''نہیں، یہ نہیں کہا۔''

''پھر کیا کہا؟''

''میرے کزن سے میری منگنی ہوچکی ہے اور وہ منگنی توڑنے پر تیار نہیں۔''

''کیا تمہیں علم نہیں تھا کہ تمہاری منگنی ہوچکی ہے؟''

''معلوم تھا۔''

''اس سے پہلے تو تم نے ذکر نہیں کیا۔''

''اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ آپ مجھے اچھے لگتے تھے اور اس کے لیے منگنی ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اب جو آپ نے شادی کا سوال چھیڑا تو منگنی درمیان میں آگئی۔''

''میں کبھی یہ نہیں چاہوں گا کہ آپ منگنی توڑ کر مجھ سے شادی کرلیں۔ اس طرح آپ کے مگنیتر پر کیا گزرے گی اس کا مجھے احساس ہونا چاہیے۔ میں ہرگز اس مزاج کا آدمی نہیں کہ اپنے فائدے کے لیے دوسرے کا نقصان کروں۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ شادی بھی کرلوں۔ ہم شادی کے بغیر بھی تو ایک دوسرے کو اچھا سمجھ سکتے ہیں۔ تمہیں اپنے مگنیتر سے شادی کرلینی چاہیے۔''

دونوں کے راستے جدا ہوگئے۔ سردار کو ایک مرتبہ پھر عشق میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس کی شرافت پھر آڑے آگئی۔ وہ سلطانہ سے یہ نہ کہہ سکا کہ اپنے والدین کو مجبور کرو، منگنی توڑ دو بلکہ یہ کہہ کر بات ختم کردی کہ میں اپنے فائدے کے لیے دوسرے کا نقصان نہیں کرسکتا۔

دونوں کے راستے جدا ہوگئے۔ سلطانہ کی شادی ہوگئی۔

☆.....☆

لکھنو کی طرف سے خط آیا تھا۔ یقیناً سردار بھائی کا ہوگا۔ اس کی بہن ستارہ نے لفافہ کھولا۔ یہ خط سردار کی طرف سے نہیں اس کے دوست سبط حسن کی طرف سے لکھا گیا تھا۔

''تمہارا خاندان ماشاء اللہ بہت بڑا ہے۔ نیا ادب اور پرچم کے لیے پیسوں کی ضرورت ہے۔ اگر ایک ایک روپیا بھی چندہ جمع کروگی تو کافی سرمایہ جمع ہوجائے گا۔

یہ بات سردار کو کہنی چاہیے تھی لیکن وہ شرما رہا ہے۔

ستارہ نے اس خط کے مطابق خاندان والوں سے چندہ مانگا۔

''سردار بھائی اور ان کے دوست ہندوستان کی آزادی کے لیے کوششیں کررہے ہیں۔ اس کے لیے چندہ چاہیے۔''

اس کے جواب میں کسی نے خوشی کے ساتھ دے دیا اور کسی نے مخالفت کی۔ سردار کی بھی اور ستارہ کی بھی۔

''ہم انگریزوں کا نمک کھا رہے ہیں۔ ان کے ساتھ نمک حرامی نہیں کریں گے۔''

ستارہ نے بھی ترخ کر جواب دے دیا۔ ''انگریز تو ہمارا نمک کھا رہے ہیں اور ہمارا حق چھین رہے ہیں۔''

''یہ تم نہیں وہ سبق بول رہا ہے جو تمہارا بھائی ہر ہفتے تمہیں پڑھا کر جاتا ہے۔'' اس کی ایک رشتے دار نے کہا اور ساتھ ہی اس کے والد سے شکایت بھی کردی کہ وہ سردار کی حمایت میں بڑوں سے بدتمیزی کرتی ہے۔ اس کے والد نے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اسے ڈانٹا تو نہیں لیکن سمجھ ضرور گئے کہ اس پر سردار کا رنگ چڑھ گیا ہے اسے ابھی سے روک دینا چاہیے۔

''سردار جو کتابیں تمہارے لیے لاتا ہے ان سب کو الماری میں رکھ کر تالا ڈال دو۔ نیا ادب اور پرچم بھی وہیں رکھا کرو۔''

کچھ دنوں بعد سبط حسن کا ایک اور خط آیا۔

''تمہاری بھیجی ہوئی چندے کی رقم موصول ہوگئی۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ تم ہماری ہم خیال ہو۔ ہم لوگوں نے ایک الگ کمرا لے لیا ہے۔ تم اور رباب یہاں آکر ہمارے ساتھ کام کرو۔ یہاں تمہارا سیاسی شعور پختہ ہو جائے گا۔''

اسے خود بھی شوق تھا کہ وہ لکھنو جیسے بڑے شہر میں جا کر رہے اور سیاسی کام کرے لیکن لڑکی ہونا اس کے راستے میں بڑی رکاوٹ تھی۔ پھر بھی یہ خط اس نے والد صاحب کو دکھایا۔

''ان کو لکھ دو پہلے آپ لوگ اپنی تعلیم مکمل کر لیجیے پھر میں آپ کے پاس آؤں گی۔''

حسب معمول سنیچر کی رات کو علی سردار بلرام پور آیا۔ حسب معمول محفل جمی۔ والد اور والدہ اوپر کے حصے میں سوتے تھے نیچے کے حصے میں بھائی بہنوں اور بھابی کی محفل جمی۔

''آج میں تمہارے لیے ایک انمول تحفہ لایا ہوں۔ ایک کتاب ''آزادی کی نظمیں'' چھپی ہے، اس میں مختلف شعراء کا باغیانہ کلام ہے۔ پڑھنے کی چیز تو جوش کی نظم ''ایسٹ انڈیا کے فرزندوں کے نام'' ہے۔''

''آپ کی بھی کوئی نظم ہے؟''

''ہاں میری ایک نظم ہے۔ ''فوجی بھرتی'' وہ بھی اس میں شامل ہے۔''

''جوش صاحب کی نظم تو ہم خود پڑھ لیں گے۔ آپ اپنی نظم اپنی آواز میں سنائیے۔''

علی سردار نے اپنی نظم ''فوجی بھرتی'' سنائی۔

سڑک کے اس کنارے اک سیہ لکڑی کے تختے پر
جلی حرفوں میں لکھ رکھا ہے یہ بھرتی کا دفتر ہے
پکارا جا رہا ہے ہند کے بھوکے کسانوں کو
بجھا سا آج اخلاق شہنشاہی کا تیور ہے
حکومت ہو تمہاری اور ہم توپوں کا ایندھن ہوں
یہ دیوانے کا اک خواب جنوں اب بندہ پرور ہے
ہمارے خون سے شہزادیوں کا روپ نکھرا ہے
ہماری ہڈیوں کے ہار سے ملکہ کا زیور ہے
ستارے کی طرح سے ٹوٹ کر گرنے والا ہے
وہ ہیرا جس کی ضو سے تاج انگلستان منور ہے

علی سردار نظم سنا رہے تھے اور بہنیں بڑی مشکل سے اپنے آنسو ضبط کیے بیٹھی تھیں۔

علی سردار چلا گیا اور یہ کتاب چھوڑ گیا۔ سب بہنوں کو ایسی دلچسپی تھی کہ سب نے مل کر دو دو تین تین نظمیں زبانی یاد کر لیں۔ کام کاج کرتے ہوئے یہ نظمیں ہی گنگنائی جاتی تھیں۔ بچوں کو لوری کے طور پر یہ نظم سنائی جاتی تھی۔

کبھی تو رحم پر آمادہ بے رحم آسمان ہو گا
کبھی تو یہ جفا پیشہ مقدر مہرباں ہو گا
کبھی تو سر پہ ابر رحمت حق گل فشاں ہو گا
مسرت کا سماں ہو گا مرا ننھا جواں ہو گا
مرا ننھا بہادر ایک دن ہتھیار اٹھائے گا
سپاہی بن کے سوئے عرصہ گاہِ رزم جائے گا
وطن کے دشمنوں کے خون کی ندی بہائے گا
اور آخر کامراں ہو گا مرا ننھا جواں ہو گا

یہ نظمیں گھر گھر میں پڑھی جا رہی تھیں اور آزادی کا شعور جاگ رہا تھا۔ برٹش حکومت اس کتاب کی مقبولیت سے گھبرا گئی اور ''آزادی کی نظمیں'' اپنی اشاعت کے چند روز بعد ضبط کر لی گئی۔

ستارہ اپنے کمرے میں بیٹھی اسی کتاب کا مطالعہ کر رہی تھی کہ اس کی بڑی بہن رباب بھاگتی ہوئی آئی۔

''تم نے آج کا اخبار پڑھا؟''

''نہیں ابھی تو نہیں پڑھا۔''

''یہ کتاب جو تم پڑھ رہی ہو ضبط کر لی گئی ہے۔ اس کا پڑھنا اور رکھنا جرم بن گیا ہے۔''

''تجھے کیسے معلوم؟''

''یہ دیکھا اخبار میں چھپا ہے۔ اب تم اس کتاب کو چھپا دو۔''

''اللہ خیر کرے۔'' ستارہ نے کہا۔ ''اس میں تو سردار بھائی کی بھی نظم ہے۔ ان پر کوئی آفت نہ آئے۔'' اس نے کہا اور سردار کو خط لکھنے بیٹھ گئی۔

جوش ملیح آبادی کی نظم ''ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب'' نیا ادب میں شائع ہوئی تھی۔ یہ زمانہ دوسری جنگ عظیم کا تھا۔ انگریز فوجیں ہر محاذ پر پسپا ہو رہی تھیں۔ ایسے میں اس نظم کا شائع ہونا غضب ہو گیا۔ ایوان

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اقتدار میں زلزلہ آ گیا۔ نیا ادب کے دفتر کی تلاشی لی گئی۔ وہ پرچہ تلاش کرلیا گیا جس میں یہ نظم شائع ہوئی تھی۔ بہ حکم سرکار ضبط کرلی گئی۔

سامراجی جنگ کے خلاف شورش نے شدت اختیار کرلی تھی۔ اسے روکنے کے لیے پکڑ دھکڑ شروع ہوگئی۔ اس کی زد میں علی سردار بھی آیا۔ اسے ایک تقریر کی پاداش میں گرفتار کرلیا گیا۔ یہ اطلاع اس کے گھر والوں کو اخبار کے ذریعے مل چکی تھی کہ سبط حسن کا خط بھی آ گیا۔

کل یونیورسٹی سے پولیس سردار کو گرفتار کرکے لے گئی۔ میں تمہارے خاندان کی روایات سے واقف ہوں۔ وہ لوگ یقیناً پریشان بھی ہوں گے اور خفا بھی لیکن تم نہ پریشان ہونا نہ شرمسار بلکہ والدین کو تسلی دینا۔ انہیں سمجھانا کہ وہ سیاسی قیدی ہے۔ اسے کسی جرم کی پاداش میں گرفتار نہیں کیا گیا ہے اور ہاں جتنی جلد ممکن ہو والدین کو لے کر لکھنو آ جاؤ اس سے سردار کو سکون ملے گا۔ تمہارا بھائی بہت عظیم بہت پیارا ہے۔

ستارہ نے یہ خط والد کو دکھایا۔ اس کے بعد چچا کو دکھانا بھی لازمی تھا۔ پھر آہستہ آہستہ یہ خط دوسرے افراد تک پہنچ گیا طرح طرح کی باتیں بننے لگیں۔

''چلے تھے ہندوستان آزاد کرانے۔''

''جیل کی ہوا کھائیں گے تو دماغ ٹھکانے آ جائے گا۔''

''خاندان کی بدنامی الگ ہوگی۔''

''بہتر یہی ہے کہ معافی نامہ پیش کرکے چھڑا لو۔''

''کالے پانی بھی تو بھیجا جاسکتا ہے۔''

ان باتوں سے قطع نظر والد اور چچا سردار کی حمایت کررہے تھے لیکن گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اس سوچ سے باہر آئے تو انہوں نے ستارہ کو بلایا۔

''جہاں تک مجھے معلوم ہے تمہارے پاس بہت سی غیر قانونی کتابیں ہیں جو سردار تمہیں لاکر دیتا رہا ہے۔''

''جی ہاں ہیں تو۔''

''میرا اندازہ ہے کہ پولیس کسی بھی وقت یہاں آسکتی ہے۔ تلاشی کے دوران اگر یہ کتابیں یہاں مل گئیں تو بہت برا ہوگا۔ تم یہ سب کتابیں میرے سامنے لاکر جلاؤ۔''

ستارہ یہ سن کر کشمکش و پیچ میں پڑ گئی۔ اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ کتابیں جلائے اور چچا کو منع بھی نہیں کرسکتی تھی۔

''جی، اچھا وہ کتابیں ابھی لارہی ہوں۔'' ستارہ نے کہا۔ اس دوران وہ سوچ چکی تھی کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اس کے چچا باہر دالان میں بچھے تخت پر بیٹھ گئے۔ ستارہ کچھ وقت گزارنے کے بعد واپس آ گئی۔

''میں الماری کی چابی رکھ کر نہ جانے کہاں بھول گئی ہوں۔ جیسے ہی ملی سب جلا دوں گی۔'' چچا مطمئن ہوکر باہر نکل گئے۔

ستارہ برابر سوچ رہی تھی کہ اب کیا بہانہ کرے۔ پھر سوچا اگر تلاشی ہوئی تو ہمارے گھر کی ہوگی۔ اگر یہ کتابیں کسی اور کے گھر رکھ دوں؟ مگر کس کے گھر؟ اسے شکیلہ کا خیال آیا۔ شکیلہ، چچا کی منجھلی لڑکی تھی۔ دونوں ہم عمر بھی تھیں، پکی دوست بھی اور راز دار بھی اس نے کتابیں اور اخبار ایک کپڑے میں لپیٹے اور چچا کے گھر پہنچ گئی۔ اسے پورا قصہ سنایا۔

''تم جلدی سے یہ کتابیں کہیں چھپا دو۔ کسی کو بھنک نہ پڑے خصوصاً چچا کو تو ہرگز معلوم نہ ہو۔'' شکیلہ نے لحاف بستروں کا صندوق کھولا اور کتابیں اس میں رکھ کر تالا ڈال دیا۔

ستارہ بھاگتی ہوئی گھر آئی۔ کچھ کتابیں اور ردی جمع کرکے آنگن میں رکھی اور نذر آتش کردی۔ جب بالکل جل گئے تو پیروں سے مسل کر اس پر پانی ڈال دیا۔ چچا آئے تو اس نے ردی کی راکھ انہیں دکھادی۔

''اپنی الماری دکھاؤ۔''

اس نے الماری دکھادی۔ دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

''شاباش اگر اب گھر کی تلاشی ہوئی بھی تو کسی کو کچھ نہیں ملے گا۔''

سردار کے خلاف فرد جرم اتنی کمزور تھی کہ اگر وہ معافی نامہ داخل کراتا تو بہ آسانی مقدمہ ختم ہوسکتا تھا لیکن اس نے تو بھری عدالت میں کہہ دیا کہ میں نہ اس عدالت کو تسلیم کرتا ہوں نہ انگریز کے قانون کو۔

اسے چھ ماہ قید سخت کی سزا ہوگئی۔

سبط حسن کے خط سے معلوم ہوا کہ سردار جیل چلا گیا۔ اس خط میں بھی اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ اگر سردار کے گھر والے اس سے ملنے آئیں تو اس کا حوصلہ بڑھے گا۔

اس خط کو پڑھتے ہی لکھنو روانگی کا فیصلہ کرلیا گیا۔ سردار کے والد، چچا، والدہ اور بہن ستارہ جعفری لکھنو پہنچ گئے۔ لکھنو میں ان کی رشتے داریاں تھیں لہٰذا قیام کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ یہاں آکر یہ بھی معلوم ہوا کہ سینٹرل جیل کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

سپرنٹنڈنٹ کرنل جعفری ہیں۔ کرنل جعفری، سردار کے چچا کے کلاس فیلو اور دوست تھے۔ وہ اسی رات کرنل جعفری سے ملے اور جیلر کے نام خط لے لیا۔

دوسرے دن اتوار تھا لہٰذا ملاقات کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن جیلر کے نام خط لے لیا گیا تھا لہٰذا اس کے گھر والے جیل کے دروازے پر پہنچ گئے۔ جیلر نے عذر پیش کیا کہ اتوار کو ملاقات نہیں ہوسکتی لیکن جب کرنل جعفری کا خط اسے دکھایا گیا تو اس نے ملاقات کا انتظام کردیا۔ یہ لوگ بڑے پھاٹک میں بنے ہوئے ایک چھوٹے دروازے کے ذریعے اندر گئے۔ کچھ فاصلے پر دوسرا پھاٹک تھا۔ دونوں پھاٹک کے درمیان دائیں بائیں چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ جیلر نے ایک کوٹھڑی کی طرف اندر جانے کا اشارہ کیا۔ انہیں لے جا کر ایک کوٹھڑی کے اندر بٹھا دیا گیا۔ تھوڑی دیر بعد اندر کی طرف کا بڑا پھاٹک کھلا اور سردار آتا ہوا دکھائی دیا۔

''دیکھو رونا نہیں ورنہ سردار کا دل چھوٹا ہوگا۔'' اس کی والدہ نے ستارہ سے کہا حالانکہ ان کی آنکھوں میں آنسو باہر آنے کے لیے تڑپ رہے تھے۔ سردار قریب آیا تو صاف لگتا تھا کہ وہ آنسو ضبط کیے ہوئے ہے۔ اس لیے نہیں کہ وہ ہمت ہار گیا تھا بلکہ اس لیے کہ اس کی وجہ سے بوڑھے ماں باپ کو تکلیف اٹھانی پڑ رہی ہے۔ جیلر موجود تھا اس لیے کوئی ایسی ویسی بات نہیں کی جاسکتی تھی۔

یہ ملاقات آدھے گھنٹے جاری رہی۔ اس کے والد اسے تسلی دے رہے تھے کہ وہ سیاسی قیدی ہے کوئی مجرم نہیں اس لیے شرمندگی کی کوئی بات نہیں۔ اسے یہ بھی تسلی دی کہ ہم لوگ اس کی رہائی کے لیے کوشش کررہے ہیں۔ چلتے وقت ستارہ اس کے قریب آئی اور گلے ملنے کے بہانے برقع میں چھپے ہوئے سگریٹ اسے تھما دیئے۔ جیلر کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔

سردار کے گھر والے ایک ماہ تک لکھنو میں رکے رہے اور ہر تیسرے دن سردار سے ملاقات کے لیے جاتے رہے۔

ایک مہینے بعد اس کے مقدمے کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ اسے چھ ماہ کی سزا ہوئی تھی۔ یہ سزا تو زیادہ نہیں تھی لیکن ہوا یہ کہ اسے لکھنو جیل سے نکال کر بنارس جیل بھیج دیا گیا۔

بنارس جیل سے اس کے خط آتے رہے اور پھر چھ ماہ بعد اس کا تار ملا کہ مجھے رہا کردیا گیا ہے اور پھر دوسرے دن بلرام پور پہنچ گیا گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی لیکن خوشی کی یہ خبر ایک دن برقرار رہ سکی۔ دوسرے دن ریاست کے انگریز مینیجر نے اس کے چچا کو کہلا بھیجا کہ وہ ملاقات کا خواہاں ہے۔ اس نے ملاقات کی اور یہ پیغام دیا کہ گورنمنٹ آف انڈیا کے مطابق علی سردار جعفری ایک سال تک بلرام پور سے باہر نہیں جاسکتے۔ یہ پابندی اس شرط پر ختم ہوسکتی ہے کہ وہ سرکاری خرچ پر پڑھنے کے لیے لندن چلے جائیں یا وہ منظور کریں تو بلرام پور میں بڑی سے بڑی ملازمت مل سکتی ہے۔

سردار کے چچا نے یہ کہہ کر اسے ٹال دیا کہ وہ سوچ کر جواب دیں گے۔ مینیجر کو رخصت کرنے کے بعد وہ گھر میں آئے تو بہت برہم تھے۔

''یہ بدمعاش حکومت روپے کا لالچ دے کر ہمارے بیٹے کو خریدنا چاہتی ہے۔ مجھے تو یہ پیشکش منظور نہیں۔ آپ لوگ بتائیں آپ کی کیا رائے ہے۔''

والدین تو بعد میں کچھ کہتے۔ سردار نے آگے بڑھ کر خود مخالفت کردی۔ ''ان سے کہیے پہلے آپ اپنی فوجیں واپس بھیج دیجیے پھر کچھ سوچیں گے۔''

دوسرے لفظوں میں یہ پیشکش ٹھکرا دی۔

نظر بندی کے دن ختم ہوئے تو وہ لکھنو چلا گیا۔

اس مرتبہ وہ لکھنو پہنچا تو جو مجلس اس نے سجائی تھی وہ درہم برہم ہوچکی تھی۔ سوویت یونین پر ہٹلر کے حملے کی وجہ سے جنگ کی نوعیت بدل گئی تھی۔ جاپانی فوجیں ملایا، برما کو روندتی ہوئی آسام کی سرحد تک پہنچ گئی تھیں۔ برطانوی حکومت نے کمیونسٹ پارٹی پر جو پابندی لگائی تھی وہ اٹھالی گئی تھی۔ پارٹی کا مرکز بمبئی ہوگیا تھا۔ وہ بھی کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہوگیا۔

''نیا ادب'' بند ہوچکا تھا۔ سردار جعفری کی رہائی کے بعد سبط حسن اسے دوبارہ نکالنے کے منصوبے بنا رہے تھے لیکن سجاد ظہیر نے سردار جعفری کو کمیونسٹ پارٹی کے ترجمان ''قومی جنگ'' کے ادارتی عملے میں شامل کرنے کے لیے بمبئی بلا لیا اور یوں یہ منصوبہ دھرا کا دھرا رہ گیا۔

بمبئی جانے سے پہلے وہ بلرام پور آیا۔ رات کو جب سب سونے کے لیے چلے گئے تو اس نے بہنوں اور بھابی کو اپنی روانگی کے بارے میں بتایا۔

''میں کمیونسٹ پارٹی میں کام کرنے لگا ہوں۔ میں عنقریب بمبئی چلا جاؤں گا۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''آپ بمبئی چلے جائیں گے؟ بمبئی تو بہت دور ہے۔''

''آج کل کوئی جگہ دور نہیں ہے۔ میں برابر خط لکھتا رہوں گا۔ تم لوگوں کی خیریت معلوم ہوتی رہے گی۔ آنا چاہوں گا تو آتا بھی رہوں گا۔ اس وقت ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھنے کا موقع نہیں ہے۔ وطن کی آزادی کے لیے کام کرنا تم لوگوں کے قریب رہنے سے زیادہ اہم ہے۔ اس حسین اور جاگتی رات میں اس نے اپنی طویل نظم ''نئی دنیا کو سلام'' سنائی اور یہ خوش خبری سنائی کہ اسی نام سے اس کی نئی کتاب آنے والی۔

کل کے دن ہم نہ ہوں گے مگر
زندگی مسکراتی رہے گی
اپنی شمعیں جلاتی رہے گی
آسمانوں کا فیروزی رنگ اتنا ہی دلکش رہے گا
اور افق کی جبیں روشنی سے چمکتی رہے گی
آج کی طرح کل بھی زمیں
اپنے محور پر گھوما کریں گی
اور فضاؤں کی لاانتہا نیلی پہنائیوں میں
آج کی طرح کل بھی جھوما کرے گی
چاند تاروں کا سیل رواں
اس کے سر سے گزرتا رہے گا
آج کی طرح کل بھی زمیں کی
آرتی بزم انجم اتارا کرے گی
چشمہ نوریں غسل کرکے
سرخ سورج کے آئینے میں
اپنی زلفیں سنوارا کرے گی

☆.....☆

وہ اپنے والدین سے کوئی بات چھپاتا نہیں تھا اور یہ تو لکھنو سے بمبئی جانے کا معاملہ تھا۔ پوچھنا ضروری تھا لیکن کہتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ اس نے آدھی بات بتائی آدھی نہیں۔

''میں بنے بھائی (سجاد ظہیر) کے ساتھ بمبئی جارہا ہوں۔ وہاں ہم لوگ کام کریں گے۔''

بہنوں کو وہ پہلے ہی بتا چکا تھا کہ وہ کمیونسٹ پارٹی کا ممبر بن چکا ہے۔

یہ زمانہ ہندوستان کمیونسٹ پارٹی کی زندگی میں بڑا اہم اور تاریخی زمانہ تھا اس لیے کہ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کے کمیونسٹوں نے اس وقت لڑی جانے والی جنگ کو انڈین نیشنل کانگریس کے موقف کے خلاف اسے قومی جنگ قرار دیا تھا اور یہ قوم پرست فلسفے میں بہت حد تک معتوب ٹھہرے تھے کیونکہ وہ اس جنگ کو ایک سامراجی جنگ تصور کرتے تھے۔ ایسے ہیجان خیز زمانے میں فاشزم کی بڑھتی ہوئی یلغار کے سامنے سینہ سپر ہونے کے لیے بڑی تگ ودو کی ضرورت تھی۔ اس تگ ودو کو سائنسی انداز میں چلانے کے لیے مختلف زبانوں میں ہفتہ وار اخبارات کا اجراء کیا گیا۔ بمبئی میں انگریزی ہفتہ وار اخبار ''پیپلز وار'' اردو میں ''قومی جنگ'' اور ہندی میں ''جن یدھ'' کا اجراء ہوا۔

مرکزی اخبار ''قومی جنگ'' تھا جس کے مدیر سجاد ظہیر تھے۔ انہوں نے اپنی رفاقت کے لیے لکھنو سے سردار جعفری اور بعد میں سبط حسن کو بلایا۔

سردار جعفری نے ترقی پسند تحریک کے اجراء سے پہلے ہی شاعری کی دنیا میں قدم رکھ دیا تھا۔ علی گڑھ میں طالب علمی کے دور میں آزادی کی تحریکوں نے طلبہ کو متاثر کرنا شروع کردیا تھا۔ علی سردار نے انقلابی شاعری کا آغاز کردیا تھا۔ اس لحاظ سے وہ پہلے دن ہی سے وہ اس تحریک کا کل وقتی کارکن سمجھا جانے لگا۔ ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا تو وہ سجاد ظہیر کے چار پانچ رفقاء میں شامل تھا اور بانی ارکان کی حیثیت رکھتا تھا حتیٰ کہ سجاد ظہیر اور سبط حسن کے پاکستان چلے جانے کے بعد بھی وہ ہندوستان میں پارٹی اور ترقی پسند ادب کا پرچم اٹھائے رہا۔

نوجوان ترقی پسند ادیبوں میں خواجہ احمد عباس بمبئی میں پہلے سے موجود تھے۔ انہی کی کوشش سے انجمن کے جلسوں کے لیے کلب کی جگہ حاصل ہوگئی۔ یہ کلب بمبئی کے ایک مشہور کتب فروش کے پارسی مالک نے قائم کیا تھا۔ یہ کلب ملتے ہی یہاں انجمن کے جلسے منعقد ہونے لگے۔

بمبئی کی انجمن کی نوعیت بالکل نرالی تھی۔ اس کے جلسوں میں مرہٹی، گجراتی، ہندی اور اردو زبان میں لکھی ہوئی نظمیں افسانے اور مضامین پڑھے جاتے تھے۔

وہ ایک زمیندار گھرانے کا فرد تھا۔ ناز ونعم میں پرورش ہوئی تھی لیکن اب وہ زمین پر بستر لگا کر سو رہا تھا۔ انجمن کا پیغام لے کر گاؤں گاؤں جارہا تھا۔ کسان مورچوں پر کام کررہا تھا۔ صحافتی خدمات انجام دے رہا تھا۔ رات کی فرصت میں تخلیق شعر کی طرف راغب ہوجاتا تھا۔ ان دنوں وہ اپنی طویل نظم ''نئی دنیا کو سلام'' کی تکمیل میں مشغول تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

یہ آدمی کی گزر گاہ شاہراہ حیات
ہزاروں سال کا بارگراں اٹھائے ہوئے
جبیں پہ کاتب تقدیر کی جلی تحریر
گلے سے سیکڑوں نقش قدم لگائے ہوئے

☆

اٹھو اور اٹھ کے انہی قافلوں میں مل جاؤ
جو منزلوں کو ہیں گردِ سفر بنائے ہوئے
قدم بڑھائے ہوئے اے مجاہدانِ وطن
مجاہدانِ وطن ہاں قدم بڑھائے ہوئے

اسی دور میں اس نے کامیاب نظمیں لکھیں اور اس کی شاعری نعرہ بازی سے نکل کر حقیقی ادبی حدود میں داخل ہوئی۔

زندگی جہد میں ہے صبر کے قابو میں نہیں
نبض ہستی کا لہو کانپتے آنسو میں نہیں
اڑنے کھلنے میں ہے نکہت، خم گیسو میں نہیں
جنت اک اور ہے جو مرد کے پہلو میں نہیں
اس کی آزاد روش پر بھی مچلنا ہے تجھے
(عورت)

☆

تیرگی کے دل سے
جگنوؤں کی بارش ہے
رقص میں شرارے ہیں
ہر طرف اندھیرا ہے
اور اس اندھیرے میں
ہر طرف شرارے ہیں
کوئی کہہ نہیں سکتا
کون سا شرارہ ہے
بے قرار ہو جائے
شعلہ بار ہو جائے
انقلاب آجائے
(پتھر کی دیوار)

☆

مجھے سورج نے پالا
چاند کی کرنوں نے نہلایا
ہر اک شے مجھ سے تھی مانوس
مجھ سے بات کرتی تھی
درختوں کی زباں
چڑیوں کے نغمے میں سمجھتا تھا
ہوا میں تتلیاں پرواز کرتی تھیں
میں ان کے ساتھ اڑتا تھا
مری مٹھی میں جگنو جگمگاتے تھے
میں پریوں کے پرستانوں میں جاتا تھا

☆

میں خود فطرت تھا فطرت میری ہستی تھی
اسی فطرت نے میرے خوں میں لاکھوں بجلیاں بھر دیں
میں بھیگیں رگ و پے جنوں کا بانکپن آیا
مرے آگے نئے رنگوں میں دنیا کا چلن آیا
ہر اک شمشاد پیکر لے کر فردوس سین بدن آیا

☆

پہلے سردار بمبئی آیا پھر سبط حسن آگئے۔ دونوں کے لکھنو سے آجانے کے بعد ''نیا ادب'' بالکل بند ہو گیا تھا لیکن سردار کی خواہش تھی کہ نیا ادب جاری رہے۔ سردار نے بمبئی آنے کے بعد فلم کمپنیوں سے اشتہارات حاصل کیے اور سبط حسن کے ساتھ مل کر چھوٹے سائز میں اور سہ ماہی کتاب کی شکل میں ''نیا ادب'' دوبارہ بمبئی سے شائع کیا لیکن سبط حسن ہوں یا سردار کسی کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ اس رسالے کی ادارت کے لیے دے سکے لہٰذا اب بھی یہ باقاعدگی سے نہ نکل سکا۔ پھر بھی اس کے جاری ہونے سے ترقی پسند تحریک کے اردو حصے میں کسی حد تک مرکزیت آگئی۔ کچھ دنوں بعد عبداللہ ملک بھی لاہور سے آکر کمیونسٹ پارٹی کے ''قومی جنگ'' کے اسٹاف میں شامل ہو گئے۔ وہ بھی ''نیا ادب'' کی ڈوبتی ناؤ کو سہارا دینے میں مشغول ہو گئے۔

نیا ادب کے اس ''نیا دور'' نمبر میں جوش اور ساغر نظامی کے دستخط سے ایام جنگ کے پیشِ نظر ادیبوں کے فرائض کے متعلق ایک بیان شائع ہوا۔

''اس خطرناک حقیقت کو ایک لمحے کے لیے بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا کہ آج ہم دہری مصیبت میں گرفتار ہیں۔ ایک طرف تو گرگ یاراں، دیدہ چور ہے جو ہمارے گھر میں چھپا ہوا ہے اور دوسری طرف ایک خون آشام ڈاکو ہے جو ہمارا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ چور کو باہر نکال دیں اور ڈاکو کو اندر نہ آنے دیں جس کے واسطے ناقابلِ تسخیر اتحاد کی ضرورت ہے۔

ہمارے نزدیک ان حالات میں تمام ادیبوں کا فرض

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ہے کہ وہ تمام ہندوستانی قوم کو موجودہ خطرات سے آگاہ کردیں۔''

جب مجاز بمبئی پہنچے تو انہوں نے بھی اسی قسم کا ایک بیان دیا۔

''ہم ترقی پسند ادیب اب تک اپنے آرٹ سے تلوار کا کام لیتے رہے ہیں۔ ہم نے ہر قسم کے ظلم اور ناانصافی کے خلاف آواز بلند کی ہے پھر کوئی وجہ نہیں کہ انسانیت اور تمدن کے سب سے بڑے دشمن ''فاشزم'' کے مقابلے میں ہم اپنی تلوار میان میں رکھ لیں۔''

ان بیانات نے یک جہتی میں اضافہ کیا اور تنظیم مضبوط ہونے لگی اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے دفاتر کی شاخیں ملک کے دوسرے حصوں میں قائم ہونے لگیں۔ حیدرآباد دکن میں مخدوم محی الدین کی رہنمائی میں انجمن کی تشکیل ہوئی۔ دہلی، الہ آباد، آگرہ اور بنارس میں بھی انجمن کی شاخیں قائم ہوئیں۔ بنگالی ادبی ماہنامہ ''پرچیے'' باقاعدہ انجمن کا ترجمان بن گیا۔ آندھرا اور مالابار کے ترقی پسند ادیبوں نے ایک ماہوار ادبی رسالہ بھی جاری کیا جس میں ترقی پسند ادب کے تراجم شائع ہونے لگے۔ بمبئی کے مرہٹی مزدوروں میں عوامی ادب کی ایک نئی تحریک شروع ہوئی۔

یہ سب کام اتنے آسان نہیں تھے۔ سردار جعفری نے ان مشکل کاموں کو آسان بنانے کے لیے دن رات ایک کردیا تھا۔ جب کیفی اعظمی بھی بمبئی آگئے تو دونوں نے مل کر ''انقلابی مشاعروں'' کی بنیاد رکھی۔ ملک کے نامور ترقی پسند اور انقلابی شاعر بمبئی آنے لگے۔ بمبئی کی فضا مخدوم، مجروح، جذبی، مجاز اور سردار جعفری کے نغموں سے گونجنے لگی۔ ان مشاعروں کے ذریعے عام ادب میں بھی ترقی پسند خیالات شامل ہونے لگے۔

انجمن کی طرف سے منعقد ہونے والی کانفرنسوں میں شرکت کے لیے آنے والے ترقی پسندوں کی بدولت ترقی پسندی کی آوازیں بمبئی میں گونجنے لگیں۔

کمیونسٹ تحریک اور ترقی پسند نظریات کو پھیلانے میں کوشاں سردار جعفری عملی میدان میں سرگرم رہنے کے باوجود تخلیقی دنیا سے غافل نہیں رہا۔ ابتدائی دور کی مخالفتوں کے باوجود اس نے ہمہ جہت محنت کے بل بوتے پر خود کو ایک بڑے شاعر اور نقاد کے طور پر منوا لیا۔ اس کی تخلیقات پر سرسری نظر ڈالنے ہی سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ اس نے اپنی زندگی میں کتنا کام کیا۔ وہ اگر چاہتا تو بمبئی کی فلمی دنیا سے وابستہ ہوکر دولت مند بن جاتا لیکن اسے اپنے نظریات بہت عزیز تھے۔ وہ تحریکی کاموں ہی کے عوض چالیس روپے ماہوار کی تنخواہ پر کام کرتا رہا۔ اس نے اپنے تخلیقی جوہر کو ضائع نہیں ہونے دیا۔

☆.....☆

سردار کو وہ لڑکی اب تک یاد تھی جس کا نام سلطانہ تھا اور جو اس سے بچھڑ کر سسرال کی ہوکر رہ گئی تھی۔

سلطانہ کی شادی اپنے چچازاد شہاب الدین سے ہو گئی۔ اس سے ایک بیٹی دردانہ بھی پیدا ہوئی لیکن یہ شادی زیادہ دن نہ چل سکی۔ شہاب الدین شکی تھے اور ان کے ماں باپ نہایت ضدی۔ ایسے ماحول میں وہ نباہ نہ کرسکی۔ دردانہ تین چار برس کی تھی کہ سلطانہ کو طلاق ہوگئی۔ یہ حادثہ تو تھا لیکن سلطانہ پڑھی لکھی تھی۔ پولیٹیکل سائنس میں ایم اے کیا تھا۔ اس نے آل انڈیا ریڈیو میں نوکری کرلی اور اس کی پوسٹنگ لاہور میں ہوگئی۔ یہ وہ وقت تھا جب تقسیم ہند کی تیاریاں مکمل ہوچکی تھیں۔ فسادات شروع ہوئے۔ سلطانہ لاہور میں دبکی بیٹھی تھی اور سردار کامریڈوں کے جلوس کی رہنمائی کررہا تھا۔ وہ ہندوستان چھوڑنے کے حق میں نہیں تھا اور سلطانہ اپنے وطن ہندوستان کی طرف لوٹنے کے لیے پرتول رہی تھی۔ لاہور کا اسٹیشن ڈائریکٹر ہندو تھا۔ اس نے سلطانہ کو بلایا۔

''اگر ملک تقسیم ہوا تو اس بات کا پورا امکان ہے کہ لاہور پاکستان کا حصہ بنے۔ ایسی صورت میں آپ اپنے ہم مذہبوں کے ساتھ یہاں رہنا پسند کریں گی یا ہندوستان واپس جائیں گی؟''

''میں ہندوستان جانا پسند کروں گی۔''

اس نے طوفان کا رخ دیکھ کر اپنا تبادلہ بمبئی کرالیا۔ بمبئی پہنچ کر اس نے آل انڈیا ریڈیو کے کاموں سے زیادہ انجمن ترقی پسند مصنفین میں دلچسپی لینا شروع کی۔

سلطانہ بمبئی میں ہو۔ ترقی پسند تحریک میں شامل ہو اور سردار سے ملاقات نہ ہو۔ یہ کیسے ممکن تھا۔ دونوں کی ملاقات ہوئی۔ وہ چنگاریاں جو ماضی کی راکھ میں دب گئی تھیں پھر سے تازہ ہوگئیں۔ سردار کو اپنا ماضی ہمیشہ عزیز رہتا تھا۔ ماضی کا یہ حسین گوشہ سامنے آیا تو وہ پھر سے جی اٹھا۔ ہر وقت کا ساتھ رہنے لگا۔ اس نے اچھی طرح جانچا پرکھا۔ دونوں کے نظریات ایک تھے۔ پسند ناپسند ایک تھی۔ اس نے شادی

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

ہر عاشق ہے سردار یہاں
ہر معشوقہ سلطانہ ہے

ملک کو آزادی مل چکی تھی۔ انگریز رخصت ہو چکا تھا۔ سردار کے والد نے یہی سوچا ہوگا کہ اب سردار کا مشن پورا ہو چکا اب اسے شادی کرنے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ ان کی صحت بھی اب خراب رہنے لگی تھی۔ انہوں نے اپنی بڑی بیٹی زبیدہ کو بلایا۔

''بیٹا تم کو میں نے اس لیے بلایا ہے کہ کوشش کر کے سردار کے سر پر سہرا بندھوادو۔''

''ابا جان! ہم بہنوں کو تو بہت ارمان ہے لیکن وہ ہامی بھی تو بھریں۔''

''تم خط لکھ کر اسے میری گرتی ہوئی صحت کے بارے میں بتاؤ اور اس سے پوچھو کہ وہ کس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔''

زبیدہ نے سردار کو خط لکھا اور کئی لڑکیوں کے نام لکھ کر اس سے پوچھا کہ وہ ان میں سے کسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے؟

اس وقت خاندان کے کئی لوگ اپنی لڑکیوں کی شادی اس سے کرنے کے خواہش مند تھے لہٰذا لڑکیوں کے ناموں کی ایک فہرست بن گئی جو اسے روانہ کردی گئی۔

سردار کی طرف سے جواب آیا۔ ''یہاں ایک لڑکی سلطانہ بیگم ہیں۔ میں ان سے شادی کرنا چاہتا ہوں مگر ایک بات ہے وہ ''مسلکی اعتبار سے الگ ہے۔'' کیا والدین ان سے شادی کی اجازت دیں گے؟''

زبیدہ نے وہ خط ڈرتے ڈرتے والد کو دکھایا انہیں یقین تھا کہ والد اس رشتے کو کبھی قبول نہیں کریں گے۔ والد نے وہ خط پڑھا۔ کچھ دیر خاموش رہے پھر زبیدہ سے کہا۔

''تم لکھ دو ہماری طرف سے اجازت ہے کیونکہ زندگی تمہیں اس کے ساتھ گزارنی ہے۔''

رشتے داروں کے گھر قریب قریب تھے۔ اس خط کا چرچا بہت جلد دوسرے گھروں تک پہنچ گیا اور باتوں کا طوفان کھڑا ہوگیا۔ پورا خاندان مخالفت پر اتر آیا۔ زیادہ زور اسی پر تھا کہ سردار ہوتے دوسرے مسلک کی لڑکی سے شادی کررہا ہے۔ محفل میں ٹاٹ کا پیوند لگا رہا ہے اور ماں باپ خاموش ہیں۔ کئی لوگ اس کے والدین کے پاس بھی آئے لیکن انہوں نے بھی جواب دیا کہ ہمیں اپنے بیٹے کی خوشی عزیز ہے۔

خاندان بھر کی مخالفت مول لے کر والدین نے شادی کی اجازت دے دی۔ پھر سردار سے بذریعہ خط یہ پوچھا گیا کہ شادی کہاں سے ہوگی اور کب ہوگی۔ سردار نے اپنے گھر والوں کو لکھ دیا۔

''ہم نہایت سادگی سے بمبئی میں شادی کریں گے۔ شادی کے بعد میں سلطانہ کو بلرام پور لے کر آؤں گا۔'' شفیق والدین نے اس کے اس فیصلے کا بھی احترام کیا۔

سردار کی شہرت اب خاندان تک محدود نہیں تھی۔ پورا بلرام پور اسے جانتا تھا۔ سلطانہ کے ایک چچا بلرام پور میں رہتے تھے۔ انہوں نے جب سنا کہ سلطانہ کی شادی سردار جعفری سے ہورہی ہے تو وہ سردار کے گھر پہنچ گئے اور انہوں نے سردار کے والد کو اس فیصلے سے روکنا چاہا۔

''یہ شادی کس طرح ہوسکتی ہے۔ ہم قریشی ہیں اور آپ لوگ جعفری۔ اگر بچوں کو عقل نہیں تو آپ کو تو ہے۔ اپنے بیٹے کو روکیے کہ وہ یہ قدم اٹھانے سے باز رہے۔''

سردار کے والد نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''لڑکے کو روکنا مشکل ہوتا ہے۔ آپ سلطانہ کے چچا ہیں اپنی لڑکی کو روک لیجیے۔ وہ انکار کردے گی تو سردار بھی پیچھے ہٹ جائے گا۔''

وہ صاحب مایوس ہوکر واپس چلے گئے۔

کچھ دنوں بعد سردار بلرام پور آیا۔ شادی کی تاریخ 30 جنوری 1948ء طے ہو چکی تھی۔ اس کی والدہ نے اپنے ارمان پورے کرنے کے لیے کچھ زیور اور کپڑے اپنی بہو کے لیے بنائے تھے لیکن سردار نے یہ سب لینے سے انکار کردیا۔

''سلطانہ بڑی سادہ زندگی گزارتی ہیں۔ ان کو اچھے کپڑے اور زیور پہننے کا شوق نہیں۔''

''بیٹا میرے دل میں وہم آتا ہے تم کچھ نہ لے جاؤ ایک سرخ رنگ کا دلہن کا جوڑا تو لیتے جاؤ۔'' سب کے کہنے سے وہ سرخ رنگ کا جوڑا لے گیا۔

ان دنوں سردار جعفری اندھیری کے کمیونسٹ پارٹی کے کمیون کے ایک کمرے میں رہتے تھے۔ اسے ماہانہ اُجرت چالیس روپے ملتی تھی۔ ادارتی عملہ مضامین لکھتا، کاپیاں جڑواتا، پریس لے جاتا اور جب اخبار چھپ جاتا تو پوری ادارتی ٹیم اخبار فروش بن جاتی اور یہ سب لوگ سڑکوں پر چیخ چیخ کر اخبار بیچتے۔ یہ تھا اخبار قومی جنگ۔ کمیونسٹ

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

پارٹی کے کمیون کی یہ عمارت کبھی قیدیوں کے استعمال میں تھی۔ اس میں بہت سے کمرے تھے جس میں کامریڈ رہتے تھے۔

سردار کی شادی نہایت سادگی سے ہوئی۔ تقریب بمبئی میں منعقد ہوئی۔ کرشن چندر، عصمت چغتائی اور خواجہ احمد عباس شادی کے گواہ بنے۔

ابھی شادی کی تقریب چل ہی رہی تھی کہ ایک کامریڈ بھاگتا ہوا آیا۔ اس نے اطلاع دی کہ مہاتما گاندھی کو قتل کردیا گیا ہے۔

یہ خبر سنتے ہی ایسی بھگدڑ مچی کہ کسی کو کسی کا ہوش نہ رہا۔ خبر یہ تھی کہ یہ کام کسی مسلمان کا ہے لہٰذا فساد کا خطرہ تھا۔ جس کا جدھر منہ اٹھا بھاگ کھڑا ہوا۔ کیفی اعظمی اور ان کی بیگم شوکت بھی شادی میں شریک تھے وہ نکل کر بھاگے کہ جلد سے جلد اندھیری اپنے کمیون تک پہنچ جائیں۔ بھاگم بھاگ اسٹیشن پہنچے۔ اسٹیشن پر بھی لوگوں کا ہجوم تھا۔ یہ ریل میں بیٹھے اور اندھیری کے اسٹیشن پر اتر گئے۔ کمیون میں کیفی اور سردار کا کمرا برابر برابر تھا لیکن اس وقت خالی پڑا تھا۔ اب یہ فکر تھی کہ دولہا دلہن پر کیا گزری ہوگی۔ وہ اپنی رات کہاں گزاریں گے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ عصمت چغتائی انہیں اپنے گھر لے گئی تھیں۔

☆.....☆

سردار کی شادی کو چار ماہ ہو چکے تھے۔ شادی کے بعد سلطانہ بھی کمیونسٹ تحریک میں شامل ہوگئی تھی اور غریب بستیوں میں جا کر کام کررہی تھی۔ ان کاموں میں اتنی فرصت بھی نہیں مل رہی تھی کہ سردار اسے لے کر بلرام پور چلا جاتا جہاں اس کی ماں بہو کو دیکھنے کے لیے بے چین تھیں۔ بالآخر اس نے وقت نکال لیا۔ وہ سلطانہ کو لے کر بلرام پور آیا۔ سلطانہ اس کی وسیع و عریض کوٹھی کو دیکھ کر حیران تو ہوئی تھی لیکن اس سے زیادہ حیرانی اس بات سے ہوئی کہ سو سے زیادہ افراد پر مشتمل یہ خاندان کس طرح یک جہتی کے ساتھ رہتا ہے۔ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوگئی کہ سردار جعفری اس عیش و عشرت کو چھوڑ کر کیسی زندگی گزار رہا ہے۔ یہ بڑے دل گردے کی بات ہے۔

اس کے بلرام پور پہنچتے ہی ہر طرف شور مچ گیا۔ ملنے کے لیے آنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ غریب امیر سب ہی اس کے پرستار تھے۔ اس کے والد نے سونے کا ٹیکس اپنے ہاتھ سے اپنی بہو کو پہنایا جس کی جو حیثیت تھی اس نے رونمائی میں دیا۔ سردار کی والدہ نے جو کپڑے سلطانہ کے لیے بنائے تھے وہ سلطانہ کو پسند نہ آئے صرف ایک جوڑا سبز رنگ کی سلک کا لیا۔ شادی کی چند دعوتیں بھی ہوئیں۔ سردار کے پاس وقت نہیں تھا ورنہ دعوتوں کا سلسلہ کبھی نہ تھمتا۔

سردار اور سلطانہ تین دن رہ کر واپس چلے گئے۔

پاکستان کا قیام عمل میں آچکا تھا اور ہندوستان میں کمیونسٹ پارٹی کے لیے حالات اچھے نہیں تھے۔ ایسے میں کلکتہ میں پارٹی کانگریس میں فیصلہ کیا گیا کہ پاکستان میں ایک علیحدہ کمیونسٹ پارٹی قائم کی جائے۔ سجاد ظہیر مرکزی کمیٹی کے ممبر چنے گئے تھے۔ ان سے کہا گیا کہ وہ پاکستان جائیں اور وہاں کمیونسٹ پارٹی کو منظم کرنے کا کام سنبھالیں۔

سجاد ظہیر پاکستان چلے گئے۔ رضیہ سجاد ظہیر لکھنو چلی گئیں۔

سجاد ظہیر کے جاتے ہی اندازے درست ثابت ہونے لگے۔ پارٹی پر مظالم اور سختیاں شروع ہوگئیں اور بالآخر کمیونسٹ پارٹی پر پابندی لگ گئی۔ کامریڈ دھڑا دھڑ روپوش ہونے لگے۔ اندھیری کمیون جہاں سردار اور سلطانہ رہ رہے تھے ٹوٹ گیا۔ سردار اپنی بیوی کو لے کر سجاد ظہیر کے گھر ''بیکری بھون'' میں منتقل ہوگیا۔

ان لوگوں کے آجانے سے یہ مکان چھوٹا سا کمیون بن گیا جس میں کئی کامریڈ آکر رہنے لگے۔

سلطانہ ان دنوں امید سے تھی۔ اس لیے اسے آرام کی بھی ضرورت تھی اور سردار کی توجہ کی بھی لیکن ہوا اس کے برعکس۔ ایک دن صبح صبح جب کہ سردار ابھی سو کر بھی نہیں اٹھا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ سلطانہ نے دروازہ کھولا۔ سامنے پولیس کھڑی تھی۔ یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ کس لیے آئے ہیں۔ یہ کمی خود پولیس نے پوری کردی۔ وہ اندر گھستے چلے آئے۔

''یہ آپ خلاف قانون کام کررہے ہیں؟'' سلطانہ نے کہا۔ ''آپ کسی کے گھر میں یوں داخل نہیں ہو سکتے۔ آپ کو جس کی تلاش ہے اس کا نام لیجیے۔ ممکن ہے آپ غلط گھر میں آئے ہوں۔''

''ہمارے پاس علی سردار جعفری کے وارنٹ گرفتاری ہیں۔''

''آپ انتظار کریں۔ میں انہیں بیدار کرتی ہوں۔''

سردار بھی شور سن کر بیدار ہوگیا تھا۔ معاملہ بھی سمجھ گیا

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

تھا کہ کیا ہے۔ جلدی جلدی تیار ہوا اور باہر نکل آیا۔
سردار کو سلطانہ کی آنکھوں کے سامنے گرفتار کرلیا گیا۔
سردار کے پاس لکھنے پڑھنے کے سامان اور چند جوڑے کپڑوں کے سوا کچھ نہ تھا۔
یہ ایسا اندوہناک واقعہ تھا کہ سلطانہ چکرا کر رہ گئی۔ سجاد ظہیر پاکستان جاچکے تھے۔ کیفی اعظمی حیدرآباد میں تھے۔ کامریڈوں کی بڑی تعداد روپوش تھی۔ وہ خود کو بہت تنہا محسوس کررہی تھی۔ ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ کیا کرے کہ پندرہ دن بعد سردار کو رہا کردیا گیا۔
اس رہائی کو ابھی چار ماہ گزرے تھے کہ اسے پھر گرفتار کرلیا گیا۔ اس مرتبہ اسے سینٹرل جیل ناسک بھیج دیا گیا۔
بچے کی پیدائش قریب تھی۔ سلطانہ عجیب الجھن میں گرفتار تھی کہ کرے تو کیا کرے۔ وہ علی گڑھ اپنے میکے چلی گئی۔
اپنے پہلے بیٹے کی پیدائش کی اطلاع اسے ناسک جیل میں ملی۔ وہ تڑپ کر رہ گیا۔ اسے تو اس وقت اپنے گھر میں ہونا چاہیے تھا۔ وہ کتنا بے بس ہے۔ اپنے بیٹے کو دیکھ بھی نہیں سکتا۔ اس نے خط لکھ کر سلطانہ کو تسلی تو دے دی لیکن خود کئی راتوں تک سو نہ سکا۔ پھر اپنی بے بسی کا مذاق اڑانے کے لیے یہ نظم لکھنے بیٹھ گیا۔

نیل گوں جواں سینہ
نیل گوں جواں بانہیں
مخملیں اندھیرے کا
پیرہن لرزتا ہے
وقت کی سیہ زلفیں
خامشی کے شانوں پر
خم بہ خم مہکتی ہیں
رات خوبصورت ہے
دن کی خشمگیں نظریں
کھو گئیں سیاہی میں
آہنی کڑوں کا شور
بیڑیوں کی جھنکاریں
قیدیوں کے سانسوں کی
تند و تیز آوازیں

☆

جیل سے نکلتی ہے
بمبئی کی بستی میں
میرے گھر کا دروازہ
جا کے کھٹ کھٹاتی ہے
ایک ننھے بچے کی
انگڑیوں کے بچپن میں
شہد گھول دیتی ہے
اک حسیں پری بن کے
لوریاں سناتی ہے
پالنا ہلاتی ہے
رات خوب صورت ہے
نیند کیوں نہیں آتی

اسی جیل میں رہ کر اس نے وہ یادگار نظم لکھی جو "میرا سفر" کے عنوان سے اسے دوام بخش گئی۔

پھر اک دن ایسا آئے گا
آنکھوں کے دیئے بجھ جائیں گے
ہاتھوں کے کنول کمھلائیں گے
اور برگ زباں سے نطق و صدا
کی ہر تتلی اڑ جائے گی
اک کالے سمندر کی تہہ میں
کلیوں کی طرح کھلتی ہوئی
پھولوں کی طرح ہنستی ہوئی
ساری شکلیں کھو جائیں گی
یادوں کے حسیں بت خانے سے
ہر چیز اٹھا دی جائے گی
پھر کوئی نہیں یہ پوچھے گا
سردار کہاں ہے محفل میں
لیکن میں یہاں پر آؤں گا
بچوں کے دہن سے بولوں گا
چڑیوں کی زباں سے گاؤں گا

☆

جب بیج ہنسیں گے دھرتی میں
اور کونپلیں اپنی انگلی سے
مٹی کی مورت کو چھیڑیں گی
میں پتی پتی کلی کلی
اپنی آنکھیں پھر کھولوں گا
اور سارا زمانہ دیکھے گا
ہر قصہ مرا افسانہ ہے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ہر عاشق ہے سردار یہاں
ہر معشوقہ سلطانہ ہے
میں سوتا ہوں اور جاگتا ہوں
اور جاگ کے پھر سو جاتا ہوں
صدیوں کا پرانا کھیل ہوں میں
میں مر کے امر ہو جاتا ہوں

☆.....☆

اس دوران سلطانہ نے بے پناہ ہمت کا مظاہرہ کیا۔ اس کا بڑا بیٹا پیدا ہو چکا تھا جس کا نام سردار نے ترکی کے ایک شاعر کے نام پر ناظم رکھا تھا۔ ناظم جعفری۔

سیکری بھون کا مریڈوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ خود نوکری کرتی تھی اور کمیون چلاتی تھی۔ ہر کامریڈ کو ہر مہینے اپنے کھاتے کے پچاس روپے دینے پڑتے تھے۔ کیفی اعظمی انڈر گراؤنڈ چلے گئے تھے اور ان کی بیوی شوکت کیفی بھی سلطانہ کے ساتھ ہی آ گئی تھی۔

یہی شب و روز تھے کہ سردار کی گرفتاری کے ایک سال بعد 50ء میں کمیونسٹ پارٹی پر سے پابندی اٹھالی گئی۔ پابندی اٹھتے ہی اسے بھی جیل سے رہا کر دیا گیا۔

وہ عید کا دن تھا جب اس نے اپنے گھر کے دروازے پر دستک دی۔

وہ عید کا تہوار بڑے اہتمام سے مناتا تھا۔ عید بچوں کی ہوتی ہے یا روزہ داروں کی۔ وہ نہ بچہ تھا نہ روزہ دار لیکن عید کے دن اس کی خوش پوشاکی اور خوشی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ آج یہ حال تھا کہ وہ اپنے ہی دروازے پر اجنبیوں کی طرح کھڑا تھا۔ پھر سلطانہ نے دروازہ کھولا۔ اس کا بیٹا ناظم اس کی گود میں تھا۔

ہر عاشق ہے سردار یہاں
ہر معشوقہ سلطانہ ہے

سلطانہ نے سردار کی طرف یوں دیکھا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو اور پھر جیسے پہچان گئی ہو۔ اس کا ثبوت وہ نمی تھی جو اس کی آنکھوں میں تیر رہی تھی۔ یہ نمی اس وقت دونوں طرف کی مسکراہٹ میں گھل مل گئی۔ جب اس کے بیٹے نے اس کی گود میں آنے کے لیے دونوں ہاتھ بڑھا دیئے۔

سلطانہ نے یخنی پلاؤ تیار کر لیا تھا۔ جو ہر عید پر بنتا تھا۔ سردار نے عید کی مناسبت سے نیا کرتہ پاجامہ زیب تن کر لیا تھا۔

رہائی کی خبر ملتے ہی کامریڈ اس سے ملنے کے لیے آنے لگے۔

اس گفت و شنید میں شام ہو گئی۔

اس اچانک ملنے والی خوشی کو چند روز ہی گزرے تھے کہ اسے سیکری بھون بھی خالی کرنا پڑ گیا۔ مالک مکان نے پولیس بلا کر کھڑے کھڑے گھر خالی کرا لیا کیونکہ سجاد ظہیر جو اس گھر کے اصل مالک مکان تھے پاکستان میں انڈر گراؤنڈ تھے۔

سردار جعفری، ریڈ فلیگ ہال کے ایک کمرے میں منتقل ہو گیا جو پارٹی کے قبضے میں تھا۔ کچھ دنوں بعد کیفی اعظمی اور ان کی بیگم بھی یہیں منتقل ہو گئیں۔

اسے قید خانہ نما کمرے میں رہ کر کوئی اور خوشی تو میسر نہیں تھی لیکن ایک خوشی ضرور میسر تھی۔ وہ جیل خانے میں کہی گئی ایک نظم ''اودھ کی خاک'' لیے شہر شہر گھوم رہا تھا اور داد سمیٹ رہا تھا۔

میں اپنی ماں کے سفید آنچل کی چھاؤں کو یاد کر رہا ہوں

مری بہن نے مجھے لکھا ہے
ندی کے پانی میں بید کی جھاڑیاں
اب بھی نہا رہی ہیں
پپیہے رخصت نہیں ہوتے ہیں
میں رات کے وقت اپنے خوابوں میں چونک پڑتا ہوں

جیسے مجھے اودھ کی مٹی بلا رہی ہے
سفید آٹا سیاہ چکی سے راگ بن کر نکل رہا ہے
سنہرے چولہوں میں آگ کے پھول کھل رہے ہیں
پتیلیاں گنگنا رہی ہیں
دھوئیں سے کالے توے بھی
چنگاریوں کے ہونٹوں سے ہنس رہے ہیں
دوپٹے آنگن میں ڈوریوں پر ٹنگے ہوئے ہیں
اور ان کے آنچل سے دھانی بوندیں ٹپک رہی ہیں
سنہری پگڈنڈیوں کے دل پر
سیاہ لہنگوں کی سرخ گوٹیں مچل رہی ہیں
یہ سادگی کس قدر حسیں ہے
میں جیل میں بیٹھے بیٹھے اکثر یہ سوچتا ہوں
جو ہو سکے تو اودھ کی پیاری زمیں کو گود میں اٹھا لوں
اور اس کی شاداب لہلہاتی جبیں کو

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ہزاروں بوسوں سے جگمگادوں

ہندوستان کے دباؤ اور دوسری مصلحتوں کو سامنے رکھتے ہوئے سجاد ظہیر کو جیل سے رہا کر دیا گیا لیکن حکومت پاکستان نے ان پر بات واضح کردی کہ انہیں پاکستان میں آزاد انسان کی حیثیت سے نہیں رہنے دیا جائے گا۔ وہ چاہیں تو ہندوستان واپس چلے جائیں۔ انہیں اپنی مرضی اور خواہش کے برخلاف ہندوستان واپس آنا پڑا۔

ہندوستان واپس آنے کے بعد وہ پہلے پارٹی کے اردو ہفتہ اخبار کے انچارج رہے اور پھر ترقی پسندوں کے محاذ پر اور پارٹی کے کلچرل محاذ پر کام کرتے رہے۔

سردار کے ہاں دوسرے بیٹے کی ولادت ہوئی۔ سردار نے اس کا نام حکمت جعفری رکھا۔ ترکی کے شاعر کا نام ناظم حکمت تھا سردار نے اس نام کا پہلا جز بڑے بیٹے کے سپرد کیا یعنی ناظم اور دوسرے بیٹے کا نام حکمت رکھا۔

☆.....☆

جعفر طیار سخت علیل تھے۔ دو چار برسوں میں دنیا ہی بدل چکی تھی۔ کئی قریبی اموات ایسی ہوئی تھیں کہ وہ نڈھال ہوکر رہ گئے تھے۔ تمام بڑی بیٹیاں سسرال والوں کے ساتھ پاکستان جاچکی تھیں۔ گھر میں صرف ستارہ جعفری اور رباب جعفری رہ گئی تھیں۔ مہندی کی باڑھ، گلاب اور چمپا کے پودے اور ہری بھری دوب سب سوکھ چکی تھیں۔ وہ چہل پہل جو کبھی ہوا کرتی تھی اب ناپید تھی۔

جعفر طیار کی جان سردار کے چھوٹے بیٹے میں اٹکی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر جواب دے چکے تھے۔ جب ہوش آتا تھا سردار کے بارے میں پوچھتے تھے۔ اسے خط لکھ دیا گیا تھا لیکن اسے آنے میں دیر ہورہی تھی۔ ایک دن قدرے ہوش تھا ستارہ کو اپنے قریب بلالیا۔

''تم سردار کے دوسرے بیٹے کو بھی دیکھ لوگی اور اپنے بھائی کا عروج بھی دیکھ لوگی مگر ہم نہیں ہوں گے۔''

ان کی یہ پیش گوئی صحیح ثابت ہوئی۔ سردار کو عروج بھی ملا۔ اس کے ادبی کام کو سراہا بھی گیا۔ اسے جس یونیورسٹی سے نکالا گیا تھا۔ وہی علی گڑھ یونیورسٹی اسے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دینے پر مجبور بھی ہوئی۔ اس نے اپنے بیٹوں کے بیٹے بھی دیکھے۔

سردار کو تار دیا گیا جس وقت اسے تار ملا والد کا آخری وقت قریب تھا۔ انہوں نے آنکھیں کھول کر دیکھا اور پوچھا سردار آگیا۔ کسی نے کہا۔ ''ہاں آگیا بس آنکھیں بند کرلیں۔ ہمیشہ کے لیے بند کرلیں۔''

سردار دوسرے دن کی ٹرین سے پہنچا۔ اس وقت تک اس کے والد کو سپرد خاک کیا جاچکا تھا۔

والد کی موت کا صدمہ ابھی کم نہیں ہوا تھا کہ عین ان کے چہلم کے دن والدہ نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔ دونوں بہنوں کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ اب وہ یہاں اکیلے کیسے رہتیں۔

''تم یہاں رہوگی تو اس صدمے سے کبھی نہیں نکل سکو گی لہٰذا تم دونوں میرے ساتھ بمبئی رہنے چلو۔''

وہ انہیں لے کر بمبئی آگیا اور ایک چھوٹے سے فلیٹ میں منتقل ہوگیا جس میں صرف دو بیڈ روم تھے۔ ڈرائنگ روم کوئی نہیں تھا۔ ستارہ اور رباب کا کمرا وہی اس کے لکھنے کا کمرا تھا۔ دن میں وہی کمرا ڈرائنگ روم بن جاتا تھا۔

اس بھرے پرے گھر کو وقت کی آندھی نے کیسا بکھیر دیا۔ بڑے بھائی بلرام پور میں تھے۔ بہنیں پاکستان چلی گئی تھیں۔ صرف ستارہ اور رباب تھیں جن کے ساتھ وہ اس چھوٹے سے فلیٹ میں رہ رہا تھا۔ بلرام پور میں رہتے ہوئے جس کے نخرے قابلِ دید تھے۔ جس گھر میں کمروں کا حساب نہیں تھا اب وہ ایک کمرے میں گزارہ کررہا تھا۔ اپنے مزاج کے خلاف بات برداشت نہ کرنے والا قوت برداشت کی مثالیں فراہم کررہا تھا۔ بچے شور مچاتے رہتے تھے اور وہ سنہری نظمیں تخلیق کررہا تھا۔

عام طور پر ادیب و شاعر عملی میدان میں ناکام ہوتے ہیں یا کوئی ایک شعبہ زیادہ طاقت ور ہوتا ہے لیکن قدرت نے اسے دونوں میدانوں میں فعال بنایا تھا۔ وہ مہاراشٹر اردو اکیڈمی کا ڈائریکٹر بھی رہا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کا صدر بھی ہوا، نیشنل بک ٹرسٹ اور کئی دوسرے اداروں کا اعزازی رکن بھی بنایا گیا۔ وہ فلموں کی طرف بھی گیا لیکن ساحر و مجروح کی طرح گیت اور منظر نامے لکھنا اس کے مزاج کا کام نہیں تھا۔ دولت کی چمک دمک کے باوجود فلموں سے دور ہوتا گیا۔

اس نے زندگی بھر کوئی ملازمت نہیں کی۔ اس کا ذریعہ معاش صرف اس کا قلم تھا۔

☆.....☆

ایسی بات نہیں تھی کہ وہ ترقی پسند ہونے کی وجہ سے ترقی پسندوں کی ہر بات من وعن تسلیم کرلے۔ ایک وقت وہ آیا تھا جب ترقی پسندوں نے علامہ اقبال کا امیج خراب

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی اور اسے فاشسٹ کہا جارہا تھا۔ سردار نے اپنے ہی ساتھیوں کی رائے سے اختلاف کیا۔ اس نے نہ صرف اقبال پر دستاویزی فلم بنائی بلکہ اقبال کی شعری صلاحیتوں اور اس کے فکر و فلسفہ کے بارے میں پہلی کتاب تحریر کی۔ اس کا معاہدہ بھی ہوگیا اور ناشر نے کچھ رقم ایڈوانس بھی دے دی لیکن ترقی پسندوں کی مخالفت کے پیشِ نظر پارٹی نے سردار کو اس کتاب کی اشاعت سے روک دیا۔ وہ اس وقت یہ کتاب شائع نہ کرسکا لیکن اقبال کے بارے میں اپنی رائے پر قائم رہا۔ ادبی کانفرنسوں اور تنقیدی نشستوں میں ہر تقریر ہر لیکچر میں اقبال کو اپنے آئیڈیل کے طور پر پیش کرتا رہا۔ بالآخر اس کی کوششوں سے پارٹی نے اپنا نقطہ نظر تبدیل کیا اور تاخیر سے سہی لیکن اس کی یہ کتاب شائع ہوئی۔

یہ حقیقت ہے کہ ترقی پسند ادیبوں کا جو طاقت ور گروپ بمبئی میں موجود تھا علی سردار اس میں شامل ادیبوں کا مسلمہ نظریاتی رہنما تھا۔ اسے سجاد ظہیر کے بعد سب سے زیادہ پڑھا لکھا ادیب تصور کیا جاتا تھا۔

اس کی اہمیت کو صرف ہندوستان میں نہیں بیرونی ممالک میں بھی تسلیم کیا گیا اور ادبی کانفرنسوں اور مشاعروں میں مدعو کیا جانا ان کی مجبوری بن گیا۔

سوویت ادیبوں کی دوسری کانفرنس منعقد ہوئی تو اسے مدعو کیا گیا۔ بعد میں بھی وہ سوویت یونین کے ادبی مذاکروں اور تقریبات میں جاتا رہا۔ سوویت زبانوں میں اس کی شعری تخلیقات کے ترجمے شائع ہوتے رہے۔ تاشقند انسٹی ٹیوٹ کے ایک اسکالر نبی محمدوف نے اس کی شاعری پر ڈاکٹریٹ کیا۔

صرف سوویت یونین اور سوشلسٹ ممالک ہی نہیں وہ انگلستان، کینیڈا، امریکا اور پاکستان کے ادبی مذاکروں اور تقریبوں میں شرکت کے لیے بلایا جاتا رہا۔

1965ء میں پاک بھارت جنگ برپا ہوئی تو وہ تڑپ اٹھا۔ اس نے معرکتہ الآرا نظم ''کون دشمن'' تخلیق کی

یہ ٹینک، توپ، یہ بمبار، آگ، بندوقیں
کہاں سے لائے ہو کس کی طرف ہے رخ ان کا

☆

غلام تم بھی تھے کل تک غلام ہم بھی تھے
ابھی تو صبح کی پہلی ہوائیں سنگی ہیں
ابھی شگوفوں نے کھولی نہیں ہے آنکھ اپنی
ابھی بہار کے لب پر ہنسی نہیں آئی
نہ جانے کتنے ستارے بجھی سی آنکھوں کے
نہ جانے کتنے فسردہ ہتھیلیوں کے گلاب
ترس رہے ہیں ابھی رنگ و روشنی کے لیے

☆

تم آؤ گلشن لاہور سے چمن بردوش
ہم آئیں صبح بنارس کی روشنی لے کر
ہمالیہ کی ہواؤں کی تازگی لے کر

اور اس کے بعد یہ پوچھیں کہ کون دشمن ہے؟

جب احمد فراز نے ہندوستانی دانش وروں کے نام اپنی نظم ''چلو میں ہاتھ بڑھاتا ہوں دوستی کے لیے'' شائع کی تو سردار جعفری نے اس کے جواب میں ایک نظم احمد فراز کے نام لکھی۔

تمہارا ہاتھ بڑھا ہے جو دوستی کے لیے
مرے لیے ہے وہ اک بارِ غم گسار کا ہاتھ
وہ ہاتھ شاخِ گل گلشن تمنا ہے
مہک رہا ہے مرے ہاتھ میں بہار کا ہاتھ
خدا کرے کہ سلامت رہیں یہ ہاتھ اپنے
عطا ہوئے ہیں جو زلفیں سنوارنے کے لیے
زمیں سے نقش مٹانے کو ظلم و نفرت کا
فلک سے چاند ستارے اتارنے کے لیے
زمینِ پاک ہمارے جگر کا ٹکڑا ہے
ہمیں عزیز ہے دہلی و لکھنو کی طرح
تمہارے لہجے میں میری نوا کا لہجہ ہے
تمہارا دل ہے حسیں میری آرزو کی طرح

☆

کریں یہ عہد کہ اوزار جنگ جتنے ہیں
انہیں مٹانا ہے اور خاک میں ملانا ہے
کریں یہ عہد کہ ارباب جنگ جتنے ہیں
انہیں شرافت و انسانیت سکھانا ہے

اس کی یہ کوششیں رائیگاں گئیں اور جنگ نے اس کے خواب چکنا چور کردیے اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہوگیا۔

اسی سرحد پہ کل ڈوبا تھا سورج ہو کے دو ٹکڑے
اسی سرحد پہ کل زخمی ہوئی تھی صبح آزادی
یہ سرحد جو لہو پیتی ہے اور شعلے اگلتی ہے
ہماری خاک کے سینے پہ ناگن بن کے چلتی ہے
سجا کر جنگ کے ہتھیار میدان میں نکلتی ہے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

میں اس سرحد پہ کب سے منتظر ہوں صبح فردا کا

☆

جب ہندوستان کے وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی امن کی پیشکش کے لیے لاہور گئے تو اس نظم کی معنویت ان پر بھی کھل گئی جن کی توجہ سے یہ نظم محروم رہی تھی۔ یہ نظم ترقی پسندوں سے مختلف ایک الگ نقطہ نظر کی ترجمانی کرتی تھی۔

ساٹھ کی دہائی میں اس نے کمیونسٹ پارٹی میں اپنی رکنیت کی تجدید نہیں کرائی لیکن وہ اپنے آپ کو مارکسٹ ہی کہتا رہا البتہ اس کی عملی سرگرمیوں میں کمی آگئی اور وہ علمی و ادبی سرگرمیوں میں مشغول ہوگیا۔ یہ اس کی ذہنی و فکری بالیدگی کا زمانہ تھا اس کے وسیع مطالعہ نے اس پر نئی فکری جہتیں روشن کردیں۔

اس کے مزاج کی تعمیر و تشکیل میں کلاسیکی تہذیب و روایت اور معیار کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ دوسرے ترقی پسند شعراء کے برخلاف اس کے دل میں کلاسیکی شعر و ادب کے لیے ایک وقعت اور اہمیت موجود تھی۔ وہ جب ہر تعصب سے الگ ہو کر علمی و ادبی کاموں کی طرف متوجہ ہوا تو سب سے پہلے غالب نے اس کا دامن کھینچا۔ اس پر یہ عقدہ کھلا کہ غالب کی عظمت صرف اس میں نہیں کہ اپنے عہد کے باطنی اضطراب کو سمیٹ لیا بلکہ اس میں ہے کہ اس نے نیا اضطراب پیدا کیا۔ اس کی شاعری اپنے عہد کے شکنجوں کو توڑ دیتی ہے اور ماضی اور مستقبل کی وسعتوں میں پھیل جاتی ہے۔ اس نے اپنے ہر تجربے کو جو ایک انتہائی لطیف جمالیاتی ذوق والے ذہن کی کارفرمائی تھی انسانی نفسیات کی آگ میں تپا کر پگھلا دیا اور پھر شعر کی شکل میں ڈھالا تب اس کے یہاں ایک عالمگیر اور آفاقی شاعر کا لہجہ پیدا ہوا اور وہ زندگی کے ہر شعبے کا شاعر بن گیا۔ ہمارے ذہنوں میں بہت سی الجھنیں ہوتی ہیں اور بے شمار مسائل پیدا ہوتے ہیں مگر ان سب کا پرتو غالب کے کلام میں ملتا ہے۔ اس طرح غالب کے اشعار ہمارے دل و دماغ کو تازگی اور آسودگی کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ اسی باعث غالب کے بہت سے اشعار جغرافیائی حد بندیوں سے بلند ہو کر ضرب المثل کی صورت اختیار کر گئے ہیں۔

اردو اور ہندی بولنے پڑھنے اور لکھنے والوں کے درمیان یگانگت، ہم آہنگی پیدا کرنے اور مرزا غالب کو غیر اردو داں طبقے سے تعارف کرانے کے مقصد سے سردار جعفری نے دیوانِ غالب مرتب کیا۔

اس نے اس دیوان کو بہ یک وقت دو زبانوں اردو اور دیوناگری رسم الخط میں چھاپا۔ مقصد یہی تھا کہ اس دیوان کی اشاعت سے ہندی والوں اور اردو والوں کے دلوں میں محبت کے نئے پھول کھلیں اور ہمارا وطن اور ہماری زبان اس کی خوشبو سے مہک اٹھے۔

اس ایڈیشن کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور ہندی والوں میں غالب کی مقبولیت میں تو اضافہ ہوا ہی علی سردار جعفری کی تنقیدی نظر کی بھی دھاک بیٹھ گئی۔

غالب کے بعد اس کی نظر خدائے سخن میر تقی میر پر گئی۔ اس پر یہ حقیقت کھلی کہ کلیات میر کا کوئی صحیح اور خوب صورت ایڈیشن آج تک شائع نہیں ہوا اور بیشتر انتخاب ناقص ہیں۔

اس دیوان کو بھی اس نے دیوناگری اور اردو رسم الخط میں ایک ساتھ شائع کرایا۔ اس کا دیباچہ بھی ایسا تحریر کیا جو میر کی شخصیت اور اس کے کلام کی تفہیم میں معاون ثابت ہوا۔ میر کا یہ انتخاب صرف انتخاب ہی نہیں بلکہ اس کی شخصیت اس کے عہد کے حالات و ماحول اور فن کا آئینہ بھی ہے۔

ایک علیحدہ کتاب اس نے دیوان پر جلد دوم کے نام سے ترتیب دی۔ اس کی ترتیب افسانہ، حقیقت، شاعری اور فرہنگ کے عنوانات سے دی گئی۔ اس میں میر تقی میر کی شخصیت ان کے عہد کے سماجی حالات اور زبان کی تشکیل اور ارتقائی عمل کا جائزہ لیا۔ اس کے بعد میر سے متعلق دو افسانوی واقعات بیان کیے جو میر تقی میر کی شخصیت سے جوڑ دیئے گئے ہیں۔

حقیقت کے عنوان کے تحت سردار جعفری نے میر کی زندگی کے اہم واقعات اور سماجی و معاشی مسائل کا جائزہ اس طور سے لیا ہے کہ شہر لکھنو کی ظاہری عیش و عشرت سے پر معاشرت اور دلی کے بادشاہوں اور امیروں کے تباہ شدہ حالات ہمارے سامنے آگئے اور عہد میر کی اخلاقی پستیاں بھی اجاگر ہوگئیں۔

شاعری کے عنوان کے تحت اس نے میر کی شاعری کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا۔

اس حصے میں علی سردار نے لکھا۔

میر کی شاعری کے تمام بکھرے ہوئے جلوے ایک صد رنگ گلستاں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اس میں پھول بھی ہیں اور کانٹے بھی۔ بلبل بھی اور صیاد بھی۔ نشیمن بھی ہے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اور بجلی بھی۔ زندہ رہنے کی امنگ بھی ہے اور مر جانے کا حوصلہ بھی۔ اور یہی وجہ ہے کہ یہ شاعری آج بھی عظیم ہے اور زمانے کے بدل جانے کے بعد بھی دو سو برس پرانی زبان میں ہمارے جذبات اور احساسات کا ساتھ دے رہی ہے۔

میر کے دیوان کی ترتیب کے دوران اسے خیال آیا کہ جس طرح اردو زبان کے ممتاز شعراء میر اور غالب کو ہندی والوں سے متعارف کرایا اسی طرح دوسری زبانوں کے شعراء کے کلام کو اردو والوں تک پہنچایا جائے۔ اس نے ہندی شعراء میں کبیر اور میرا بائی کا انتخاب کیا اور ہندوستانی تہذیب کے مشترک ذخیروں کو پھر سے متعارف کرانے کی ٹھان لی۔ سردار نے کبیر میر اور غالب تینوں کو ایک ہی سلسلے کی کڑیاں قرار دیا لہٰذا ہر ایک کے انتخاب کلام کے دیباچے کو پیغمبران سخن نامی کتاب میں جمع کر دیا اور بقول اس کے اس کی ضرورت اس لیے پیش آئی۔

یہ اردو دانوں کی کوتاہ نظری تھی کہ انہوں نے قطب شاہی اور اس سے پہلے دکنی شاعری کو تو اردو ادب کی میراث کی حیثیت سے قبول کیا لیکن کبیر سے پہلو تہی کی اور ہندی والوں کی تنگ نظری نے کھڑی بولی کی نکھری ہوئی شکل کے دو سب سے بڑے شاعر میر اور غالب کو ہندی کا رتن ماننے سے انکار کر دیا۔ اب ہندی اور اردو دو مستقل زبانیں بن چکی ہیں لیکن ان کی میراث میں کچھ مشترکہ قدریں شامل ہیں۔

علی سردار نے کبیر داس کے کلام کا انتخاب اس لیے بھی کیا کہ اردو ادب جس تصور آزادی، ہمہ جہتی اور ہندوستانی مشترکہ قدروں کی روایت سے پھل پھول رہی ہے اسی کی جھلک کبیر کے کلام میں بھی ملتی ہے۔ کبیر کی آزاد خیالی اردو والوں کے لیے قابلِ قدر بھی ہے اور قابلِ قبول بھی۔

اس نے کبیر کی 128 نظموں کا انتخاب ''کبیر بانی'' کے نام سے کیا۔

ان نظموں کا انداز کچھ یوں ہے۔

نہ جانے صاحب کیسا ہے
ملّا ہو کر بانگ جو دیوے
کیا تر اصاحب برا ہے
مالا پھیری، تلک لگایا
لمبی جٹا بڑھاتا ہے
انتر تیرے کپٹ کٹاری

نینڈرتھل مذہب

بہت شروع کی نسل انسانی میں سے ایک نام نہاد نینڈرتھل لوگ تھے جن کا دور تقریباً ایک لاکھ سے پچیس ہزار سال قبل مسیح تک تھا۔ نینڈرتھل لوگوں کے بارے میں ہمیں بہت کم علم ہے۔ ماسوائے اس کے کہ وہ موجودہ انسانوں کی نسبت چھوٹے تھے اور غالباً شکار اور خوراک اکٹھی کرنے کے سبب گھٹن والی فضا میں آباد تھے۔ بلاشبہ نینڈرتھل لوگوں نے اپنے معاشرے یا مذہب سے متعلق کوئی تحریری ریکارڈ نہیں چھوڑا۔ ان کے مذہبی ہونے کی شہادت صرف علم بشریات سے ملتی ہے اور درحقیقت یہ قطعی شہادت ہے۔ مختلف علاقوں میں نینڈرتھل لوگوں کے قبرستانوں سے ماہرین بشریات نے جانوروں کی ہڈیاں اور پتھر کے اوزار حاصل کیے ہیں۔ کچھ کی رائے میں یہ آثار ظاہر کرتے ہیں کہ مُردوں کو خوراک اور ان کے اوزاروں اور ہتھیاروں سمیت دفن کر دیا جاتا تھا غالباً دیوتاؤں کی نذر کی غرض سے یا مُردوں کی دنیا میں ضروری اشیاء بھجوانے کی خاطر۔ مزید یہ کہ ماہرین بشریات نے ریچھ کی ایسی کھوپڑیاں پائی ہیں جنہیں نینڈرتھل لوگوں کے قبرستان میں بظاہر احتیاط سے ترتیب دیا گیا تھا اور اس سے ریچھ کے لیے عقیدت مندانہ رویہ ظاہر ہوتا ہے۔

مرسلہ: احمد حق، پشاور

یوں نہیں صاحب ملتا ہے

''ہمیں آج کبیر کی شاعری کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ اسی روشنی کی ضرورت ہے جو اس سنت صوفی کے دل میں پیدا ہوئی تھی۔ آج دنیا آزاد ہو رہی ہے۔ سائنس کی بے پناہ ترقی نے انسان کا اقتدار بڑھا دیا ہے۔ صنعتوں نے اس کی دست و بازو کی طاقت میں اضافہ کر دیا ہے۔ انسان ستاروں پر کمندیں پھینک رہا ہے پھر بھی حقیر ہے، مصیبت زدہ ہے، دردمند ہے، وہ رنگوں میں بٹا ہوا ہے، قوموں میں تقسیم ہے۔ اس کے درمیان مذہب کی دیواریں کھڑی ہوئی ہیں، فرقہ وارانہ نفرتیں ہیں۔ طبقاتی کشمکش کی تلواریں کھنچی ہوئی ہیں۔ بادشاہوں اور حکمرانوں کی جگہ بیوروکریسی لے رہی ہے۔ اس لیے اس کو ایک نئے یقین نئے ایمان اور نئی محبت کی ضرورت ہے جو اتنی ہی پرانی ہے جتنی کبیر کی آواز۔'' (دیباچہ کبیر بانی)

بھگتی تحریک کی ایک عظیم شاعرہ میرا بائی کے کلام کا

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

انتخاب بھی اس نے اسی جذبے سے کیا اور شائع کرایا جس جذبے کے تحت غالب، میر اور کبیر کا انتخاب کیا تھا۔

بھگتی تحریک ہندوستان کی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے۔ اس طرز فکر میں نہ ذات پات کا فرق تھا اور نہ سماجی وطبقاتی اونچ نیچ کی گنجائش۔ بس محبت، انسانیت اور رواداری بھگتی تحریک کی بنیادی قدریں تھیں۔ شری کرشن اس تحریک کے ماننے والوں کے پریتم تھے۔ میرا بائی اپنے پریتم کو بہت زیادہ چاہتی تھی۔ وہ ان کی اس قدر دیوانی تھی کہ اس نے اپنے پریتم کو پانے کے لیے راج گھرانے کی شان وشوکت کو ٹھکرا دیا۔ راج محل میں رہنا چھوڑ دیا یہاں تک کہ محل کا کھانا پینا اور لباس تک ترک کر دیا۔ راج رانی سے بیراگن بن گئی۔ اب میرا بائی دنیا جہاں کی تمام خوشیوں سے بے نیاز ہو کر اپنے پریتم کا بھجن کرتی، درد بھرے گیت گاتی اور ان پر اپنا سب کچھ نچھاور کر دیتی پھر بھی اسے تسکین نہ ہوتی۔ اس تسکین کے حصول کے لیے وہ اپنے سسرال چتوڑ سے بندرابن گئی۔ وہاں کی ہر چیز میں اسے اپنے پیا کا عکس نظر آیا اور وہ پھولے نہیں سمائی۔ یہاں اس کے دل سے ایسے عقیدت بھرے نغمے نکلے کہ سننے والے وجد کرنے لگے۔ اس کے بعد وہ شری کرشن کی آخری جائے رہائش دوار کا (کاٹھیاواڑ) گئی اور وہاں اپنے پریتم کے روپ میں ہمیشہ کے لیے سما گئی۔ میرا بائی کی یہی درد اور اشک بھری پریم کہانی اس کے گیتوں اور بھجنوں میں قدرے تفصیل سے بیان ہوئی۔

میں گردھر کے گھر جاؤں
گردھر مہاروں سانچو پریتم
دیکھت روپ لبھاؤں
رین پڑے تپ ہی اٹھ جاؤں
بھور بھئے اٹھ جاؤں

علی سردار جعفری نے ''پریم وانی'' کے نام سے میرا بائی کی ایک سو باون نظموں کا انتخاب کیا اور سابقہ دو اوین کی طرح اسے بھی اردو اور دیوناگری رسم الخط میں شائع کیا۔ ایک صفحہ اردو میں اور دوسرا دیوناگری میں۔

علی سردار جعفری نے برگزیدہ شعراء کے کلام کا انتخاب اردو اور ہندی میں ایک ساتھ شائع کر کے محبت اور یگانگت کی فضا عام کرنے کی کامیاب کوشش کی۔

☆.....☆

اس نے اپنی ذمہ داریوں کو دیکھتے ہوئے فلمی دنیا سے بھی وابستگی اختیار کی۔ اس سلسلے میں اس نے فلم انہونی، فٹ پاتھ، پردیسی، شہر اور سپنا، دھوبی ڈاکٹر کے گیت لکھنے کے علاوہ سونی مہیوال، میلہ، سازش اور رضیہ خاتون کی کہانیاں لکھیں۔ لال قلعہ، سابرمتی آشرم اور شالیمار باغ پر ڈاکیومنٹری فلمیں بھی بنائیں۔ ٹی وی کے لیے ڈرامے بھی لکھے۔ ایک ڈراما ''کہکشاں'' بہت پسند کیا گیا۔ یہ سیریل حسرت موہانی، جوش، جگر، مجاز، فیض اور فراق وغیرہ کی ذاتی اور ادبی زندگی پر مشتمل تھا۔

اتنے نفع بخش کاموں کے بعد اسے کم از کم لکھ پتی ہو جانا چاہیے تھا لیکن غریبوں کی امداد کرتے رہنا اس کا شیوہ تھا۔ اگر مارکیٹ سے پھل لے کر آرہا ہوتا تو گھر تک پہنچتے پہنچتے تمام پھل راستے میں ملنے والے غریب بچوں میں تقسیم ہو چکے ہوتے۔ اس حالت میں بمبئی جیسے مہنگے شہر میں خوش حال زندگی کیسے گزار سکتا تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے ساٹھ ستر ہزار روپے جمع کیے اور سلطانہ کے لیے ایک چھوٹا سا فلیٹ خرید لیا جس میں بہ مشکل دو بیڈ روم تھے۔ اس کی عمر ستر سے تجاوز کر چکی تھی اور اس چھوٹے سے فلیٹ میں رہنے والوں کی تعداد آٹھ تھی۔ اس شور وغل میں وہ اپنے تخلیقی کاموں میں مگن رہتا تھا۔

اس کی یہی محنت تھی جس نے اسے دوسرے ترقی پسندوں سے ممتاز کر دیا۔ اگر اس کا موازنہ سجاد ظہیر سے کیا جائے تو یہ بات سامنے آجاتی ہے کہ سجاد ظہیر صلاحیتوں کے باوجود علمی میدان میں ناولٹ، لندن کی ایک رات اور روشنائی کے علاوہ کوئی یادگار تصنیف نہ دے سکے جب کہ سردار جعفری نے خود کو آزادانہ طور پر علمی کاموں کے سپرد کر دیا اور نہایت وقیع تصنیفات پڑھنے والوں کے حوالے کیں۔ دس سے زائد شعری مجموعے تخلیق کیے۔ نثری تصانیف کیں اور کلاسیکی شعراء کے دواوین ترتیب دے کر ان پر فاضلانہ دیباچے لکھ کر اپنا نام نقادان اردو میں درج کرالیا۔

اس کے اس خلوص کا نتیجہ تھا کہ اسے بیسیوں ایوارڈز کے علاوہ ہندوستان کا بڑے سے بڑا ایوارڈ اسے حاصل ہوا۔ علی گڑھ یونیورسٹی نے کبھی اسے یونیورسٹی سے نکالا تھا اسی یونیورسٹی نے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دی۔ سوویت یونین نے امن ایوارڈ سے نوازا۔

ہندوستان کا کوئی ایوارڈ ایسا نہیں تھا جو اسے نہ ملا ہو۔

ان علمی سرگرمیوں میں مشغول ہونے کے بعد ایسا نہیں تھا کہ وہ ترقی پسند تحریک سے دور ہو گیا ہو۔ لندن میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

http://paksociety.com

Downloaded From Paksociety.com

انجمن ترقی پسند مصنفین کا جشن منایا گیا تو اس نے ملک راج آنند کے ساتھ اس میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا۔ 1986ء میں لکھنو اور دہلی میں بھی ترقی پسند تحریک اور انجمن کا جشن منایا گیا تو اس کے مذاکروں میں بھی وہ دلجمعی سے شریک ہوا حالانکہ اس کی عمر اب آرام کی تھی۔

1987ء میں اس نے دہلی یونیورسٹی میں سالانہ نظام خطبہ ''ترقی پسند تحریک کی نصف صدی'' کے عنوان سے پیش کیا۔

سوویت یونین میں کیمونزم کا انہدام ہوا تو دوسرے کمٹڈ مارکسیوں کی طرح اسے دلی صدمہ ہوا۔ اس نے اس نظریے کے دفاع میں اپنی جوانی لٹائی تھی اور اب اس کی عمر اسی سال سے تجاوز کر رہی تھی۔ وہ اب پیچھے پلٹ کر دیکھتا تھا تو دل میں ایک ٹیس سی اٹھتی تھی۔ اسے اس صدمے نے نڈھال کر دیا تھا لیکن پھر وہ سنبھل گیا اور جب ایک کانفرنس حیدر آباد میں ہوئی تو اس نے تقریر کرتے ہوئے کمیونسٹوں کو تسلی دی۔

''کیمونزم روس میں ختم ہوا ہے، ہمارے یہاں نہیں۔ کیمونزم دراصل ایک تصور ہے بہتر زندگی کا۔ جو کچھ سوویت یونین میں تھا وہ کیمونزم کی طرف جانے کا راستہ تھا۔''

اس نے کانفرنس کے ایک اجلاس میں روس کے اکتوبر انقلاب کے عالمگیر اثرات کا جائزہ لیا لیکن واقعہ یہ ہے کہ سوویت یونین کے خاموش انہدام کا سانحہ ایسا تھا جس نے اسے ہلا کر رکھ دیا۔ اس نے ایک نظم ''الوداع'' لکھی۔

الوداع اے سرخ پرچم، سرخ پرچم الوداع
اے نشان عزم مظلومان عالم الوداع
اے ردائے سربرہنہ بنت مریم الوداع
اے جلال کاوۂ آہن گر ضحاک کش
اے زوال نخوت اسکندر و جم الوداع
آفتاب بطن گیتی کی شعاع شب شکن
اے متاع انقلاب دور عالم الوداع
اے غرور دست محنت اے شکوہ بے نوا
حشر تک دنیا کرے گی تیرا ماتم الوداع
دیدۂ پرنم سے کل دل نے کہا تھا ''مرحبا''
کہہ رہی ہے آج لیکن چشم پرنم الوداع

اس کی اہمیت کا احساس صرف دوسروں کو نہیں تھا خود اسے بھی تھا۔ آخری عمر کے آتے آتے اسے یقین ہونے لگا تھا کہ اس نے ایسا وقیع کام کر لیا ہے کہ آنے والی نسلیں اسے بھلا نہیں سکیں گی۔ اس نے ایک نظم ''نئی نسل کے نام'' تخلیق کی۔

مجھ سے نظریں چرا کر کہاں جاؤ گے
اے مرے آفتابو!
راہ میں رات کی بے کراں جھیل ہے
اور اونچی ہیں لہریں
آسمان سخن کے نئے ماہتابو
تیرگی پوچھتی پھر رہی ہے تمہارا پتا
اے مرے شعلہ پیکر عقابو
اپنے لوح و قلم تو دکھاؤ ذرا
سچ کہو کیا تمہارے تراشے ہوئے لفظ میں
میری آواز کا شائبہ بھی نہیں
مری آواز پتھر میں شعلہ ہے
شعلے میں شبنم
اور طوفاں میں طوفاں
اور تمہارے بھی سینے میں اس کی چبھن ہے
سچ کہو
آنے والے زمانے کی روشن کتابو
مجھ سے نظریں چرا کر کہاں جاؤ گے

اس کی عمر 1999ء میں چھیاسی سال کی ہو گئی تھی۔ کچھ عمر کا تقاضا کچھ بے پناہ ذہنی محنت اس کے ذہن نے اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ ڈاکٹروں نے نسیان تجویز کیا تھا۔ بات کرتے کرتے الفاظ بھول جاتا تھا۔ گم صم رہنے لگا تھا۔ کوشش کرتا تھا کہ چپ رہے۔ جس کی شعلہ بار تقاریر مخالفین کی زبانیں بند کر دیا کرتی تھیں۔ وہ اب خود خاموش تھا۔ ایسے میں اسے ''اودھ سمان ایوارڈ'' لینے کے لیے لکھنو بلایا گیا۔ اسے غالباً اپنی حالت کا احساس تھا اس لیے اس سفر میں وہ اپنے ساتھ سلطانہ، ستارہ جعفری اور اپنے کلام کی گلوکارہ سیما سہگل کو بھی ساتھ لے کر گیا۔

وہ تاج ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔

اس رات ''اودھ سمان'' کے جشن میں اس نے اپنی مشہور نظم ''کون دشمن ہے'' سنائی۔

تم آؤ گلشن لاہور سے چمن بردوش
ہم آئیں صبح بنارس کی روشنی لے کر
ہمالیہ کی ہواؤں کی تازگی لے کر
اور اس کے بعد یہ پوچھیں کہ کون دشمن ہے

☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

دوسرے دن تاج ہوٹل کے سیمینار میں ریاست کے گورنر سورج بھان نے سردار جعفری سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے اپنے بچپن کا ایک دلچسپ واقعہ دہرایا۔ وہ اپنے گاؤں کے اسکول میں تقریری مقابلہ جیت کر جب اگلے مقابلے کے لیے شہر آئے تو وہاں اسکول کے بچے ایک سے ایک اچھی تقریر کررہے تھے۔ ان بچوں کی تقریریں سن سن کر ان کے بولنے کی ہمت جواب دے گئی اور وہ ہال سے باہر نکل کر ایک گوشے میں چھپ کر اس لیے کھڑے ہوگئے کہ کوئی ان سے بولنے کو نہ کہے۔ گورنر نے کہا وہ آج پھر اپنے کو اس گوشے میں کھڑا ہوا محسوس کررہے ہیں کہ کوئی ان سے سردار جعفری کے آگے بولنے کے لیے کہے۔

سردار کو دعوت خطاب دی گئی مگر یہ وہ وقت تھا جب مرض نے ان کے دماغ پر حملہ کرنا شروع کردیا تھا اور ان کی یادداشت جواب دیتی جارہی تھی۔ پھر دیکھنے والوں نے دیکھا اور سننے والوں نے سنا کہ وہ سردار جعفری جس کا حافظہ تلوار کی دھار کی طرح تھا جسے چھ سال کی عمر میں ہی پانچ چھ سو اشعار یاد ہوگئے تھے، وہ دوران تقریر شاعروں کے حوالے تو دے رہا ہے مگر ان کے اشعار یاد نہیں آرہے ہیں۔ وہ اکثر اشعار کے صرف مفاہیم بیان کرنے پر اکتفا کررہا ہے۔

اس کا علاج ہوتا رہا لیکن اس کی حالت یہ تھی کہ بالکل خاموش ہوگیا تھا۔ کوئی آتا تو اس کی صورت دیکھتا رہتا چہرے کے تاثرات سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ پہچاننے کی کوشش کررہا ہے۔ یہی حال اخبار کا تھا۔ وہ اخبار لے کر بیٹھتا ضرور تھا لیکن ایسا لگتا تھا پڑھ نہیں رہا ہے صرف دیکھ رہا ہے۔ لکھنے پڑھنے کا شغل تو ظاہر ہے ختم ہی ہوگیا تھا۔

اسے دماغ کا سرطان تھا جس نے اس کے حافظے کو اس قدر دھندلا دیا کہ شاعری کا بیش بہا خزانہ لٹانے والا حروف کی ساخت ہی بھول چکا تھا۔ اسے کاغذ قلم دیا جاتا تو کچھ لکھنے کے بجائے کاغذ پر پھول بناتا رہتا۔ یہ پھول یقیناً پھول جیسے بچوں کا استعارہ تھا جن سے وہ زندگی بھر محبت کرتا رہا تھا۔

وہ کبھی اسپتال چلا جاتا کبھی گھر چلا آتا۔ اب تو وہ شاید زندگی بھر کی ساتھی سلطانہ کو بھی پہچاننے سے انکار کر بیٹھا تھا۔ اسے دیکھ کر آنکھوں میں ایک چمک ضرور آجاتی تھی لیکن کچھ بولنے سے قاصر تھا۔

اس کی بیماری بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ وہ ''کوما'' میں چلا گیا۔

بمبئی اسپتال کے ایک بستر پر بے حس و حرکت لیٹا ہوا تھا۔ بیڈ کے برابر ایک کرسی پڑی تھی۔ جس پر سلطانہ بیٹھی رہتی تھی۔ کمرے میں ہر وقت سناٹا رہتا۔ اس کے قریبی دوست اسے دیکھنے آتے کچھ دیر بیٹھتے اور چلے جاتے۔

ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ کبھی بھی ہوش آسکتا ہے کب آئے گا پتا نہیں۔

اسی کومے کے دوران وہ اسپتال کے کمرے کے سناٹے کو مزید گہرا کرگیا۔ ایسا سناٹا جسے آہیں اور سسکیاں بھی نہیں توڑ سکتی تھیں۔

اسے اسپتال سے اس کے فلیٹ پر پہنچا دیا گیا اور آخری سفر کی تیاری شروع ہوگئی۔

وہ چونکہ بلرام پور کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوا تھا اس لیے ایک شیعہ قبرستان رحمت آباد میں تدفین کا بندوبست کیا گیا۔

سلطانہ اب تک خاموش تھی لیکن پھر اس سے رہا نہیں گیا۔

''سردار کو سانتا کروز قبرستان میں دفن کیا جائے گا۔''

''سانتا کروز قبرستان؟ وہ تو سنیوں کا قبرستان ہے۔'' شیعہ مولوی نے کہا۔

''میرا سردار نہ شیعہ تھا نہ سنی۔ میں تو اس لیے کہہ رہی ہوں کہ اس کے سارے دوست اسی قبرستان میں ہیں۔ وہ اپنے دوستوں کے درمیان رہنا چاہے گا۔ میں بھی عنقریب جانے والی ہوں۔ سنی ہوں اسی لیے میں بھی سانتا کروز ہی جاؤں گی۔ سردار کو میرے پاس ہونا چاہیے۔''

سردار اور سلطانہ جو چار دن بھی ایک دوسرے سے الگ نہیں رہے ہمیشہ ہمیشہ الگ رہیں یہ کیسے ممکن تھا۔

بہت دیر تک اعتراضات ہوتے رہے۔ جوابات ملتے رہے اور پھر وہی ہوا سردار جعفری کو سانتا کروز کے سنی قبرستان میں دفن کردیا گیا۔

صدیوں کا پرانا کھیل ہوں میں
میں مر کے امر ہو جاتا ہوں

ماخذات

علی سردار جعفری شخصیت اور فن..... مرتبہ: عقیل عباس جعفری
سجاد ظہیر شخصیت اور فکر..... مرتبہ: ڈاکٹر سید جعفر احمد

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

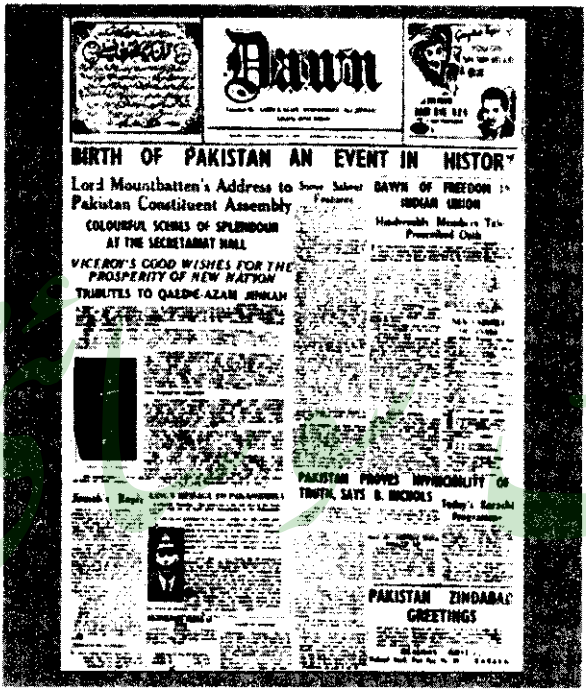

Dawn

BIRTH OF PAKISTAN AN EVENT IN HISTORY

Lord Mountbatten's Address to Pakistan Constituent Assembly

COLOURFUL SCENES OF SPLENDOUR AT THE SECRETARIAT HALL

VICEROY'S GOOD WISHES FOR THE PROSPERITY OF NEW NATION

TRIBUTES TO QAEDE-AZAM JINNAH

DAWN OF FREEDOM IN INDIAN UNION

Honourable Members Take Prescribed Oath

PAKISTAN PROVES INVINCIBILITY OF TRUTH, SAYS B. NICHOLS

Today's Karachi Programme

PAKISTAN ZINDABAD GREETINGS

قائد کا ڈان

شکیل صدیقی

ہر مہذب معاشرے میں اخبارات کو خصوصی اہمیت ہے کیونکہ اخبارات ہی عوامی جذبات کے عکاس ہوتے ہیں، حکمرانوں تک عوامی آواز پہنچاتے اور رائے عامہ ہموار کرتے ہیں۔ اس وقت جب پورے برصغیر میں مسلمانوں کا ترجمان کہلانے کے لائق ایک بھی انگریزی اخبار نہ تھا۔ اس کمی کو قائداعظم نے محسوس کیا اور انہی کے مشورے پر انگریز تک اپنے مطالبات پہنچانے، مسلمانوں کے مسائل کو اجاگر کرنے کے لیے اس روزنامہ کی بنیاد پڑی۔ اس اخبار نے کیسے کیسے اتار چڑھائو دیکھے اس کا مختصر سا تذکرہ۔

معلومات حاصل کرنے کے شوقین افراد کے لیے تحفۂ خاص

روزنامہ ''ڈان'' انگریزی صحافت کا سب سے پرانا اور سب سے زیادہ پڑھا جانے والا اخبار ہے۔ یہ ہیرالڈ پبلی کیشنز کے تحت شائع ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اسی ادارے سے انفرمیشن ٹیکنالوجی کا میگزین ''اسپائڈرز'' اور مارکیٹنگ کے لیے ''ارورا'' بھی شائع ہوتا ہے۔

روزنامہ ڈان کی داغ بیل قائداعظم محمد علی جناح نے 26 اکتوبر 1941ء کو دہلی، انڈیا میں ڈالی۔ اس کی حیثیت اس وقت مسلم لیگ کے نمائندے کی سی تھی اور یہ روزنامے کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

بجائے ہفت روزہ تھا۔اس کا پہلا شمارہ 12 اکتوبر 1942ء کو لطیفی پریس میں شائع ہوا۔اس کے اجرا کا مقصد یہ تھا کہ اس کے ذریعے آزادی کی راہیں استوار ہوں اور مسلمانوں کو نشانِ منزل مل جائے۔محمد علی جناح نے اس اخبار کی غرض وغایت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا۔''ڈان ہندوستانی مسلمانوں اور آل انڈیا مسلم لیگ کا آئینہ دار ہے۔یہ معاشیات،سماجیات اور تعلیم میں پڑھنے والوں کی رہنمائی کرے گا۔خاص طور پر سیاسیات میں اسے مسلمانوں کا سچا اور بے خوف رہبر و رہنما سمجھنا چاہیے۔اس کی پالیسی میں قوم کی آزادی کے لیے خدمت کرنا اور ان کے حقوق کے لیے لڑنا شامل ہے۔اسے یہ بھی نظر انداز نہیں کرے گا۔''

اس کے بعد قائداعظم نے محسوس کیا کہ ایسے کئی اور اخبارات ملک کے مختلف حصوں سے شائع کیے جانا چاہئیں۔جس کے نتیجے میں کلکتہ سے بنگالی اخبار ''آزاد'' 1936ء میں (جس کے مدیر مولانا محمد اکرم خان تھے) منشور 1937ء (اس کی ادارت حسن ریاض کرتے تھے) اور کلکتہ سے انگریزی اخبار ''دی اسٹار آف انڈیا'' 1947ء کا اجرا عمل میں آیا۔

آل انڈیا مسلم لیگ کے لاہور کے اجلاس میں 23 مارچ 1920ء میں قرارداد پاکستان منظور ہوئی۔اس طرح سے مسلم لیگ کی سیاست میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔اس کے بعد مسلمانوں کے مطالبات کی تشہیر سارے انڈیا کے مسلمانوں کے مطالبات کو یعنی ان کے لیے ایک علیحدہ خطۂ زمین نامزد کرنے اور ہندوؤں،انگریزوں،سکھوں اور دوسری اقلیتی قوموں کے سامنے اپنے مؤقف کی وضاحت کرنے کے لیے ایک قومی روزنامے کی ضرورت کا لوگوں کو شدید احساس ہوا۔9 دسمبر 1937 کو ''پیسہ'' اخبار نے اپنے اداریے میں ایسے انگریزی روزنامے کی طرف توجہ دلائی جو سارے ہندوستان کے مسلمانوں کی صحیح طور نمائندگی کر سکے۔اور ان کے مفادات کا تحفظ کر سکے۔قائداعظم نے محسوس کیا کہ مسلمانوں کے پڑھے لکھے طبقے کے لیے کسی ایسے اخبار کی ضرورت ہے جو اس کی دل چسپیوں اور اہم خبروں کے پیشِ نظر اس کا مستقل قاری بن سکے۔جس طرح کہ اسٹیٹسمین،سول اینڈ ملٹری گزٹ اور ٹائمز آف انڈیا ہیں۔

چنانچہ انہوں نے ڈان کی بنیاد ڈالی جس کا تذکرہ اوپر کیا جا چکا ہے۔اس کے نگراں قائد ملت لیاقت علی خاں تھے۔ایک سال کے اندر ہی ہفت روزہ کو روزنامے میں تبدیل کر دیا گیا۔

مسلمانوں اور خاص طور پر قائداعظم کو صحافت میں قدم رکھنے کی ضرورت یوں پیش آئی کہ سیکڑوں اہم مسائل ہندو پریس میں جگہ نہیں پاتے تھے۔اس لیے کہ صحافتی قوت اس وقت ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی۔کانگریس کا ''نیشنلسٹ پریس'' مسلمانوں کی خبروں کو نظر انداز کر دیتا تھا۔حد یہ ہے کہ قائداعظم کی تقریروں کو بھی شائع نہیں کیا جاتا تھا۔پھر ایک خاص منصوبے کے تحت اگر کچھ شائع کیا جاتا تھا تو توڑ مروڑ کر جس سے لیڈروں کے صحیح خیالات عوام تک نہیں پہنچ پاتے تھے۔ہندوؤں نے دروغ گوئی کو اپنا وتیرہ بنا رکھا تھا۔

لکھنؤ،دہلی،لاہور،کلکتہ اور بمبئی سے اردو اخبارات شائع ہوتے تھے لیکن ان کی اشاعت قابل فخر نہ تھی۔ان میں سے کسی اخبار کی اشاعت بیس ہزار سے اوپر نہ پہنچ سکی۔انگریزی اخبارات کی حالت دگرگوں تھی۔پورے ہندوستان میں نمایاں اخبار ''اسٹار آف انڈیا'' تھا مگر اس کی ادارت بھی ایک انگریز کے ہاتھ میں تھی جس کا نام لارنس بی انگلسن تھا۔اس اخبار کی اشاعت خود اپنے صوبے بنگال میں بھی کم تھی۔

اس کے علاوہ انگریزی میں چند ہفت روزہ شائع ہوتے تھے جن میں اسٹار،دکن ٹائمز،ایسٹرن ٹائمز اور نیو ٹائمز آف لاہور شامل ہیں۔ان تمام ہفت روزوں کی مجموعی اشاعت دس ہزار سے زیادہ نہیں تھی۔چنانچہ انہیں مالی استحکام حاصل نہیں تھا۔اس کے علاوہ اشتہاری ایجنسیاں بھی ان کے ساتھ تعاون نہیں کرتی تھیں اور انہیں اشتہارات نصیب نہیں ہوتے تھے۔

جب کہ ہندو پریس اردو ہو یا انگریزی بھرپور قوت کے ساتھ اپنا کام کر رہا تھا۔ان اخبارات میں ٹریبون،نیشنل کال،امرت بازار پتریکا،ہندوستان ٹائمز اور ہندو قابلِ ذکر ہیں۔انہیں سہولیات زیادہ حاصل تھیں اور ہندو اشتہاری ایجنسیاں انہیں اشتہارات سے بھی نوازتی تھیں۔

ہندوؤں کے پریس کی قوت کا مقابلہ کرنے کے لیے قائداعظم نے ''مسلم پریس قائم کرو'' کی تحریک چلانا شروع کی۔چنانچہ 1936ء میں انہوں نے ''اورینٹ پریس آف انڈیا'' کے قیام کی داغ بیل ڈالی۔پٹنہ کے بیرسٹر سید محمد کو اس ایجنسی کا ڈائرکٹر مقرر کیا۔انڈیا کے سارے بڑے شہروں میں ایجنسی کے دفاتر قائم کیے گئے۔حالانکہ یہ ایجنسی مالی اعتبار سے کمزور تھی۔وسائل بھی کم تھے،حد یہ ہے کہ اس کے پاس اپنا ٹیلی پرنٹر بھی نہیں تھا۔ایجنٹوں کی طرف سے بھیجی ہوئی خبریں ڈاک یا ٹیلی گرام سے وصول کی جاتی تھیں۔اس کے باوجود اس ایجنسی نے اپنا مؤقف عام لوگوں کے سامنے پیش کیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ڈان کے لیے ایک پڑھے لکھے شخص کی ضرورت تھی، لہٰذا ''اسٹار آف انڈیا'' کے مدیر پوتھن جوزف کو اس کا مدیر بنا دیا گیا۔ یوں 22 اکتوبر 1922ء میں اس روزنامے کا پہلا شمارہ شائع ہوا تو اس کے لیے ایک ٹرسٹ بنا دیا گیا۔ جس کے رکن قائداعظم اور لیاقت علی خان تھے۔ پوتھن جوزف ہر چند کہ مسلمان نہیں تھے، لیکن انہوں نے ڈان کو مسلمانوں کی آرزوؤں کا نمائندہ بنا دیا۔ وہ بہرحال ایک اچھے مدیر ثابت ہوئے۔ دو سال تک انہوں نے اس اخبار کو سلیقہ مندی اور ہوش مندی سے چلایا۔ اس کے بعد انہیں ایک اور جگہ اچھی ملازمت کی پیشکش ہوئی تو انہوں نے ڈان کی ادارت چھوڑ دی۔

ان کی جگہ الطاف حسین کو ڈان کی ادارت سونپ دی گئی، جو سٹیٹسمین کے اداریہ نویس تھے اور اپنی لازوال تحریروں سے لوگوں کے دلوں میں جگہ بنا چکے تھے۔ انہوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنے اداریوں سے آزادی کے لیے جگانا شروع کر دیا۔ وہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن (جو ہندوستان کے آخری برطانوی وائسرائے اور گورنر جنرل تھے) اور کانگریس پارٹی کے خلاف تھے جو یہ چاہتے تھے کہ مسلمان اور ہندو علیحدہ نہ ہوں اور آپس میں متحد رہیں۔

2 فروری 1922 کو لاہور سے ''دی پاکستان ٹائمز'' کی اشاعت شروع ہوئی، جس کی بنیاد قائداعظم نے رکھی۔ اس اخبار نے بھی لوگوں کے دلوں میں جگہ بنالی اور اس کی اشاعت میں اضافہ ہونے لگا۔ ڈسمنڈ ینگ اس کے پہلے مدیر تھے۔ کچھ ہی عرصے کے بعد فیض احمد فیض نے ان کی جگہ لے لی۔ قائداعظم اس اخبار کو پسند کرتے تھے۔ اس کا اندازہ ان کے اس پیغام سے ہوسکتا ہے جو انہوں نے اخبار کی پہلی سالگرہ پر دیا تھا۔

''پاکستان ٹائمز کا آغاز اس وقت ہوا ہے جب کہ بھارت کے مسلمانوں کے مستقبل پر اثر انداز ہونے والے مسائل موجود ہیں۔ اور مسلمانوں کے اخبارات کی ضرورت شدید ہوگئی ہے۔ میں نے پاکستان ٹائمز کا اس کے آغاز سے لے کر بارہ ماہ کے اندر ہونے والی ترقی کا مشاہدہ کیا ہے۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی ہے کہ اس ایک سال میں اخبار نے خود کو مضبوط اور معیاری کرلیا ہے۔ جس طرح اس نے یہ ترقی حاصل کی ہے اس کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا پڑتا ہے کہ آیندہ یہ مزید مضبوط ہوجائے گا۔ بشرطیکہ اس نے پریس کی اعلا روایت کو برقرار رکھا۔ اور بلا خوف و خطر عوام کے مؤقف کی نمائندگی کرتا رہا۔ میں پاکستان ٹائمز کی خوش حالی کے لیے دعاگو ہوں۔''

قائداعظم محمد علی جناح حالانکہ کبھی صحافی نہیں رہے اور انہوں نے کبھی کسی اخبار کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں کام نہیں کیا۔ مگر اس کے باوجود انہوں نے پریس کی سرپرستی کی ہے۔ اور برصغیر کے مسلم پریس کے قیام میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ قائداعظم اخبارات کو فوری اثر انداز ہونے والا آرگن نہیں سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ ایک طاقتور اور مضبوط ذریعہ ہے۔ وہ اس ذریعے کو پاکستان کے تصور کو مقبول بنانے میں استعمال کرنا چاہتے تھے۔ تاکہ مسلمانوں میں قومیت کا جذبہ بیدار ہوجائے۔ اس طرح سے وہ آنے والے حالات کے لیے خود کو تیار کرسکتے تھے۔

محترمہ فاطمہ جناح نے اپنے بھائی کی پندرھویں برسی پر 1962ء میں کہا۔ ''قائداعظم ہمیشہ سے پریس پر پابندی کے خلاف تھے۔ محمد علی جناح اظہار رائے میں جمہوری اصولوں کے بہت بڑے نقیب تھے۔ وہ انفرادی آزادی اور پریس کی آزادی پر پابندی عائد کرنے کے حق میں نہیں تھے۔''

قائداعظم نے کبھی صحافیوں کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی، بلکہ وہ اس خیال کو مسترد کرتے تھے۔ ہیکٹر بولیتھو نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ وہ شہرت حاصل کرنے کے کبھی متمنی نہیں رہے۔ صحافی ان کی بہت عزت کرتے تھے، لیکن ایک صحافی کے بقول انہوں نے صحافیوں کو لبھانے کی کوشش نہیں کی۔ اس اعتبار سے وہ ایک مشکل سیاست داں تھے۔ وہ صحافیوں کے ساتھ خوش مزاجی سے پیش آتے تھے اور ملائم گفتگو کرتے تھے۔ انہیں گھر پر بھی مدعو کرتے تھے۔ لیکن انہیں کبھی چائے کی ایک پیالی یا سگریٹ تک نہیں پلاتے تھے، اس لیے ان کے نزدیک یہ رشوت دینے کے مترادف تھا۔

قائداعظم کا پریس کے بارے میں یہ نظریہ تھا کہ وہ عوام کو باخبر رکھے۔ انہیں تفریح بہم پہنچائے، اچھے تجزیے کرے۔ ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے اظہارِ رائے نہایت ضروری ہے۔

انہوں نے اظہارِ آزادی اور غیر جانبدارانہ رپورٹنگ اور پریس کی آزادی کے اسی جذبے کے ساتھ ہمیشہ خود بھی عمل کیا۔ اور کبھی ڈان کے کاموں میں مداخلت نہیں کی۔ اسی لیے ڈان مسلم لیگ کا ترجمان ہونے کے باوجود غیر جانبدار ہونے کے علاوہ اپنی آزاد پالیسی پر گامزن رہا۔

22 اکتوبر 1923ء کو ڈان کی پہلی سالگرہ تھی۔ اس موقع پر انہوں نے کہا۔ ''قوم کی ترقی اور صلاح کے لیے پریس اہم ضرورت ہے۔ اس لیے کہ پریس ہی کے ذریعے لوگوں کی

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

رہنمائی کی جاسکتی ہے۔اور زندگی کے تمام شعبوں میں عمل کو تیز تر کرنے کے لیے ان کی سوچ کا دھارا تبدیل کیا جاسکتا ہے۔''

مئی 1922ء میں کشمیر میں صحافیوں سے گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے کہا۔''پریس ایک ایسی قوت ہے کہ اس سے فائدہ بھی اٹھایا جاسکتا ہے اور نقصان بھی پہنچایا جاسکتا ہے۔اگر اسے صحیح طور پر استعمال کیا جائے تو یہ رائے عامہ ہموار کرنے اور عوام کی رہنمائی کا ذریعہ بن سکتا ہے۔''

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ پریس کے تاریک اور روشن دونوں پہلوؤں سے واقف تھے۔اور اس کے لیے انہوں نے بر صغیر میں ایک ایسے مستحکم اور طاقتور پریس کے قیام کے لیے جدو جہد کی، جو پاکستان کے نصب العین کے حصول کے کامیاب سفر کو تیز کرنے کا سبب بنی۔

☆☆☆

ڈان نے قارئین کے ایک بڑے حلقے کو قلیل عرصے میں متوجہ کرلیا۔اس اخبار کی اشاعت میں اضافہ ہونے لگا۔الطاف حسین نے مسلمانوں کو ایک مؤثر اور بھرپور قوت بننے کا راستہ فراہم کیا۔حالانکہ اس وقت دو اور انگریزی روزنامے کلکتہ سے شائع ہو رہے تھے، مارننگ نیوز اور اسٹار ٹائمز۔لیکن مسلمانوں نے اپنی رہنمائی کے لیے ڈان کا انتخاب کرلیا۔1947ء میں ڈان کا اسٹاف اور الطاف حسین کراچی آگئے تاکہ 15 اگست 1947ء سے مقامی ایڈیشن شائع کیا جاسکے۔

تحریک پاکستان میں بہت سی ایسی قد آور شخصیات بھی تھیں جنہوں نے اپنی مساعی جمیلہ سے نظریہ پاکستان کی مخالفت کرنے والوں کو شکست فاش دی اور اپنے قلم کو بطور ہتھیار استعمال کیا۔بات یہیں ختم نہیں ہوئی۔قائد اعظم کی کاوشوں سے مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ ملک کی بنیاد پڑی۔لیکن مخالفین نے یہاں بھی پیچھا نہیں چھوڑا اور اپنی زہریلی سانسوں سے فضا کو مسموم کرتے رہے۔وہ جن کے ہاتھوں میں قلم تھا انہوں نے جہاد کیا اور ان عناصر کو منہ کی کھانی پڑی۔

یہ قلمکار حقیقت میں ایک تاریخ ہیں جن کا تذکرہ کیے بغیر کوئی بات مکمل نہیں ہوسکتی۔ان ہی لوگوں میں الطاف حسین بھی تھے، جن کے قلم سے ڈان صحیح معنوں میں ایک روشنی بن کر ابھرا اور اس کی ضیا پاشیوں سے وطن عزیز میں سویرا ہوگیا۔

پروفیسر شریف المجاہد نے الطاف حسین کے بارے میں لکھا تھا:''جدو جہد آزادی کے آخری مرحلے میں تین اداروں نے انتہائی اہم کردار ادا کیا تھا، جن میں مسلم لیگ، قائد اعظم اور ڈان اخبار شامل تھا۔وہ اس طرح کہ مسلم لیگ نے تحریک پاکستان چلانے کے لیے ایک پلیٹ فارم مہیا کیا۔جناح کی بے باک شخصیت، دوراندیشی اور معاملہ فہمی نے تحریک کو کامیابی سے ہمکنار کیا۔جب کہ ڈان نے اس کی تشریح کی کہ تحریک چلانے کے اسباب و علل کیا تھے۔ڈان کو یہ کامیابی صرف اور صرف الطاف حسین کی وجہ سے حاصل ہوئی جو ایک مستعد، سرگرم اور انتھک محنت کرنے والے مدیر تھے۔''

وہ 26 جنوری 1900ء میں مشرقی بنگال کے سلہٹ میں پیدا ہوئے تھے اور زمانہ طالب علمی سے ہی انہوں نے میدان صحافت میں قدم رکھ دیا تھا۔ان کا خاندان زمین دار تھا اور وکالت ان کا آبائی پیشہ تھا۔چنانچہ الطاف حسین کے لیے پیشۂ صحافت اختیار کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا۔مگر ان کے والد نے ان کی حوصلہ افزائی کی اور ان کے شوق کو فزوں تر

ڈان کو تازہ ترین خبریں شائع کرنے میں غیر ملکی اخبارات کا تعاون بھی حاصل ہے جن میں دی انڈیپنڈنٹ، دی گارڈین، لاس اینجلس ٹائمز اور دی واشنگٹن پوسٹ شامل ہیں۔

ڈان کے ہفتے کے ایڈیشن میں کلاسفائڈ اشتہارات، کیریئر اور زمین کی خرید و فروخت کے خصوصی ضمیمے شامل ہوتے ہیں۔جولائی 2007ء میں میڈیا میں اس کا نیوز چینل شروع ہوگیا۔انگریزی بہرحال عام افراد کے لیے سمجھنا دشوار ہوتی ہے، اس لیے مئی 2010ء میں نیوز چینل کی زبان اردو کردی گئی۔

19 مئی 2011ء کو ڈان گروپ نے جولین اسانج سے معاہدہ کیا جو جولین اسانج کے خالق ہیں کہ ریاست ہائے متحدہ کے سیاست دانوں کی خفیہ سرگرمیاں اور تازہ ترین سیاسی اور ملکی خبریں سب سے پہلے ڈان کو حاصل ہوں گی۔اس کا باقاعدہ اعلان کیا گیا۔

مذکورہ روزنامے کے آفس اس وقت کراچی، لاہور اور اسلام آباد میں ہیں۔اس کے علاوہ بہت سے نمائندے غیر ملک میں بھی کام کر رہے ہیں۔2010ء میں اس کی ہفتہ وار اشاعت تقریباً 109,000 تھی۔اس کے مالک حمید ہارون ہیں جب کہ ظفر عباس اس کے مدیر ہیں۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کیا۔

یہاں تک کہ ان کا کوئی مضمون کسی اخبار میں شائع ہوتا تو وہ اسے پڑھ کر الطاف کو انعام سے نوازتے تھے۔ 1912ء میں جب وہ ہائی اسکول کے طالب علم تھے تو ان کے مضامین کلکتہ سے شائع ہونے والے انگریزی اخبار ''انگلش مین'' میں چھپتے تھے۔ الطاف حسین نے کلکتہ یونیورسٹی سے بی۔اے کی ڈگری حاصل کی اور پھر ڈھاکا یونیورسٹی میں ایم اے کے لیے داخلہ لیا۔

اس وقت ڈھاکا یونیورسٹی کی وہ طلبہ تنظیم جسے الطاف حسین کی حمایت حاصل تھی، سلیم اللہ مسلم ہال اسٹوڈنٹ یونین کے انتخابات ہار چکی تھی۔ اس لیے الطاف حسین نے ''دی ڈان'' کے نام سے ایک چھوٹا سا سائیکلو اسٹائل اخبار نکالا، جو حزب اختلاف کے موقف کی حمایت کرتا تھا۔ اس اخبار اور قائد اعظم کے اخبار میں کیا فرق تھا۔ الطاف حسین نے ایک موقع پر اس کی وضاحت یوں کی کہ قائداعظم اور ایس ایم ہال طلبہ تنظیم کے اخبار میں فرق صرف ''دی'' کا تھا۔ قائد اعظم کا اخبار ''ڈان'' تھا۔ جب کہ میں نے ''دی ڈان'' شائع کیا تھا، ورنہ اس کا معیار بھی وہی تھا جو میرے اخبار کا تھا۔

الطاف حسین نے ڈھاکا یونیورسٹی سے ایم اے کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ اس کے بعد درس و تدریس کے پیشے کو اپنایا۔ مگر اس دوران ان کے مضامین انگریزی اخبارات میں شائع ہوتے رہے۔ ان کے مضامین اور کالم اس درجے معیاری تھے کہ قائداعظم انہیں شوق سے پڑھتے تھے۔ اسی زمانے میں اسٹیٹس مین اخبار میں ہمایوں کبیر جو ''مسافر'' کے قلمی نام سے اپنا کالم ''مسلم جہاں'' لکھتے تھے، انہوں نے علامہ اقبال کی مخالفت میں ایک مضمون لکھ دیا۔ اس مضمون میں انہوں نے نازیبا کلمات استعمال کیے۔

الطاف حسین کو یہ کالم پڑھ کر بہت غصہ آیا۔ وہ اس کے مدیر مسٹر آرتھر مور کے پاس گئے۔ ان سے کہا کہ ہمایوں کبیر کانگریس کا حامی ہے، چنانچہ انہوں نے اس سے علامہ اقبال پر بیہودہ مضمون کیوں لکھوایا اور شائع کیا ہے؟

آرتھر مور نے ان کے احتجاج کو غور سے سنا اور الطاف حسین کو پیشکش کی کہ وہ ان کے اخبار میں پندرہ روز کے لیے کالم نویسی کریں۔ الطاف حسین نے ''عین الملک'' کے قلمی نام سے کالم لکھنا شروع کر دیا، جس کا نام ''مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے'' (Through Muslim Eye)۔ اس کالم کا معاوضہ 16 روپے فی کالم تھا۔

کچھ عرصے بعد خواجہ ناظم الدین نے ایک اخبار ''دی بنگالی'' کے اثاثے خرید لیے۔ پھر اسے ''اسٹار آف انڈیا'' میں ضم کر دیا اور اس کی ادارت ایچ جی فرینکس کو سونپ دی۔ الطاف حسین نے اس اخبار میں بھی قلمی نام ''مغل مسلم'' سے کالم نگاری شروع کر دی۔ اس کالم نگاری کا معاوضہ انہوں نے لینا قبول نہیں کیا۔ ان کے کالم کا نام ''صاف گوئی'' تھا۔ سرکاری ملازمت میں رہتے ہوئے الطاف حسین نے اسٹار آف انڈیا میں اداریے لکھے۔ اس دوران انہیں ڈھاکا بھیج دیا گیا۔ لیکن 1938ء تک وہ اداریہ نویسی کرتے رہے۔ ان کی قلمی صلاحیتوں کے اعتراف کے طور پر انہیں ''ناظم اطلاعات عامہ'' کے عہدے سے نوازا گیا۔

شومئی قسمت کہ آرتھر مور کو اسٹیٹس مین کی ادارت سے علیحدہ کر دیا گیا اور ان کی جگہ ایک ہندو کام کرنے لگا۔ اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ الطاف حسین کو ہٹا کر ہمایوں کبیر سے اداریے لکھوانے لگا۔ قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا، اس لیے آرتھر مور نے اخبار کی دوبارہ ادارت سنبھال لی۔ اس نے ہمایوں کبیر کو ہٹایا اور الطاف حسین کو لکھنے پر لگا دیا۔ انہوں نے شاہد کے قلمی نام سے کالم نگاری شروع کر دی۔

تقریباً 1942ء میں الطاف حسین اور وزیر اعلا بنگال فضل الحق میں اختلافات ہو گئے تو اس بنا پر الطاف حسین کا تبادلہ راجشاہی کے گورنمنٹ کالج میں وائس پرنسپل کی حیثیت سے کر دیا گیا۔ اسی سال خواجہ ناظم الدین نے وزیر اعلا کا عہدہ سنبھالا تو الطاف حسین کو ''ناظم اطلاعات عامہ بنگال'' کے عہدے پر فائز کر دیا۔ حالات کے اس اتار چڑھاؤ سے الطاف حسین مایوس و دلگیر نہ ہوئے اور ان کے قلم کی کاٹ روز بہ روز تیز ہوتی چلی گئی۔ اس وقت جب کہ وہ اسٹیٹس مین میں لکھنا بند کر چکے تھے، ان کی ملاقات قائداعظم سے ہوئی تو انہوں نے پوچھا۔

''تم نے لکھنا کیوں چھوڑ دیا؟''

تب الطاف نے اس کی وجہ بتائی اور کہا کہ اسٹیٹس مین کی انتظامیہ کا رویہ ان کے ساتھ اچھا نہیں تھا۔

1945ء میں ڈان کی ادارت پوتھن جوزف نے چھوڑ دی تو عارضی طور محمد حسین اس کے مدیر بنا دیے گئے۔ اپریل کے مہینے میں بنگال کے وزیر اعلا نے الطاف کو اپنے گھر بلایا اور خانزادہ فیاقت علی خان کا ایک خط پڑھوایا جس میں قائداعظم نے انہیں ڈان کی ادارت سنبھالنے کی پیشکش کی تھی۔ الطاف حسین ایک لحاظ سے خوش تھے، لیکن ساتھ ہی تذبذب میں مبتلا تھے کہ انہیں سرکاری ملازمت چھوڑنا پڑے گی۔ چنانچہ وہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

بروقت فیصلہ نہ کرسکے۔ قائداعظم نے ایک بار پھر ان سے درخواست کی تو الطاف حسین راضی ہوگئے۔ اس کشاکش کے زمانے کی تفصیل خود الطاف حسین کے الفاظ میں کچھ یوں ہے:

''میں ان دنوں پُرجوش تھا، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ سوچ رہا تھا کہ سرکاری ملازمت بلاوظیفہ ترک کرنا دشوار لگ رہا تھا، اس لیے کہ وظیفہ حاصل کرنے کے لیے مجھے پھر سے تیس برس ملازمت کرنا تھی۔ قائداعظم نے مجھے پھر لکھا۔ ''میں ایک بار آپ کو پیشکش کرتا ہوں کہ اس ادارت کو قبول کیجیے۔ کسی بھی فرد کو صرف روٹی حاصل کرنے کے لیے ملازمت نہیں کرنا چاہیے۔''

اس خط کے نتیجے میں، میں نے ڈان کی ادارت سنبھال لی۔

الطاف حسین کو ڈان کی ادارت شروع کرتے وقت دو ہزار دو سو روپے دیے گئے۔ جو ان کی سرکاری ملازمت کے مساوی تھے۔

دو برس تک الطاف حسین مسلم لیگ کے مؤقف کی حمایت میں لکھتے رہے اور ڈان مسلم لیگ کا نقطۂ نظر بیان کرتا رہا۔ اسی اثنا میں پنجاب میں سول نافرمانی کی بڑے پیمانے پر تحریک چلی اور وزیراعلا پنجاب نے احکامات جاری کردیے کہ کوئی اخبار بغیر سنسر کے شائع نہ کیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی ڈان پر پابندی لگا دی گئی۔ لیکن یہ پابندی غیرمؤثر ثابت ہوئی۔ ڈان اسمگل ہوکر پنجاب پہنچ جاتا تھا۔ اور لوگ بغیر پریشانی اٹھائے اس کا مطالعہ کرلیتے تھے۔ یہ ایک اچھی صورتِ حال تھی، اس لیے کہ ڈان انڈیا کے ساتھ اس علاقے میں بھی مقبول تھا، جو پاکستان بننے والا تھا۔ لہٰذا یہ فیصلہ کیا گیا کہ ڈان کو دہلی اور کراچی سے بیک وقت شائع کیا جائے۔ تاکہ دہلی ایڈیشن کے ذریعے ہندوستانی مسلمانوں کی ترجمانی ہوسکے اور کراچی ایڈیشن سے اس خطے کے مسلمانوں کی۔ چنانچہ الطاف حسین ضروری ساز و سامان کے ساتھ کراچی پہنچ گئے۔ چند دنوں تک دونوں مقامات سے ڈان شائع ہوتا رہا، لیکن پھر بلوائیوں نے ڈان کے دہلی کے آفس کو آگ لگا دی۔ بہرحال ڈان کراچی مستحکم ہوگیا اور حالات نامساعد ہونے کے باوجود الطاف حسین نے اس کی جڑوں کی آبیاری کی اور اسے مضبوط سے مضبوط تر کردیا۔

قیامِ پاکستان کے بعد ڈان کو حکومت کی غلط حکمتِ عملی پر کڑی نکتہ چینی کرنا تھی، جو اس نے اپنا فرض سمجھتے ہوئے کی۔ لہٰذا ڈان کی اعلا حکام سے تکرار شروع ہوگئی۔ صورتِ حال بہت ہی نازک تھی، وہ یہ کہ لیاقت علی کے قتل پر ڈان نے تحریک چلانا شروع کردی کہ ان کے قاتلوں کو تلاش کیا جائے۔ تحقیق کی جائے۔ اس میں جن لوگوں کے نام آتے ہیں انہیں چھپایا نہ جائے۔

جب یہ تحریک اپنے عروج پر پہنچ گئی تو حکومت نے ڈان پر پابندی عائد کردی۔ اس کے اشتہارات بند کردیے۔ حکومت کے ملازمین کو ہدایت کردی گئی کہ وہ ڈان خریدنا بند کردیں۔ اعلا حکام ڈان کے نمائندوں کو انٹرویو نہ دیں۔ پریس کانفرنسوں اور سرکاری تقریبات میں ڈان کے نمائندوں کو نہ بلایا جائے۔ لیکن یہ پابندی زیادہ عرصے تک جاری نہ رہ سکی اور درج بالا احکام واپس لینا پڑے۔

الطاف حسین کی تنقیدی پالیسی میں کوئی فرق نہ آیا، ہرچند کہ مالی وسائل کے کمزور ہونے کے باوجود پائے استقامت میں لغزش نہ آنے دی۔ وہ ان دنوں صاحبِ فراش تھے، لیکن انہوں نے اس کیفیت میں بھی اداریے لکھے۔ ان کے سیکریٹری جناب انصار احمد نے لکھا:

اکتوبر 1953ء میں میں نے الطاف حسین کے ساتھ اندرون سندھ کا دورہ کیا جب کہ الطاف حسین کو وزیراعظم نے ساتھ چلنے کی دعوت دی تھی۔ سفر کے دوران پارٹی کو باخبر رکھنے کے لیے الطاف حسین ایک چھوٹا سا اخبار نکالتے تھے جسے وہ ''ڈان کا بچہ'' کہتے تھے۔ اس میں تازہ ترین خبریں ہوتی تھیں، اس لیے اس کے قارئین حیرت زدہ رہ جاتے تھے کہ یہ اخبار دنیا کے بارے میں اتنی صحیح تازہ خبریں شائع کر رہا ہے۔ آگے چل کر وہ لکھتے ہیں کہ میں نے اپنی طویل ملازمت کے دوران انہیں کسی نہ کسی کام میں مصروف پایا۔ وہ اپنی سوچوں میں منہمک رہتے تھے۔ شاید ہی کوئی موقع ایسا ہو جب میں نے انہیں فوراً ہی کام کے لیے آمادہ نہ پایا ہو۔ وہ جب کام کرنے لگتے تھے تو کسی قسم کا شور غل پسند نہیں کرتے تھے۔ اس سے ان کے ارتکاز میں فرق پڑ جاتا تھا۔ وہ کام کرتے وقت جو شیلے ہوتے تھے اور اپنے کام سے شدید محبت کرتے تھے۔

وہ ڈان سے کتنی محبت کرتے تھے، اس کے گواہ ان سے قریب اور دور رہنے والے بھی تھے۔ ان کا معمول تھا کہ جب ڈان شائع ہوجاتا تھا تو سرخ اور نیلی پنسل لے کر بیٹھ جاتے اور غلطیوں کو نشان زد کرتے۔ بے توجہی کی بنا پر کوئی غلطی رہ جاتی تو متعلقہ فرد کو بلا کر اس سے باز پرس کرتے اور غصے میں بھی آجاتے تھے۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں اپنے غصے پر قابو پالیا کرتے تھے۔ اس کے بعد متعلقہ فرد کو نرمی سے سمجھاتے تھے کہ اس غلطی سے کیسے بچا جاسکتا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

جب انہیں یہ محسوس ہوجاتا کہ کسی خاص انداز کے واقعہ کو خاص انداز میں کوریج دینا چاہیے تو وہ رپورٹر کو بھیجنے کی بجائے خود اس جگہ جاتے تھے اور جب وہ دن گزار کر بوجھل قدموں سے واپس آتے تو ان کے ساتھی ان کی رپورٹنگ دیکھ کر حیران رہ جاتے تھے۔ اگر انہیں معلوم ہوجاتا کہ فلاں کام کو آج کیا جاسکتا ہے تو اسے کل پر نہیں ٹالتے تھے، بلکہ اسی روز کر ڈالتے تھے۔

حکومت بنگال کے ناظم اطلاعات عامہ کی حیثیت سے انہیں اس وقت کے گورنر لارڈ لیسی کے دورۂ کلکتہ کے پریس کوریج کا انتظام کرنا تھا۔ 1942ء میں جب وسائل بھی محدود تھے ایسے وقت میں یہ کام انتہائی اہم تھا، لیکن کلکتہ کے اخبارات اس معاملے میں سستی کا مظاہرہ کررہے تھے۔ اس تاخیر سے بلاواسطہ ان کے شعبے کی اہلیت متاثر ہوجاتی، اس لیے انہوں نے ایک ٹیکسی کرایے پر لی اور خود آدھی رات کو وہاں پہنچ گئے۔

پھر وہاں سے انہوں نے شہر بھر کے سارے اخبارات کو خبریں، پریس ریلیز اور تصاویر بھیج دیں، جو ایک روز بعد اخبارات کو ملتیں اور ایک روز بعد شائع ہوتیں۔

وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ میری دنیا میری بیوی بچوں اور ڈان تک محدود ہے۔ ان کا یہ احساس ذمے داری تھا جس کی بنا پر انہوں نے صحافت میں نام پیدا کیا اور خود کو ذی حیثیت لوگوں سے منوالیا۔ ایک موقع پر 1946ء میں مہاتما گاندھی نے کہا تھا۔ ''ہندوؤں کے پاس بہت سے اخبارات اور بہت سے ایڈیٹر ہیں۔ لیکن سب غیر مؤثر ہیں۔ البتہ مسلمانوں کے پاس ایک اخبار اور ایک ایڈیٹر الطاف حسین ہے جو ''بم شیل'' کا کام انجام دیتا ہے۔''

اپنی صحافت اور ادارت کے ساتھ ساتھ الطاف حسین اپنے قلم سے اور اپنے قارئین سے بے حد مخلص تھے۔

اپنے کام سے محبت اور وقت کی قدر کرنا ہمیں ہر اس شخص میں دکھائی دیتا ہے جو قائداعظم کے قریب رہا اور جس نے ان کے فرمودات پر عمل کیا۔ الطاف حسین کام میں ڈوب کر اس طرح اسے انجام دیتے تھے کہ اس کے بعد انہیں گردوپیش کی خبر نہیں رہتی تھی۔

مسلم لیگ کو پیش آنے والی الجھن آمیز دشواریوں کے خلاف الطاف حسین نے اپنے نوک قلم سے جہاد کیا۔ اس میں مہاجرین کی آبادکاری، کشمیر کا مسئلہ، اقتصادی ترقی کے لیے غیر ملکی امداد اور ملک کے اندر تخریبی عناصر جیسے مسائل شامل ہیں۔

وہ ان مسائل پر اداریے لکھتے تھے جو نظریہ پاکستان اور ان کی حب الوطنی کے آئینہ دار ہوتے تھے۔ جدوجہد آزادی کے وقت انہوں نے مسلمانوں کے جذبات کی بے خوفی سے ترجمانی کی۔

حمید نظامی مرحوم (مدیر نوائے وقت) کی برسی کے موقع پر جو 1965ء میں ہوئی تھی، اپنے جذبات کا یوں اظہار کیا۔

☆ایک مدیر کو حقیقت میں ایماندار اور اپنی پالیسیوں میں آزاد ہونا چاہیے۔ صحیح یا غلط اسے خود پر اعتماد اور یقین ہونا چاہیے۔ ایک بار کسی بات پر یقین کرلے تو اس پر ڈٹا رہنا چاہیے۔

☆ایک مدیر کو کسی مقتدر سیاسی ہستی کی حمایت بھی کرنا چاہیے، لیکن نہایت وقار کے ساتھ، اس کے تابع فرمان بن کر نہیں۔

☆ایک مدیر کو مخالفت برائے مخالفت نہیں کرنا چاہیے۔

حمید نظامی میں یہ خصوصیات بدرجہ اتم موجود تھیں۔

''الطاف حسین کئی قومی اور بین الاقوامی تنظیموں سے وابستہ تھے۔ وہ ''پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز کانفرنس'' کے بانی تھے اور کئی سال تک اس تنظیم کے سربراہ بھی رہے۔ دنیا کے مختلف ممالک میں مدیروں کی کانفرنس میں پاکستانی اخبارات کی نمائندگی بھی کی۔''

زیورچ (فرانس) کے ایگزیکٹو بورڈ آف انٹرنیشنل پریس انسٹی ٹیوٹ کے سربراہ منتخب ہوئے۔ دولت مشترکہ صحافتی تنظیم کے سربراہ کے فرائض انجام دیے۔ 1952ء میں انہوں نے ماسکو میں ہونے والی عالمی اقتصادی کانفرنس میں پاکستان کی نمائندگی کی۔ واپسی پر انہوں نے اس دورے کے بارے میں مضامین لکھے اور اسی مناسبت سے اس کا عنوان A fortnight in Mascow رکھا۔ 1959ء میں صدر ایوب نے انہیں ''ہلال قائداعظم'' کے عہدے سے نوازا۔

اپنی 37 سالہ صحافتی زندگی میں انہوں نے 20 سال ڈان کی ایڈیٹری کی۔ ان کے قویٰ مضمحل ہوچکے تھے۔ اسی دوران انہوں نے سیاسی زندگی میں قدم رکھا اور مارچ 65ء میں ڈان سے استعفا دے دیا۔ مگر سیاسی زندگی کے پیچ وخم میں وہ الجھ کر رہ گئے اور اس کوچۂ پرخار سے واپس آتے ہی بنی۔ انہوں نے 1968ء میں کابینہ کی وزارت و معدنی وسائل سے بھی استعفا دے دیا۔ پھر 25 مئی 1968ء کو ان کا انتقال ہوگیا۔ وہ مسلمانوں کے عظیم صحافی تھے۔ ان کی وفات پر نیویارک کے ہیرالڈ ٹریبون نے اپنے تعزیتی ادارے میں لکھا۔ ''انہوں نے حکومت سازی کی اور حکومتوں کا بوریا لپیٹنے والے بھی ثابت ہوئے۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

لیلیٰ حرف شیریں

ایاز راہی

تاریخ کے جھروکے سے ایک منفرد تحریر

اس دوشیزہ نے محبت کی شاہراہ پر قدم رکھا اور عشق کے سمندر میں ڈوب گئی لیکن اس کا محبوب کون ہے یہ جان کر آپ بھی حیران رہ جائیں گے۔ شہزادیاں عیش و عشرت میں ڈوب کر زندگی گزارتی ہیں لیکن اس نے عیش بھری زندگی تج کر ایک ایسی راہ کا انتخاب کیا جو ہم سب کے لیے بھی مشعل راہ ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

عجیب طرح دار خاتون تھی کہ جس کی مثال شاید انسانی تاریخ میں ڈھونڈے سے بھی نہ ملے۔ عشق نے اسے دونوں جہان سے بے نیاز کر دیا تھا۔ انفرادیت اور امتیاز کا وہ درجہ بخش دیا تھا کہ لیلیٰ۔ عذرا اور روپ متی جیسوں کا عشق بھی اس کے آگے سر بہ سجدہ دکھائی دیتا ہے۔ اس خاتون کا سچا اور سچا تاب دار عشق عمر بھر۔

''اللہ کرے مرحلہ شوق نہ ہو طے'' کی عملی تفسیر بنا رہا۔ اس خاتون کا مجنوں (محبوب، پریتم، پریمی، پیا) کہ جس کے آگے دونوں جہان کی نعمتیں ہاتھ باندھے کھڑیں اک نظر کرم کی منتظر مگر مجنوں کی شان استغناء ہے کہ فرشتوں کو بھی حیرت زدہ کیے ہوئے ہے۔ اس عشق کے آگے کائنات بھی انگشت بہ دنداں اور سر بہ گریباں ہے۔ کائنات کا سوچا حسن اس خاتون کے خاک پا کے ایک ذرّے سے بھی لگا نہیں کھاتا کہ یہ عشق سلسلہ ہائے مہر و خلوص میں یکسر جداگانہ مقام و حیثیت رکھتا ہے کہ آس پاس دور و نزدیک کہیں بھی یہ انوکھا رنگ۔ مقدّس جذبہ اور اعلیٰ سرشاری نظر نہیں آتی۔ آج ہمیں سوہنی، سسی، نوری، ماروی اور شہر بانو کے قصے تو خوب یاد ہیں جنہیں ہم اپنی گفتگو، تحریر اور محافل میں بار بار دہراتے، سر دھنتے ہیں لیکن اس پاک باز خاتون اور کردار کو ہم نے مکمل طور پر طاق نسیاں کی نذر کر رکھا ہے۔ نہ صرف اس خاتون بلکہ اس کے مجنوں کو بھی مسلسل بھول اور بے حسی کا نشانہ بنا رکھا ہے۔ سبق آموز حقیقی واقعات کی بجائے عیش و عشرت سے بھرپور قصے کہانیوں کے

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

Downloaded From Paksociety.com

رسیا ہیں جو ہمیں غفلت اور بے عملی کی نیند سلائے رکھتے ہیں، نتیجہ یہ کہ آج دنیا بھر میں ہم ذلیل وخوار ہو رہے ہیں۔ ہر طرف سے ٹھوکروں، طمانچوں اور تھپیڑوں کی زد میں ہیں۔ وہ قوم جس نے دنیا کی امامت کی اور مسلسل امامت کرتے رہنا تھی آج اغیار کے ہاتھوں بری طرح پٹ رہی ہے اور پستی کی انتہا یہ کہ زنخوں کی مانند کوسنوں، بددعاؤں، گالیوں کی خواپنائے ہوئے ہے۔ بہ قول اکبر الہ آبادی مرحوم(16 نومبر 1846 تا 15 فروری 1921ء) کہ ''اٹلی کی توپوں میں کیڑے پڑیں۔''

بے حسی ہے کہ ہمارے رگ وپے میں اتری ہوئی بلکہ رچی بسی ہوئی ہے۔ سو میرا قلم مجبور ہو چلا ہے کہ'' گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را''

یہ اٹھارویں صدی عیسوی کے پنجاب کا ذکر ہے۔ پنجاب (پنج آب) جو پانچ دریاؤں (راوی، چناب، جہلم، ستلج، بیاس) کی سرزمین ہے جس نے رنگین وسنگین ہر طرح کے ادوار دیکھے۔ اک بھرپور تہذیب وتمدن سے مالا مال خطہ ہے۔ جہاں حسن داؤدی اور شوکت سلیمانی کا جلال وجمال پہلو بہ پہلو نظر آتے ہیں۔ تمدنی دور کے ابتدا (ہڑپہ۔ ساہیوال) کی سنہری نشانی اس کا طرۂ امتیاز ہے۔ یہ سات لڑیوں کی پھول مالا (نیلی بار، ساندل بار، گوندل بار، صادق بار، کرانہ بار، کوچی بار اور نجی بار) گلے میں سجائے ہوئے ہے جسے پانچ پانیوں (دریاؤں) کی تراوٹ خوشی وخوش حالی بخشتی ہے۔ جس سے ان پھولوں کی رنگارنگی اور خوشبو عجب بہار دیتی ہے۔ ان دنوں مغلیہ سلطنت بہ ظاہر اپنے عروج پر مگر دراصل روبہ زوال تھی۔ یہاں اس وقت لاہور کے حکمران نواب عبدالصمد خان کی بیٹی ذکر یہ خان کی بہن محترمہ آنسہ شرف النسا بی بی کا ذکر خیر مقصود ہے جسے قرآن اور تلوار سے محبت تھی۔ جب وہ قرآن پاک کی تلاوت کرتی تو ہمیشہ ہاتھ میں تلوار رکھتی تھی یا کمر سے باندھے رہتی۔ تمام عمر بن بیاہی (کنواری) رہی کہ اس باعصمت اور باکردار لیلیٰ کا مجنوں (قرآن مع تلوار) بھی تو منفرد۔ اعلیٰ اور سچا وجود تھا۔ ہے اور قیامت تک رہے گا۔ یہ فانی لیلیٰ اپنے زندۂ جاوید مجنوں (قرآن مع تلوار) کے عشق میں امر ہو گئی کچھ اس شان سے کہ اس حقیقی عشق کے آگے تمام مجازی عشق ہمیشہ کے لیے سربہ سجدہ ہو گئے۔ شرف النسا بی بی نے اپنی والدہ محترمہ کو وصیت کی تھی کہ مرنے کے بعد میری سادہ سی کچی قبر بنوایئے گا اور اس کے اوپر تلوار وقرآن پاک رکھ دیجئے گا چناں چہ اس وصیت پہ پورا پورا عمل کیا گیا۔ اس حور ارضی نے باغبان پورہ (لاہور) میں گوشۂ لحد کو فردوس بریں بنایا اور رشک حوریاں ٹھہری۔ سکھوں کو نواب عبدالصمد خان کے خاندان سے بڑی پرخاش اور بغض تھا کہ اسی خاندان کے ایک حاکم نے سکھوں کے سردار بندہ سنگھ بہادر عرف بندہ بے راگی (1670ء تا 1716ء) کو زندہ گرفتار کر کے مغلیہ دربار (دہلی) بھیجا تھا اور سکھوں کی بغاوت وسرکشی اپنی طاقت کے زور پر دبادی تھی۔ انہیں سر نہ اٹھانے دیا۔ لہٰذا سکھوں نے اپنے دورِ حکومت (1801ء تا 1846ء) میں جہاں مسلمانوں پر خوب مظالم توڑے جی بھر کے بدلہ لیا وہاں شرف النسا بی بی کا مقبرہ بھی محفوظ نہ رہا۔ اجاڑ دیا گیا۔ قرآن پاک اور تلوار اٹھالی گئی کہ وہ نواب عبدالصمد خان کی بیٹی اور خاندان سے تعلق رکھتی تھیں غنیمت یہ کہ قبر اور میت سکھوں سے محفوظ رہی۔ شرف النسا بی بی کی وصیت کے مطابق ان کی قبر ایک اونچے چبوترے پہ بنائی گئی تھی۔ بعد میں حفاظت کے لیے مزار کے چاروں طرف سرو کے درخت لگا لیے گئے۔ آج بھی شالامار قبرستان باغبان پورہ (لاہور) میں یہ مزار ''سرو والا مقبرہ'' کے نام سے مرجع خلائق ہے جہاں روحانی عشق وفیض کا چشمہ تشنہ کام عشاق صادقین کو مسلسل سیراب کر رہا ہے۔ قرآن اور تلوار سے کسی خاتون کا یہ عشق انسانی تاریخ کی آبرو ہے۔ خوش بخت وخوش نصیب تھی آنسہ شرف النسا بی بی کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں دین اسلام کی صحیح سمجھ اصل روح اور عشق وعمل سے نواز رکھا تھا۔ مغل شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر(04 نومبر 1618ء تا 03 مارچ 1707ء) کے بعد اٹھارویں صدی عیسوی میں مغل سلطنت کھوکھلی ہو رہی تھی۔ مسلمان تن آسانی اور عیش وعشرت کے دل دادہ ہو رہے تھے کہ مغل حکمران بھی (محمد شاہ رنگیلا وغیرہ 17 اگست 1702ء تا 26 اپریل 1748ء) آگے چل کر شمشیر وسناں کو تیاگ کے طاؤس ورباب کے عادی ہو گئے تھے۔ ایسے میں قرآن اور تلوار سے محبت بڑی بات تھی وہ بھی کسی نواب خاندان کی خاتون کا قرآن مع تلوار سے عشق۔ اللہ، اللہ۔

ایں سعادت بہ زور بازو نیست
تانہ بخشد خدائے بخشندہ

چنانچہ شرف النسا بی بی پہ اللہ تعالیٰ کی خاص نظر عنایت تھی کہ وہ حقیقی دین اسلام کی سچی اور باعمل پیروکار تھی۔ اس کے نزدیک اصل زندگی قرآن اور تلوار ہی تھی۔ شریعت کے لیے طاقت وقوت از بس ضروری ہے۔ دونوں ہی لازم وملزوم عنصر ہیں۔ شاعر مشرق علامہ اقبال کو شرف النسا مرحومہ سے بڑی عقیدت تھی۔ اپنی فارسی مثنوی۔ ''جاوید نامہ'' میں وہ ذہنی معراج

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کی روداد بیان کرتے ہیں۔ اپنے پیرومرشد مولانا روم (30 ستمبر 1207ء تا 17 دسمبر 1273ء) کی معیت اور راہنمائی میں چھ سیاروں (فلک قمر، فلک عطارد، فلک زہرہ، فلک مریخ، فلک مشتری، فلک زحل) سے گزرتے، وہاں مختلف بڑی شخصیات سے ملتے جب جنت میں داخل ہوتے ہیں تو سب سے پہلے قصر شرف النسا (بی بی شرف النسا کا محل) کو پاتے ہیں اور پھر اپنے مرشد وراہنما سے یوں گفتگو کا آغاز کرتے ہیں۔

گفتم! ایں کاشانہ از لعل ناب
آں کہ می گیرد خراج از آفتاب

میں نے کہا کہ یہ خالص لعل کا بنا ہوا گھر ہے جو آفتاب سے خراج لیتا یعنی سورج بھی اس کے سامنے بے رونق ہے۔

ایں مقام ایں منزل ایں کاخ بلند
حوریاں بر در گہش احرام بند

یہ مقام، یہ منزل، یہ بلند محل کہ اس کے دروازے پہ حوریں احرام باندھے کھڑی ہیں (حوریں محل کا طواف کر رہی ہیں)

اے تو دادی سالکاں را جستجوئے
صاحب اوکیست؟ با من بازگوئے

اے رومی کہ تو نے راہ حق پہ چلنے والوں کو جستجو عطا کی ہے مجھ سے کہہ کہ اس محل کا مالک کون ہے؟

گفت! ایں کاشانہ شرف النسا است
مرغ بامش با ملائک ہم نوا است

اس نے کہا کہ یہ شرف النسا کا گھر ہے اس کی چھت کا پرندہ فرشتوں سے کلام کرتا ہے یعنی یہ بہت پاک صاف محل ہے۔

قلزم ما ایں چنیں گوہر نہ زاد
ہیچ مادر ایں چنیں دختر نہ زاد

ہمارے سمندر نے اس قسم کا موتی پیدا نہیں کیا یعنی ہند کے مسلمانوں میں اس قسم کی پاکیزہ لڑکی پیدا نہیں ہوئی۔ کسی ماں نے ایسی بیٹی نہیں جنی۔

خاک لاہور از مزارش آسماں
کس نہ داند راز او را در جہاں

اس کے مزار کی وجہ سے لاہور کی زمین، آسمان ہے، اس سے شہر لاہور کو بلند مرتبہ ملا ہے۔ اس کے راز کو جہاں میں کوئی نہیں جانتا یعنی اس نیک دختر کے بلند مقام کو کوئی نہیں جانتا۔

آں سراپا ذوق وشوق ودرد و داغ
حاکم پنجاب را چشم و چراغ

وہ سراپا ذوق وشوق اور درد وداغ تھی۔ وہ پنجاب کے حاکم (عبدالصمد خان) کی چشم وچراغ تھی

آں فروغ دودۂ عبدالصمد
فقر او نقشے کہ ماند تا ابد

وہ پنجاب کے حاکم عبدالصمد خان کے خاندان کا فروغ تھی۔ اس کا فقر ایک ایسا نقش تھا جو ابد تک رہے گا

تا ز قرآں پاک می سوزد وجود
از تلاوت یک نفس فارغ نہ بود

تا کہ قرآن کریم کے فیض سے اس کا وجود مکمل طور پہ سوز حاصل کرلے۔ وہ قرآن مجید کی تلاوت سے ایک لمحہ فارغ نہیں رہتی تھی

در کمر تیغ دو رو قرآں بہ دست
تن بدن ہوش وحواس اللہ مست

اس کی کمر میں دودھاری تلوار اور ہاتھ میں قرآن تھا اس کا جسم اور اس کے ہوش وحواس اللہ میں مست تھے

خلوت و شمشیر و قرآں و نماز
اے خوش آں عمرے کہ رفت اندر نیاز

تنہائی، تلوار، قرآن اور نماز، یہ اشیا اس کے شب وروز کی ساتھی تھیں۔ کیسی اچھی ہے وہ زندگی جو نیاز مندی میں گزر جائے

برلب او چو دم آخر رسید
سوئے مادر دید ومشتاقانہ دید

اس کے ہونٹوں پہ جب آخری دم تھا اس نے اپنی ماں کی طرف دیکھا اور مشتاقانہ انداز سے دیکھا

گفت! اگر از راز من داری خبر
سوئے ایں شمشیر وایں قرآں نگر

کہنے لگی اگر تو میرے راز سے خبر رکھتی ہے تو اس تلوار اور اس قرآن کی طرف دیکھ جو میری زندگی کا سرمایہ رہا ہے

ایں دو قوت حافظ یک دیگر اند
کائنات زندگی را محور اند

یہ دو طاقتیں (قرآن اور تلوار) ایک دوسرے کی حفاظت کرنے والی ہیں اور زندگی کی کائنات کا محور ہیں۔ یہ شعر دین اسلام کی اصل روح کا ترجمان اور فلسفہ اقبال کا نچوڑ ہے مگر بگاڑنے والوں نے سیدھی سادی اسلامی تعلیمات کو ایرانی، ہندی، اسرائیلی، رومی اور یونانی تصوف کی بھول بھلیوں میں ڈال دیا خصوصاً فرقہ بندی کا زہر ہلاہل جسد اسلام کے رگ وپے میں اتر گیا۔ امت واحدہ پارہ پارہ ہو کے اجڑ، بکھر گئی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

خرافات میں الجھ، کھو گئی۔

اندریں عالم کہ میر دہر نفس
دخترت را ایں دو محرم بود و بس

اس دنیا میں کہ وہ لحہ بہ لحہ مر رہی ہے۔ تیری بیٹی کے لیے یہی دو چیزیں محرم تھیں ورنہ تو، تو میرے اس راز سے خبر رکھتی ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں کسی نامحرم کو نہیں دیکھا۔

وقت رخصت با تو دارم ایں سخن
تیغ و قرآں را جدا از من مہ کن

لہٰذا مرتے دم کہہ رہی ہوں کہ تلوار اور قرآن کریم کو مجھ سے جدا نہ کرنا۔

دل بہ آں حرفے کہ می گویم بنہ
قبر من بے گنبد و قندیل بہ

میں جو بات کہہ رہی ہوں اس پہ دل سے توجہ دے۔ میری قبر گنبد اور قندیل کے بغیر اچھی ہے

مومناں را تیغ با قرآں بس است
تربت مارا ہم ایں ساماں بس است

مومنوں کے لئے تلوار اور قرآن کریم کافی ہے۔ سو میری قبر کے لئے یہی سامان کافی ہے۔ اسے میرے سرہانے میرے ساتھ رکھ دینا

عمر ہا در زیر ایں زرّیں قباب
بر مزا رش بود شمشیر و کتاب

اس زرّیں قبے (آسمان) کے نیچے برسوں اس (شرف النسا) کے مزار پر تلوار اور قرآن پاک رکھے رہے

مرقدش اندر جہان بے ثبات
اہل حق را داد پیغام حیات

اس جہان فانی میں اس کی قبر نے اہل حق کو زندگی کا پیغام دیا

تا مسلماں کرد با خود آں چہ کرد
گردش دوراں بسا طش در نورد

تا آں کہ مسلمان نے خود اپنے آپ سے کیا جو کچھ بھی کیا۔ نتیجہ یہ کہ زمانے کی گردش نے مسلمانوں کی بساط الٹ کے رکھ دی کہ انہوں نے قرآن کریم اور تلوار کے باہمی ربط و تعلق کو نہ سمجھا بلکہ بے گانگی اختیار کی اور ذلت و رسوائیوں کی گھاٹی میں جا گرے چناں چہ دین کے رہے نہ دنیا کے

مرد حق از غیر حق اندیشہ کرد
شیر مولا روبہی را پیشہ کرد

تامل یہ کہ اللہ تعالیٰ کے یہ بندے (مسلمان) غیر اللہ سے ڈرنے لگے۔ شیر نے لومڑی کا پیشہ اختیار کرلیا۔ بہادری کو چھوڑ کر بزدل ہوگیا

از دلش تاب و تب سیماب رفت
خود بہ دانی آں چہ بر پنجاب رفت

مسلمان کے دل سے عشق کی آب و تاب پارے کی مانند تڑپ کر چلی گئی۔ تو اے زندہ رود (اقبال) خود جانتا ہے جو کچھ پنجاب پر گزری (سکھوں کے عہد میں)

خالصہ ر اشمشیر و قرآں را بہ برد
اندر آں کشور مسلمانی بہ مرد

سکھوں نے وہ قرآن کریم اور وہ تلوار جو مقبرہ شرف النسا بی بی پہ رکھی تھیں، اٹھالے گئے جس کے نتیجے میں مسلمانی (اسلامی غیرت) مرگئی کہ مسلمان پہلے ہی قرآن کریم اور تلوار کو چھوڑ بیٹھے تھے اور طاؤس و رباب کے ہوگئے۔ فارسی مثنوی، جاوید نامہ (باب، آں سوئے افلاک) کے یہ چوبیس اشعار محترمہ شرف النسا مرحومہ کا بھرپور تعارف اور خراج تحسین ہیں جو شاعر مشرق نے شرف النسا بی بی کو پیش کیے۔ اس حوالہ سے علامہ اقبال ایک واقعہ یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ پنجاب کے ایک شاعر وحید خان نامی تھے جن کے آباؤ اجداد افغانستان سے آکر پنجاب میں بس گئے تھے۔ وحید خان کہیں ایک ہندو جوگی رگ ناتھ داس کے بتھے چڑھ گئے جس نے وحید خان کو ہندو تصوّف کی چاٹ لگادی یوں عرصہ گزر گیا وحید خان عملی زندگی چھوڑ کے جوگی بن بیٹھے آخر انہیں ہوش آیا اور وہ ہندو تصوّف کے دھوکے سے آگاہ ہوئے تو یوں حقیقت کا اظہار کیا۔

تھے ہم پوت پٹھان کے دل کے دل دیں موڑ
چرن پڑے رگ ناتھ کے سکیں نہ تنکا توڑ

لیکن وحید خان عمر گنوا بیٹھے تھے۔ ایک روز شاعر مشرق کی کوٹھی پہ علماء و ادبا حاضر تھے۔ علامہ اقبال نے تمام صاحبان علم سے استفسار کیا کہ بتایئے کائنات کی مظلوم ترین ہستی کون ہے؟ سبھی حاضرین نے آپس میں مشورہ کر کے متفقہ جواب دیا کہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ۔ علامہ فرمانے لگے کہ ''میرے نزدیک کائنات کی مظلوم ترین ہستی قرآن حکیم ہے کہ ہم نے اسے صرف اور صرف مذہبی کتاب سمجھ کر جھاڑ پھونک اور عملیات کی پوتھی قرار دے دیا ہے''۔ علامہ مرحوم اشک بار تھے۔

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارک قرآں ہو کر

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

سورج سوا نیزے پر تھا۔

شمالی ہندوستان کی ریاست پنجاب کے علاقہ 'ترن تارن' میں لو کے تھپیڑے تن من جھلسا رہے تھے۔ آبادی کی اکثریت اپنے کام نمٹائے قیلولہ کے لیے گھروں میں چلی گئی لیکن اکّا دکّا مقامات پر چند ایک افراد اب بھی اپنے غم روزگار میں الجھے ہوئے تھے۔

نظام بھی شدید گرمی میں پسینے سے شرابور تھا لیکن زبان سے بے صبری کے کلمات ادا کرنے کا یارا خود میں نہ

باغی

زویا اعجاز

اس دنیا میں روز اوّل سے یہی ہوتا آیا ہے کہ شورہ پشت، کمزوروں کو غلام بنانا شروع کردیتے ہیں۔ ہر طرف ظلم و جور کا بازار گرم کر دیتے ہیں۔ یہ بات بھی اظہر من الشمس ہے کہ اس دور میں کہیں نہ کہیں سے، کوئی نہ کوئی دبا کچلا فرد اعلان بغاوت کردیتا ہے اور تب اہل قوت اسے مجرم مشہور کر کے اس کی گردن زدنی کا مطالبہ شروع کردیتے ہیں۔ پنجاب کی سرزمین پر بھی ایسے کئی کمزور پیدا ہوئے جنہوں نے زور آوروں کا ناطقہ بند کردیا تھا۔ ایسے ہی ناموں میں سے دو نام۔

وہ دولت مندوں کے لیے عذاب تھے اور غرباء کے لیے مسیحا

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

Downloaded From Paksociety.com

پاتا۔اس کے والد کا حال تو اس سے بھی برا تھا مگر لوہا کوٹتے ہاتھ بغیر رکے چلتے گئے۔حدت سے چہرہ لہو رنگ ہونے لگا اور لوہا موم کی طرح اس کی جنبش دست پر تھرکنے لگا۔

''اذان کا وقت ہونے والا ہے ابا جان!'' نظام نے دبے لفظوں میں اسے دو پل سانس لینے کے لیے آمادہ کرنا چاہا۔

''ہاں مجھے معلوم ہے۔بس تھوڑی دیر اور۔تم سمیٹنا شروع کرو سب۔''

پندرہ سالہ نظام آسودگی سے اردگرد بکھرے اوزار سمیٹنے میں مصروف ہوگیا۔چند لمحوں ...بعد وہ اپنے شرابور جسم صافی سے پونچھ کر گھر جانے کے لیے تیار تھے۔

''اس مرتبہ ہتھیار کچھ زیادہ ہی بنوائے ہیں گوروں نے۔'' نظام نے چلتے چلتے والد سے استفسار کیا۔

''میں بھی اسی نکتہ پر سوچ رہا ہوں۔ان کے پاس گولہ بارود بھی خاصا موجود ہوتا ہے پھر بھی ان کی ہڑک ختم ہی نہیں ہوتی۔''

''علاقے میں ان کا گشت بھی کافی بڑھ گیا ہے۔'' نظام تاگواری سے بولا۔

''بادشاہ نے بہت سر چڑھا لیا ہے ان کو.....تجارت کے لیے آئے تھے لیکن اب یوں دندناتے پھرتے ہیں جیسے ان کا اپنا ملک ہے یہ۔مجھے تو خدشہ ہے کہ یہ وہی مقولہ درست ثابت نہ کردیں۔''

''کون سا مقولہ ابا جان!''

''آگ لینے آئی اور گھر والی بن بیٹھی.....اجنبیوں کو اتنی ڈھیل دینی مناسب نہیں ہوتی.....مگر خیر! ہم تو شاہی حکم کے پابند ہیں،حکم حاکم مرگ مفاجات۔جس مغل خاندان کے گھوڑوں کی ٹاپ سے دنیا لرزتی تھی' آج وہ اس قدر کمزور ہو چلے ہیں کہ اپنی حفاظت ایک غیر قوم کے سپرد کردی ہے۔''

نظام خاموشی سے ان باتوں پر غور کرتا چلتا رہا۔گھر پہنچ کر دونوں باپ بیٹے نے نہا دھو کر نماز ادا کی اور کھانے کے بعد قیلولہ کی غرض سے لیٹ گئے۔نیند اس کی آنکھوں سے فی الوقت دور تھی۔ذہن میں صرف گورے فوجی اور ان کی سرگرمیاں تھیں۔

ہندوستان کے طول وعرض میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارتی سرگرمیوں کے بعد اب شاہی حکم نامہ کی مدد سے تجارتی کوٹھیاں اور اسلحہ کا ذخیرہ بڑھنے لگا تھا۔نظام کا خاندان پشتوں سے حداد تھا۔لوہے کو اپنی مطلوبہ اشکال میں ڈھالتے ان کی سوچ' ارادوں اور فطرت میں بھی چٹانی سختی در آئی تھی۔وہ جھکنا جانتے تھے نہ ڈرنا۔اس کے آباؤ اجداد مغلیہ حکومت کی شان وشوکت کے چشم دید گواہ تھے۔اور اب انگریز کسی دیمک کی طرح شاہی اقتدار کھوکھلا کرنے لگے۔وہ آتشیں ہتھیاروں کی موجودگی کے باوجود مقامی ہتھیار بھی بنواتے رہتے۔

1850 کی اس گرم دوپہر میں پنپنے والے وہ خدشات سات سال کے قلیل عرصے میں مجسم روپ اختیار کر گئے۔

☆☆☆

مغلیہ حکومت کے اقتدار کا ٹمٹماتا چراغ بالآخر 1857 میں گل ہوگیا۔ایسٹ انڈیا کمپنی شاہی دربار پر قابض ہوکر تحلیل ہوگئی اور ہندوستان ملکہ کے احکامات کا پابند ہوا۔بائیس سالہ نظام لوہار کے لیے وہ وقت بہت کربناک تھا۔مرکز میں ہونے والی قتل و غارت اور بربریت کی خبریں 'ترن تارن' تک اپنے اصل سے کہیں زیادہ شدت سے پہنچتیں۔26 مغلیہ شہزادوں کے سر قلم کرنے کے بعد چوراہوں پر لٹکائے جانے اور خواتین کی بے سروسامانی کے عالم میں گھر بار چھوڑنے کی اندوہناک خبریں اس کے دل میں ایک شمع روشن کرنے لگیں۔زندگی کی نوید پا کر فرار میں کامیاب ہونے والے شہزادے کوڑھی' فقیر اور درویشوں کے روپ میں جینے پر مجبور تھے۔

دہلی حکومت تو چند ننگ وطن افراد کی غداری اور بے حمیتی کے بعد نابود ہوگئی لیکن نظام لوہار جیسے سینکڑوں نوجوانوں کے دلوں میں ایک اضطراب پیدا کر گئی۔ایک متعصب اور غاصب قوم کی غلامی ان کے لہو میں شرارے دوڑا دیتی۔ان کا مقامی لوگوں سے برتاؤ بغاوت کا محرک بننے لگا۔ایسے ہی ایک انگریز فوجی کے رویہ نے اسے بھی بقاء کے طویل وپر پیچ رستہ کی مسافت کا پروانہ تھما دیا۔

بڑھاپے کے باعث باپ کے اعصاب میں اب پہلے جیسا دم خم باقی نہ رہا تھا۔نظام اب اکیلا ہی بھٹی پر جایا کرتا۔لوہا کوٹتے ہاتھ پردہ تصور میں انگریزوں کی بھی ایسی ہی درگت بنانے کے لیے بے چین رہتے۔

''بند کرو یہ شور شرابہ! کیا تمہیں نظر نہیں آتا افسر لوگوں کی آمد کا وقت ہے یہاں؟'' ایک کرخت صورت برطانوی فوجی خشونت زدہ انداز میں بولا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''میرا تو کام ہی یہی شور شرابہ ہے.....افسروں کی سماعت اتنی نازک ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں؟'' وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر کہنے لگا۔

''غلام اپنے آقا کو اپنی کھال کی جوتیاں بھی پہنا دے تو حق غلامی ادا نہیں ہو پاتا.....تمہاری یہ معمولی سی بھتی تو کسی شمار میں ہی نہیں۔''

''میں کسی کا غلام نہیں ہوں.....دھوکا دف دہی سے حاصل کی گئی حکومت موم کے گودے پر ہوتی ہیں۔ ذرا سی تپش ملی تو پگھل جائیں گے۔''

''تم ہی نہیں.....تمہاری آیندہ آنے والی ہر نسل اب ہماری غلام ہے.....اس حقیقت کو تسلیم کر لو۔'' فوجی نے دانستہ طنزیہ اور سلگا دینے والی مسکراہٹ بکھیری۔

''اچھے خواب ہیں.....دیکھتے رہو.....میری قوم کبھی تمہاری حکمرانی تسلیم نہیں کرے گی۔'' نظام نے مٹھیاں بھینچ لیں۔

''تمہاری قوم کے ضمیر سلانے کا منتر بھی ہمیں خوب آتا ہے۔ دولت کی چھنکار اور زمین کی ہوس انہیں اپنے ہی ہم وطنوں کے گلے کاٹنے پر بھی آمادہ کر لے گی۔ برطانیہ میں اس ملک کو 'سونے کی چڑیا' کہا جاتا تھا لیکن اب بے ضمیری کی مناسبت سے بھی یاد رکھا جائے گا۔''

نظام لوہار کی سماعت اب مزید زہر افشانی کی تاب نہیں لا سکتی تھی۔ اس نے غصہ اور طیش سے کھولتے دماغ کے زیر اثر اسے ایک زوردار گھونسا رسید کر دیا۔ اور چند ہی لمحوں بعد وہ برطانوی اہلکاروں کی حراست میں تھا۔

☆☆☆

قید میں آنے کے باوجود اس کے دل و دماغ پر لگے چرکے بہت اذیت دے رہے تھے۔ اس کی کوٹھری میں دو قدرے عمر رسیدہ افراد بھی موجود تھے جو گاہے بگاہے دزدیدہ نظروں سے اس کے تیور بھانپ کر زیر لب مسکرانے لگتے۔

''اپنی اس تپش کو دشمن کے خلاف ہتھیار بنا لو جوان! ورنہ یہ تمہیں جلا کر خاکستر کر دے گی۔'' گندمی رنگت دراز قد اور بھاری بھرکم جسامت والے شخص نے اس کے قریب آ کر سرگوشی میں کہا۔ ''میری مانو تو اس فوجی سے معذرت کر کے معاملہ رفع دفع کرو۔ تمہارے سامنے ایک طویل مسافت ہے۔ اس وقت ان 'سفید چوہوں' سے حساب چکتا کر لینا۔''

''میں چاہ کر بھی اس کی ہرزہ سرائی برداشت نہیں کر سکتا۔'' نظام پھنکارا۔ ''تم معذرت کی بات کرتے ہو بھائیا جی!''

''کچھ پانے کے لیے اک ذرا سا نقصان برداشت کر لینے میں کوئی حرج نہیں جوان!'' اس نے نظام کے ہاتھ تھپکے۔

اگلے چند گھنٹوں میں وہ ان کی بابت مکمل آگاہی حاصل کر چکا تھا۔ وہ تحریک آزادی کے بے بس پنچھی ہوئے مہرے تھے جو کوشش کے باوجود اپنے وطن کو غلامی کی بیڑیوں سے بچا نہ پائے اور اب وہ از سر نو حکمت عملی مرتب کر کے پُرجوش اور مخلص جوانوں کی مدد سے ایک نئی تحریک کا آغاز کرنا چاہتے تھے۔

نظام نے ان کی پیشکش پر رضامندی ظاہر کر دی۔ ایک جبری معذرت کے بعد اسے رہائی مل گئی اور ایک نیا عزم لیے وہ اپنے گھر لوٹ آیا۔ رہائی کے بعد اس نے نچلی سطح پر پوشیدہ رہتے ہوئے انگریز سرکار کے خلاف کارروائیوں کا آغاز کر دیا۔ کچھ ماہ بعد اس کے والد کی وفات ہو گئی۔ گھر میں اب بوڑھی ماں اور جوان بہن کے سوا کوئی نہ تھا۔ ان خواتین کی حفاظت اور تنہائی کے خیال نے اک لمحہ کے لیے اس کے ارادوں میں لغزش پیدا کی لیکن والدہ کے بھرپور حوصلہ اور اخلاقی سہارے نے اسے ایک بار پھر مہمیز کر دیا۔ روپوش رہتے ہوئے وہ بہت کامیابی سے اپنے مقاصد میں کامیابیاں سمیٹتا رہا۔ تنظیم کے لیے اس کے بنائے گئے ہتھیار بھی بہت سودمند ثابت ہو رہے تھے۔

انگریز قانون کے خلاف اس کی سرگرمیاں فرنگیوں میں کھلبلی مچانے لگیں۔ ان کا چوکنا دماغ کچھ اشارات کے باعث اپنے اصل مجرم تک پہنچ چکا تھا لیکن مناسب ثبوت نہ ہونے کی بدولت وہ کوئی بھی قدم اٹھانے سے قاصر تھے۔ نظام کی پشت پناہی کرنے والے افراد نے بھی اس بار بہت ہوشیاری سے یہ بساط بچھائی تھی۔ ان کی تنظیم کے ارکان چونکہ ایک دوسرے کی شناخت اور محل وقوع سے نا آشنا ہوتے۔ اس لیے برطانوی پولیس کے دست برد سے محفوظ تھے۔

وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ نظام لوہار پر شکوک بڑھتے گئے۔ اس کے بنائے ہتھیاروں کی ساخت سے وہ پہلے ہی واقف تھے اس لیے ایک مکمل سازش تیار کر کے وہ اس کے گھر پہنچ گئے۔ افسران نے ماضی قریب میں بنوایا دیسی اسلحہ اس چھاپے کے دوران گھر کے تہہ خانے میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

پہنچا کر برآمدگی کا کامیاب ناٹک رچایا۔خواتین کو رسن بستہ کرنے کے بعد ان کے رہنما 'کیپٹن کول' نے نظام لوہار کی جواں سالہ بہن کی آبروریزی اس کی بے بس اور لاچار ماں کے سامنے کی۔وہ بوڑھی عورت ان انسانیت سوز مناظر کی تاب کیونکر لا پاتی؟ شدید صدمے اور کرب سے اس کی دھڑکنیں ساکت ہوگئیں۔فرنگی راج کے خلاف نظام لوہار کی نفرت میں مزید اضافہ ہوگیا۔

☆☆☆

''کیا بات ہے نظامے؟ کس پریشانی میں الجھے ہو دوست؟'' ایک فکرمند آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

''میری سوچیں تو جامد ہوگئی ہیں شفیع! سمجھ ہی نہیں آتی کہ کیا کروں' کیا نہ کروں؟'' اس نے پریشانی کے عالم میں اپنے بال نوچ لیے۔شفیع سے اس کی دوستی بہت پرانی تھی۔ وہ سیدھا سادا سانو جوان تھا جو تحریک میں نظام کی شمولیت و کردار سے بھی واقف تھا۔

''اس حادثے کا ہم سبھی کو بہت افسوس ہے۔ماں جی کی موت اور اس بے گناہ کی آبروریزی ہم سب کے سینوں میں الاؤ کی طرح دہک رہی ہے۔'' شفیع نے دلگیر لہجہ میں کہا۔

''مگر میں اسی الاؤ میں ان متکبر و غاصب فرنگیوں کو بھسم کر دینا چاہتا ہوں۔میں اس بلی چوہے کے کھیل سے تنگ آچکا ہوں۔اب کھلے عام جنگ ہوگی۔میں ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے انہیں موت کے منہ میں پہنچاؤں گا۔''

''لیکن نظامے!! اس اکیلی جان کا کیا ہوگا؟'' شفیع نے دبے لفظوں میں اس کی تنہا بہن کی بابت یاد دہانی کروائی۔

''میری ایک التجا مانو گے دوست؟'' وہ یکدم اس کا ہاتھ تھامے بولا۔

''تیرے لیے تو جان بھی حاضر ہے.....التجا کیسی؟ حکم کرو تم۔'' شفیع نے خلوص سے کہا۔

''اس مظلوم سے شادی کر کے ایک سائبان عطا کر دے.....میری زندگی اب صحرا کے کسی بگولے کی مانند گذرے گی۔میں جب تک ان غاصبین کو جہنم رسید نہ کردوں' سکون سے مر بھی نہ پاؤں گا۔بہن کی حفاظت سے بے فکر ہو کے میں ایک نئی مسافت اختیار کرنا چاہتا ہوں۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔

''لیکن میں یہ سب کیسے کر سکتا ہوں؟'' شفیع بوکھلا گیا۔

''کیا تم اس کا داغی وجود قبول کرنے سے ہراساں ہو؟'' وہ دکھ سے بولا۔

''نہیں! بخدا نہیں! یہ داغ میری نظر میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے اور نہ ہی اس کی حیاء پر کوئی شبہ ہے.....میں یہ چاہتا ہوں کہ تم اس کی رضامندی پہلے حاصل کرو۔شادی بیاہ زبردستی کا سودا تو نہیں۔''

نظام نے اس کی بات تسلیم کر لی اور اگلے ہی روز بہن کی رضامندی کے بعد شفیع سے اس کا نکاح پڑھوا دیا۔

اپنی زندگی کے اس واحد رشتے کی حفاظت کا بندوبست ..... ہوتے ہی وہ علی الاعلان حکومتی اہلکاروں پر ایک بلائے ناگہانی بن کر ٹوٹ پڑا۔اگلی رات اس نے تھانے پر بھرپور حملہ کیا اور اپنے خاندان کی تباہی کے مرکزی کردار 'کیپٹن کول' کو دردناک موت کے حوالے کر دیا۔

اس قتل کے بعد نظام نے وقتی روپوشی اختیار کر لی۔افسران اسی زعم میں تھے کہ اب وہ ان کی دہشت سے ایک طویل مدت تک منظر عام پر نہیں آئے گا لیکن یہ ان کی خام خیالی ثابت ہوئی۔نظام لوہار نے دوبدو جنگ کا طبل بجا دیا تھا اور جنگوں میں فتح یاب وہی ہوتے ہیں جو موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر للکارنے کی ہمت رکھتے ہیں۔

چند روز بعد اس نے اپنے دوسرے مجرم 'ایس. پی رونلڈ' کو بھی راہی عدم کر دیا۔نظام ترن تارن کے ایک گمنام لوہار سے امرتسر کے لوگوں کا 'ہیرو' بن گیا۔امرتسر کے طول و عرض میں اس کی بہادری کے قصے زبان زدعام ہوتے ہی وہ ہزاروں دلوں میں دھڑکن کی طرح سما گیا تھا۔

انگریز سرکار غیظ و غضب کے عالم میں نظام کی گرفتاری کے لیے سر جوڑے بیٹھ گئی۔

☆☆☆

امرتسر کے ایک نواحی گاؤں میں ڈھول کی تھاپ اپنے جوبن پر تھی۔ایک دبلا پتلا' چاق و چوبند درمیانی عمر کا شخص ہاتھ میں جھانجھ تھامے علاقے کے رہائشیوں کی توجہ کا مرکز تھا۔اس کی پاٹ دار آواز اس جھانجھ کے صوتی تاثر سے ہم آہنگی لیے گلی کوچوں میں کسی سرسراہٹ کی مانند پھیلنے لگی۔

''سرکار نے فیصلہ کیا ہے کہ نظام لوہار کی مخبری کرنے والے کو مربع زمین اور نقد رقم ادا کی جائے گی۔گاؤں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

والو! اس مفرور قاتل کی گرفتاری میں معاون بنو اور انگریز بہادر کی کرم نوازی کے حقدار بن جاؤ۔''

جوش و خروش سے اعلان کرتا یہ ایلچی مقامی لوگوں کے چہروں اور آنکھوں میں مدو جزر کی کیفیت سے بھی آگاہ تھا۔ معنی خیز نظروں سے انہیں دیکھتا ہوا وہ مختلف علاقوں میں گشت کرتا رہا۔ اپنی اس کارکردگی اور عوام کی تاثراتی کیفیت اس نے من و عن افسران کے گوش گزار کردی۔ جو اپنے اس نئے چارہ کی کامیابی پر مکمل پُرامید تھے۔ ایلچی آئندہ چند روز اس اعلان کو جاری رکھنے کی ہدایات لیے لوٹ آیا۔

اگلے روز بھی امرتسر کے گلی کوچوں میں وہی منظر اور صدائیں تھیں۔ لیکن تغیر کی نامحسوس لہر اسے کسی انہونی کا احساس دلانے لگی۔ اردگرد گزرتے لوگوں کی مسکراہٹ میں طنز اور تمسخر کی کیفیات واضح تھیں۔ وہ ایلچی کو دیکھنے کے بعد جتاتی ہوئی نظروں سے دیوار پر نظر دوڑاتے اور آگے بڑھ جاتے۔ ایلچی نے فوری طور پر ان کی نظروں کا ماخذ تلاش کیا تو اس کے قدموں تلے سے زمین کھسک گئی۔

آس پاس دیواروں پر حکومت کی جانب سے انعامی اشتہاروں کی عبارت کا متن تبدیل ہو چکا تھا۔ رات کے اندھیرے میں کسی نے اعلان عام کی تحریر میں تبدیلی کردی تھی اور اب وہ عبارت ایک سنگین دھمکی میں ڈھل گئی۔ اپنی مہم منسوخ کیے وہ پہلی فرصت میں اس حادثہ کی اطلاع اپنے آقاؤں کو دینے کے لیے روانہ ہوگیا۔

''کیا تم نشے میں تو نہیں ہو؟ یہ کیا بے ہودہ مذاق ہے؟'' ایک پولیس اہلکار نے دھاڑ کر کہا۔

''نن..... نہیں جناب! میں بالکل ہوش و حواس میں ہوں۔ آپ کے فراہم کردہ کاغذی اشتہارات اپنا متن کھو چکے ہیں۔'' وہ منمنایا۔

''ایسا کیسے ممکن ہے یوفول!''

''مم..... مجھے کیا علم..... مگر وہاں واضح طور پر ایک ہی بات لکھی ہے کہ نظام لوہار کی مخبری کرنے والے شخص کا گھر نذر آتش کردیا جائے گا۔ اسے روئے ارض میں کہیں پناہ نہیں ملے گی۔'' اس کی لرزتی آواز نے وہاں موجود افسران کے چہرے متغیر کردیئے۔

''احمق لوگ..... اپنی اسی جہالت اور جذباتیت کی وجہ سے آج ان حالات کا شکار ہیں۔ سسٹم کو مات دینے کی خوش فہمی میں بے موت مارے جائیں گے۔'' شیفرڈ نامی ایک افسر تنفر سے بولا۔ لیکن اس کے لہجے میں پنہاں خوف

رحمان کی صفت

حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ حضور پُرنورؐ نے ایک صاحب کو ایک مہم پر سردار بنا کر بھیجا اور اس پورے سفر کے دوران اس کا مستقل طریقہ یہ رہا کہ ہر نماز میں سورۃ اخلاص پر قرأت ختم کرتے تھے۔ واپسی پر ان کے ساتھیوں نے آپؐ سے اس کا ذکر فرمایا۔ آپؐ نے فرمایا ان سے پوچھو کہ وہ ایسا کیوں کرتے تھے۔ ان کے پوچھنے پر ان صاحب نے فرمایا کہ اس میں رحمان کی صفت بیان کی گئی ہے۔ اس لیے اس کا پڑھنا مجھے بہت محبوب ہے۔ حضور پُرنورؐ نے فرمایا ان کو خبر دے دو کہ اللہ تعالیٰ انہیں محبوب رکھتا ہے۔ (بخاری و مسلم)

مرسلہ: زینب زیدی۔ ساہیوال

بابر کی ماں تعلق نگار خانم

سلطنت مغلیہ کا بانی ظہیر الدین بابر اپنی ماں کا بڑا احترام کرتا تھا۔ وفات کے بعد بابر نے اپنی والدہ کو کابل کے ''باغ نوروز'' میں دفن کیا اور اس باغ کے مالک سے ایک ہزار مثقال میں زمین خریدی اور خود قبر میں اتر کر اپنی ماں کو سپرد خاک کیا اور جب تعلق نگار خانم کی والدہ یعنی بابر کی نانی شاہ بیگم اور تعلق نگار خانم کی بہن یعنی بابر کی خالہ مہر نگار تعزیت کے لیے آئیں تو بابر ماں کی یاد میں بہت پریشان تھا۔ اس بارے میں بابر تزک بابری صفحہ 6 پر خود لکھتا ہے کہ ان کے آنے سے سوگ تازہ ہوگیا۔ جدائی کی آگ بھڑک اٹھی۔ تعزیت کی رسمیں ادا کرنے کے بعد کھانا پکوا کر غرباء کو کھلایا، فاتحہ دلوائی، دل کو ذرا تسلی دی اور رنج رفع کیا۔ ظہیر الدین بابر اپنی والدہ کی طرح دیگر عزیز رشتے داروں کا بھی بڑا احترام کرتا تھا۔ ہندوستان میں جب اس کی حکومت قائم ہوئی تو اس نے اپنی دو پھوپیوں فخر جہاں بیگم اور خدیجہ بیگم کو خصوصی طور پر کابل سے بلوایا۔ ان کا زبردست استقبال کیا اور ہر طرح کی سہولیات بہم پہنچائیں۔ بعد ازاں فخر جہاں اور خورشید بیگم نے اپنے عزیز و اقارب کو بھی کابل سے بلوایا تو بابر نے ان کا بھی ویسا ہی خیر مقدم کیا۔ بابر اپنے رشتے داروں کی عزت و احترام میں بڑا اہتمام کرتا۔ ان کی قیام گاہوں کے لیے پُرتکلف سامان بہم پہنچاتا، مشکل وقت میں ان کی ہمدردی اور دلجوئی سے سکون حاصل کرتا اور بعض معاملات میں ان سے مشورے بھی لیتا۔

مرسلہ: اشفاق حسین، گجرات

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اور کھوکھلا پن خود اس سے بھی پوشیدہ نہ تھا۔

عین اسی وقت جب یہ افسران اس نئی صورتِ حال سے نمٹنے کی ترکیب تلاشنے میں مگن تھے' وہاں سے چند کوس دور نظام لوہار ان پر ایک اور کاری وار کرنے کے لیے مقامی تھانے میں موجود تھا جہاں ایک اور معتوب باغی 'سوجھا سنگھ' مقید تھا۔

سوجھا سنگھ بھی اس غیر ملکی تسلط کا مخالف تھا لیکن مناسب رہنمائی کی عدم موجودگی نے اسے تا حال اپنے دلی ارمان پورے کرنے سے محروم رکھا تھا۔ چھ فٹ سے نکلتا قد' مضبوط جسامت اور جارحانہ مزاج کے حامل سوجھا کی والدہ کے سوا اس دنیا میں کوئی قریبی رشتہ موجود نہ تھا۔

''اس مہربانی کی وجہ جان سکتا ہوں ویرے؟'' سوجھا سنگھ نے رہائی کے بعد نظام کے ایک مخصوص ٹھکانے پر پہنچ کر پوچھا۔

''ویر (بھائی) بھی کہہ رہا ہے اور وجہ بھی پوچھ رہا ہے؟'' نظام نے خلوص سے جواب دیا۔ ''یہ وطن ہمارا سانجھا ہے، تو اسے آزاد کروانے کی کوشش میں بھی سانجھ ہونی چاہیے ناں؟''

''ٹھیک کہہ رہے ہو ویرے! میں اپنے پنڈ (گاؤں) میں ان فرنگیوں کو دندناتے دیکھتا ہوں تو میرا دل مجھے ملامت کرتا ہے۔ میرے اندر سے آواز آتی ہے کہ سوجھے! یہ دھرتی تو تیری ماں سمان تھی، یہاں غیروں کا وجود کیوں؟ انہیں اپنے دیس کا رستہ دکھا ورنہ زخم زخم وجود لیے نابود ہو جا۔'' جوش سے اس کے حلق کی رگیں ابھر آئیں۔

''مجھے اپنے ساتھیوں میں یہی جذبہ درکار ہے میرے بھائی! اور اگر ہم اسی خلوص و جوش سے کام کرتے رہے تو وہ دن دور نہیں جب ان بے لگام انگریزوں کو ہم نکیل ڈال لیں گے۔''

''واہگرو کی جے..... میں تیرے ساتھ ہوں۔ یہی سپنا لیے تو میری آنکھوں سے نیند روٹھ چکی ہے۔ تو نے سوجھا سنگھ کو خرید لیا ہے نظام! اس رہائی کے بعد میری زندگی تیری مقروض رہے گی ہمیشہ۔''

اس روز کے بعد نظام لوہار اور سوجھا سنگھ میں گہرے روابط استوار ہونے لگے۔ درد مشترک انہیں بہت قریب لے آیا۔ ان میں کوئی سگا رشتہ نہ تھا' لیکن احساس اور حب الوطنی کے جذبے سے گندھے ضمیر نے برادرانہ محبت استوار کر دی۔ تحریک کے امور سے قطع نظر ذاتی زندگی کی قربت بھی بڑھنے لگی۔ سوجھا سنگھ ایک دن اسے اپنی ماں سے ملوانے لے آیا جس نے گرمجوشی سے اس کا استقبال کیا۔

''جیوندا (جیتا) رہ میرا پتر! سوجھا تو دن رات تیرا نام جپتا ہے۔ شیدائی ہو چکا ہے تیرا۔'' اونچی لمبی' تنے ہوئے جسم اور ایک باوقار شخصیت کی حامل خاتون نے بہت محبت سے اس کے سر پر دست شفقت پھیرا۔

اس کے وجود سے پھوٹتی مہک' لہجے کی چاشنی اور انداز کی حلاوت نے نظام کے تشنہ جذبات میں ایک مانوس ہلچل برپا کر دی اور اس کی آنکھوں میں نمی پیدا ہو گئی۔

''لے بھلا؟ روتا کیوں ہے جھلا کہیں کا..... تجھ جیسے شیر جوان آنسو بہاتے اچھے نہیں لگتے۔''

''میری مرحومہ ماں بھی مجھے انہی الفاظ و محبت سے ڈانٹتی تھی..... وہ بھی یونہی میرے صدقے واری جاتی تھی اپنی ماما کی مہک سے میری روح معطر کر دیتی تھی۔ آج ایک طویل عرصہ بعد مجھے وہی مہک آپ میں محسوس ہوئی ہے۔'' نظام آبدیدہ ہو گیا۔

''میں بھی تو تیری ماں ہی ہوں ناں جھلے! اور اس دھرتی کی ہر ماں کا ضمیر ایک سا ہی تو ہوتا ہے اور مجھے سوجھے کی طرح تو بھی اتنا ہی عزیز ہے، بس آج سے مجھے ماں ہی کہا کرنا، میں بھی بڑے مان سے بتاؤں گی سب کو کہ میرا ایک نہیں دو بیٹے ہیں۔''

نظام لوہار کا ان ماں بیٹے سے قلبی تعلق بہت مضبوط ہوتا چلا گیا۔ اس دبنگ عورت کے دل میں بھی برطانوی راج کے لیے بے حد نفر تھا۔ اس کے جذبات نظام اور سوجھا سنگھ کی قوت بن گئے۔ ایک اور ایک گیارہ کے مصداق وہ پوری ریاست کے انگریزوں کے ناک میں دم کیے رکھتے۔ جبر و استبداد کے خلاف ان کی کاوشیں کسی بھی ضرب المثل سے کم نہ تھیں۔

قدم ملتے گئے' قافلے بڑھتے گئے۔ ظلم و تعصب کی لہر چکی میں پسے سینکڑوں نوجوان دل میں آتش انتقام لیے ان کے ساتھ شامل ہونے لگے۔ کچھ عرصہ بعد ہی ان کے اس قافلہ میں ایک ایسے جوان کی آمد ہوئی جو انتہائی قلیل مدت میں نظام اور سوجھا سنگھ کا معتمد خاص بن گیا۔ یہ جوان رعنا بلھے شاہ کی نگری قصور کا رہائشی 'جبر و جٹ' تھا۔

جبر و کی شمولیت نے نظام اور سوجھا سنگھ کی تحریک میں ایک نئی روح پھونک دی اور جلد ہی یہ تگڈم حکومت کے لیے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ایک مستقل دردسر کی حیثیت اختیار کرگئی۔ جبرو کی فطرت میں بے خوفی کے ساتھ معاملہ فہمی کی صلاحیت بھی موجود تھی۔ وہ ساتھیوں کی جدوجہد سے مکمل مطمئن نہ تھا۔ اس کی خاموشی میں پوشیدہ اضطراب نظام نے فوری محسوس کرلیا۔

''تیرے ذہن میں کیا کھچڑی پک رہی ہے جبرو! تیری یہ خاموشی بے سبب نہیں لگتی مجھے۔''

''انگریز حکومت ایک تناور درخت کی صورت اختیار کرتی جارہی ہے نظام! ہماری لاکھ کوششوں کے باوجود وہ اپنے قدم مضبوطی سے جمانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔'' جبرو کی پیشانی پر تفکر کی پرچھائیاں واضح تھیں۔

''تو کیا کوئی حل ہے تمہارے پاس اس صورتِ حال سے نمٹنے کا؟'' نظام نے کریدا۔

''دیکھ بچن پیارے! درخت اکھاڑنے کے لیے اس کی جڑوں پر وار ضروری ہوتے ہیں جبکہ ہم چھوٹی موٹی شاخوں کی کٹائی میں الجھے رہتے ہیں۔ جڑ تو اب بھی جوں کی توں موجود ہے۔''

''سولہ آنے درست بات ہے۔'' نظام نے اپنی پیشانی مسلی۔ ''میں تیری رمز سمجھ گیا ہوں۔''

''اپنی اس تحریک کو وسعت دے بچناں! تیرے للکاروں سے ہزاروں لوگ اکٹھے ہوں گے۔ پانچ دریاؤں کی اس سرزمین کو انگریز حکومت کی قبر بنادیں گے ہم۔''

باہمی افہام وتفہیم کے بعد انھوں نے ایک تاریخی قدم اٹھایا اور اپنی جدوجہد کو ایک نئی سمت دے دی۔ ''پنجاب چھوڑ دو'' تحریک نے اپنے آغاز سے ہی مقامی برطانوی حکومت کی نیندیں اڑادیں۔

پنجاب بھر کے گبرو جوانوں کے علاوہ کن ٹٹے بدمعاش بھی جوق در جوق اس قافلے کا عملی حصہ بن گئے۔ وہ انتہائی منظم طریقے سے اپنے فرائض کی بہترین ادائیگی میں جت گئے۔ کئی سو انگریزوں کے قتل کے بعد ان کا مال اسباب لوٹ کر کچلے ہوئے عوام کے سپرد کر دیا جاتا۔ برطانوی راج اس قتل عام اور لوٹ مار سے کمزور ہونے لگا تو دوسری جانب غریب عوام وسائل کی دستیابی ملتے ہی اپنی محرومیوں کے ذمہ داران پر قہر بن کر ٹوٹ پڑتے۔ پنجاب ایک یقینی تبدیلی کی زد میں تھا۔

☆☆☆

فرنگی حکومت شدید ذہنی تناؤ کا شکار تھی۔

'پنجاب چھوڑ دو' تحریک نے حقیقتاً انہیں ناکوں چنے چبوا دیئے۔ بہترین افسران سے محرومی' مال ومتاع پر نظام لوہار کے ساتھیوں کا قبضہ اور عوام میں آگہی وشعور نے برطانوی راج کی بنیادیں ہلا دیں۔ وہ سر توڑ کوششوں کے باوجود اس تحریک کے کرتا دھرتاؤں اور مقاصد کا بال بھی بیکا نہ کرپائے۔ انتظامیہ کے بہترین افراد سر جوڑے اس مخدوش صورتِ حال کا باعزت حل تلاشنے میں کوشاں تھے۔ لالچ' خوف اور ضمیر کی خریداری کے تمام حربے ناکام ہو جانے کے بعد بالآخر انگریزوں کی طرف سے ایک اہم میٹنگ بلائی گئی جس میں ایک گھاگ اور عمر رسیدہ افسر نے ایک تجویز پیش کی۔ تجویز سن کر وہاں موجود سبھی لوگ بے اختیار پھڑک اٹھے۔

''شاندار آئیڈیا ہے مسٹر ہنری! تمہارے دماغ پر یقیناً لومی فر کا سایہ ہے۔ تم نے تو ہماری سب پریشانیاں ہی ختم کر دیں..... بریوو!'' اس میٹنگ کے سربراہ نے کھلے دل سے سراہا۔

''تھینک یو ویری مچ!! لیکن اس آئیڈیا کی کامیابی مکمل رازداری اور بہترین فرد کے انتخاب پر منحصر ہوگی۔ ذرا سی بے صبری اور بے احتیاطی کھیل بگاڑ دے گی۔'' ہنری نے متنبہ کیا۔

''ایسا بالکل بھی نہیں ہوگا..... شطرنج کی اس بازی میں ہم اپنے مہرے بہت سوچ سمجھ کر آگے بڑھائیں گے۔ یہ مقامی لوگ چاہے جتنی مرضی اچھل کود مچالیں' ہماری ذہانت اور بروقت چالوں کو کبھی نہیں سمجھ پائیں گے۔'' متوقع کامیابی کی ایک موہوم جھلک سے ان سبھی کا فطری تکبر فوری عود آیا تھا۔

''ساتھیو! آج کا یہ جام نظام لوہار اور اس کے گماشتوں کی یقینی تباہی کے نام!!'' ہنری نے بلوریں جام اٹھالیا۔

انگور کی بیٹی سے دل بہلاتے وہ اس نوخیز منصوبے کی جزئیات پر غور کرنے لگے۔

☆☆☆

وہ ایک انتہائی خوبصورت لڑکی تھی۔ غربت اور کسمپرسی میں پروان چڑھنے کے باعث اخلاقیات کا درس تو جانے کب کا فراموش کر چکی تھی۔ فطرتاً بے باک اور خود پسند بھی تھی اور حسن جب بے باک ہو جائے تو اس کی ہلاکت خیزی ایک طوفان بن جایا کرتا ہے۔

وہ علاقے کے ماچھی (ایک ذیلی ذات جو تندور پر

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

روٹیاں لگانے کے لیے مامور ہوتے ہیں) کی بیٹی تھی اور اپنے اس آبائی کام میں خود بھی خاصی ماہر تھی۔ جاڑے کی ایک کہر آلود صبح اسے گوراصاحب کی جانب سے جب تھانے میں طلب کیا گیا تو وہ کسی بھی گھبراہٹ میں مبتلا نہ ہوئی۔ اس کی خوبصورتی اور دلکشی سے کئی ایک نچلے درجے کے اہلکار مستفید ہوتے رہتے تھے۔ اس لیے وہ انتہائی اعتماد اور پُرسکون انداز میں تن تنہا تھانے جا پہنچی۔

ایک سنتری اسے خاموشی اور احتیاط سے اندرونی کمرے میں لے گیا جہاں ایک عمر رسیدہ افسر پہلے ہی موجود تھا۔

''مجھے کس لیے بلایا ہے صاحب؟'' وہ اپنی آنکھیں مٹکاتی ہوئی بے باکی سے بولی۔

''نام کیا ہے تمھارا؟'' ہنری نے اس کا سراپا گہری نظروں سے ٹٹولتے ہوئے پوچھا۔ کسے ہوئے جسم، دلکش جسمانی خطوط اور صنف مخالف کو اپنے ناز و انداز سے ڈھیر کر دینے کے اعتماد کی مخصوص چمک دیکھ کر وہ اس انتخاب کو پہلی ہی نظر میں پسندیدگی کی سند دے چکا تھا۔

''میرا نام تو سیتا بھی ہے، سُشلی بھی اور روزی بھی۔ نام میں کیا رکھا ہے صاحب! آپ یہ بتاؤ کہ کام کیا ہے؟'' وہ اپنے پراندے کو ایک ادا سے جھٹک کر بولی۔

''تمھارا مذہب؟'' ہنری نے وہی سوال ایک نئے زاویے سے پوچھا۔

''دولت میرا مذہب ہے صاحب! ڈھیر سارا پیسا اور عیش بھری زندگی میری زندگی کا مقصد ہیں بس۔''

''بہت خوب بہت خوب۔ واقعی نگینہ ہو تم برطانوی سرکار نے تمھیں ایک خصوصی ذمہ داری سونپنے کا فیصلہ کیا ہے انکار کی کوئی گنجائش نہیں۔''

''زہے نصیب سرکار! میری کیا مجال کہ میں انکار کروں، آپ کام بتائیے کسے شکار کر کے آپ کے قدموں میں ڈھیر کرنا ہے؟''

''وہ بھی بتا دوں گا۔ پہلے تمھارا ایک 'ٹرائل' تو لے لوں۔'' اس کی آنکھوں میں بوڑھے گدھ کی سی چمک تھی۔

''مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے بھلا؟ جیسے سرکار کی مرضی۔'' وہ ہنری کا مطمع نظر بھانپ کر ایک توبہ شکن انگڑائی لے کر بولی۔

☆☆☆

سوجھا سنگھ کسلمندی سے اپنے ڈیرے پر موجود چارپائی پر دھوپ میں لیٹا جسم سینک رہا تھا۔ اس کے ذہن میں گذشتہ شب کی کامیاب مہم کا سرور چھایا تھا۔ قریبی گاؤں میں دو انگریز افسران کے قتل کے بعد مال و متاع وہاں کے غرباء میں تقسیم کرنے کے بعد وہ حسب روایت اپنے دیگر ساتھیوں سے الگ ہو کر اپنے اس مخصوص ڈیرہ پر آ چکا تھا۔ ایک آسودہ انگڑائی لیے وہ اگلی مہم کے بارے میں سوچنے لگا جب بیرونی چوبی دروازے پر ہلکی سی دستک نے اسے چونکا دیا۔ اس دستک کا انداز اجنبی ضرور تھا لیکن اس کے تجربہ کے مطابق وہاں کسی صنف نازک کی آمد ہوئی تھی۔ تجسس و اشتیاق کی ملی جلی کیفیت میں اس نے دروازہ کھول دیا۔

''ست سری اکال سوجھا جی!'' دلکش مترنم آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ اس کے ہاتھوں میں روٹیوں کا ایک چھابہ اور سالن کا کٹورا تھا جس کی اشتہا انگیز مہک نے اس کی بھوک مزید بڑھا دی۔

''کون ہو بھئی تم؟ اور یہاں کس مقصد سے آئی ہو؟'' وہ کڑے تیوروں سے بولا۔

''میں اس علاقے کی ماچھن ہوں جی! آپ کے لیے کھانا لائی ہوں۔'' اس کی نظروں میں وارفتگی کی کیفیت سوجھا سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔

''کس کے کہنے پر لائی ہو یہ؟ میں نے تو طلب نہیں کیا؟'' وہ قدرے مشکوک ہوا۔

''میرے باپو نے بھیجا ہے جی! وہ آپ کی بہادری کا بہت مرید ہے۔'' اس نے فوری بات بنائی۔ ''ہم غریبوں کی جانب سے ایک بھینٹ سمجھ لیں۔ آپ کو گرو کی سوگند۔''

''اچھا! اچھا! ٹھیک ہے۔ لاؤ مجھے پکڑاؤ یہ برتن اور اپنی شکل گم کرو۔''

''دھنے واد سوجھا جی!'' اس نے برتن تھماتے ہوئے اپنے لمس کی حرارت بھی اسے منتقل کر دی۔ سوجھا سنگھ کے بدن میں پھریری دوڑ گئی۔

''میں کل پھر کھانا لے کر آؤں گی جی! اور یہ برتن بھی لے جاؤں گی۔'' سوجھے نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ہنری کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق وہ نہایت صبر و سکون سے اپنے پتے کھیل رہی تھی۔ عجلت ان کا بنا بنایا کھیل بگاڑ سکتی تھی۔ انھوں نے دانستہ طور پر سوجھا کا انتخاب کیا تھا کیونکہ اس کا ڈیرہ نظروں میں آ چکا تھا لیکن مقامی

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

آبادی کی سابقہ دھمکیوں کے پیشِ نظر وہ اس پر براہِ راست ہاتھ نہیں ڈال سکتے تھے۔

اب اتفاق ایسا ہوا کہ اگلے چند روز سوجھا سنگھ کو کوئی بھی مہم درپیش نہ آئی۔ کھانا پہنچانے کے بہانے میٹھی میٹھی نظروں کا تبادلہ اور آنکھ مچولی بھی جاری رہی۔ تبھی ایک دن سوجھا نے اسے پہلی بار اندر آنے کی دعوت دی۔

''میں دو روز کے لیے کہیں جا رہا ہوں۔ اس لیے کھانا مت لایا کرنا۔''

''کیا ہم سے کوئی غلطی کوتاہی ہوگئی سرکار؟'' اس نے معصومیت سے آنکھیں پٹپٹائیں۔

''او نہیں جھلی! میں کسی کام سے جا رہا ہوں۔'' وہ ہنسا۔ ''ویسے تو نے کبھی بتایا نہیں کہ تیرا نام کیا ہے؟''

''آپ نے کبھی پوچھا بھی تو نہیں؟'' وہ ناز دکھاتے ہوئے بولی۔ ''میں تو آپ کی داسی ہوں جی! آپ جو چاہے نام دے لیں..... میں اسی کو اپنی شناخت بنالوں گی۔''

''تیری سندرتا دیکھ کر تو ایک ہی نام ذہن میں آتا ہے، سندر کور۔ میں تجھے یہی کہہ کر پکارا کروں گا۔'' اس کی آنکھوں میں چھپی دعوت سوجھا سنگھ کے دل میں چنگیاں بھرنے لگی۔

''مجھے دل و جان سے منظور ہے۔ میں تو جانے کب سے تیری جوانمردی اور دلیری پہ فدا ہوں۔ اس پورے امرتسر کا کوئی ایک جوان بھی تو تجھ جیسا نہیں ہے۔'' اس نے ایک جست میں بے تکلفی اختیار کرلی۔

''ہاں مجھے علم تھا کہ تو صرف میرے لیے یہاں آتی ہے۔ کھانے کا تو محض بہانہ تھا۔ ورنہ میں اتنا بھی بھولا نہیں کہ ذائقہ اور مہک سے یہ نہ جان سکوں کہ وہ تیرے ہاتھوں سے بنا ہوتا تھا۔ تیرے باپو کے نہیں۔'' سوجھا سنگھ نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیا۔

''مجھے اپنی داسی بنا لو سوجھا! یا مجھے ان قدموں کی خاک دے دو، میں اسے اپنی مانگ میں سجالوں گی۔ مگر تجھے واہگرو کا واسطہ! مجھے کبھی خود سے دور جانے کا مت کہنا۔'' وہ بے خودی اس کے قدموں میں جا بیٹھی۔

سوجھا سنگھ اس کے جذبات کی شدت پر ششدر رہ گیا۔ سندر کی وارفتگی اور اظہار کا یہ انداز اسے مسحور کرنے لگا۔ عورت جب مرد کے عشق میں خاک ہونے لگے تو کسی چنگاری کی مانند اس کے دل و دماغ کو بھی سلگا دیتی ہے۔ نظام لوہار کی سپاہ کا وہ سالار اس کمزور لمحے کی زد میں آ چکا تھا۔ انگریز افسران کو گاجر مولی کی طرح کاٹ دینے والے اس سپاہی نے اپنے قدموں میں بیٹھی عورت کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔

سندر کور نے سوجھا سنگھ کے دل کا قلعہ فتح کرنے کی اطلاع اپنے آقاؤں تک پہنچا دی اور اب وہ نئی ہدایات پر عمل کرنے کے لیے بھی مکمل تیار تھی۔

پہلے مرحلہ میں اس نے شب و روز اس کے ساتھ بتانے شروع کردیئے۔ 'پنجاب چھوڑ دو' تحریک کے فرائض اب کہیں پس پشت جانے لگے۔ تفویض کردہ فرائض وہ مارے باندھے سرانجام دیا کرتا۔ زندگی کا حسن اب صرف سندری کی زلفوں کی گھنیری چھاؤں اور خود سپردگی میں تھا۔

سوجھا سنگھ اپنے حواس سے اس قدر بیگانہ ہو چلا تھا کہ اپنی ان نئی سرگرمیوں کے رنج میں دکھی اور بیمار ماں کی تیمار داری کرنے کا اسے خیال بھی نہ تھا۔ اپنے اردگرد نادیدہ جال کی موجودگی سے بے خبر وہ ہمہ وقت سندر کور کے ساتھ داد عیش دینے میں مگن رہتا۔

☆☆☆

بیرونی دروازے پر گھوڑے کی ٹاپوں کی مخصوص آواز سن کر کمرے میں نڈھال لیٹی امرت کے دل میں اُمید کی ایک کرن جاگ اٹھی۔ اس کی سماعت میں اب مضبوط قدموں سے ہانپتے ہوئے گھوڑے کو صحن میں باندھنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ اگلے ہی پل وہ اس کے سامنے موجود تھا۔

''یہ کیا حال بنا لیا ہے آپ نے ماں جی اپنا!'' مؤدب آواز اور شائستہ اطوار سے مستفسر نظام کو دیکھ کر وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔

''کیسا ہے پتر تو؟ مجھے لگا کہ سوجھا آیا ہے۔ مجھے بہت اڈیک (انتظار) ہے اس کی۔'' وہ نقاہت سے بولی۔

''میری تو کئی ہفتوں سے کوئی ملاقات نہیں ہو پائی اس سے..... کیا ہوا سب خیریت تو ہے ناں؟ آپ کی اس ناسازی طبع میں تو اسے آپ کے پاس موجود ہونا چاہیے۔'' نظام کو تشویش نے گھیر لیا۔

''وہ کم بخت اپنا آپ بھول چکا ہے، اسے ماں کیونکر یاد رہے گی؟ سپاہی کی تلوار پر جب عشق و عاشقی کا سایہ پڑ جائے تو اس کی دھار کند ہو جاتی ہے۔ ایک ماچھن کے عشق کا جادو سوجھا سنگھ کے سر چڑھ کر بولنے لگا ہے۔ ڈرتی ہوں کہ وہ کسی تباہی کا شکار نہ ہو جائے۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''یہ تو بہت ہولناک خبر سنائی ہے آپ نے ماں جی! میں خود اس سے ملتا ہوں۔ آپ فکر نہ کریں وہ اپنے فرائض میں کوئی غفلت نہیں کرے گا۔'' نظام نے اسے بھرپور تسلی دی اور سوجھا سنگھ کے ڈیرے پر روانہ ہوگیا۔

اسے قوی اُمید تھی کہ ماں اپنے جذبات کے تحت کچھ زیادہ ہی وہمی ہوگئی ہے اور حالات اس قدر بھی مخدوش نہ ہوں گے لیکن ڈیرے پر پہنچ کر غیظ و غضب کی ایک لہر نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ سوجھا سنگھ کے سامنے بیٹھی وہ عورت عشوہ طرازی سے نوالے بنا کر اسے کھانا کھلا رہی تھی۔ ان دونوں میں ہونے والی اٹکھیلیاں اور چارپائی کے قریب شراب کے جام کی موجودگی نے اسے مزید تاؤ دلا دیا۔

''اپنی ان ناز برداریوں سے فرصت مل جائے تو گھر میں تنہا بھوکی پیاسی لیٹی بیمار ماں کا بھی خیال کر لینا سوجھے!'' نظام نے طنزیہ کہا۔

''کیا ہوا ماتا جی کو؟'' اس نے بے نیازی سے کہا۔

''جب کوئی جنگجو سپاہی اپنے ہتھیاروں سمیت کسی نا محرم عورت کے سامنے سرنگوں ہو جائے تو ایک ماں کے دل پر بیتنے والی کیفیت قیامت سے کم تو ہرگز نہ ہوگی۔''

''ارے ہٹاؤ بھی! ماتا جی نے تو خوا مخواہ بیر باندھ لیا ہے سندری سے۔'' وہ بیزاری سے بولا۔

''بہت غلط رستے پر چل پڑا ہے تو سوجھے! چھوڑ دے یہ طور طریقے۔ ایک سپاہی کو یہ سب زیب نہیں دیتا۔'' نظام کی جہاندیدہ نظریں اس عورت کا 'قبیلہ' بھانپ گئی تھیں۔

''کیوں؟ سپاہی کے جسم میں دل نہیں ہوتا کیا؟ ہتھیار اٹھانے کا مطلب یہ تو نہیں کہ اپنے جذبات ہی کچل دیئے جائیں۔'' اپنی محبوبہ کے سامنے وہ نظام کی خلوص بھری لتاڑ برداشت نہ کر سکا۔

اس کی بے مروتی دیکھ کر نظام نے سندری کو خشونت سے دیکھا جو چہرے پر انتہائی غمگین تاثرات سجائے بیٹھی تھی۔

''اسے تو میں بعد میں خود ہی سمجھا لوں گا..... لیکن آئندہ تم مجھے اس کے قریب کہیں نظر آئیں تو تمہارا بولو رام ہو جائے گا۔'' وہ انگلی اٹھائے سختی سے بولا۔ ''اپنا بوریا بستر گول کرو یہاں سے۔ ورنہ انجام کی ذمہ دار خود ہوگی۔''

اس کے خوفناک تیور اور سنگین دھمکی سوجھا سنگھ کے دل میں تیر کی مانند پیوست ہوئی تو سندری کو اپنے مقصد کے حصول کی راہ مزید آسان لگنے لگی۔

☆☆☆

''یہ کیا بچپنا ہے سندر کور! تو اس طرح مجھ سے کیسے الگ ہو سکتی ہے؟'' سوجھا محبت بھرے لہجے میں بولا۔

''میری وجہ سے تیری ماتا جی بیمار ہیں۔ تیرا ویروں جیسا دوست خفا ہو گیا ہے۔ میں اتنی ذلت کیسے سہوں؟'' وہ ہچکیاں لینے لگی۔

''ایسا بھی کوئی اندھیر نہیں ہے اب۔''

''تیرے سامنے وہ مجھے اتنی دھمکیاں دے کر چلا گیا۔ اور تو خاموشی سے سنتا رہا..... کیا یہی وقعت ہے میری؟ وہ تم سے ایسے مخاطب تھا جیسے وہ آقا ہے اور سوجھا سنگھ غلام۔ مجھے کیا علم تھا کہ جس سوجھے کی دلیری نے مجھے اپنا مرید بنا لیا تھا وہ اتنا کمزور ہوگا۔'' وہ بے رخی سے بولی۔

''تو کیا چاہتی ہے تو؟ میں ہر بات ماننے کے لیے تیار ہوں مگر تجھے جانے نہیں دوں گا۔'' وہ اس بے مروتی پر بوکھلا گیا۔

''مجھے صرف سوجھا سنگھ کا مان اور مقام واپس چاہیے۔ اور اس کے لیے تجھے بہت بڑی قربانی دینی ہو گی۔'' وہ سکون سے بولی۔

''میں ہر قربانی کے لیے تیار ہوں۔''

''نظام لوہار سے چھٹکارا پا لو۔ پنجاب کی انگریزوں سے خلاصی کا تاج میں تیرے سر پر سجا ہوا دیکھنا چاہتی ہوں۔ ورنہ اس بے دید انسان سے کیا بعید اپنا مطلب پورا ہوتے ہی وہ تجھے دودھ سے مکھی کی طرح نکال کر پھینک دے گا۔'' اس نے تاؤ دلایا۔ ''تیری ماتا جی کو بھی اسی نے بھڑکایا ہوگا۔ ورنہ ایک ماں اپنی اولاد سے کیسے ناراض ہو سکتی ہے۔ وہ تیرا گھر بستے دیکھ کر جلنے لگا ہے۔ آج اگر اس کا کوئی اپائے نہ کیا تو وہ ہمیں کبھی اکٹھے رہنے نہ دے گا۔''

سوجھا سنگھ کی پیشانی پر تفکر کی گہری لکیریں اور آنکھوں کی سرخی اس کے دل و دماغ میں برپا ہلچل کا واضح عکس تھیں۔ نفس نے اسے ماضی کے سارے عہد فراموش کروا دیئے اور اس نے سندر کی بات پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اپنے ذہن میں پنپتے ایک خیال کے بعد وہ ماں سے ملنے روانہ ہوگیا۔

''تیری اس غیر ذمہ دار حرکت نے مجھے بہت دکھ دیا ہے سوجھے! تو نے نظام کی بھی کوئی لاج نہ رکھی۔'' ماں نے کڑک کر کہا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''مجھ سے بڑی بھول ہوگئی ماتا جی! میں اسے چھوڑ آیا ہوں ہمیشہ کے لیے۔ نظام سے بھی معافی مانگ لوں گا۔'' وہ اپنے دل میں اٹھتا طیش دباتے بظاہر لجاجت سے بولا۔ ''کب آئے گا وہ ملنے؟ میں اس کے پاؤں پکڑ لوں گا۔''

''وہ تین روز بعد آئے گا میری خبر لینے۔ جب تک وہ تجھے شما نہیں کرے گا' میں بھی کوئی بات نہیں کروں گی تجھ سے۔'' امرت تو زاس کا ہاتھ جھٹک کر بولی۔

''اب کوئی غلطی نہیں کروں گا ماتا جی! اب تو میں سب کچھ ٹھیک کر دوں گا۔'' کچھ دیر وہاں بیٹھنے کے بعد وہ کسی بہانے سے اٹھ کر باہر چلا گیا۔

اب اس کا اگلا ہدف پولیس تھانہ تھا۔ مقامی افسران سے وعدہ معاف گواہ بننے کے بعد اس نے نظام لوہار کی آمد کی اطلاع دے دی۔ بوڑھے ہنری کا داؤ کامیاب ہو گیا تھا۔ نظام کے علاوہ اس نے جیرو جٹ کا خفیہ ٹھکانہ بھی آشکار کر دیا۔

سندر کور سے کیے گئے وعدوں کی تکمیل کے بعد وہ بہت سرشار تھا۔

☆☆☆

تیسرے روز وہ صبح سویرے گھر سے روانہ ہو گیا۔

''دوپہر تک لوٹ آنا سوجھے! نظام سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔'' امرت نے یاد دہانی کروائی۔

''چنتا نہ کرو بے بے! میں جلد ہی لوٹ آؤں گا۔'' وہ مسکراتے ہوئے دہلیز عبور کر گیا۔

نظام لوہار اپنے قول کے مطابق بیمار ماں کی تیمارداری کے لیے دوپہر سے قبل ہی وہاں موجود تھا۔ اس نے بہت محبت سے گھر میں بکھری اشیاء سمیٹیں اور اپنے ساتھ لایا کھانا اسے کھلانے لگا۔

''سوجھا بھی آئے گا آج تجھے ملنے۔'' وہ محبت سے اس کا ہاتھ تھام کر بولی۔

''ارے واہ! اس ماچھن سے رہائی مل گئی اسے؟'' وہ مسکرایا۔

''ہاں! میری پرارتھنا کام آ گئی۔ اسے اپنی غلطی پر بہت پچھتاوے ہیں۔ میں نے بھی خوب لتے لیے اس کے۔''

''اچھی بات ہے ماں جی! لوٹ کے بدھو گھر کو آیا۔ جیرو بتاتا ہے کہ اکثر یہ فرنگی عورتوں کو جاسوس بنا کر

مشینی دل

سیاہ فام امریکی لڑکا اسٹین لارکن ایک سال سے دل کے بغیر گھوم رہا ہے۔ دل کے عارضے میں مبتلا 25 سالہ اسٹین پچھلے سال مشی گن کے ایک اسپتال میں داخل ہوا۔ تشخیص کے بعد ڈاکٹر اس نتیجے پر پہنچے کہ اسٹین کا دل مکمل طور پر ناکارہ ہو چکا ہے۔ لہٰذا اسے نیا دل لگایا جائے گا مگر مصیبت یہ آن پڑی کہ اسٹین سے پیشتر بہت سارے اُمیدوار نئے دل کے انتظار میں قطار میں موجود تھے۔ لہٰذا اسٹین کو اپنی باری کا انتظار کرنا پڑا۔ اس عرصے میں اسے دل کی جگہ کام کرنے والی ایک مشین دے دی گئی۔ پچھلے ایک سال سے اسٹین اس مشین کے سہارے نہ صرف زندہ ہے بلکہ اپنے روزمرہ کے معمولات بخوبی سرانجام دیتا ہے۔ یہ مشین ایک بیگ میں موجود ہے جو اسٹین ہر وقت اپنی پشت پر اٹھائے رکھتا ہے۔ اسٹین کا بڑا بھائی ڈومینکو بھی کچھ عرصہ پہلے اسی بیماری میں مبتلا رہا تھا اسے بھی کچھ عرصہ مصنوعی دل پر زندہ رکھا گیا اور پھر انسانی دل دستیاب ہونے پر آپریشن کر کے اسے نیا دل لگا دیا گیا۔ ڈومینکو اب معمول کی زندگی گزار رہا ہے اور اپنے چھوٹے بھائی کے لیے فکرمند ہے۔

مرسلہ: نظیر حسن، مظفر گڑھ

پرندے اپنا رخ کیسے متعین کرتے ہیں

ایک اڑتا ہوا پرندہ سمت کے تعین کے لیے اپنے دو اعضاء کا استعمال کرتا ہے۔ آنکھوں میں موجود قطب نما اسے صحیح سمت اختیار کرنے میں مدد دیتا ہے جب کہ چونچ میں موجود خلیات زمین کے مقناطیسی میدان کی طاقت کا اندازہ لگاتے رہتے ہیں اس طرح پرندے کو ہر لمحے نہ صرف اپنے رخ کا صحیح اندازہ ہوتا ہے بلکہ اسے یہ بھی پتا ہوتا ہے کہ وہ سطح زمین سے کتنی بلندی پر پرواز کر رہا ہے۔ سائنسدانوں نے یہ تحقیق ایک چھوٹے پرندے رابن پر مکمل کی ہے۔

مرسلہ: ارشد حسن، جہلم

WWW.PAKSOCIETY.COM

http://paksociety.com

پاک سوسائٹی پر مُوجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

Downloaded From Paksociety.com

اپنے مقصد پورے کیا کرتے ہیں۔'' نظام نے سادگی سے کہا۔

''میرا باپو کہتا تھا کہ دشمن اعلیٰ ظرف اور غیرت مند ہو تو دشمنی نبھانے کا سواد (مزہ) آتا ہے۔ ورنہ دشمن کی سطح پر آنا بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔''

''ہمارا یہ دشمن بھی ایسا ہی ہے ماں جی! ظرف اسے چھو کر بھی نہیں گذرا۔''

کچھ ہی لمحوں بعد گھر کے باہر گھوڑوں کی ہنہناہٹ اور اسلحہ کی مخصوص جھنکار نے انہیں ساکت کر دیا۔ برطانوی اہلکار اس کے استقبال کی مکمل تیاری کے ساتھ وہاں موجود اسے گرفتاری کے لیے للکار رہے تھے۔

''انہیں کہیے خبر ہوئی کہ میں آج یہاں موجود ہوں گا..... میں تو ہر بار ایک نیا بھیس بدل کر آتا ہوں۔'' وہ بے اختیار بڑبڑایا اور ڈیوڑھی کے ساتھ موجود گودام نما کمرے میں چلا گیا جہاں اس نے انگریزوں سے چھینا ہوا اسلحہ چھپا رکھا تھا۔ اپنی عجلت اور افراتفری کے عالم میں اسے امرت کے چہرے پر کھنڈی زردی بھی نظر نہ آسکی جو اس کے سوال کے جواب اور اصل مجرم کی تہہ تک فوری پہنچ گئی تھی۔

نظام باوقار انداز سے اس گودام میں چلا گیا اور فوری طور پر کمرے کا چوبی فرش اکھاڑنے لگا جہاں کچھ طمنچے گاڑ رکھے تھے۔ اس کام سے فرصت ملتے ہی وہ شمعدان اور ایک طرف تھیلے میں موجود مورتیاں نکال کر تیزی سے ان کے کھوکھلے خول اتارنے لگا۔ اس کے سامنے طمنچوں کی شکم سیری کے لیے وافر خوراک موجود تھی۔

اس کی آنکھوں میں موجود آتش، اب چہرے کو بھی دہکانے لگی۔ امرت ہانپتی کانپتی کمرے میں داخل ہوئی۔ نظام نے اسے فوری سہارا دیا۔ ''آپ کیوں چلی آئیں یہاں؟ میں سنبھال لوں گا انہیں۔ آخری گولی تک شکست تسلیم نہیں کروں گا۔'' وہ ان کے چہرے کی یخ بستگی دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ بیرونی جانب اب دیوالی کے پٹاخے پھوٹنے جیسی صدائیں گونجنے لگی تھیں۔

''مجھے چند چیزیں درکار ہیں پتر! وہ لے کر چلی جاؤں گی۔'' امرت انتہائی اعتماد سے بولی اور ایک کونے میں موجود کاٹھ کباڑ سے چند فیتے اور دیسی ساختہ آتش گیر گولے تھامے روانہ ہوگئی۔

انگریز اہلکار اپنی کامیابی کے لیے بہت پُرامید تھے لیکن نظام لوہار ان کے لیے لوہے کا چنا ثابت ہوا۔ اس رات تک وہ نہایت کامیابی سے انہیں تاک تاک کر نشانے لگاتا رہا۔ خود اعتمادی کے زعم میں وہ اسے نہتا سمجھ کر قابو کرنے آئے تھے لیکن اس کی جوابی کارروائی بہت تشویشناک تھی۔

رات کے سائے گہرے ہوتے ہی مخالف کیمپ میں خاموشی چھا گئی۔ نظام نے بھی صورتِ حال کی نزاکت کے تحت فائرنگ روک دی۔ وہ 'فضول خرچی' کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ لالٹین کی مدھم زرد روشنی میں اس کے چہرے پر تفکر کی لکیریں نمایاں تھیں۔ اسے شدت سے سوجھا سنگھ کی فکر لاحق تھی۔ اس کی یقینی آمد میں اس خلل سے نظام کے دل و دماغ میں اندیشے کنڈلی مارے بیٹھ گئے۔

وہ رات سوئی جاگی کیفیت میں بیت گئی اور اگلی صبح ایک بار پھر وہی اعصاب شکن دھما کے شروع ہو گئے۔ نظام نے بھی بھرپور جوابی کارروائی کا آغاز کر دیا۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ سوجھا کی جانب سے لاحق تشویش سینے میں دھوئیں کی مانند گھٹن پیدا کرنے لگی۔ شام ڈھلنے پر اس کا اضطراب مزید بڑھ گیا۔ امرت بھی باہر کھڑ پٹر میں مگن تھی۔

''چند نوالے حلق سے اتار لے پتر! خالی پیٹ کمزوری ڈھالے گی تجھے۔''

''مجھے سوجھے کی فکر ہو رہی ہے ماں جی! اسے خبر مل گئی ہوگی اس ٹاکرے کی۔ اب تک تو آجانا چاہیے تھا اسے۔ رب خیر کرے کہیں کسی مصیبت میں نہ پھنس گیا ہو۔''

''وہ خود بہت بڑی مصیبت بن چکا ہے نظامے!'' امرت کے چہرے پر دکھ کا سایہ لہرایا۔

''یہاں سے جو سامان لے کر گئی تھیں وہ کہاں ہے؟'' نظام نا سمجھی سے بولا۔

''جو فرنگی پچھلی جانب موجود تالاب کے رستے اوپر آنا چاہیں گے ان پر چلاؤں گی۔'' اس کے بیمار چہرے پر طیش و کرب کی لہریں کسی انہونی کی خبر دینے لگیں۔

''آپ کو آرام درکار ہے..... اس مشقت میں نہ الجھیں۔''

''آرام نہیں۔'' مجھے قرض کی ادائیگی درکار ہے۔ یہ قرض نہ چکایا تو واہگرو کیسے شما کرے گا مجھے؟''

''میں سنبھال لوں گا ماں جی! بس ایک بار سوجھا آجائے پھر دیکھنا آپ۔''

''وہ اب کیوں آئے گا نظامے! نہیں آئے گا۔ ..... یہ باہر کھڑی سفید بلائیں اسی کی بھیجی ہوئی ہیں..... بیچ

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ولیا اس مورکھ نے اپنا دھرم۔''

نظام اس انکشاف پر ششدر رہ گیا۔ کمرے کے در و دیوار پر شمع کی ایک مدھم لو تھرکتی عجیب ہیولے بناتی رہی۔ نظام لوہار کی آنکھیں بے طرح جلنے لگیں۔ سوجھا کی اس حرکت نے اس کی رگیں پھڑکا دی تھیں۔ تبھی کمرے کی کھڑکی کے باہر ایک آہٹ نے اسے چونکا دیا۔ ایک محتاط آواز نے دبے دبے انداز میں اسے مخاطب کیا۔

''میں تیرا خیر خواہ ہوں نظام! تو اگر ہتھیار ڈال دے تو میں تجھے معافی دلوا سکتا ہوں۔''

نظام نے فوری طور پر اس آواز کے ماخذ پر فائر چلا دیا اور کھڑکی کے اہنی پٹ کی آڑ میں کھڑا ہو کر چلایا۔ ''میں کسی جال میں نہیں آؤں گا بزدلو! جھکوں گا نہ بکوں گا۔ میں اپنی دھرتی کا کوئی سودا نہیں کروں گا۔ زندہ تم لوگوں کے ہاتھ نہیں آؤں گا اور اگر یہاں سے نکل گیا تو تمہاری موت یقینی ہے۔''

وہ اس گودام نما کمرے میں موجود اسلحہ کی مدد سے اڑتالیس گھنٹے تن تنہا ان کا مقابلہ کرتا رہا۔ کمرے کی ساخت اور لوہے کی سلاخوں والی کھڑکی اس کے لیے بہترین آڑ ثابت ہوئیں لیکن کچھ اچٹتے ہوئے فائر اس کا کندھا اور بازو گھائل کر گئے۔ خون بہنے سے نقاہت نے وجود میں پنجے گاڑنے شروع کر دیئے۔

انگریز اہلکار اس چوہے دان میں اسے کسی بھی قیمت پر موت کے گھاٹ اتارنا چاہتے تھے۔ چند افراد نے گھر کے عقب سے چھت پر پہنچنے کی کوشش بھی کی لیکن امرت کی بر وقت حکمت عملی نے ان کی ایک نہ چلنے دی۔ نظام کے پاس موجود اسلحہ تیزی سے کم ہونے لگا۔ باہر موجود دشمن کی نفری بھی واضح کمی کا شکار تھی۔

تیسری رات اس کے دشمنوں کی بندوقیں قدرے خاموش ہو گئیں۔ چند اہلکاروں کو گولہ بارود لانے کے لیے روانہ کر دیا گیا۔ نظام کے لیے فوری فیصلہ کا یہ بہترین وقت تھا۔ محدود ترین گولیوں کے ساتھ مخالف کی نئی کمک کا سامنا صریحاً خودکشی تھی۔ بہترین دوست کے بعد اب اس کے ہتھیاروں نے بھی اسے دغا دے دیا تھا۔ اذیت و دکھ کی لہریں اس کا وجود پاش پاش کرنے لگیں۔ اس نے اپنی موجودگی میں امرت کو چارے کے ایک بلند ڈھیر کے پیچھے موجود دروازہ سے ہمسایہ کے گھر میں منتقل کیا اور خود بھی اندھیرے کی آڑ میں باہر نکل گیا۔

مسلمانوں کی فتوحات کے نتیجے کے طور پر اسلامی سلطنت میں غلاموں کا جو سیلاب امڈ آیا تھا اس کا اندازہ ان مبالغہ آمیز اعداد و شمار سے کیا جا سکتا ہے کہ موسیٰ نے شمالی افریقا سے تین لاکھ قیدی بنائے جن کے منجملہ اس نے ساٹھ ہزار قیدیوں کو خلیفہ کے حضور میں پیش کیا یا اسی موسیٰ نے اسپین کے غوطی امیر خاندانوں کی تیس ہزار کنواریوں کو بھی گرفتار کیا تھا یا ترکستان میں ایک اسلامی سپہ سالار قتیبہ بن مسلم نے ایک لاکھ قیدی بنائے تھے۔ مالک اور لونڈی کے درمیان جنسی تعلق تو جائز تھا لیکن نکاح جائز نہ تھا۔ اس طرح جو اولاد ہوتی تھی وہ مالک کی کہلاتی تھی۔ اس لیے وہ آزاد ہوتی تھی مگر حرم کو صرف ''ام الولد'' کا درجہ عطا کیا گیا تھا۔ اس کا مالک اس کو بیچ سکتا تھا اور نہ کسی کے نام ہبہ کر سکتا تھا۔ ایسی لونڈی مالک کے مرنے کے بعد آزاد ہو جاتی تھی۔

اقتباس: تاریخ عرب از فلپ کے حتی
مرسلہ: زاہد علی خان، سیالکوٹ

آسمان پر آخری تاریخوں کا چاند بادلوں کی اوٹ میں موجود تھا۔ تاریکی اور سناٹے میں پھونک پھونک کر قدم رکھتا وہ اپنی نقاہت اور نیند سے مغلوب حواس پر قابو پاتے ایک بڑے پتھر سے ٹکرا کر زمین بوس ہو گیا۔ سر پر اسی پتھر کے کنارے سے لگی گہری چوٹ اسے ہوش و حواس سے بیگانہ کر گئی۔ ڈوبتے ذہن میں ابھرنے والی آخری سوچ کلمہ شہادت کے سوا کچھ نہ تھی۔

☆☆☆

''مجھے ہنری صاحب سے ملواؤ۔ انہیں اگر علم ہو گیا کہ تم لوگوں نے میرے ساتھ یہ سلوک کیا ہے تو تمہاری وردیاں اتروا دیں گے وہ۔'' سوجھا سنگھ بیسیوں بار کیا گیا مطالبہ ایک بار پھر چیخ چیخ کر دہرانے لگا۔

''کیوں ہلکان ہو رہا ہے غدار! تجھے کیا لگتا تھا تیری اس بہادری پر یہ سفید چوہے تجھے پھولوں کے ہار پہنائیں گے؟'' دیوار کے ساتھ بیٹھے جبرو نے تنفر سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

اس صبح نظام لوہار کی لاش دریافت ہوتے ہی گورا صاحب نے سوجھا کو بھی گرفتار کر لیا تھا۔ نظام کے ہاتھوں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

آخری وقت سے قبل اپنے بیسیوں اہلکاروں کی موت نے انہیں وحشی بنا دیا۔ وعدہ معافی کے قول قرار ہوا میں تحلیل ہو گئے تھے اور اب کوئی بھی اس کی آواز پر کان ہی نہ دھر رہا تھا۔

''انہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے..... ورنہ مجھے یوں گرفتار نہیں کیا جا سکتا۔'' وہ جبرو کی بات پر بھڑک اٹھا۔

''غلط فہمی انہیں نہیں، تجھے ہو گئی تھی۔ بہت افسوس ہے مجھے کہ اپنی دھرتی کا سودا کتنے سستے میں کر ڈالا تو نے ایک ناری کے سامنے اتنی بے بسی۔''

سوجھا اسے تلخ جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ حوالات کی سلاخوں کے پار ایک چہرے نے اسے ششدر کر دیا۔ اپنی والدہ کی یہاں موجودگی کا وہ تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔

''بے بے! تو یہاں کیسے؟''

''بڑی منت سماجت سے دو گھڑی تجھے ملنے کا موقع ملا ہے۔ تھانے کا سنتری تیرے باپو کا پرانا دوست تھا۔ اسی کی مہربانی سے یہاں پہنچی ہوں۔'' وہ آزردگی سے بولی۔

''بے بے! اس سے کہہ کر مجھے بھی نکلوا دے یہاں سے۔'' اس نے بڑی سی سیاہ چادر میں لپٹی امرت کے ہاتھ جوڑ دیئے۔

''تجھے اب بھی صرف اپنی فکر ہے سوجھے!! صرف اپنی۔'' اس کا لہجہ دکھ کی شدت سے چور تھا۔ ''تو نے نظام کی یاری اور محبت کا کیا مول دیا۔ ایک بار بھی تجھے خیال نہ آیا ہم سب کا؟''

سوجھا کے پاس خاموشی کے سوا کوئی جواب نہ تھا۔ یکدم سلاخ پر دھرا ہاتھ امرت نے جھٹکا اور اپنی چادر میں موجود کرپان نکال کر بیٹے کے سینے میں گھونپ دی۔ لہو کا ایک فوارہ اچھلا اور اس کے کپڑوں پر رنگین گل بوٹے بنا گیا۔ جبرو جٹ بھی اس اچانک وار پر ساکت رہ گیا۔

''یہ..... کک..... کیا کر دیا ماتا جی آپ نے؟'' وہ فرطِ حیرت سے گنگ تھا۔

''میں نے کچھ نہیں کیا جبرو! اس دھرتی کے مجرم بیٹے اور ایک مخلص دیش بھگت کے قاتل کو اس کے انجام تک پہنچایا ہے۔'' وہ فرش پر اپنے ہی خون میں لت پت بیٹے کو دیکھ کر بولی۔ ''اور تم گواہ رہنا جبرو!! تم گواہ رہنا! یہ موت تو بہت چھوٹی سزا ہے اس کے لیے۔ میں تو اسے اپنے دودھ کی تیس دھاریں بھی کبھی نہ بخشوں گی۔ اس نے نظام ہی نہیں بلکہ پورے پنجاب کو بے موت مار دیا۔ ان فرنگیوں سے ایسی جی داری سے ٹکر لینے والا اب جانے کب پیدا ہو؟ کاش میں تجھے ہی یہاں سے نکال پاتی۔''

''آپ یہاں سے چلی جائیں ماتا جی! اب یہاں رکنا مناسب نہیں۔''

امرت آنکھوں میں آنسو لیے بوجھل قدموں سے لوٹ آئی۔

☆☆☆

امرتسر کے عوام میں ایک ماتم برپا تھا۔ ان کے دلی امنگوں کا ترجمان اور انگریز دست برد میں ایک باوقار زندگی عطا کرنے والا ہر دلعزیز رہنما 'نظام لوہار' کی ایسی المناک موت نا قابلِ برداشت سانحہ تھی۔ حکومتی حلقوں میں 'اشتہاری مجرم' اور 'ڈکیٹ' کی حیثیت رکھنے والا نظام ان کے لیے ایک مثالی ہیرو تھا۔ اس کے جنازے میں شرکت کے لیے لوگوں کا ایک طوفان امڈ آیا۔ ہزاروں افراد کی متوقع شمولیت نے انتظامیہ کی صفوں میں کھلبلی مچا دی۔ ان کی آمد پر بند باندھنے کے لیے انھوں نے ٹیکس لاگو کر دیا۔ دو روپے فی کس (موجودہ وقت میں لگ بھگ 20000 روپے) ادائیگی کے بعد ہی وہ نظام لوہار کی نماز جنازہ میں شریک ہونے کے مجاز تھے۔

یہ خود غرضانہ امر بھی انہیں اپنے محبوب سپاہی کی آخری رسومات میں شرکت سے روک نہ پایا۔ اس تاریخی جنازہ کے ٹیکس کی مد میں حکومت کو مبلغ ۳۵،۰۰۰ روپے کا مالیہ حاصل ہوا۔ ہزاروں اشکبار آنکھوں اور سوگوار دلوں نے نظام لوہار کو سپردِ خاک کر دیا۔

دشمن کے کیمپ میں جشن کا سماں تھا۔ جام لنڈھاتے، مستی اور سرشاری میں بے حال افسران نخوت و تکبر سے ایک دوسرے کو مبارک دیتے ایک ہی بات دہرا رہے تھے۔

''اب آئندہ کوئی بھی ہندوستانی ماں باغی پیدا نہیں کرے گی۔ نظام لوہار کی موت ان کے لیے ہماری دہشت کی علامت بن جائے گی۔''

اور عین اسی پل قبرستان کے ایک الگ تھلگ گوشے میں متورم چہرے اور نڈھال وجود لیے امرت اب بھی ایک ہی بات سوچ رہی تھی۔

''ان فرنگیوں سے ایسی جی دار ٹکر لینے والا اب جانے کس خوش نصیب ماں کا بیٹا ہوگا؟''

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ابھرتے ستارے

زریاب وصلی

کرکٹ ایک ایسا کھیل ہے جو جنون کی طرح پھیل رہا ہے۔ مقبولیت میں تمام کھیلوں کو پیچھے چھوڑ چکا ہے اس کھیل کے کچھ کامیاب ستاروں کا مختصر مختصر سا تعارف۔

کرکٹ کے شائقین کے لیے تحفۂ خاص

کرکٹ آج کے دور کا ایک مقبول کھیل ہے۔ پوری دنیا ہی اس کھیل کی دیوانی نظر آتی ہے۔ دنیائے کرکٹ میں نت نئے کھلاڑی سامنے آتے ہیں۔ ان میں کچھ اپنے غیر معمولی ٹیلنٹ کی وجہ سے بہت جلد مقبولیت حاصل کر لیتے ہیں۔ ہم اپنے اس آرٹیکل میں چند ایسے کھلاڑیوں کا ذکر کریں گے جو کہ اپنی ٹیم کا مستقبل سنوار سکتے ہیں۔

بابر اعظم

پچھلے کچھ سالوں سے پاکستان کرکٹ ٹیم کی بیٹنگ کافی مشکلات کا شکار رہی ہے۔ ورلڈ کپ 2015 کے بعد کچھ اہم کھلاڑیوں کی ریٹائرمنٹ کی وجہ سے ان مشکلات میں مزید اضافہ ہوا۔ ایسے حالات میں نوجوان کھلاڑیوں کی ضرورت تھی جو ٹیم کو ان مشکلات سے نکال سکتے۔ بابر اعظم ایسا ہی ایک نوجوان ہے جس کی ٹیم کو ضرورت تھی۔ بابر اعظم 15 اکتوبر 1994 کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ وہ حماد اعظم کے چھوٹے بھائی اور عمر اکمل، کامران اکمل کے کزن ہیں۔ فرسٹ کلاس اور لسٹ اے میں اچھی کارکردگی دکھانے کی بدولت انٹرنیشنل ٹیم میں سلیکشن ہوئی۔ اس سے پہلے 2012 کے انڈر 19 ورلڈ کپ میں بھی بہترین کارکردگی دکھا چکے ہیں۔ 31 مئی 2015 کو انہوں نے زمبابوے کے خلاف اپنا ون ڈے ڈیبیو کیا اور اپنے پہلے ہی میچ میں ففٹی اسکور کی۔ بابر اعظم اب تک اٹھارہ میچوں میں باون کی اوسط سے آٹھ سو چھیاسی رنز بنا چکے ہیں جس میں تین سینچریاں اور پانچ نصف سینچریاں ..... شامل ہیں۔ حال ہی میں انہوں نے ویسٹ انڈیز کے خلاف ون ڈے سیریز میں لگاتار تین سینچریاں اسکور کیں۔ یہ کارنامہ انجام دینے والے وہ تیسرے پاکستانی ہیں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

بابر اعظم اپنے ٹیسٹ کیریئر کا آغاز بھی ویسٹ انڈیز کے خلاف کر چکے ہیں اور پہلے ہی ٹیسٹ میں ففٹی اسکور بنا چکے ہیں۔ یہ پرفارمنس دیکھ کر ہی اندازہ کیا جا سکتا ہے کے وہ پاکستان کے مستقبل کا چمکتا ہوا ستارہ ہیں۔

بین اسٹوکس

اینڈریو فلنٹوف کے بعد انگلینڈ ٹیم کے پاس کوئی اچھا آل راؤنڈر نہیں تھا۔ ایسے میں ورھم کی طرف سے کھیلنے والے بین اسٹوکس اس رول کے لیے بہترین ثابت ہوئے۔ 4 جون 1991ء کو کرائس چرچ نیوزی لینڈ میں پیدا ہونے والے بین اسٹوکس بارہ سال کی عمر میں انگلینڈ منتقل ہوئے۔ دائیں ہاتھ کے میڈیم فاسٹ باؤلر اور بائیں ہاتھ کے جارح مزاج بیٹسمین بین اسٹوکس نے اپنے کیریئر کا آغاز ورھم کی طرف سے 2009 میں کیا۔ انڈر 19 اور کاؤنٹی کرکٹ میں بہترین پرفارمنس دکھانے کی بدولت انگلینڈ ٹیم میں سلیکشن ہوئی۔ پہلے کچھ میچوں میں اسٹوکس خاص پرفارمنس نہ دکھا سکے۔ 2013 کی ایشز سیریز میں انگلینڈ کو بری طرح ..... شکست ہوئی۔ اسی سیریز کے ایک میچ میں اسٹوکس نے مشکل حالات میں شاندار سنچری اسکور کی مگر ٹیم کو شکست سے نہ بچا سکے۔ اس سیریز میں اسٹوکس نے بہترین کارکردگی دکھائی۔ انہوں نے دو سو اناسی رنز اسکور کیے اور پندرہ وکٹس حاصل کیں۔ 2016 کے شروع میں اسٹوکس نے ساؤتھ افریقا کے خلاف دو سو تریسٹھ رنز کی ریکارڈ ساز اننگ کھیلی۔ دوسرے ٹیسٹ میں چھٹے نمبر پر بیٹنگ کرتے ہوئے اسٹوکس نے تیس چوکوں اور گیارہ چھکوں کی مدد سے شاندار ڈبل سنچری اسکور کی اور ٹیسٹ کرکٹ کے تیز ترین دو سو پچاس رنز بنائے۔ یہ اب تک چھٹے نمبر پر کسی بھی بیٹسمین کا سب سے بڑا اسکور ہے۔ ان کی پرفارمنس دیکھ کر ان کا موازنہ مشہور انگلش آل راؤنڈر این بوتھم سے کیا جاتا ہے۔

کاگیسو رابادا

ساؤتھ افریقا کی سرزمین نے بہت سے مشہور فاسٹ باؤلر کو جنم دیا ہے۔ ایلن ڈونلڈ، ڈیل اسٹین، شان پولک اور مکھایا انٹینی جیسے فاسٹ باؤلرز اس ٹیم کی نمائندگی کر چکے۔ کاگیسو رابادا بھی اسی ٹیم کے باؤلنگ اٹیک کا شاندار مستقبل ہے۔ رابادا 25 مئی 1995 کو ساؤتھ افریقا کے شہر کیپ ٹاؤن میں پیدا ہوئے۔ چھ فٹ پانچ انچ کے رابادا نے اپنے کیریئر کا آغاز گیئنگ کی طرف سے کیا اور اپنی شاندار پرفارمنس کی بنیاد پر ساؤتھ افریقا انڈر 19 میں سلیکٹ ہوئے۔ 2014 کے انڈر 19 ورلڈ کپ میں رابادا نے شاندار پرفارمنس دکھائی اور اپنی ٹیم کو پہلی بار چیمپئن بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس ٹورنامنٹ میں رابادا نے تین کی اکانومی سے چودہ وکٹس حاصل کیں اور ٹورنامنٹ کے بہترین باؤلر ٹھہرے۔ رابادا نے اپنے ون ڈے کیریئر کا آغاز بنگلہ دیش کے خلاف کیا اور پہلے میچ میں سولہ رنز دے کر چھ وکٹس حاصل کیں۔ پہلے میچ میں یہ باؤلنگ فگر ریکارڈ میں دوسرے نمبر پر ہے۔ رابادا اپنے ڈیبیو پر ہیٹرک بھی کر چکے ہیں۔ 2016 میں انگلینڈ کے خلاف چوتھے ٹیسٹ میں رابادا نے اپنے ٹیسٹ کیریئر کا بہترین باؤلنگ فگر حاصل کیا۔ انہوں نے اس ٹیسٹ میں تیرہ وکٹس حاصل کیں۔ یہ کارنامہ انجام دینے والے وہ دوسرے ساؤتھ افریقن ہیں۔ زبردست رفتار اور بال کو دونوں طرف سے سوئنگ کرنے کی صلاحیت رکھنے کی بدولت رابادا مستقبل کے ایک خطرناک باؤلر ثابت ہو سکتے ہیں۔

عماد وسیم

پاکستان کے پاس ہر دور میں ایک ایسا بہترین اسپنر موجود ہوتا ہے جو دوسری ٹیموں کے بلے بازوں کے لیے خطرے کی علامت ہوتا ہے۔ ماضی میں عبدالقادر، ثقلین مشتاق اور مشتاق احمد اس ٹیم کا حصہ رہے ہیں۔ 2014 میں سعید اجمل پر پابندی کے بعد پاکستان کا یہ شعبہ کافی حد تک کمزور ہو

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

گیا۔یاسر شاہ نے ٹیسٹ میں اس کمزوری کو کافی حد تک کم کر دیا مگر محمد وداوور کی کرکٹ کے لیے پاکستان کی تلاش عماد وسیم پر ختم ہوئی۔عماد وسیم پاکستان کے ابھرتے ہوئے سپر اسٹار ہیں۔18 دسمبر 1988 کو ویلز میں پیدا ہونے والے عماد وسیم نے اپنے کیریئر کا آغاز پاکستان انڈر 19 کی طرف سے 2006 میں کیا۔وہ واحد پاکستانی کرکٹر ہیں جو ویلز سے تعلق رکھتے ہیں۔لسٹ اے میں شاندار پرفارمنس دکھانے کے

بعد پاکستان ٹیم میں سلیکٹ ہوئے۔عماد نے اپنے انٹرنیشنل کیریئر کا آغاز زمبابوے کے خلاف 2015 میں کیا۔عماد پاکستان کے واحد اسپنر ہیں جو ایک ٹی ٹوئنٹی میچ میں پانچ کھلاڑیوں کو آؤٹ کر چکے ہیں۔عماد لوئر آرڈر میں اپنی بیٹنگ کی وجہ سے بھی کافی کامیاب ہیں۔اب تک کھیلے گئے چودہ ایک روزہ میچوں میں تین نصف سنچریاں اسکور کر چکے ہیں۔پاکستان کا ویسٹ انڈیز کے خلاف کھیلی گئی حالیہ ٹی ٹوئنٹی سیریز میں کلین سویپ میں عماد نے اہم کردار ادا کیا اور مین آف دی سیریز ٹھہرے۔اس کارکردگی کو مدنظر رکھتے ہوئے عماد وسیم کو پاکستان کا مستقبل قرار دیا جائے تو کچھ غلط نہ ہوگا۔

جسپریت بمراہ

فاسٹ باؤلنگ کے شعبے میں انڈیا ٹیم ہمیشہ کمزور رہی ہے۔بہت سے ایسے میچز ہیں جن میں انڈین باؤلنگ کی مخالف بلے باز نے خوب پٹائی کی۔ڈیتھ باؤلنگ ایک مشکل شعبہ ہے جس میں باؤلر صرف اپنی مہارت سے بچ سکتا ہے۔اسی شعبے میں اپنی صلاحیتیں ثابت کرنے والے انڈیا کے نوجوان فاسٹ باؤلر جسپریت بمراہ ہیں۔6 دسمبر 1993 کو گجرات میں پیدا ہونے والے جسپریت سنگھ بمراہ نے کرکٹ کیریئر کا آغاز 2013 کی آئی پی ایل میں ممبئی انڈینز کی طرف سے کیا۔اپنے ان آرتھوڈکس ایکشن اور آخری اوورز میں باؤلنگ کرنے کی صلاحیت کی وجہ سے جسپریت جلد ہی ایک اچھے باؤلر کے روپ میں ابھرے۔2015 کی انڈیا آسٹریلیا سیریز کے دوران بمراہ نے اپنے ون ڈے اور ٹی ٹوئنٹی ڈیبیو کیا۔اسی سال انہوں نے ٹی ٹوئنٹی میں ریکارڈ اٹھائیس وکٹیں حاصل کیں۔ان کے یارکرز اور سلو باؤنسر نے انہیں ڈیتھ اوورز میں ایک کامیاب باؤلر ثابت کیا۔2016 کے ٹی ٹوئنٹی ورلڈ کپ میں بمراہ نے اچھی پرفارمنس دکھائی۔نوجوان باؤلر کے کیریئر کا آغاز شاندار ہے۔

ہیزل ووڈ

گلین میک گراتھ کی ریٹائرمنٹ کے بعد آسٹریلیا ٹیم کو ایسے باؤلر کی ضرورت تھی جو مستقل لائن اور لینتھ کے ساتھ لمبے باؤلنگ اسپیل کر سکے۔ان کی یہ تلاش تین چار سال کے بعد ختم ہوئی جب ہیزل ووڈ منظر عام پر آئے۔ہیزل ووڈ آٹھ جنوری 1991 کو نیو ساؤتھ ویلز میں پیدا ہوئے۔انہوں نے اپنے کیریئر کا آغاز 2008 میں نیو ساؤتھ کی ٹیم کی طرف سے کیا اور جلد ہی سلیکٹرز کی نظروں میں آ گئے۔انہوں نے 2010 میں انگلینڈ کے خلاف اپنا پہلا ون ڈے کھیلا اور صرف انیس سال کی عمر میں ڈیبیو کرنے والے آسٹریلیا کے تیسرے کھلاڑی بن گئے۔پہلے میچ میں ان کی کارکردگی کچھ خاص نہیں رہی جس کی وجہ سے ٹیم سے باہر ہو گئے۔2013 کے میٹاڈور کپ میں شاندار کارکردگی پر انہیں ساؤتھ افریقا کے خلاف ون ڈے اسکواڈ میں شامل کیا گیا۔اس سیریز میں ان کی کارکردگی شاندار رہی اور انہوں نے تین میچوں میں نو وکٹیں حاصل کیں۔ون ڈے میں

شاندار کارکردگی دکھانے کے بعد انہیں انڈیا کے خلاف ٹیسٹ سیریز میں شامل کیا گیا۔انہوں نے دوسرے ٹیسٹ میں برسبین کے میدان پر اپنا ڈیبیو کیا اور پہلی ہی اننگ میں پانچ وکٹیں حاصل کیں۔لائن اور لینتھ پر مکمل کنٹرول ہی ان کی باؤلنگ کی

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

خاصیت ہے۔اس کے علاوہ وہ ٹیسٹ میں لمبے سپیل پھینکنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔2015 کے عالمی کپ میں بھی ان کی پرفارمنس شاندار رہی اور کوارٹر فائنل میں وہ پاکستان کے خلاف چار وکٹیں حاصل کر کے وہ مردِ میدان قرار پائے۔کرکٹ کے پنڈتوں کے مطابق ہیزل آسٹریلین ٹیم باؤلنگ اٹیک کیب لیڈر بننے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں اور ٹیم کو ان سے بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔

مستفیض الرحمان

آج سے کچھ عرصہ پہلے تک بنگلہ دیش کی ٹیم بڑی ٹیموں میں کچھ خاص مقام نہیں رکھتی تھی مگر 2015 کے عالمی کپ میں شاندار پرفارمنس دکھانے کے بعد بنگالی حقیقی ٹائیگرز کے روپ میں نظر آئے۔2015 میں انڈیا نے بنگلہ دیش کا ٹور کیا۔اس سیریز کے پہلے میچ میں بنگلہ دیش کے نوجوان فاسٹ باؤلر مستفیض نے اپنا ڈیبو کیا اور آتے ہی چھا گئے۔پہلے دونوں ایک روزہ میچوں میں مستفیض نے پانچ پانچ وکٹس حاصل کر کے سب کو حیران کر دیا۔مستفیض کی یہ کامیابی بلاوجہ نہیں۔چھ ستمبر 1995 کو بنگلہ دیش کے ایک قصبہ میں پیدا ہونے والے مستفیض الرحمان کو بچپن سے ہی کرکٹ کا شوق تھا۔اس شوق کو

پورا کرنے کے لیے صرف بارہ سال کی عمر میں وہ گھر سے چالیس کلو میٹر دور ایک شہر میں کرکٹ کھیلنے کے لیے جاتے۔مستفیض نے اپنی تعلیم پر کرکٹ کو ترجیح دی۔انڈر 19 میں اپنی بہترین باؤلنگ کی وجہ سے وہ سلیکٹرز کی توجہ کا مرکز ..... بن گئے۔2014 میں لسٹ اے اور فرسٹ کلاس کرکٹ میں شاندار کارکردگی دکھانے کی وجہ سے ان کی سلیکشن انڈیا کے خلاف سیریز میں ہوئی۔بنگلہ دیش نے تین میچوں کی یہ سیریز دو ایک سے جیتی۔مستفیض نے اس سیریز میں تیرہ وکٹس حاصل کیں۔یہ کارنامہ انجام دینے والے وہ دنیا کے دوسرے باؤلر ہیں۔ساؤتھ افریقا کے خلاف ون ڈے سیریز میں جیت میں بھی مستفیض نے اہم کردار ادا کیا۔2016 کی انڈین پریمیر لیگ میں مستفیض کے سامنے اے بی ڈویلیئر اور ویرات کوہلی جیسے بیٹسمین بھی بے بس دکھائی دیے۔انہوں نے اس لیگ میں اپنی ٹیم حیدرآباد کی جیت میں اہم کردار ادا کیا اور ایمرجنگ پلیئر کا ایوارڈ جیتنے میں کامیاب رہے۔اب تک کھیلے گئے نو ایک روزہ میچوں میں مستفیض صرف بارہ کی باؤلنگ ایوریج سے چھبیس وکٹس حاصل کر چکے ہیں جس میں تین بار پانچ وکٹس کا گلر شامل ہے۔اس پرفارمنس کو دیکھتے ہوئے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مستفیض اپنی ٹیم کا شاندار مستقبل ہیں۔

کوشل پریرا

2014 کے ورلڈ کپ کا پہلا میچ تھا۔سری لنکا اور ساؤتھ افریقا کی ٹیمیں آمنے سامنے تھیں۔سری لنکا کی طرف سے نوجوان اوپنر بیٹنگ پر آیا۔اس کے سامنے ساؤتھ افریقا کا مشہور باؤلر ڈیل اسٹین تھا۔اسٹین کی پہلی بال ایک فل لینتھ ڈیلیوری تھی اور نوجوان بلے باز نے اسے ایک خوب صورت شاٹ کے ساتھ باؤنڈری سے باہر پھینکا۔کنٹری کرنے والے حیران رہ گئے۔ورلڈ نمبر ون باؤلر کے ساتھ یہ سلوک کرنے والے بلے باز کوشل پریرا تھے۔اس میچ میں پریرا نے شاندار اننگز کی اور اپنی ٹیم کو جیت سے ہمکنار کیا۔چھبیس سالہ کوشل پریرا سری لنکا کے ایک چھوٹے سے شہر میں پیدا ہوئے۔کرکٹ کا بے پناہ شوق ہونے کی وجہ سے گیارہ سال کی عمر سے کرکٹ کھیل رہے ہیں۔وہ پیدائشی طور پر دائیں ہاتھ کے ہیں مگر مشہور سری لنکن اوپنر جے سوریا کا فین ہونے کی وجہ سے بائیں ہاتھ سے کرکٹ کھیلتے ہیں۔انڈر 19 میں شاندار کارکردگی دکھانے کی وجہ سے سری لنکن ٹیم میں سلیکٹ ہوئے۔شروع میں کھیلنے کا چانس کم ملا مگر 2013 میں آسٹریلیا کے خلاف پلینگ الیون میں انہیں چانس دیا گیا۔اس کے بعد یہ مستقل ٹیم کا حصہ ہیں۔پریرا اپنے ون ڈے کیریئر میں تین سنچریاں اور آٹھ نصف سنچریاں اسکور کر چکے ہیں جس میں دوسری تیز ترین نصف سنچری شامل ہے۔کمار سنگاکارا کے بعد وکٹ کیپنگ گلوز بھی پریرا سنبھالے ہوئے ہیں۔نوجوان کی کارکردگی دیکھ کر انہیں مستقبل کا بے سوریا قرار دیا جائے تو کچھ غلط نہ ہوگا۔

☆.....

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

شمشال سے ٹورنٹو

ندیم اقبال

شاعر نے غلط نہیں کہا ہے کہ چاند میری زمیں پھول میرا وطن۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ میرا وطن چاند سے بھی زیادہ خوب صورت ہے۔ اس کی وادی، اس کے دریا، شہر وکوہسار سب کے سب بے نظیر و بے مثال ہیں۔لیکن ان فضاؤں سے جو نکل کر کسی اور شاخ پر آشیانہ سجانے کی خواہش کرتا ہے۔ اسے کیسی کیسی پریشانیاں گھیرتی ہیں اس کا ذکر۔جو یورپ و امریکا میں بسنا چاہتے ہیں وہ اس تحریر کو ضرور پڑھیں۔

ایک جداگانہ انداز کی دلچسپ سفر کہانی کا بارہواں حصہ

سنگدل سنگھ ڈرائیونگ کرتے ہوئے بھی متواتر بولے جارہا تھا۔ ”بابا کینیڈا آکر بھی نہیں بدلا اب بھی خود کو پنجاب میں بیٹھا سمجھتا ہے۔ کینیڈا میں خود کو بدلنا پڑتا ہے۔“ ابھی اس نے یہ کہا ہی تھا کہ پیچھے سے ایک پولیس کار نے ہوٹر بجایا اور پھر سنگدل نے گاڑی سڑک کنارے روک لی۔ سنگدل سنگھ نے زیرلب گالیاں نکالیں اور اپنے کاغذات نکالنے لگا۔ پولیس والا اپنی گاڑی سے اتر کر ہماری جانب آیا اور آگے بڑھ کر مسکراتے ہوئے مصافحہ کیا اور پھر موسم کی تعریف کی جو میرے

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

Downloaded From Paksociety.com

خیال میں بنتی نہ تھی۔ پولیس مین نے لائسنس، انشورنس اور رجسٹریشن کے کاغذات مانگے تو سنگدل سنگھ نے تینوں چیزیں آگے بڑھا دیں۔ پولیس والے نے سب کاغذات اور لائسنس پکڑے اور اپنی گاڑی میں بیٹھ کر کمپیوٹر پر ان کی جانچ پڑتال کرنے لگا۔ سنگدل اسی دوران پولیس والے کو اپنی کار میں بیٹھا گالیاں دیتا رہا۔ کچھ دیر بعد پولیس والا آیا اور بولا۔ ''ایک ایکسیڈنٹ چار سال پہلے آپ کر چکے ہیں اور اب کی بار بھی آپ کی اسپیڈ۔۔۔ زیادہ تھی۔ سیکنڈ وارننگ کے ساتھ اس نے زیادہ اسپیڈ کا ٹکٹ کاٹ کر سنگدل کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ پھر اس نے دوسری مشین نکالی اور سنگدل کے دہانے سے قریب کر کے دیکھنے لگا۔ میٹر نے جو بتایا اسے دیکھ کر اس کی جبیں پر سلوٹیں ابھر آئیں۔ اس نے میٹر بند کر کے کہا۔ ''نشے کی حالت میں ڈرائیو کرنا سنگین جرم ہے۔ آپ ڈرائیونگ سیٹ سے ہٹ جائیں۔''

اور پھر ایک اور ٹکٹ اسے تھما دی۔ سنگدل سے کہا کہ الکوحل کا لیول اتنا زیادہ نہیں ہے ورنہ تمہارا لائسنس یہیں ضبط کر لیتا۔ پھر مجھے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میرے پاس تو لائسنس بھی نہیں تھا مگر میں نے سیٹ سنبھال لی۔ لائسنس تو کیا مجھے تو ڈرائیونگ بھی نہیں آتی تھی۔ پولیس والا اصولی طور پر میرا لائسنس پہلے دیکھتا اور پھر مجھے ڈرائیونگ سیٹ پر بٹھاتا۔ مگر وہ چوک گیا تھا۔ مجھے بٹھا کر خود تو چلتا بنا۔ اب میں نے سنگدل سے کہا۔ ''مجھے تو ڈرائیونگ بھی نہیں آتی اور نہ لائسنس ہے۔'' سنگدل نے حیرت سے میری جانب دیکھا اور پولیس والے کو ایک شاندار گالی دی۔ جو جا چکا تھا۔ پھر ڈرائیونگ سیٹ پر سے مجھے اٹھا کر خود آ بیٹھا۔

یہ تمام وارننگ اور ٹکٹس کا ریکارڈ دو سال تک سنگدل کے کھاتے میں ڈال دیا گیا تھا اور اسے چھ پوائنٹس پڑ چکے تھے اگر دو سال میں یہ پوائنٹس بارہ ہو جاتے تو اس کا لائسنس کچھ عرصے کے لیے ضبط کر لیا جاتا۔ لائسنس ضبطگی کا مطلب یہ تھا کہ وہ آرام سے اپنے پنجاب جا کر بیٹھ جاتا۔ یہاں تو اس کی زندگی ایک اپاہج والی بن کے رہ جاتی لیکن سنگدل سنگھ مسکرا رہا تھا۔ جانے کے لیے مسکراتے ہوئے اس نے کار آگے بڑھا دی۔

پھر کچھ دیر آج باپو نے میری بھی چڑھا لی ہے۔ پھر اس پولیس والے نے ایک ''معمولی'' سی غلطی اور ذرا سی اسپیڈ تیز کرنے پر ڈرائیونگ لائسنس کے ریکارڈ میں یہ سب سبق دیا ہے جس کا خمیازہ مجھے جرمانے اور خراب ریکارڈ کی بدولت دو سال بھگتنا پڑے گا۔'' پھر میری معلومات میں یہ اضافہ کیا۔ ''دو سال بعد یہ سب ریکارڈ آپ کے کھاتے سے نکال دیا جاتا ہے اگر آپ کوئی اور غلطی اسی دوران نہ کریں۔'' اب وہ احتیاط سے گاڑی چلا رہا تھا شکر ہے نشے میں ہونے کے باوجود اس کا لائسنس اسی وقت اس نے ضبط نہ کیا تھا۔

اپارٹمنٹ پہنچا تو سرجی چہرے پر خفگی کا ماسک چڑھائے کارپٹ پر خاموش لیٹے تھے۔ شہباز حسبِ سابق لیٹا اپنی زندگی کو مسلسل کوسے چلا جا رہا تھا۔ مفتی سب سے بے پرواہ اپنے میٹرس پر ٹیک لگائے ٹی وی میں گھسا ہوا تھا۔ سرجی کا شکوہ مجھ سے یہ تھا کہ مجھے ین کی سرجی سے لگاوٹ دیکھی نہیں جاتی ہے اور یہ گلہ بھی تھا کہ میں مایا اور شہباز کے کھاتے پیتے عشق میں خاموش رہتا ہوں اور سرجی کی اس غوطہ زنی پر میں ان سے حسد کرتا ہوں اور یہ بھی کہا کہ جب بھی ان کی ین سے آنکھیں چار ہوتی ہیں تو میں کیا ساری کلاس اس کی بیری ہو جاتی ہے۔

آج کل سرجی نے اپنی گفتگو میں محاورے بولنا شروع کر دیے تھے۔ شروع میں وہ کچھ دبے دبے رہتے تھے مگر اب وہ کچھ کھل رہے تھے۔ اہل زبان تو وہ تھے گو پشاور میں پلے بڑھے تھے مگر ٹکسالی اردو بولتے تھے اور شادی لاہور میں کی تھی اور اب کینیڈا میں اپنے جوہر دکھلا رہے تھے۔

کھانا کھا کر میں نے سب کا جرگہ بٹھا دیا اور ان کے سامنے سرجی کا شکوہ پیش کیا اور کہا کہ اب جرگہ فیصلہ کرے کہ میں کہاں غلط ہوں۔

سرجی بولے۔ ''غلط تو میں ہی ہر وقت ہوتا ہوں۔ ایک ننھی سی جان کے ساتھ دو چار بول کیا بول لیے تو لوگ برداشت ہی نہ کر سکے۔''

لوگ سے مراد میں ہی تھا۔ میں اپنی مسکراہٹ چھپائے ایک ملزم کی طرح بیٹھا تھا۔ جرگے کے بیچ مفتی نے سرجی سے سوال پوچھا۔ ''ین بھی کیا آپ سے اتنی محبت کرتی ہے، جتنی آپ اس سے کرتے ہیں؟''

سرجی اس سوال پر اٹھے، کمرے سے کمبل لا کر اپنے آپ کو اس میں لپیٹا اور دوبارہ اپنی جگہ پر بیٹھ کر بولے۔ ''وہ مجھے دیکھ کر آتش زیر پا ہو جاتی ہے۔''

میں نے کچھ دیر حیرت سے چھت کی جانب دیکھ کر اس فقرے پر کچھ غور کیا کہ اس فقرے کا مطلب کیا ہے؟

مفتی بھی یہ سن کر سیدھا بیٹھ گیا اور شہباز ''کیا کہا، کیا کہا'' کہتا ہوا بمشکل اپنی جگہ سے اٹھا اور ابرو کو بار بار اٹھاتے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ہوئے بولا۔ ''یہ کیا سیاپا بولا ہے؟''

سر جی شرما کر نظریں جھکائے جھکائے بولے۔

''مطلب ہے کہ بے قرار ہو جاتی ہے۔'' میں منہ پر ہاتھ رکھے اپنی ہنسی دبائے بیٹھا تھا، سر جی نے اپنی بات آگے بڑھائی۔

''وزن تو ہم دونوں کا برابر ہی ہوگا مگر پیار کا وزن شاید اس کا کچھ زیادہ ہے۔''

اب مفتی پہلو بدلتا اور شاید یہ سوچ رہا تھا کہ سر جی بہک تو نہیں گئے یا ہمیں بہکا رہے ہیں۔ لیکن شہباز پھٹ پڑا۔

''کل تو میں سینٹر نہیں جا رہا مگر پرسوں دونوں کو باری باری گود میں اٹھا کر تول لوں گا۔''

سر جی بگڑ گئے۔ ''خبردار! اگر جو آرے جیسے اپنے ہاتھ اس معصوم جان کو لگائے بھی تو۔''

اب مجھ سے پوچھا گیا کہ میں کیوں سر جی سے جیلس ہوں۔ میں ندامت سے سر جھکائے بیٹھا مسکراتے ہوئے بولا۔ ''میں اپنی اس حرکت پر نادم ہوں۔ مجھے کسی کے پیار کے بیچ ظالم سماج کی طرح نہیں آنا چاہیے تھا۔''

پھر شہباز بھی اپنا شکوہ لے آیا۔ ''ندیم بھائی میرے اور مایا کے درمیان بھی دیوار بنے ہوئے ہیں۔''

بچ نے کافی دیر سوچنے سے گریز کرتے ہوئے یہ فیصلہ دے دیا کہ اب ندیم کسی کے پیار میں کسی قسم کے روڑے نہیں اٹکائے گا۔

اس اعلان پر سر جی مطمئن ہو گئے اور مفتی مسکرا کر مجھے میرے فیصلے پر قائم رہنے کا وعدہ یاد دلانے لگا۔

سر جی بہت سی باتیں اپنی معصومیت میں کر جاتے اور پھر ہمارے لطف اندوز ہونے پر وہ زیادہ شوخ ہو گئے تھے۔ ہمیں بھی ان کی حرکتیں نہیں کھٹکتی تھیں کیونکہ وہ بے حد مخلص انسان تھے۔ ہمارے لیے وقت سے پہلے کھانا تیار کر لیتے، ہم جب کہتے کہ ہر ایک کو کام بانٹا ہوا ہے اور سب کو اپنا اپنا کام کرنے دیں تو کہتے۔ ''دوستوں کے لیے میں اپنی رضامندی اور خوشی سے ان کا کام کرتا ہوں اور مجھے منع مت کیا کریں۔''

وہ یہ بات ہمیں حکم دیتے ہوئے کہتے تھے۔ کئی بار سب کو ان کے ہاتھوں چائے پکڑا کر خود بیٹھ جاتے۔ جب ہم پوچھتے۔ ''آپ چائے خود کیوں نہیں پی رہے؟'' تو کہتے۔ ''میرا اپنا موڈ تو نہیں ہے لیکن آپ کے تھکے چہروں سے اندازہ لگا لیتا ہوں کہ آپ لوگوں کو چائے کی طلب ہو رہی ہے۔'' اپنے کپڑے استری کرنے لگتے تو سب سے پوچھتے پھرتے۔ ''کسی نے مفت میں کپڑے استری کروانے ہیں؟'' یہ ان کا انداز تھا۔ ہم سے کوئی بھی انہیں اپنے..... کپڑے استری نہ کرنے دیتا مگر کبھی کبھار وہ خود اپنے پسند سے اٹھا کر استری کر دیتے اور جواز یہ دیتے کہ ''بہت دنوں سے یہ آپ نے نہیں پہنے۔'' حالانکہ وہ ہم دو دن پہلے بھی پہن چکے ہوتے۔ کھانے کے برتن اٹھا کر خود دھونا شروع کر دیتے۔ کئی بار ان کے ہاتھوں ہمیں برتن چھیننا پڑ گئے تھے۔ سر جی کے خلوص کو وہ لوگ بہتر جان سکتے ہیں جو ''چھڑے'' مل کر ہماری طرح رہتے ہیں۔ میں پاکستان میں کئی بار اس طرح رہ چکا تھا مگر سر جی جیسا فرشتہ صفت اور مخلص انسان کبھی نہیں دیکھا۔ ان کی معصومیت کی وجہ سے ہی تو میں انہیں کہیں اور شفٹ نہ کرنا چاہتا تھا۔

پھر مفتی نے مجھے اپنا فتویٰ دے دیا تھا اور میں نے یہ فیصلہ اپنی مسکراہٹ دبائے قبول کر لیا تھا۔

شہباز دوبارہ بمشکل اٹھا اور سونے کے لیے کمرے میں ہنستا ہوا چلا گیا ساتھ ہی ساتھ یہ اعلان بھی کر گیا۔ ''مجھے آج ہلکا بخار ہے۔ کل میں سینٹر نہیں جاؤں گا۔''

میں اور سر جی دوسرے دن صبح کین سینٹر روانہ ہوئے۔ بس میں بیٹھے تھے کہ سر جی کا الاپ شروع ہو گیا وہ مسلسل یہ کہہ رہے تھے۔ ''مجھے نہیں لگتا کہ مایا شہباز سے پیار کرتی ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''یہ آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں۔ کیا مایا نے کوئی بات کی ہے؟''

''مایا نے تو نہیں کی لیکن شہباز کی دن بدن بڑھتی ہوئی مایوسی بتا رہی ہے۔'' سر جی کچھ سوچ کر بولے۔ پھر اپنی بات کو آگے بڑھایا۔ ''میرا پیار تو سچا ہے مگر ساری کلاس سمجھتی ہے کہ ہم تینوں انتہا کے ٹھرکی ہیں۔ سچ ہے کہ آٹے کے ساتھ گھن بھی پسا جاتا ہے۔''

میں نے انہیں سمجھایا۔ ''شہباز تو کنوارہ ہے اور اپنے کنوارے ہونے کی قسم بھی کھا سکتا ہے اور اسے اپنی محبت کے چنگل میں پھنسانے کے لیے لڑکیوں کی کوئی کمی ہے؟''

وہ بولے۔ ''مایا کے علاوہ کوئی بھی اس کے ماتھے چڑھ جائے، مجھے کوئی پرواہ نہیں۔ پر مایا اس کے عذاب سے بچ جائے۔''

میں چڑ کر بولا۔ ''آپ کو مایا سے اتنی ہمدردی کیوں ہو گئی ہے؟''

وہ ایک دم شرما گئے اور نظریں نیچی کر کے بولے۔ ''دراصل میری نظریں این سے ہٹ کر اب مایا کی جانب ہو گئی ہیں۔ ان چینی لڑکیوں سے پیار کرنے کا سواد بھی نہیں آتا۔ ایسا لگتا ہے کہ آپ نے کوئی بلی پال رکھی ہے۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

میں نے پوچھا۔ ''جو رات آپ اپنے ین سے سچے عشق، ننھا سا دل اور کن کن مشکل الفاظ میں بہت کچھ کہہ رہے تھے، اس محبت کا کیا ہوا؟''

بولے۔ ''کبھی کبھی وہ محبت کینیڈا کی سردی میں منجمد ہو جاتی ہے۔''

ہم باتیں کرتے ہوئے ٹرین میں آکر بیٹھ چکے تھے۔

ٹرین جب اگلے اسٹیشن پر رکی تو اتفاق سے مایا اس بوگی میں سوار ہوئی جس میں ہم دونوں براجمان تھے۔ سرجی کی نظر ابھی اس پر نہیں پڑی تھی۔ اس نے ہمیں دیکھا تو سیدھا ہماری طرف آئی۔ سرجی اسی دوران مایا مایا کا ورد جاری رکھے ہوئے تھے۔ وہ آئی، گڈ مارننگ کہا اور ہمارے سامنے والی خالی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ سرجی اس کو اچانک دیکھ کر بے ہوش ہونے والے ہو گئے تھے۔ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا تھا۔ انہیں یقین نہ آرہا تھا کہ جس کا ذکر وہ کرتے آرہے تھے وہ اچانک اس طرح نمودار ہو جائے گی۔ وہ ایسے بیٹھے تھے کہ جیسے ان کا بھانڈا پھوٹ گیا ہو۔ مجھے ان پر ہنسی آرہی تھی۔

سرجی کو تو چپ لگ گئی تھی۔ مجھ سے مایا نے پوچھا۔ ''جاب کا کیا ہوا؟''

میں نے کہا۔ ''ابھی تو انتظار ہو رہا ہے۔''

وہ کہنے لگی۔ ''تم کو یہ جاب مل جائے گی۔''

میں حیران تھا کہ سب اتنے یقین سے کیسے کہہ رہے ہیں کہ ہیمو سال کی جاب مجھے ہی ملے گی۔ میں نے باتوں کا رخ بدلنے کے لیے اس سے پوچھا۔ ''کیا اکیلی رہتی ہو؟''

وہ بولی۔ ''رہتی تو اکیلی ہوں مگر بوائے فرینڈ بھی کبھی کبھار آجاتا ہے۔'' یورپین لڑکیوں کا بوائے فرینڈ ہونا کوئی اچنبھے کی بات نہ تھی مگر سرجی تو یہ سن کر اس فانی دنیا سے فنا ہونے والے ہو گئے تھے۔ صدمے سے جھٹکے کھانے لگے۔

میرے کان میں تڑپ سے بولے۔ ''یہ تو آستین کا سانپ نکلی۔'' پھر بے چارگی سے کہا۔ ''اس کے بوائے فرینڈ کا نام پوچھو۔''

مایا نے کہا۔ ''کیا میری بات ہو رہی ہے؟''

میں نے کہا۔ ''ہاں! یہ پوچھ رہا ہے کہ وہ خوش قسمت کون ہے؟''

اسے اس کا نام چھپانے کی کوئی ضرورت نہ تھی مگر اس کے بتانے سے پہلے ہی ہمارا اسٹاپ آگیا۔

ہم اترے تو سرجی مسلسل بول رہے تھے۔ پہلے تو مایا کو کوسے چلے جا رہے تھے۔ ''پتا نہیں! اپنے آپ کو شاخ زعفران سمجھتی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''خوب صورت تو ہے مگر اب کھوج یہ لگانا ہے کہ یہ بوائے فرینڈ کون ہو سکتا ہے؟''

میں جان بوجھ کر رخ شہباز کی جانب موڑ رہا تھا پھر سازشی انداز سے آہستگی سے کہا۔ ''یہ اپنا شہباز نہ ہو؟'' اس پر کچھ غصے سے بولے۔ ''ذرا زور سے تو بولو۔ آپ تو بات ایسے کرتے ہیں جیسے آپ سنیں، آپ کا ازار بند سنے۔'' وہ پھر میرے زور سے بتانے پر میرے جال میں آگئے اور کہنے لگے۔ ''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ یہ شہباز ہی ہوگا۔ یہ ہمیں دھوکا دے رہا ہے کسی فوڈ فیکٹری کی جانب نہیں جاتا، اسی سے ملنے جاتا ہوگا۔''

میں نے کہا۔ ''مگر وہ تو مچھلیوں کی بو کی وجہ سے ماسک بھی ساتھ لے جاتا ہے۔''

سرجی مصر تھے کہ وہ مایا کو بھی گھڑے کی مچھلی سمجھتا ہے۔

ہم بس میں آبیٹھے تھے جو کین سینٹر کو جاتی تھی۔ مایا کہیں دور بیٹھ چکی تھی اور سرجی کو چین نہیں آرہا تھا۔ وہ تسلسل کے ساتھ ماتم کر رہے تھے۔ آخر میں نے تنگ کرتے ہوئے کہا۔ ''پہلے تو وہ خوش قسمت بوائے فرینڈ شہباز نہیں ہو سکتا اور اگر ہے بھی تو آپ نے اتنا فساد کیوں ڈالا ہوا ہے، پلیز اب آپ چپ ہو جائیں۔''

وہ چپ تو ہو گئے مگر مسلسل بڑبڑائے چلے جا رہے تھے۔ ''ہتھیار تو میں بھی کبھی نہیں پھینکوں گا اور یہ بھید تو میں بھی نہ کبھی کھول کر رہوں گا۔'' میں نے ان کی بڑبڑاہٹ سن لی تھی تو میں بولا۔ ''پہلے ہتھیار اٹھائیں تو سہی۔ پھینکنے یا تانے رکھنے کی نوبت تو بعد میں آئے گی۔''

میں نے انہیں تاکید کی کہ شہباز سے مایا کے بوائے فرینڈ کی کوئی بات نہ کرنا۔ انہوں نے میری بات کو غور سے سنا، پھر سوچا اور پھر خاموش ہو کر مطمئن سے بیٹھ گئے۔ کیونکہ میں یہ ڈراما ابھی ختم نہ ہونے دینا چاہتا تھا۔ سرجی سمجھے کہ میں شہباز کے منہ سے سچ اگلوانا چاہتا ہوں۔

کین سینٹر پہنچے تو سرجی سیدھا ان کی جانب لپکے کہ کہیں وہ بھی ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ انہیں میں نے اپنے حال پر چھوڑا اور نسرین کے ساتھ آکر بیٹھ گیا۔ میں نے یہ نوٹ کیا کہ اب ین بھی سرجی کو غور سے دیکھ رہی تھی۔

کلاس شروع ہو چکی تھی۔ کلاس میں تیز خوشبو لگانے کی اجازت نہ تھی مگر نسرین سے مسلسل معطر خوشبو آرہی تھی۔ میں نے پوچھا تو بولی۔ ''میں نے تو کوئی پرفیوم نہیں لگایا مگر شکر ہے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کہ تمہیں مجھ سے کم از کم خوشبو تو آتی محسوس ہوئی۔"

میں ذرا سا شرمندہ ہوا تو وہ ہنس کر بولی۔ "نہیں! میں نے آج پرفیوم لگایا تھا، شاید زیادہ چھڑک لیا۔"

کافی کا وقفہ ہوا تو مارک نسرین کی جانب دیکھ کر مجھ سے بولا۔ "چلو تم تو کام پر لگ گئے۔ میں کہتا تھا ناں کہ وہ تم میں دلچسپی لے رہی ہے۔"

میں اس سے پہلے کھلکھلا کر ہنستا تو دیکھا کہ سرجی اور ین کونے میں کھڑے کھسر پھسر کر رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر میں زیادہ زور سے کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ مارک اور نسرین بھی خوب ہنس رہے تھے مگر سرجی کو آس پاس کی خبر بھی نہ تھی۔ اب کلاس کے بہت سے اسٹوڈنٹس سرجی کے پیار سے آگاہ ہو چکے تھے اس کے بارے میں جاننے لگے تھے مگر نہ جانتی تھی تو وہ صرف ین تھی۔

وقفے کے بعد کلاس میں الزبتھ اپنے پرانے لیکچر دہرا رہی تھی کہ اتنے میں اشوک دروازے میں نمودار ہوا اور بولا۔ "ندیم کا ایمپلائر کی طرف سے فون ہے۔"

سب کلاس فیلو اور الزبتھ خوشی سے میری جانب دیکھنے لگے۔ الزبتھ سمیت سب خاموش تھے اور میں اشوک کے ہمراہ باہر چلا گیا۔

اشوک نے باہر آکر بتایا۔ "ابھی شہباز کا فون آیا ہے کہ ہیموسال سے ثمارا تم سے بات کرنا چاہتی ہے۔"

اشوک کے ڈیسک سے میں نے ثمارا کو فون ملایا تو اسی نے اٹھایا اور بولی۔ "مسٹر ندیم! میں ہیموسال کی جانب سے آپ کو جاب کی آفر کرتی ہوں اور کیا آپ تیرہ مارچ سے جاب جوائن کر سکتے ہیں۔"

وہ فروری کی چھبیس تاریخ تھی اور دوپہر کا ایک بجا تھا۔

آج سے پورے تین ماہ پہلے چھبیس نومبر کو میں نے کینیڈا کی زمین پر لینڈ کیا تھا۔ وہ لمحہ مجھے اس وقت بھی یاد آرہا تھا جب میں ثمارا سے یہ آفر سن رہا تھا۔

ہر انسان اپنی زندگی کے سفر میں مختلف مراحل سے گزرتا ہے۔ اس وقت تک زندگی بے سمت رہتی ہے جب تک ذمہ داریوں کا بوجھ کندھوں پر نہیں پڑتا۔ میری زندگی ایک طرح سے ٹھیک ٹھاک گزر رہی تھی مگر حالت اس پرندے جیسی تھی جو اپنے پنجرے میں اڑان بھرنے کے لیے پھڑپھڑاتا ہے۔ میں نئے جہانوں کی تلاش میں کینیڈا آنکلا تھا۔ میں نے کچھ خواب بُنے تھے اور ایک ایسی زندگی کا تصور پالا تھا جہاں کی زندگی آسائشوں سے بھری ہوگی۔ جہاں کوئی خوف اور ڈر نہ ہوگا۔

اپریل 2017ء کا شمارہ..... بدلتے موسموں کا اظہار

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

مزید

خطوط کی محفل، محفل شعر و سخن اور ملک صفدر حیات کی جستجو

جواز

دوستی، دشمنی اور نفرت و چاہت کے جذبات کے درمیان کشمکش اور نیکی و بدی کے درمیان معرکہ آرائی کی دلچسپ داستان......

آخری صفحات پر...... نعمان اسحاق کے قلم کا جادو

کافر نعمت

انسان جب اوقات سے زیادہ پاتا ہے تو اپنی اوقات بھول جاتا ہے، ابتدائی صفحات پر ڈاکٹر ساجد امجد کا سحرانگیز انداز

شیش محل

لٹے پٹے خاندانوں کا تباہ کن حال...... قیام پاکستان کے خونی واقعات کی شمولیت...... اسماء قادری کے خیالات کی پرواز

وقت

وقت اپنی رفتار سے چلتا ہے۔ یہی وقت کی خوبی ہے اور شاید کچھ کے نزدیک ظلم بھی...... کہ وہ کبھی کسی کو خاطر میں نہیں لاتا......

حسام بٹ کے قلم سے تلاطم خیز واقعات کا نیا سلسلہ

اس کے علاوہ

تنویر ریاض، اختر علی، ڈاکٹر شیر شاہ سید، سلیم انور اور ثمر عباس کی تحریریں آپ کی منتظر

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

جہاں قدم رکھتے ہی میں فرش سے عرش پر جا کھڑا ہوں گا۔ میں اپنے بھیگتے خواب لیے ٹورنٹو کے پیرسن ایئرپورٹ کے باہر بھیگتے موسم میں کھڑا ٹیکسی کی ڈگی میں اپنا بھاری بیگ رکھ رہا تھا جب شہباز نے کہا تھا۔ ''حالات بہت خراب ہیں، بہت سیاپا ہے۔'' مجھے اس کی باتیں اس وقت بچکانہ محسوس ہوئی تھیں۔ ٹورنٹو میں میری پہلی رات ہی کو میرا کمرا میرے لیے قبر بن گیا تھا۔ وہ پرندہ جو اپنے وطن کو پنجرہ سمجھ بیٹھا تھا اور اب ایک لمبی اڑان بھر کے اپنا راستہ بھول بیٹھا تھا۔ پیچھے یادیں تھیں اور واپسی کا کوئی راستہ نہ تھا۔ آگے سرد اور برفیلے تھپیڑے تھے جو روح کو بھی چیر کر رکھ دیتے تھے اور مجھے ان جھکڑوں میں آگے بڑھنا تھا۔ یہاں کے سب تارکین وطن اندھوں کی طرح ٹٹول ٹٹول کر آگے بڑھنے کی سعی کر رہے ہیں۔ کوئی ایک سال سے اور کوئی دو سال سے یہاں دھکے کھا رہا تھا اور کوئی ڈھنگ کی جاب نہ تھی۔ ان کی حالت زار دیکھ کر میں پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھتا اور واپسی کو پلٹنا چاہتا تھا مگر میں تو اپنے سارے نشان بھی کھرچ چکا تھا۔ پھر اپنے رب کے آگے گر گیا، گڑگڑایا اور رویا تو اس نے وسیلے پیدا کیے۔ ہمت عطا کی اور میں بھی اسی بھیڑ میں کسی نہ کسی کے دامن کو پکڑے آگے بڑھنے لگا۔

''ہر طرف پھیلا ہوا تھا بے یقینی کا دھواں
خود بخود فاروق پھر ایک راستہ بنتا گیا''

اور آج ثمارا کہہ رہی تھی۔ ''میں ہیمو سال کی جانب سے آپ کو جاب کی آفر کرتی ہوں اور کیا آپ تیرہ مارچ سے جوائن کر سکتے ہیں؟''

میرے بہت سے دوست اور جاننے والے دوست سال دو سال سے یہ فقرہ سننے کے لیے بے تاب تھے اور میرے رب نے مجھے یہ خبر تین ماہ میں ہی مہیا کروا دی تھی۔ میں نے ثمارا سے پوچھا۔ ''جاب لیٹر کب ملے گا۔''

اس نے جواب دیا۔ ''وہ ہم دو چار دن میں میل کر دیں گے۔''

میرے ذہن میں ایسے ہی خیال آ گیا اور کہنے لگا۔

''کل یا پرسوں میں خود آ کر اپنا جاب لیٹر لے سکتا ہوں؟''

اس نے کچھ سوچا اور جواب دیا۔ ''پرسوں جمعہ کے دن تین بجے آ کر لے جانا۔''

مجھے معلوم نہ تھا کہ میرا بروقت یہ جاب لیٹر لینا آگے چل کر مجھے کتنی بڑی مصیبت سے بچائے گا۔

فون تو دو منٹ کی بات کے بعد ہی بند ہو گیا تھا۔ میری آنکھیں تشکر سے نم تھیں۔ فون رکھا تو اشوک گھوم کر اپنے کاؤنٹر کے پیچھے سے آیا اور مجھے گلے لگا کر رونے لگا۔ اس کی آنکھیں میری طرح خوشی سے نم تھیں۔ اشوک کا رویہ اور خلوص میں تاحیات نہیں بھول سکوں گا۔ جس طرح وہ میری رہنمائی کرتا اور مشکل وقت میں تسلی دیتا تھا، ایسے کہ جیسے ہم مدتوں پرانے دوست ہوں۔ وہاں سے کلاس میں آیا اور یہ خبر سنائی تو پوری کلاس تالیاں بجا رہی تھی۔

الزبتھ نے بڑھ کر مصافحہ کیا اور مبارک باد دی۔ اس کے چمکتے چہرے سے خوشی کو میں پھوٹتے دیکھ رہا تھا۔ مارک، مایبو اور ین آ کر ملے اور اپنی خوشی کا اظہار کرنے لگے۔ ایرانی رضا آیا تو آج اس کی سرد نگاہوں میں گرماہٹ تھی۔ مایا آئی۔ خوب بھینچ کر مبارک باد دی اور دور ہو کر ہانپنے لگی۔ سرجی تو مجھ سے ہر گلے ملنے والے سے بھی گلے مل رہے تھے اور اسی چکر میں مایا کی بانہوں میں بھی جھول گئے۔ میں نسرین کو ڈھونڈ رہا تھا تو وہ دور اپنی کرسی پر بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھتے پایا تو دور سے ہاتھ ہلایا۔ اس کی آنکھوں میں دور سے معلوم نہیں کیا دیکھا تھا کہ میں اندر سے خالی ہو گیا کیونکہ شاید آج کا دن یا کل میرا کین سینٹر میں آخری دن تھا۔

الزبتھ نے کلاس ختم کر دی تھی۔ ہم کافی مشین کے قریب کھڑے تھے۔ سب یہی کہہ رہے تھے کہ میں کتنا خوش قسمت ہوں کہ تین ماہ میں اپنی فیلڈ کی جاب پر آ گیا ہوں۔ مارک آیا اور مجھے اپنی مضبوط ہاتھوں سے کھینچتا ہوا ایک کونے میں لے آیا اور متانت سے بولا۔ ''سب سے تم مل لیے اور جس کے ساتھ اتنی دوستی اور تعلق رہا، اس سے بات کرنا بھی گوارہ نہ کی۔''

اس کا اشارہ نسرین کی طرف تھا۔ وہ کافی مشین کے قریب نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ''وہ ہے کہاں؟''

''ابھی تک کلاس میں اپنی کرسی سے چپکی بیٹھی ہے۔'' مارک نے میرا ہاتھ دبا کر کہا۔

نسرین کے ساتھ نہ ہوتے ہوئے بھی ایک ناتہ تھا اور اسی ناتے سے میں اس کی حالت سمجھ رہا تھا اور اپنی بھی۔ مجھے علم تھا کہ اب یہاں میں کبھی نہیں آؤں گا۔ اس کا مطلب صاف تھا کہ فاصلے بڑھتے ہیں تو بڑھتے چلے جاتے ہیں جب تک آپ واپس مڑ کر نہیں دیکھتے۔ نہ میں اپنے آپ کو دھوکے میں رکھ سکتا تھا اور نہ اس کو اور یہ بات وہ بھی خوب جانتی تھی۔ ان چند ہفتوں نے ہمارے درمیان ایک ایسا انوکھا تعلق قائم کر دیا تھا کہ میں جتنا بھی حقیقت پسندی کے گہرے کنویں میں جھانکتا اتنا ہی میرا دل ڈوب سا جاتا۔ میں اس سے کوئی رشتہ نہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

رکھ سکتا تھا مگر اسے ہمیشہ کے لیے الوداع کہنے کا حوصلہ بھی نہ تھا۔ ہر دن مجھے نویدیں سنانے والی، میری اس کامیابی پر مجھ سے دور بیٹھی تھی۔ میں اس کی حالت سے بخوبی واقف تھا۔ کسی کے دل کی کسک کو میں کیسے نہ سمجھ سکتا تھا؟ میں خود بھی مغموم ہوگیا۔ پچھلے چند ہفتے ایسے گزارے تھے کہ میں بھول بیٹھا تھا کہ یہ عارضی پڑاؤ ہے۔ مجھے بھی اور دیگر احباب کو بھی یہاں سے جلد ہی کوچ کرنا ہے۔ پھر بھی دوستیاں قربت میں بدل گئی تھیں۔ کینیڈا آکر میں خالی اور منجمد ہوگیا تھا مگر نسرین نے جمے ہوئے دل کو اپنی دوستی اور خلوص سے پگھلا دیا تھا اور اب میں بہنے لگا تھا۔ یہ نہیں کہ اس کے پیار میں بلکہ زندگی کی رو میں بہنے لگا تھا۔

میں مارک کی سرزنش سے نکلا اور کلاس روم کی طرف آیا سوچا کہ اپنے دل پر جبر کر کے اس سے جدائی کی اجازت چاہوں گا۔ کچھ اس کو اور باقی اپنے آپ کو سمجھاؤں گا۔ اس کو دنیا کے کچھ راہ رسم بتاؤں گا کہ یہاں کوئی ساتھ حتمی نہیں ہوتا۔ ایک نہ ایک دن دوست بھی اپنی راہیں جدا کر لیتے ہیں اگر اس کی پلکیں بھیگیں تو اس کے آنسو پونچھ کر نکل جاؤں گا مگر پھر یہ سوچا

مجھے رونا نہیں آواز بھی بھاری نہیں کرنی
محبت کی کہانی میں اداکاری نہیں کرنی

دیکھا کہ نسرین اپنا بیگ سنبھالے کلاس سے نکل رہی تھی۔ پوچھا۔ ''کہاں جارہی ہو؟''

وہ بے تاثر لہجے میں بولی۔ ''بیٹے کو اسکول سے لینا ہے اور جلدی میں ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''ابھی تو ڈیڑھ گھنٹا رہتا ہے۔''

وہ خاموش رہی۔ میں بھی خاموش کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ اس کی سیاہ آنکھوں کو چپ سی لگ گئی اور میرا اپنا دل بھی آزردہ تھا کیونکہ یہ بات عیاں تھی کہ شاید اس دوستی کا سفر تمام ہوا چاہتا ہے۔ اس نے اپنا سرد ہاتھ بڑھا کر مصافحہ کیا اور جاب ملنے کی مبارک باد دی۔

میں نے کہا۔ ''کچھ دیر بیٹھ کر بات کر لیتے ہیں۔''

اس کی خاموشی میں نیم رضامندی تھی۔ اس نے قدم بڑھایا تو کرسی سے ٹھوکر لگی اور جب لڑکھڑائی تو میں نے تھاما تو اس کے سیاہ بال میرے چہرے پر بکھرے تھے اور سر میرے کندھے پر تھا۔ وہ وہیں تھم گئی اور میں بھی وہیں جم گیا تھا۔ اسی لمحے اس کی آنکھوں سے بہے آنسوؤں کے قطرے میری گردن پر انگارے بن کر آ گرے۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور احتیاط سے اسے اپنے وجود سے علیحدہ کیا۔ وہ اب بھیگی آنکھوں سے مسکرا رہی تھی۔ پوچھنے لگی۔ ''کل تو آؤ گے؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا۔ ''پرسوں سے شاید نہیں مگر یہ نہ بھولنا کہ ہائی پارک تمہی نے مجھے دکھانا ہے۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں پھر سے بولا۔ ''کل کا دن ہم اکٹھے گزاریں گے۔'' پھر ہم دونوں نے ہاتھ ملایا اور کافی مشین کی طرف آگئے جہاں سب موجود تھے۔ مارک نے ہمیں اکٹھے دیکھا تو دور سے اپنی بائیں آنکھ مسکراتے ہوئے دبائی اور اب کی بار میں مسکرایا نہیں بلکہ خاموش کھڑا رہا۔ جاب ملنے کی خوشی تھی مگر ان دوستوں سے بچھڑنے کا درد بھی ساتھ تھا۔ مختلف ملکوں، رنگوں، نسلوں اور زبانوں کے لوگ ایک ہی کشتی میں بیٹھے اچھے دوست بن گئے تھے۔ کچھ بہت قریب آگئے تھے جن کو اب بھرے دل سے رخصت کرنا تھا۔

سر جی نظر نہ آئے تو میں نے میامبو سے پوچھا تو وہ بولا۔ ''ابھی ین کے ساتھ باہر نکلا ہے۔''

میں اور نسرین مین گیٹ پر آئے تو دیکھا کہ سر جی اپنا لمبا کوٹ پہنے اپنے چھوٹے قدموں سے تیزی کے ساتھ فٹ پاتھ پر برف سے بچتے بچاتے بھاگے چلے جارہے ہیں اور ین دس قدم پیچھے اپنا ہینڈ بیگ کندھے سے لٹکائے ان کا ساتھ دینے کی کوشش کر رہی ہے جیسے سر جی ان کی کوئی چیز لے کر بھاگ رہے ہوں اور وہ ان کا پیچھا کر رہی ہو۔ یہ منظر دیکھ کر ہم دونوں کا قہقہہ نکلا تو اشوک بھی ہمارے قہقہوں میں آشامل ہوا۔ بعد میں شام کو سر جی سے آدھ گھنٹے کریدا تو معلوم ہوا کہ وہ ین کو کافی پلانے پر راضی کر کے لے گئے تھے۔

جیسے میں نے پہلے کہا تھا کہ ٹورنٹو کے موسم کو بدلنے میں کوئی دیر نہیں لگتی۔ جو درجہ حرارت ایک دن پہلے منفی بیس تک گر گیا تھا اور آج حیرت ناک طور پر دس درجے اوپر آچکا تھا۔ ڈھیروں پڑی برف کے نیچے سے برف پگھل کر پانی کی صورت رس رہی تھی اور پتھر سے تبدیل ہو کے پانی پانی ہو رہی تھی۔ ضروری نہ تھا کہ یہ درجہ حرارت یہی رہتا یا اس سے بھی بڑھ جاتا۔ ہوسکتا تھا کہ کل پھر منفی سے کئی درجے اور نیچے گر جائے۔ مگر آج کے موسم نے سب کے چہرے کھلا دیے تھے۔ لوگوں نے بھاری جیکٹوں سے نجات پا کر ہلکی جیکٹس پہن لی تھیں۔ جہاں پہلے لوگ کسی ڈریا خوف سے بھاگتے پھرتے تھے اب خراماں خراماں چل رہے تھے۔ فروری میں یہ موسم سب کے لیے ایک نعمت الٰہی تھا۔ میں اسی نعمت سے لطف اندوز ہوتا ہوا اپارٹمنٹ پہنچا تو شہباز کو اپنا منتظر پایا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اس نے بڑھ کر جاب ملنے کی مبارک باد دی اور بڑھ کر گلے لگاتے ہوئے کہا۔ ''شکر ہے تمہارا یہ سیاپا تو ختم ہوا۔'' پھر پوچھا۔ ''یہ سرجی کہاں رہ گئے؟''

میں نے صرف یہ کہا۔ ''کچھ بتا کر تو نہیں گئے مگر اس خوشگوار موسم میں میرا گرم اونی کوٹ پہنے جلدی میں کہیں جارہے تھے۔'' اسے کچھ اور بتانا مناسب نہ سمجھا تو شہباز خود ہی بول پڑا:

''جلیبیاں لینے گئے ہوں گے!'' پھر گہرا سانس لے کر اپنی بات جاری رکھی۔ ''پہلے ہی تین لفافے بھرے ہوئے فریج میں رکھے ہیں اور ساتھ شکر قندی کا سیاپا بھی شروع ہوگیا ہے۔'' پھر سر جھٹک کر بولا۔ ''معلوم نہیں اتنی انرجی کس کے لیے اکٹھی کررہے ہیں؟''

میں نے بات بدلی اور شہباز سے پوچھا۔ ''تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میری جاب ہوگئی ہے۔''

''مفتی کا ہیموسال سے فون آیا تھا۔'' وہ بتا رہا تھا۔

شہباز نے اتنی دیر میں سب دوستوں کو یہ خوش خبری سنا دی تھی اور مجھے یقین تھا کہ آج اپارٹمنٹ میں سب مبارک باد کے لیے جمع ہوں گے۔ میں نے شہباز سے کہا کہ آج مہمانوں کے لیے کھانا ہی بنا دے تو کہنے لگا ''واجد اور خان نے کہا ہے کہ کھانا ہم گھر سے بنوا کر لائیں گے۔''

میں نے طارق کو نیویارک فون کر کے جاب ملنے کی خوش خبری سنائی تو وہ خوشی سے جھوم اٹھا۔ اپنی خوشی کا تادیر اظہار کرتا رہا اور کہا۔ ''پرسوں جاب لیٹر لے کر اسی روز نیویارک کے لیے نکل پڑوں۔''

شہباز نے سنا تو کہنے لگا۔ ''میں بھی تو ساتھ جاؤں گا۔''

ادھر سرجی بھی ساتھ جانے کے لیے پر تول رہے تھے۔ اب ہم تینوں کا گروپ نیویارک کے لیے باہم سفر تیار تھا۔ شہباز کی ایک لیب میں opp-Co کی بات ہوچکی تھی اور اس نے دو ہفتے بعد حاضری دینی تھی۔

میں سوچ رہا تھا کہ آیا ٹرین سے نیویارک جایا جائے یا پھر بس کا سفر اختیار کیا جائے۔ ہم سب کے پاسپورٹ پاکستانی تھے اور ہم نے اپنے کینیڈا کے لینڈنگ پیپرز دکھا کر بارڈر کراس کرنی تھی۔ اس لیے ہمارا بذریعہ بس جانا زیادہ مناسب تھا کیونکہ ٹرین کے سفر میں امریکن امیگریشن والے اندر آکر پاسپورٹ چیک کرتے ہیں۔ اگر کوئی مسئلہ پیدا کردیں تو واپس بھیجنے کا خطرہ رہتا ہے۔ ان دنوں امریکا کی بارڈر کینیڈا سے کراس کرنا بہت آسان تھا۔ پاکستانیوں کو ویزے کی ضرورت نہ تھی۔ لینڈنگ پیپرز یا ڈرائیونگ لائسنس دکھا کر آپ بارڈر کے آر پار جاسکتے تھے۔ اب تو پاکستانیوں کے پاس کینیڈا کا پاسپورٹ بھی ہوتو کوئی سوال کرتے ہیں اور بہت سوں کو تو واپس بھی بھیج دیتے ہیں۔ اگر بس سے جائیں تو وہ امیگریشن کے دفتر کے باہر سب مسافروں کو اتارتی ہے اور اندر جاکر اپنے آپ کو کلیئر کروا کر امریکا میں داخل ہوسکتے ہیں۔ پھر میں نے بس سے جانے کا ارادہ کرلیا۔

گرے ہاؤنڈ (Greyhound) کمپنی کی لاتعداد بسیں ٹورنٹو سے نیویارک کے لیے چلتی ہیں۔ میں نے پہلے سے ہی معلومات لے لیں تھیں۔ یونین اسٹیشن کے اندر ہی ان کا ٹرمینل ہے اور ٹکٹس وہیں پر مہیا ہوجاتی ہیں۔ یونین اسٹیشن ٹورنٹو کے ڈاؤن ٹاؤن میں سی این ٹاور کے آس پاس واقع ہے۔ میں کئی بار بعد میں اپنی کار پر ٹورنٹو سے نیویارک گیا تو سات آٹھ گھنٹوں میں اپنے آپ کو وہاں پایا۔ بس پر دس بارہ گھنٹے لگتے ہیں۔

اتنے میں تمنا بھابی کو فون کیا اور ان سے بھی جاب کی مبارک بادیں سمیٹیں۔ اس کو بذریعہ بس آنے کا بتایا تو اس نے نیویارک بس اسٹینڈ سے ان کے گھر لانگ آئی لینڈ تک پہنچنے کا پورا نقشہ لکھوا دیا۔ مجھے ڈاؤن ٹاؤن نیویارک سے تین میٹرو ٹرین بدل کر اس اسٹیشن پر اترنا تھا جو ان کے گھر سے قریب تھا۔ فیصلہ ہوا کہ میں اس اسٹیشن پر پہنچ کر انہیں فون کروں گا اور وہ مجھے پک کرلیں گی۔ میں نے پورا نقشہ ایک کاغذ پر نوٹ کرلیا۔ شہباز کو بھی تاکید کردی کہ وہ بھی اپنے بھائی سے تمام معلومات لے کر لکھ لے اور سرجی کے لیے بھی فیض صاحب سے ساری معلومات لے لے۔

سرجی ابھی نہیں پہنچے تھے اور مجھے ان کی فکر ہورہی تھی۔ مجھے خوف تھا کہ کہیں انہوں نے ین کے ساتھ کوئی معاملہ کھڑا نہ کرلیا ہو۔ میں اپنے خدشے کا اظہار شہباز سے بھی نہ کرسکتا تھا کیونکہ پھر اسے بتانا پڑتا کہ وہ ین کے ساتھ کہاں ہیں اور کیا گل کھلانے کا ارادہ لے کر کیسن سینٹر سے نکلے تھے۔ اتنا تو مجھے یقین تھا کہ وہ کوئی معیوب حرکت نہ کریں گے۔ زیادہ سے زیادہ شرما کر اور اس پر کچھ خرچا کر کے واپس آجائیں گے مگر میری پریشانی بھی بجا تھی۔

میرا نسرین سے کل ملنے کا وعدہ تھا اور میں بھی سرجی سے بہت پہلے اپارٹمنٹ پہنچ چکا تھا اور وہ کہیں کھو چکے تھے۔ میں اپنی جانب سے فکرمند تھا کہ کہاں اتنی دیر لگا دی ہے کہ اتنے میں دروازہ کھلا اور سرجی ہاتھ میں دو بیگ پکڑے، مٹھوں کو

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

چھوتا اونی گرم سوٹ اس شاندار موسم میں پہنے یہ گنگناتے اپارٹمنٹ میں داخل ہوئے

میرے دل کے تار بجے بار بار۔ ہوا تجھ سے پیار آجا

میں نے اور شہباز نے ایک دوسرے کی جانب حیرت بھری نظروں سے دیکھا اور پھر انہوں نے ایک لفافے سے جلیبیاں اور دوسرے سے شکر قندی نکالی اور دونوں کو جا کر فریج میں سجا دیا۔ پھر کوٹ اتارا، الماری میں لٹکایا اور ہمارے ساتھ بیٹھ کر وہی گانا پھر سے گنگنانا شروع کر دیا۔ اب شہباز کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا، وہ بولا۔ ''یا تو یہ کوئی سیاپا ڈال آئے ہیں یا ابھی ڈالنے والے ہیں۔''

وہ بہت خوش تھے۔ بولے۔ ''آج کا دن تھا ہی با برکت۔ ندیم بھائی کو جاب بھی ملی اور مجھے میری منزل۔'' پھر بولے۔ ''آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام۔''

اب شہباز پیچھے پڑ گیا کہ بتایا جائے کہ کون سی منزل ملی اور یہ آم اس موسم میں کہاں سے مل گئے؟ میں نے تو کچھ نہ بتایا تھا مگر خود پھوٹ پڑے۔ ''ہم کو تو سب لوگ نااہل سمجھتے تھے مگر آج ین کے ساتھ بہت زبردست وقت گزرا اور ساتھ میں شیرے والی جلیبیاں بھی مل گئیں۔'' پھر اپنے محاورے کی تشریح کی کہ آج دوہرا فائدہ ہوا یعنی پھیکی ین اور میٹھی جلیبیاں۔

پھر میں نے شہباز کو بتایا کہ آج ین کو اپنے پیچھے لگائے کہیں نکلے تو تھے مگر معلوم نہیں کہاں گئے تھے۔ یہ سننے کے بعد وہ بولے۔ ''آج ین کو میں نے کافی پلانے کی آفر کی جو اس نے اپنی مصروفیت کی وجہ سے مسترد کر دی۔''

میں نے سرجی سے پوچھا۔ ''تو پھر وہ آپ کے پیچھے کہاں بھاگی چلی جا رہی تھی۔''

وہ بولے۔ ''دراصل اس کی بھی کہیں جاب کی بات چل رہی ہے۔ تو میں نے کہا اس خوشی میں کوئی تحفہ ہی اسے دلا دوں۔''

میں چونک پڑا اور کریدا تو بولے۔ ''کہتی تھی کہ میں جلدی میں ہوں تو میں اسے فنانٹ ایک اسٹور پر لے گیا۔ اس کے لیے پرفیوم خریدا اور اس نے میرے لیے چاکلیٹ پسند کی۔ اس نے پرفیوم کو اپنے ہینڈ بیگ میں ڈالا اور میں چاکلیٹ وہیں کھڑے کھڑے کھا گیا۔''

شہباز بولا۔ ''اس کے بعد کیا ہوا؟''

وہ بولے۔ ''اس کو بس تک چھوڑا اور میں سیدھا ریکس ڈیل مارکیٹ گیا اور اسی خوشی میں جلیبیاں لے آیا اور لگے ہاتھوں شکر قندی بھی اٹھا لی۔''

ہم دونوں نے پوچھا۔ ''پھر کوئی اگلی ملاقات طے ہوئی؟''

وہ ہلکا سا منمنائے اور بولے۔ ''کل تو وہ سینٹر نہیں آ رہی اور پرسوں تو ماشاء اللہ میں نیویارک جا رہا ہوں۔ پھر نجانے یہ بھگتی روحیں کہاں ملتی ہیں۔''

یہ سن کر شہباز اور میں نے اپنے سر پکڑ لیے۔ دکھ یہ تھا کہ پینتیس ڈالر کا پرفیوم بھی خرید کر دے چکے تھے۔ شہباز نے کہا۔ ''چلو ایک چاکلیٹ تو آپ کو دلا دی۔ ورنہ یہ دکھڑا ہمیشہ رہتا کہ آپ کو وہ دھان پان سی چینی لڑکی ماموں بنا گئی۔''

یہ سن کر وہ کسی سوچ میں ڈوبے، پھر ابھرے اور سر جھکا کر بولے۔ ''چاکلیٹ پسند تو اس نے کی مگر ادائیگی تو میں نے خود کی تھی۔''

اتنا سن کر شہباز اپنا ضبط کھو بیٹھا۔ جو احترام وہ سرجی کو دیتا تھا، اسے ایک سائیڈ پر رکھا۔ پہلے انہیں اٹھا کر مفتی کے میٹرس پر پٹخا اور پھر مفتی ہی کے تکیے سے جوان کی دھلائی شروع کی کہ اگر میں بیچ میں نہ آتا تو وہ تھمنے والا نہیں تھا۔ گالیاں اس کی زبان سے کسی آبشار کی طرح گر رہی تھیں اور سرجی خاموشی سے یہ وار سہہ رہے تھے۔ اب شہباز کارپٹ پر پڑا اس مشقت کے بعد بری طرح ہانپ رہا تھا اور سرجی سب کچھ بھول کر وہی گانا گا رہے تھے۔ میرے دل کے تار .....اور باہر آسمان پر بادل جھوم جھوم کر تیرنے لگے۔

اب سرجی مجھے اشارے کر رہے تھے کہ کسی طرح شہباز سے اگلواؤں کہ مایا کا بوائے فرینڈ کہیں وہ تو نہیں؟ میں انہیں خاموش رہنے کا اشارہ اس طرح سے کرتا کہ شہباز بھی دیکھ لے۔ یہ اشارے بازی چل رہی تھی اور آخر شہباز جھلا کر بولا۔ ''یہ کیا سیاپا چل رہا ہے؟ کیوں مجھے لگتا ہے کہ آپ دونوں کوئی چال چل رہے ہیں؟''

اب سرجی کو موقع مل گیا تو شہباز سے بولے۔ ''آخر تم کیوں اس معصوم کی آبرو کے پیچھے پڑ گئے ہو؟ اپنی نہیں تو اس کی عزت کا تو خیال کر لو۔''

شہباز ایک دم اٹھ بیٹھا اور غصے میں سرجی کی طرف دیکھ کر بولے۔ ''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ کون معصوم اور کس کی آبرو؟''

میں نے اس جھگڑے سے اپنے آپ کو علیحدہ کر کے مزے سے مفتی کے میٹرس کے ساتھ ٹیک لگائی اور لطف اندوز ہونے لگا۔

اب سرجی کمر کس چکے تھے۔ شہباز سے کہتے تھے۔ ''ہمیں سب معلوم ہو چکا ہے کہ مایا سے آپ چھپ چھپا کر ملتے جاتے رہتے ہیں۔ آپ میاں فصیحت اور دوسروں کو فصیحت.....'' شہباز چلا کر بولا۔ ''کس وصیت کی بات کر رہے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ہو؟ میری کون سی جائیدادیں ہیں کہ مایا کہ نام کروں گا؟''

بات بڑھ گئی تھی۔ شہباز کھڑا پھنکار رہا تھا اور سرجی ہمیشہ کی طرح اپنے دونوں گھٹنے، بازوؤں کے گھیرے میں لے کر سینے سے لگائے اور دیوار کی طرف منہ پھیر کر کہہ رہے تھے۔ ''ہم تو صرف سمجھا سکتے ہیں اور آپ آٹھ وقت میاں سے باہر رہتے ہیں۔''

اب شہباز مجھ سے بے بس ہو کر پوچھ رہا تھا۔ ''یہ میاں اور تلواریں کہاں سے آ گئیں؟''

میں نے جب یہ بتایا کہ ان کا مطلب ہے کہ آپ ان سے ہر وقت جھگڑا کرتے رہتے ہیں تو بولا۔ ''ندیم بھائی! آپ انصاف کریں، میں نے کب جھگڑا شروع کیا ہے؟''

اب بات کو نمٹانا بھی تھا اور شہباز کو ساری بات بتائی کہ کس طرح مایا نے اپنے بوائے فرینڈ کا ذکر کیا اور سرجی کو آپ پر شک نہیں بلکہ یقین ہے کہ ہو نہ ہو آپ ہی مایا کے بوائے فرینڈ ہیں اور یہی اصل جھگڑا ہے۔ اب بات شہباز کی سمجھ آئی۔ پہلے تو اس نے اپنا سر پکڑ لیا اور پھر سرجی سے کہنے لگا۔ ''آپ ین کے ہاتھوں بے وقوف بن گئے۔ اس کے پیچھے بھاگتے پھرتے ہیں اور پھر مجھے کیوں روکتے ہیں؟''

سرجی نے بات یہ کہہ کر ختم کر دی۔ ''ہم تو زمانے کی اونچ نیچ خوب جانتے ہیں اور تمہاری مثال ایسے ہے کہ بارہ برس کا بیٹا برما مانگے۔''

اب میں اور شہباز دونوں ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہے تھے اور سرجی ہم دونوں کے لیے چائے بنانے کچن میں کھڑے تھے۔

کچھ دیر میں اپنا سخنی سا پٹھان دوست مطیع اللہ آ گیا۔ اسے بھی شہباز نے میری جاب کے بارے میں فون کر کے بتا دیا تھا۔ آتے ہی نعرہ لگایا۔ ''بہت مبارک ہو۔ اللہ کا شکر ہے کہ تمہیں اچھی جاب مل گئی۔'' پھر اپنی قد سے لمبی جیکٹ اتاری اور ایک طرف رکھتے ہوئے بولا۔ ''ہم تو آٹھ ماہ سے اس خنزیر ملک میں خوار ہو رہی ہے۔ چلو اللہ کی شکر ہے کہ تم تو ٹھکانے لگی۔''

شہباز بولا۔ ''مطیع اللہ بھائی! ٹھکانے لگا ہے، لگی نہیں۔''

یہ سن کر وہ بولا۔ ''یہی تو بولا ہے۔ تم بھی اپنی طرح موٹا سوچتی ہے۔''

شہباز بھی شرارت کے موڈ میں تھا اور بولا۔ ''تمہاری یہ خواری نو ماہ ہوگی، پھر قرار آ جائے گا۔''

تیکھی نظروں سے شہباز کے بھاری وجود کا جائزہ لیا۔ ''تمہارا خواری تو لگتا ہے سال دو سال چلا ہوگا۔'' پھر شہباز کے جواب سے پہلے پینترا بدل کر سرجی پر حملہ آور ہوا۔ ''تم بھی کمزور ہوتی جا رہی ہو۔ کچھ کھایا پیا کرو۔''

سرجی بولے۔ ''جلیبیاں دودھ میں ڈال کا کھاتا ہوں۔''

وہ بولا۔ ''اس سے صحت خراب ہوتا ہے۔ گرمائش سے زیادہ کمزوری ہوتا ہے۔'' مطیع اللہ معصومیت کا لبادہ اوڑھے سب کے پاؤں تلے سے قالین کھینچ رہا تھا اور ہم سب بے بسی سے اس کا منہ دیکھ رہے تھے۔ شہباز سے بولا۔ ''تم ابھی بیٹھی ہو۔ یارا کچھ دودھ پتی بناؤ۔''

اس سے پہلے شہباز اٹھتا کہ سرجی کھڑے ہو گئے اور بولے۔ ''میں دودھ پتی اچھی بناتی ہوں۔''

مطیع اللہ بولا۔ ''اچھی خاصی مرد ہو، اپنے آپ کو عورت کیوں بناتی ہو؟''

مطیع اللہ کی اپنی آواز عورتوں کی طرح باریک تھی۔ سننے والا مغالطے میں پڑ جاتا کہ ہے تو لڑکا مگر آواز لڑکیوں کی طرح ہے۔

اتنے میں خان کا فون آیا تو مطیع اللہ نے بڑھ کر اٹھایا۔ ہیلو کہا تو دوسری جانب خان نے رانگ نمبر کہہ کر بند کر دیا۔ دوسری بار بھی مطیع اللہ نے اٹھایا تو پھر خان نے نمبر کنفرم کیا اور اس کے کہنے پر مطیع اللہ نے ریسیور مجھے تھما دیا۔

میری آواز سنتے ہی گالیاں دینے لگا۔ ''ابھی جاب کی آفر ہوئی ہے اور اپارٹمنٹ میں لڑکی کو لا بٹھایا۔''

میں نے کہا۔ ''یہ شہباز کی مہمان ہے۔ رات سے پہلے چلی جائے گی۔''

وہ بولا۔ ''میں کچھ دیر میں کھانا لے کر آتا ہوں۔ اسے کھانا کھائے بغیر مت جانے دینا۔''

میں نے سعادت مندی سے ہامی بھر لی تو مطیع اللہ بولا۔ ''وہ میری بات کر رہی تھی؟''

اتنے میں مفتی آ گیا۔ موسم باہر اچھا تھا اور بادل صاف وشفاف فضا میں تیر رہے تھے۔ مفتی نے بڑھ کر گلے لگایا۔ اس کے چہرے پر اطمینان تھا اور میری کامیابی کی داستان اس کی آنکھوں میں تھی۔ میں نے تہہ دل سے اس کا شکریہ ادا کیا اور پھر سے اسے گلے لگا لیا۔

کچھ ہی دیر میں خان بہت سا کھانا لے کر آیا۔ وہ مطیع اللہ کو فون پر لڑکی سمجھ بیٹھا تھا اور اسی لیے کھانا کچن میں رکھ کر کمرے میں جھانک رہا تھا۔ مایوس لوٹا تو میں نے مطیع اللہ کا تعارف کروایا تو وہ بولا۔ ''اچھا آپ خان قیصر ہو۔ ندیم بھائی تمہاری بہت تعریف کر رہی تھی۔''

خان نے اس کی باریک آواز سنی تو معاملے کی تہہ تک پہنچ گیا کہ میں نے اسے بیوقوف بنایا ہے۔ پہلے میری جانب تیکھی نظروں سے دیکھا اور پھر کھی کھی والی ہنسی نکال کر مطیع اللہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

سے بولا۔ ''اچھا تم شہباز کی دوست ہو؟''

یہ سن کر مطیع اللہ نے سرجی کے نیچے سے تکیہ کھینچ کر اپنے نیچے رکھا اور بولا۔ ''میں تو سب کی دوست ہوں مگر اس خنزیر ملک میں دوستی کی کوئی وقعت بھی نہیں۔''

ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ واجد اپنے گھر سے کھانا لے کر آ گیا۔ مجھے مبارک بادیں دیں۔ سب یہی کہہ رہے تھے کہ میں بہت خوش قسمت ہوں کہ آتے ہی تین ماہ میں اچھی جاب پر لگ گیا۔ میں بار بار اللہ کا شکر ادا کرتا تھا اور سب کہتے تھے کہ تم ہر ایک سے دعا کا کہتے تھے اور یہ سب انہی کا اثر ہے۔ اس دن سے میرا دعاؤں پر یقین مضبوط ہوتا چلا گیا تھا۔

شام کی سیاہی ڈوروال کے شیشوں کے پار اتر رہی تھی۔ باہر بادل برس رہے تھے اور ہم اندر بیٹھے بھیگتے تھے، پانیوں سے نہیں بلکہ محبتوں سے۔ سرجی نے شہباز کے ساتھ مل کر دستر خوان لگایا اور بہت دنوں بعد ذائقے دار کھانوں سے لطف اندوز ہوئے۔ کسی نے پوچھا۔ ''جاب کب جوائن کر رہے ہو۔''

میں بولا۔ ''نیویارک سے آنے کے بعد۔''

یہ سن کر بہت سے چونکے۔ کچھ نے سمجھایا اور کچھ نے روکا۔

میں بولا۔ ''ابھی پرسوں جاب لیٹر ملے گا اور جوائن کرنے میں دو تین ہفتے ہیں۔''

مطیع اللہ بولا۔ ''یہ نہیں رکے گی۔ کئی بار ڈیرہ سے میرے پاس سوات میں لکی پڑی رہتی اور بس ادھر ادھر پھجول (فضول) میں گھومتی رہتی تھی۔''

اس بات پر سب کا قہقہہ بلند ہوا اور باہر بادلوں کی گرج اپارٹمنٹ کے در و دیوار ہلا گئی۔ محفل رات گئے تک جمی رہی۔ کل جہاں اداسیاں پھرتی تھیں، آج ہنسی کے طوفان موسلا دھار بارش کی تال پر ناچتے تھے۔ اندر کا موسم بدلا تو باہر کی رت بھی بدل گئی۔ جب سب کو معلوم ہوا کہ سرجی اور شہباز بھی امریکا کے سفر میں میرے ہمسفر ہیں تو بہت شور مچا کہ میں ان دو معصوم انسانوں کو ورغلا کر اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں اور وہ دو معصوم انسان سر جھکائے واقعی معصوم بنے بیٹھے رہے۔ میں اب سب سے بے نیاز باہر برستی بارش میں سفید برف کو پگھل کر بہتے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کہیں میں بھی تو پگھل نہیں رہا کیونکہ کل نسرین سے ملنا تھا۔

صبح بیدار ہوا تو میرے اردگرد خراٹے تھے۔ شہباز نیند میں بھی سانس لینے کی بجائے ہوا نکالتا اور سرجی ہمیشہ کی طرح اپنے کمبل کی قبر میں لپٹے بے حس و حرکت پڑے تھے۔ میں نے کمرے کی ڈوروال کا پردہ کھسکا کر باہر دیکھا تو دن آئینے کی طرح روشن تھا۔ رات کو بارش تھمی تو بادل بھی رخصت ہو کر اپنے پیچھے ایک چمکتا دمکتا دن چھوڑ کر جا چکے تھے۔ رات کی بارش برف کو پگھلا کر کہیں بہا کر لے گئی تھی۔ اب بے رنگ گھاس میرے سامنے شیشے کے پار بکھری تھی۔ درخت تمام کے تمام تھک ہار کر خاموشی سے ستا رہے تھے۔ ایک ٹھہری ہوئی مطمئن صبح نئے دن کا آغاز کر رہی تھی۔ بہت دنوں بعد میں ٹورنٹو کو برف کے لباس سے خالی دیکھ رہا تھا۔ میں یہ منظر دیکھ کر خوش ہو رہا تھا کہ باہر کی روشنی اندر تک آ گئی۔ ذرا سی روشنی پڑنے پر شہباز کی نیند اچاٹ ہوئی اور اس کی ہوں ہوں بلند ہوئی۔ میں نے جلدی سے پردے دوبارہ کھینچے اور باہر لیونگ روم میں آ گیا۔ باہر مفتی آنکھیں کھولے لیٹا تھا۔ مجھے محسوس کیا تو آنکھیں موند لیں۔ جب کسی کو نہ کچھ کہنا ہو اور نہ ہی سننا ہو تو وہ اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے۔

میں شاور لے کر باہر آیا تو مفتی نے دوبارہ سے وہی حرکت کی۔ میں کچن میں چائے بنانے گیا تو وہ ہلکا ہلکا کھانسنے لگا۔ اس کا مطلب صاف تھا کہ میں جاگ رہا ہوں اور میرے لیے بھی چائے بنا لو۔ میں نے کچن سے آواز لگائی۔ ''مفتی چائے میں چینی کتنے چمچ؟''

اس نے آنکھیں موندھے وہیں سے جواب دیا۔ ''دو'' اور میں مسکرا دیا۔

میں عادت کے مطابق لپٹ لپٹا کر باہر آیا تو محسوس ہوا کہ جو کچھ میں نے پہن رکھا ہے وہ اس موسم سے مطابقت نہیں رکھتا۔ حیرت انگیز طور پر موسم خوش گوار تھا۔ آج درجہ حرارت پندرہ سے بیس درجوں کے بیچ تھا۔ مجھے کچھ لوگ اسپرنگ جیکٹ میں چہکتے نظر آئے۔ ہر چہرہ کھلا ہوا تھا۔ میں بس میں بیٹھا تو آج سب ایک دوسرے سے مسکرا کر مل رہے تھے۔ پچھلے دو تین ماہ سے جو چہرے بے تاثر ہو چکے تھے، اب کچھ کہانیاں بیان کرتے نظر آ رہے تھے۔ برف کی شدت نے چہروں کا ماس ایک طرح سے کھینچ دیا تھا۔ آج برف پگھلی تو وہی چہرے بولنے لگے تھے۔ میں سب وے میں آیا تو بہت سے لوگ مجھے اونی ٹوپی، مفلر اور جیکٹ میں لپٹا دیکھ کر پہلے تو حیران ہوئے اور پھر مسکرا کر قریب سے دیکھتے گزر جاتے تھے۔ وہ مجھے شاید احمق سمجھ رہے تھے مگر میں اتنا احمق نہ تھا کہ کسی شرمندگی سے اپنا یہ لبادہ اتار پھینکتا۔

میں کل سے اسی ذہنی کشمکش کا شکار تھا کہ نسرین سے ملنے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کا ارادہ تو باندھ لیا ہے مگر لے کر اسے جاؤں گا کہاں؟ کسی ریسٹورنٹ، کافی شاپ میں یا پھر کسی مال میں بلاوجہ گھومنے میں یہ وقت گزاروں گا؟ ایسا بھی نہ تھا کہ کسی فلم تھیٹر میں جا بیٹھتا اور دو ڈھائی گھنٹے پاپ کارن کھانے میں گزار دیتا۔ میرے ذہن میں پھر ایک خیال آیا کہ کیوں نہ یہ کچھ گھنٹے اونٹاریو لیک کے کنارے کسی پارک میں بیٹھ کر گزاروں۔ پارک کا خیال مجھے کل رات تب آیا تھا جب سرجی یہ کہتے پائے گئے۔ ''ماشاء اللہ ان کے پارکوں میں جھولے بہت ہیں، گرمیوں میں مزے اڑائیں گے۔''

بالآخر میں نے پارک میں جانے کا ارادہ کرلیا تھا۔ سردی جتنی بھی ہو مجھے کوئی پرواہ نہ تھی کیونکہ دبکتی نسرین کو بھی تو ہمراہ ہونا تھا۔

ہمیں کیل سب وے پر ملنا تھا۔ شاید میں وقت سے پہلے آ گیا تھا۔ وہ موجود نہ تھی۔ میں ایک خالی بنچ پر بیٹھا آتی جاتی اور شور مچاتی ٹرینوں کو دیکھنے لگا۔ مسافر زیادہ تر سوار ہو رہے تھے۔ سب کی منزل ڈاؤن ٹاؤن تھی۔ اتنے میں وہ سیڑھیاں اترتی نظر آئی۔ اس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ دور سے ہاتھ ہلایا اور بڑھتی چلی آئی۔

وہ میری طرح گرم یونیفارم میں نہ تھی۔ نیلی گرم جیکٹ پر کھلا سر اور بکھرے بال تھے۔ کلاس کے برعکس وہ بنی سنوری ہوئی تھی۔ آتے ہی ہاتھ ملایا اور سب وے میں میرے ساتھ لگ کر بنچ پر بیٹھ گئی۔ کہنے لگی۔ ''سعد اسکول گیا ہے اور تین بجے اسے لینا بھی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اسے بھی ہمراہ لے آتی۔''

وہ بولی۔ ''اسے کیا بتاتی کہ تم کون ہو؟''

میں بولا۔ ''کہہ دیتی کہ انکل ہیں۔''

کہنے لگی۔ ''پھر بھی کہلواووں گی مگر بتاؤ اب کہیں چلنا ہے یا ان ٹرینوں کے شور کے پاس ہی بیٹھے رہیں گے۔''

میں بولا۔ ''کہاں تمہیں لے چلوں؟''

پھر سامنے دیکھ کر کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ''یہ تو مجھے یقین ہے کہ کسی غلط جگہ تم چلنے کا نہیں کہو گے اور نہ میں جاؤں گی۔''

میں یہ سوچتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ معلوم نہیں غلط جگہ کون سی ہوتی ہے اور صحیح کون سی؟ پھر اس کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''تو ٹھیک ہے۔ کوئی صحیح جگہ ڈھونڈتے ہیں۔'' یہ سن کر وہ ہنس پڑی۔

ہم ڈاؤن ٹاؤن جانے والی ٹرین میں بیٹھے تو میں بولا۔ ''باہر اتنا خوشگوار موسم بھی نہیں کہ تم کھلے بالوں ہی چلی آئی۔''

وہ بولی۔ ''کیا کہیں باہر بیٹھنے کا سوچا ہے تم نے؟''

میں نے کہا۔ ''صحیح جگہ باہر ... کی کوئی کھلی فضاء ہی ہو سکتی ہے۔ چلیں پہلے چائنا ٹاؤن سے تمہارے لیے کیپ اور مفلر خریدتے ہیں۔ پھر تمہیں صحیح جگہ لے چلتا ہوں۔''

ہم Spadina کے اسٹیشن پر اترے اور پھر جنوبی سمت جانی ٹرین میں بیٹھ کر دنداس (Dundas) اسٹیشن پر اتر کر باہر نکل آئے۔ یہ ٹورنٹو کا مشہور زمانہ چائنا ٹاؤن تھا۔ یہ علاقہ تو ڈاؤن ٹاؤن کا تھا مگر اسکائی سکریپر پر عمارتوں کی جگہ زیادہ تر دو تین منزلہ نئی پرانی دکانیں تھیں۔ موسم بہتر تھا تو فٹ پاتھ پر اپنا سامان بیچنے والے تختے لگائے چینی باشندے کھڑے ہر آتے جاتے کو اپنی طرف متوجہ کر رہے تھے۔ خریداروں میں ایک بھی چینی نہ تھا۔ نسرین بولی۔ ''کیسا چائنا ٹاؤن ہے جہاں دوسری نسلوں کے لوگ زیادہ نظر آ رہے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''سنا ہے کہ چینیوں سے چینی خریداری نہیں کرتے بلکہ زیادہ تر تارکین وطن یا سیاح یہاں سے اپنی مطلب کا سامان خریدتے ہیں۔''

میں جب ٹورنٹو آیا تو چائنا ٹاؤن کا ذکر بہت سنا تھا۔ ہر ایک کہتا تھا کہ یہاں دو نمبر مال ارزاں نرخوں پر باآسانی دستیاب ہوتا ہے۔ ہم فٹ پاتھ پر ٹھیلوں سے بچتے بچاتے چل رہے تھے۔ ہماری دائیں جانب اور سڑک کے پار سب ایک طرح کا ماحول تھا۔ سب دکانیں چینی باشندوں کی ملکیت تھیں۔ ریسٹورنٹ تھے جہاں شیشوں کے پار سلاخوں پر مرغیاں اور بطخیں روسٹ ہو کر آتے جاتے کو جیسے رحم طلب نظروں سے تک رہی تھیں۔ گفٹ شاپس تھیں جہاں چین کی بنی اشیا بھری پڑی تھیں۔ پھلوں اور سبزیوں کی دکانوں والے کھسک کر فٹ پاتھ پر چڑھ آئے تھے۔ نرخ دیکھے تو حیران رہ گیا کہ اتنی سستی سبزیاں اور پھل میں نے دنیا میں کہیں نہیں پائے۔ گارمنٹس کی دکانوں کا یہ حال تھا کہ جو شرٹ کسی سپر مال میں دس ڈالر کی ہوتی ہے تو یہاں دو ڈالر کی تھی اور وہ بھی کیش دینے پر کوئی ٹیکس نہیں لیتے ہیں۔ یہ جگہ مجھے لاہور کی انارکلی لگی اور فرق یہ تھا کہ لاہوریوں کی جگہ چینیوں نے لے لی تھی۔ کھلونوں کی دکانیں ایک یا دو ڈالر کے اچھے کھلونوں سے بھری تھیں۔ ننگی فلموں کی دکانیں تھیں جہاں کوئی چینی نہ اندر جا رہا تھا اور نہ باہر نکل رہا تھا بلکہ دوسری نسل کے باشندے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

آجا رہے تھے۔

کینیڈا نے جب ٹرانس پیسفک ریلوے کا منصوبہ بنایا تو معلوم نہیں مزدوری کرنے یہ باشندے کہاں سے اور کیسے یہاں پہنچے؟ زیادہ تر ہانگ کانگ سے آئے تھے۔ 1880ء کے بعد یہ منصوبہ وینکوور سے ٹورنٹو تک مکمل ہوا تو یہ اسی جگہ جلوسوں کی صورت آنا شروع ہوئے اور یہیں سستی اجرت پر مزدوری شروع کی۔ ہاتھ سے لوگوں کے کپڑے دھونے کا کاروبار شروع کیا اور پھر دھوتے ہی چلے گئے۔ اس کے بعد بیسویں صدی کے اوائل میں یہ لوگ ایسے آنا شروع ہوئے جیسے خودرو پودے دنوں میں اگ آتے ہیں۔ چین میں پیدا... ہوتے ہی یہاں آبستے۔ غربت اور افلاس کے مارے چین سے آتے اور پھر یہاں بھی بہت زیادہ پیدا ہونا شروع ہو جاتے۔ شروع میں سو چینی مرد کی نسبت یہاں ایک چینی عورت تھی۔ یہ ٹورنٹو میں صرف نہیں آئے بلکہ پورے کینیڈا اور امریکا میں پھیل گئے۔ دنیا کے بڑے چائنا ٹاؤن وینکوور، سان فرانسسکو اور ٹورنٹو میں ہیں۔ میں نے تینوں دیکھے ہیں اور تینوں میں رتی برابر کا فرق نہیں۔ دنیا کا سب سے بڑا چین ٹاؤن وینکوور میں ہے۔ وینکوور کینیڈا کے مغرب میں آخری شہر ہے اور اس کے بعد الاسکا شروع ہو جاتا ہے۔ میں چند سالوں بعد وینکوور گیا تو معلوم ہوا کہ اپنا مطیع اللہ بھی وینکوور میں ہوتا ہے۔ آٹھ سال اسے کینیڈا میں آئے ہوئے ہو گئے تھے مگر کار کبھی نہیں رکھی۔ بیس منٹ کی جاب پر جانے کے لیے بس میں دو گھنٹے گزارتا ہے مگر گاڑی کا کہتا ہے۔ ''کافروں کی ایجاد ہے۔'' میں نے وینکوور... پہنچ کر ہوٹل سے فون کیا تو آواز پہچان گیا۔ وینکوور آنے کی وجہ پہلے پوچھی اور پھر کہا۔ ''میری تو ابھی جاب ہے، تم شام میں بس پر گھر آجاؤ۔''

میں نے کریدا ''اس کافر ملک میں بچے لے آئے ہو۔''

شرمندہ ہو کر بولا۔ ''مجبوری تھی۔ لے آئی ہوں۔''

میں نے بس پر دو گھنٹے کا سفر کر کے اس کے گھر جانے سے انکار کر دیا۔ پھر بولا۔ ''کل کا کیا پروگرام ہے؟''

میں نے جب چائنا ٹاؤن کا بتایا تو لڑنے لگا۔ ''کس جگہ جاتی ہو اللہ کی قسم وہاں ایک بندہ بھی نہیں ہوتی۔''

میں حیران تھا کہ دنیا کا سب سے بڑا چائنا ٹاؤن ہے اور جہاں ایک بندہ بھی نہ ہو، یہ کیسے ممکن ہے۔ میں سخت پریشان ہو گیا۔ میں شدید تذبذب میں مبتلا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کیا یہ پٹھان دوست مذاق تو نہیں کر رہا۔ کافی بار پوچھا اور اس نے اللہ اور قرآن کی قسمیں اٹھانا شروع کر دیں کہ ایک بندہ بھی چائنا ٹاؤن میں نہیں ہوتا۔ آخر میں یہ بتایا۔ ''ایک بندہ بھی نہیں ہوتی، سب چینی ہوتے ہیں۔'' یہ سن کر میں بہت ہنسا کہ یہ چینیوں کو انسان بھی نہیں سمجھتا۔ میں انشاء اللہ برٹش کولمبیا اور البرٹا کی سیر پھر کبھی اپنے پڑھنے والوں کو کرواؤں گا جہاں میں نے تین بار بہت خوبصورت سفر کیے ہیں۔ ابھی تو نسرین کو لے کر کوئی ''چیز'' جگہ تلاش کر رہے تھے۔

ہم ایک گفٹ شاپ میں داخل ہوئے۔ کوئی معنک چینی لڑکی اپنے کالے تراشیدہ بال کندھوں کے اوپر لٹکائے کسی کونے سے برآمد ہوئی اور احمقوں کی طرح مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے جب یہ کہا کہ زنانہ گرم ٹوپی اور مفلر چاہیے اور اچھی کوالٹی کا ہو تو عین اسی نظروں سے وہ نسرین کو دیکھنے لگی۔ کچھ دیر تک اسے بے تاثر چہرے اور سوالیہ نظروں سے دیکھتی رہی اور پھر بھاگی بھاگی بہت سے مفلر اور اونی کیپ کہیں سے اٹھا لائی۔ کاؤنٹر پر وہ سامان رکھا اور پھر سے ویسے ہی دیکھنے لگی۔ معلوم نہیں وہ ہمیں نروس کر رہی تھی یا خود ہو رہی تھی کہ اتنے میں نسرین نے اپنے لیے گلابی رنگ کی کیپ اٹھائی اور سر پر پہن لی۔ کیپ میں اور کھری تو میں نے ایک گلابی مفلر اٹھا کر اسے دے دیا۔ اس نے اوڑھا تو اور اچھی لگنے لگی۔ چینی لڑکی ابھی تک ٹکٹکی باندھے اسے دیکھے چلے جا رہی تھی جب تک کہ میں نے اس سے ان چیزوں کی قیمت نہ پوچھی۔ پھر میری طرف متوجہ ہوئی اور ہاتھ پھیلا کر دس ڈالر مانگے۔ نسرین اپنا پرس کھولنے لگی مگر اس سے پہلے میں نے اپنے بٹوے سے دس ڈالر نکال کر اس کے پھیلے ہاتھ پر رکھ دیے۔ نسرین نے شکایتی نظروں سے مجھے دیکھا اور میں اس کا بازو پکڑ کر اسے باہر لے آیا۔ باہر نکلتے ہوئے میں نے مڑ کر پیچھے دیکھا تو وہ چینی لڑکی وہیں کسی مجسمے کی طرح ایستادہ کھڑی بت بنی ہمیں دیکھ رہی تھی۔ چینیوں کے چہرے اکثر بے تاثر ہوتے ہیں۔ سرجی کی مین سے مل کر مجھے اس کا اندازہ ہو چکا تھا۔

شفاف موسم اور چمکتے سورج کی... کرنوں میں نسرین نے اپنے ہاتھوں سے کیپ کو ذرا سا درست کیا اور مسکرا کر ترچھی نگاہوں سے پوچھا۔ ''کیسی لگ رہی ہوں؟''

یہاں آکر میں پھنس گیا۔ کسی لڑکی کے چہرے یا کپڑوں کی تعریف کرنا میرے بس سے ہمیشہ باہر ہی رہا ہے اور خاص کر وہ لڑکی جو آپ کی عمر سے جان پہچان میں ہو۔ میں تعریف ایک دو بار تو کر سکتا ہوں مگر بار بار نہیں۔ عورت تعریف کروانا چاہتی ہے اور یہ کام میرے لیے بہت مشکل ہوتا

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ہے۔ وہ انتظار میں رہی کہ میں کچھ بولوں گا مگر میں چاہتے ہوئے بھی تعریف نہ کر سکا۔ ذرا سی خفا ہوئی اور کہا۔ ''میری تعریف تم نے بھی نہیں کی۔''

میں نے بخوشی اپنی اس خامی کو تسلیم کیا اور بولا۔ ''اب چلیں؟''

سر ہلا کر جواب آیا۔ ''ہاں۔''

میں نے ایک ٹیکسی روکی تو ڈرائیور سردار جی تھے۔ مجھے دیکھا تو پنجابی بولنے کا سوچنے لگے مگر جب ساتھ کھڑی نسرین پر نظر پڑی تو دیکھتے ہی رہ گئے۔ میں نے کھنکارا بھر کر اپنی جانب متوجہ کیا اور کہا۔ ''لیشبرج پارک (BayAshbridge Park) جانا ہے۔''

جواب میں کہا۔ ''کیوں نہیں! قریب ہی ہے۔''

ہم پچھلی سیٹ پر بیٹھے تو اس نے اپنی بات آگے بڑھائی۔ ''گرمیوں میں بیچ پر کڑیاں نہاتی ہیں وہاں، اب تو کچھ نہیں ہوگا۔''

میں نے کہا۔ ''میں نے کڑیاں نہیں دیکھنی۔ بس یہ بتائیں جگہ تو اچھی ہے۔''

ہنس کر کہا۔ ''بہت پُرسکون اور خوب صورت مگر گرمیوں میں جب انگریز کڑیاں نہاتی ہیں تو اپنے دیسی وہاں بہت جاتے ہیں۔''

اس نے سی این ٹاور کے قریب سے بائیں جانب ٹیکسی موڑی اور لیک شور روڈ پر آ گیا۔ کچھ دور جا کر دائیں جانب کو مڑا تو آس پاس کھڑے مرجھائے درختوں کے تلے سڑی اور بے رنگ گھاس تھی جس پر سے برف رات کی بارش سے پگھلی تھی۔ سڑک کے ساتھ سائیکل کے ٹریل تھے اور دور دور تک درختوں کے اداس جھرمٹ اور نیچے مری ہوئی گھاس پر کہیں کہیں پانی کھڑا تھا اور درختوں کا عکس ان میں نظر آ رہا تھا۔ ذرا آگے بڑھے تو سامنے دور تک نیلے پانیوں کی حد نگاہ سے بھی آگے تک پھیلی جھیل تھی۔ یہ لیک اونٹاریو جھیل نہ تھی بلکہ ایک سمندر تھا جس کا دوسرا کنارہ دکھلائی نہ دیتا تھا۔ جھیل کے پانیوں سے پہلے سڑک تک ریت بچھی تھی اور گرمیوں میں یہاں چھٹی کے روشن دنوں میں آنکھوں کو خیرہ کر دینے والے نظارے ہوتے ہوں گے۔ ریت اور سڑک کے بیچ گھاس کے وسیع میدان تھے جو اب اجڑے پڑے تھے۔ ان گھاس کے کناروں پر بنچ رکھے تھے جو چند ایک کے علاوہ سب خالی پڑے نظر آ رہے تھے۔ اچھے موسم کی وجہ سے چند لوگ بہت دنوں بعد برف کے سحر سے نکل کر کھلے آسمان تلے خوش خوش پھر رہے تھے۔ میں نے ایک بنچ کو اسپاٹ کیا جس کا رخ جھیل کی جانب تھا اور نیلگوں آسمان پر روشن سورج تلے پانیوں کے اوپر سمندری سفید پرندے اپنی پروازیں بھرتے تھے۔ سردار جی نے ٹیکسی روکی اور بولا۔ ''واپسی پر یہاں سے ٹیکسی نہیں ملے گی۔'' پھر اپنی بات آگے بڑھائی۔ ''تسی بولو تو لینے آجاؤں؟''

میں نے ٹائم دیکھا تو گیارہ بج رہے تھے۔ اسے کہا کہ دو بجے آجانا۔ پھر وہ کہنے لگا۔ ''جیراڈ اسٹریٹ قریب ہے۔ کہو تو کچھ کھانے پینے کے لیے کچھ لے آتا ہوں۔'' پینے پر اس نے کافی زور دیا اور میری جانب دیکھ کر اپنی ایک آنکھ بھی دبا دی۔ میں نے نسرین سے پوچھا تو اس نے انکار کر دیا اور میں نے بھی وہی نسرین والا جواب اسے دے دیا۔ وہ چلا گیا تو جیسے کوئی بلا ٹلی۔

ہم بنچ پر بیٹھ گئے۔ میں سامنے دور تک پھیلے پانیوں کو دیکھ رہا تھا۔ لیک اونٹاریو کو کچھ دن پہلے برفانی ہواؤں میں رات کو دیکھ چکا تھا۔ وہ ملگجا اندھیرا تھا اور آج روشن چمکتا ہوا دن تھا۔ اونٹاریو لیک دیکھنے کی میری پرانی آرزو اس طرح پوری ہوگی، یہ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اداس سیاہ آنکھوں والی اور گلابی رنگت میں ڈھلی ایک دوشیزہ ایران میرے ہمراہ ہوگی۔

جھیل سے آتی خنک ہوا ذرا بے چین کرتی تھی اور نسرین اپنی کیپ اور مفلر کے ہونے پر میرے گن گانے لگی۔ آسمان پر اڑتے بے تحاشا پرندے بھی کبھار ہمارے اوپر منڈلانے لگتے۔ وہ بھی بہت دنوں بعد انسانوں کی شکل دیکھ رہے ہوں گے اور اس اُمید پر ہماری جانب پرواز کرتے آگے کہ ہم بھی اوروں کی طرح کھانے کا بہت سامان لیے ہوں گے کہ شاید ان کی بھی دادرسی ہو جائے۔ کچھ دیر منڈلاتے رہے اور پھر شور مچاتے، گالیاں دیتے واپس چلے گئے اور دوبارہ پانیوں کے اوپر سے جھانک جھانک کر چھوٹی مچھلیاں تلاش کرنے لگے۔

میں کینیڈا میں پہلی بار کھلے آسمان تلے، جھیل کنارے ایک چمکتے دن میں بیٹھا اس کا ایک اور رنگ دیکھ رہا تھا۔ دور جھیل میں کچھ جزیرے پھیلے تھے۔ ان کو سینٹرل آئی لینڈز کہا جاتا ہے۔ میں ان جزیروں پر کبھی نہیں گیا تھا مگر آفاقی صاحب کے سفرناموں نے مجھے ان کی سیر پہلے ہی کرا دی تھی۔ ہمارے پیچھے کچھ دور سی این ٹاور نظر آ رہا تھا اور اسی کے ساتھ بلند عمارتیں ایک دلکش منظر ترتیب دے رہی تھیں۔ ڈاؤن ٹاؤن کو

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

میں چند دن پہلے رات میں خان کے ساتھ دیکھ چکا تھا مگر دن میں اس کا نظارہ پہلی بار دیکھ رہا تھا وہ عمارت میرے پیچھے تھی۔ میرے لیے زیادہ زیادہ دلکشی جھیل کے نیلے پانیوں میں تھی۔ میں کچھ دیر ماحول کے سحر میں کھویا رہا پھر ایسا لگا جیسے میں ان اڑتے سی گل میں سے کسی ایک کو چن کر اس کے اندر جا بیٹھا ہوں اور جھیل کے اوپر چلتی ٹھنڈ ہواؤں میں پانیوں کے اوپر تیرتا جا رہا ہوں۔

میرے اندر ہی کہیں تو گم ہے
کس سے پوچھوں تیرا نشاں ،جاناں!
اب بھی جھیلوں میں عکس پڑتے ہیں
اب بھی نیلا ہے آسماں، جاناں!

ہم پہلی بار کسی کھلی جگہ پر اکیلے بیٹھے تھے۔ میں کچھ نروس تھا۔ مجھے کیا کہنا تھا؟ میرے پاس کچھ کہنے کے لیے الفاظ نہیں تھے۔ وہ بھی سامنے نیلے پانیوں پر نجانے کیا دیکھ رہی تھی؟ نسرین وہ لڑکی بھی نہ تھی جس سے میں پیار کے کچھ بول بولتا، کچھ دل لگی کی باتیں کرتا اور کوئی سچی یا جھوٹی کہانی گھڑتا۔ میں ایک کشمکش میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ اس سے کیا باتیں کروں؟ اس سے میں کیا پوچھوں اور کیا سنوں؟ میں بچ سے اپنا بایاں بازو ٹکائے، سوچوں میں گم تھا سامنے آسمان کی نیلاہٹ میں اڑتے پرندوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا ساتھ اچھا بھی لگ رہا تھا بلکہ بہت اچھا لگ رہا تھا مگر الفاظ کہیں گم ہو چکے تھے۔ مگر جب نسرین نے کہنی ماری تو خیالات کے تانے بانے ٹوٹ گئے۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''مجھے بھی کوئی پرندہ ہی سمجھ لو۔''

میں دل میں شرمندہ ہوا کہ اسے اپنے ہمراہ لے تو آیا مگر اب جھیل کے اس خوب صورت منظر میں کھویا ہوں۔ پاکستان میں میرے ٹریک کے ساتھی مجھ سے ٹھیک خفا ہوتے تھے کہ میں سب سے الگ ہو کر چلتا ہوں، اکیلے میں۔

میں نے اسے اپنی اس ''بری عادت'' کا بتایا اور معذرت کرنے لگا۔ وہ سر ہلا کر کہنے لگی۔ ''نہیں! مجھے تمہاری سمجھ اب آنے لگی ہے اور تمہارے لیے یہ خاموشی اور فطرت کے نظارے زیادہ اہم ہیں۔''

اس بات پر میں اسے کیا کہتا کہ میں اسی کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ اس کا لمس میرے اندر کسی لڑکی کے ساتھ ہونے کا یہ احساس پیدا کر رہا تھا کہ ایک خوب صورت چہرہ میرے ساتھ اپنی مرضی اور خوشی سے بیٹھا ہے اور وہ میرے اندر کسی جنسی کشش کا احساس نہیں بلکہ ایک طمانیت کا تصور ابھر رہا ہے۔

میں نے بات کا رخ موڑا۔ ''چلو اب اپنے بارے میں کچھ بتاؤ۔ کون ہو اور کیا کرتی ہو؟''

اس نے کہا۔ ''نہیں پہلے اپنے بارے میں تم بتاؤ۔''

اس بے چاری نے یہ کہہ کر مجھے چھیڑ دیا۔ پھر میں اپنی چاہتیں، محبتیں آرزوئیں، ٹریکس، پہاڑ، جھیلیں اور کیا کچھ کھول کر بیٹھ گیا۔ میں اسے ان مقامات کا بتانے لگا جہاں میں کبھی نہیں گیا۔ وہ موڑ بتانے لگا جہاں سے میں ہو آیا تھا۔ اپنی کہانی میں کچھ رنگ بھرے اور اس کے سامنے کھولتا چلا گیا۔

وہ سنتی رہی اور میں آسمان پر اڑتے پرندوں اور نیچے ٹھہرے پانیوں پر نظریں رکھے معلوم نہیں کیا کچھ کہتا گیا۔ بچوں کے بارے میں بتانے لگا تو آبدیدہ ہو گیا۔ جب ڈیرہ اسماعیل خان میں دریائے سندھ کے کنارے چاندنی راتوں میں بیٹھ کر اس کی منظر کشی کی تو آنکھیں نمی سے تر تھیں۔ کئی رنگین قصے سنائے اور کئی غمگین داستانیں چھیڑیں۔

وہ خاموشی سے میری کہانیاں سنتی رہی۔ مجھے کچھ دیر بعد ادراک ہوا کہ میں کچھ زیادہ ہی بول رہا ہوں۔ اسے میری داستان گوئی میں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ تو پھر میں نے اس سے کہا۔ ''اب اپنے بارے میں تو کچھ بتاؤ۔''

پھر کیا تھا درد کا دریا بہنے لگا۔ وہ کھلتی گئی، میں متحیر بیٹھا سنتا رہا۔ میری نظریں اڑتے سفید پرندوں اور جھیل کے پانیوں سے ہٹ کر اب اس پر جم چکی تھیں۔ مجھے اس نے کبھی یہ احساس بھی نہ دلایا تھا کہ وہ اتنے بوجھ اٹھائے پھرتی ہے۔ میں اس کا درد سنتا رہا اور پگھلتا رہا۔ یہ سوچتا رہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس عمر میں اس لڑکی پر اتنے عذاب گزر گئے۔ میں نے تو کبھی اس سے پوچھا بھی نہیں کہ وہ آخر اکیلی کینیڈا میں کیا کر رہی ہے۔ دکھ اور درد کے کن کن صحراؤں پر چلتی رہی ہے۔ مجھے تو معلوم بھی نہ تھا کہ کانٹے اس کے پاؤں تلے نہیں بلکہ اس کے پاؤں میں پیوست ہیں۔ اس نے عمر بتائی ہے۔ زندگی نہیں گزاری تھی۔

درد ہو دل میں تو دوا کیجیے
دل ہی جب درد ہو تو کیا کیجیے
ہم کو فریاد کرنی آتی ہے
آپ سنتے نہیں تو کیا کیجیے

اس نے اپنی کہانی سنانی شروع کی تو غیر ارادی طور پر اس کا ہاتھ میرے دونوں ہاتھوں میں آ گیا اور وہ وہیں چھلک پڑی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

مشہد کے قریب اور ترکمانستان کی سرحد کے پاس فرمد ایک چھوٹا سا خوبصورت قصبہ ہے جہاں نسرین اپنے والدین اور دو بڑے بھائیوں کے ساتھ رہتی تھی۔ باپ کی زرعی زمینیں تھیں اور قصبے میں کچھ جائیداد بھی تھی۔ اچھے خاصے متمول خاندان سے تعلق تھا۔ جب انقلاب ایران آیا تو وہ بتا رہی تھی کہ میں گریڈ تھری میں پڑھتی تھی۔ انقلاب کے دوران باپ مارا گیا۔ کاروبار اور زمینیں بھائیوں نے سنبھال لیں۔ یہ چھوٹی تھی اور اسے اتنا یاد رہا کہ جب باپ مرا تو گھر میں میت بھی نہ لائی گئی تھی اور کہیں باہر ہی دفنا دیا گیا تھا۔ اسکول ختم کیا تھا کہ ماں بھی کسی موذی بیماری میں چل بسی۔ بھائیوں نے ماں کے علاج پر کوئی توجہ نہ دی تھی۔ بھائی شادیاں رچا کر اپنے گھروں میں باپ کی جائیداد پر عیش کرتے رہے۔ یہ بھی بڑے بھائی کے ساتھ ہوتی اور کبھی چھوٹے بھائی کے پاس۔ ایک طرح سے بے آسرا زندگی بسر کر رہی تھی۔ زرعی زمینیں بہت تھیں اور نوکر چاکر بھی تھے۔ اس نے کسی طرح کالج میں گریجویشن مکمل کر لی۔ شکل کی بہت اچھی تھی۔ اچھے رشتے مل سکتے تھے مگر بڑے بھائی نے اس کی شادی جائیداد کی خاطر اپنی زمینوں پر کام کرنے والے ایک ملازم سے کروا ڈالی اور اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو گیا۔ اسے یقین تھا کہ نہ ملازم کہیں بھاگے گا اور نہ کوئی جائیداد میں اپنا حصہ مانگے گا۔ اس وقت اس کی عمر بائیس سال تھی۔ بھائیوں نے سر سے ہاتھ اٹھایا تو شوہر بھی شیر بن گیا۔ بیٹا بھی پہلے سال ہو گیا تھا اور اب شوہر اسے اپنی جائیداد کا حصہ بھائیوں سے مانگنے پر مجبور کر رہا تھا۔ یہ تو بچپن سے دبی ہوئی تھی اور اپنے حق پر آواز بھی نہ اٹھا سکتی تھی۔ پھر شوہر مارنے پیٹنے لگا۔ بھائی سگے تھے مگر وہ اس کی دادرسی نہ کرتے تھے۔ وہ شوہر سے پٹتی بھی تھی اور گھر کا سارا کام بھی خود کرتی، وہ پڑھی لکھی تھی مگر شوہر کی تعلیم واجبی سی تھی۔

یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے کہ جب بھی وہ شوہر کی مار کھاتی تو اس کے جسم پر نیل پڑ جاتے تھے۔ بھائیوں سے شکایت کرتی تو وہ اسے برا بھلا کہتے۔ چھوٹا بھائی اس کی طرف داری کرتا مگر وہ بھی اپنے بڑے بھائی کے آگے زیادہ بول نہ سکتا تھا۔ وہ پانچ سال یہ ستم سہتی رہی۔ پھر اس نے اس ظلم کے خلاف آواز بلند کی اور عدالت میں طلاق کا مقدمہ دائر کر دیا۔ اس کے بعد بھائیوں نے غصے میں اپنے گھر کے دروازے اس پر بند کر دیے اور زور دیا کہ یا تو یہ مقدمہ واپس لو یا ہم سے قطع تعلق کر لو۔ جب ان سے اپنا حق مانگا تو بڑا بھائی دھمکیاں دینے لگا کہ کہیں بچے سے بھی ہاتھ نہ دھو بیٹھو۔ جب طلاق ہوئی تو فرمد کی زمین اس پر تنگ ہوتی چلی گئی۔ یہ وہاں سے اپنے بیٹے کو لیے اپنے کسی دور کے ماموں کے پاس تہران آ گئی۔ ماموں کے خاندان والے اسے قبول کرنے پر راضی نہ تھے کیونکہ فرمد میں ان کی زمینوں کی دیکھ بھال بھی اس کا بڑا بھائی کرتا تھا۔ پھر ماموں نے اسے کینیڈا کا راستہ دکھایا کہ وہاں سیاسی پناہ کی درخواست دے دو کہ اسے اور اس کے بیٹے کی جان کو اس کے بھائی سے خطرہ ہے۔ وہ کہتی تھی کہ اس منصوبے کے پیچھے بھی اس کے بڑے بھائی کا ہاتھ تھا۔ اس کی درخواست قبول ہوئی کیونکہ ماموں نے ایک اچھے وکیل کے ذریعے اس کا کیس دائر کروایا تھا۔ بھائی نے یہ سوچ کر وکیل کی فیس دی کہ اسی طرح بہن سے ہمیشہ کے لیے جان چھوٹ جائے گی اور جائیداد کی وراثت کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ یہ پھر ٹورنٹو آ گئی۔

یہ سب سنا کر بیگ سے رومال نکالا اور اپنے آنسو صاف کرنے لگی۔ پھر بولی۔ ''یہاں تو آ گئی ہوں مگر زندگی کا یہ لمبا راستہ میں اپنے معصوم بیٹے کے ساتھ کیسے کاٹوں گی؟ اب تو حکومت کی طرف سے ایک بیڈ کا اپارٹمنٹ ملا ہوا ہے مگر وہ کہتے ہیں کہ میں کوئی جاب کروں اور میرے پاس کوئی پروفیشنل ڈگری بھی نہیں تو میں کیا جاب کر سکتی ہوں۔ کسی اسٹور پر سیل گرل کے علاوہ کیا کام کر سکتی ہوں؟''

اس کی درد بھری داستان سن کر میں خود بھونچکا رہ گیا تھا۔ یہ بچپن سے اب تک دربدر ہو رہی تھی اور کیا معلوم آگے اس کے نصیب میں کتنے دھکے پڑے تھے؟

میں نے پوچھا۔ ''کیا اپنے بھائیوں سے کوئی رابطہ ہے؟''

وہ بولی۔ ''ہاں! چھ ماہ پہلے بڑا بھائی کسی ایکسیڈنٹ کی وجہ سے بیک انجری میں بستر پر لگ گیا ہے۔ وہ اب پچھتا رہا ہے۔ میری منتیں کرتا ہے کہ واپس آ کر اپنا حق لوں اور اسے معاف کر دوں اور میرا دل یہ خبر سن کر بہت بے چین ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''کیا تمہیں اپنے حصے سے اتنا مل جائے گا کہ تمہارا اور تمہارے بیٹے کے لیے کافی ہو؟''

وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ''ہاں! میرا حصہ اتنا ہے کہ میری اور میرے بیٹے کی زندگی باآسانی گزر سکتی ہے مگر میں واپس جانا نہیں چاہتی۔ مجھے گزرا ہوا وقت یاد آتا ہے تو کانپ جاتی ہوں۔'' کچھ توقف کے بعد اپنی بات آگے بڑھائی۔ ''بھائی کے مظالم کا سوچتی ہوں تو راتوں میں اٹھ بیٹھتی ہوں مگر اس کی تکلیف کا سوچ کر بہت بے چین ہو جاتی ہوں۔ کبھی

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

محسوس ہوتا ہے کہ کیا معلوم یہ بھائیوں کی چال تو نہیں ہے کیونکہ قانونی طور پر ساری جائیداد اپنے نام کروانے کے لیے بھی انہیں میری ضرورت ہوسکتی ہے۔ مجھے اب اپنوں سے بہت ڈر لگتا ہے اور اسی لیے ... میں تم سے کہتی رہی ہوں کہ مجھے کوئی ایسا دوست چاہیے جو مجھے صحیح سمت دکھلا سکے یا کوئی اچھا مشورہ ہی دے سکے۔''

لڑکی ایک بار ہنس ہنس کر بات کرے اور پھر بار بار کرے تو غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے۔ میں نسرین کے اپنے ساتھ رویے سے کئی بار الجھا اور کئی بار سلجھا۔ اگر اسے ایک دوست چاہیے تھا تو میں کیوں؟ پھر بھی یہ سوچتا کہ پھر میں کیوں نہیں؟ میں اس کے بارے میں کیا سوچتا تھا، وہ میں تو جانتا تھا مگر وہ کیا سوچتی ہے اس پر میں مغالطوں کا شکار بھی رہا۔ پھر سب کچھ اس کے آئندہ کے انداز پر چھوڑ دیا تھا۔ آج پھر میں الجھا بیٹھا تھا کہ جب کبھی ایک دو بار وہ میرے کندھے پر سر رکھ روئی تھی تو کیا وہ میری چاہت میں روئی تھی یا بھائی کے مظالم یا اس کے ایکسیڈنٹ پر غم زدہ تھی۔ اگر اس کے آنسو اپنے دکھوں پر بہے تھے تو کسی اور کے کندھوں پر اس کا سر کیوں نہ ٹکا؟ مگر یہ بھی تو ہوتا ہے کہ پچاس کی کلاس میں ایک یا دو لڑکے ہی آپ کے دوست بن پاتے ہیں۔ یہ تو ہم کبھی نہیں سوچتے کہ دوسرا صرف میرا دوست کیوں بنا ہے، کسی اور کا کیوں نہیں بن پایا؟ ہم رشتوں اور تعلقات میں بھی جواز ڈھونڈنا شروع کر دیتے ہیں۔ میں آج سر خرو بیٹھا ہوں کہ کبھی بھی میں نے اس کے بارے میں غلط نہیں سوچا تھا۔ ایک دوستی کا رشتہ تھا اور وہی سمجھتا رہا تھا۔ مجھے اندازہ نہ تھا کہ یہ دوستی اتنی بڑھ جائے گی کہ ہم باہر اکیلے بیٹھے ہوں گے اور اس کا ہاتھ میرے ہاتھوں میں ہوگا اور اس کی آنکھوں میں آنسو ہوں گے۔

اب وہ مجھ سے مشورہ مانگ رہی تھی کہ میں واپس ایران چلی جاؤں یا اپنی زندگی کو اپنے بیٹے کے ساتھ جیسے تیسے یہیں کینیڈا میں گزاروں۔ میں کچھ دیر سوچ کر بولا۔ ''میں واپس آجاؤں تو بات کریں گے اور اسی دوران میں بھی کچھ سوچتا ہوں۔''

میری اس بات پر وہ چونک پڑی۔ ''کیا مطلب کہ واپس آجاؤں؟ کیا کہیں جا رہے ہو؟''

میں بولا۔ ''کل میں دو ہفتے کے لیے امریکا جا رہا ہوں۔'' تو وہ بہت خفا ہوئی کہ اسے کیوں نہیں بتایا۔

میں نے جھوٹ بولا۔ ''ہمارا کل رات ہی کو پروگرام بنا تھا اس لیے بتا نہیں سکا۔''

یہ سن کر اور بگڑی اور پھنکارنے لگی۔ ''تم پر جھوٹ جچتا نہیں ہے۔ کچھ دنوں سے سرجی مجھ سے بار بار کہہ رہے تھے کہ ہم نیویارک جا رہے ہیں پر میں نے کوئی توجہ نہیں دی تھی۔''

اسے رام کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ شکایتی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے اسے منانے کے لیے بات کا رخ موڑا۔ ''تمہارے ہاتھ کتنے کمزور ہیں۔''

یہ سن کر پھر بگڑ گئی اور کہنے لگی۔ ''نازک ہاتھ کمزوری نہیں خوب صورتی کی علامت ہوتے ہیں۔''

اس کی آنکھوں میں پانی تیرنے لگا پھر میری جانب تیکھی نظروں سے دیکھ کر بولی۔ ''ایک تو تعریف کرنی نہیں آتی اور دوسرا اپنا رنگ دیکھا ہے جو مجھ پر بات کر رہے ہو۔ میں نے تو تمہارے رنگ پر آج تک کوئی بات نہیں کی۔''

میں نے اسے منانے کی خاطر یہ بات ہنس کر قبول کر لی۔ دل میں سوچا کالا تو نہیں پر گندمی ضرور ہوں مگر اسے بھی خوش کرنا تھا اور اسی لیے پکے رنگ ہونے کا نا کردہ جرم دل و جان سے قبول کر لیا۔ پھر ماحول میں کچھ دیر کے لیے پھیلی ناراضی آنسو بھری آنکھوں میں پھیلتی مسکراہٹ سے دور ہو گئی۔ میں نے بھی اطمینان کا سانس لیتے ہوئے اپنے اوپر چھائے درخت کی ٹہنیوں کو سکون سے دیکھا جن کے پتے جھڑ چکے تھے۔

ماحول نرم ہوا تو جھیل کے اوپر اور آسمان تلے اڑتے پرندے بھی ہماری جانب چلے آئے۔ ایک دو چکر ہمارے اوپر لگائے اور پھر کچھ کہتے ہوئے واپس جھیل کی جانب پرواز بھر گئے۔

ہم بہت دیر بیٹھے رہے۔ دھوپ چمک رہی تھی۔ ہوا کے جھونکے آہستگی سے ہمیں اپنی موجودگی کا احساس دلا کر واپس چلے جاتے مگر ان میں ملائمت تھی، کوئی کرختگی نہ تھی۔ ہم بھی گرم کپڑوں اور ٹوپیوں اور مفلروں میں لپٹے آسودہ بیٹھے تھے۔ کچھ دیر خاموش بیٹھے رہتے اور پھر کوئی نہ کوئی بات چھیڑ لیتے۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''تمہیں یہاں میرے ساتھ بیٹھنا کیسا لگ رہا ہے؟'' میں نے جگجیت سنگھ کی گائی نظم کا ایک مصرعہ پڑھا اور اس کا مطلب اسے سمجھانے لگا۔

تم سے بچھڑیں گے تو سوچیں گے
ہم نے کیا کھویا، ہم نے کیا پایا

یہ سن کر وہ چپ سی ہو گئی۔ شاید یہ سوچ رہی ہوگی کہ ہم دونوں .... ایک ساتھ بیٹھے تھے اور کوئی بھی اپنی دل کی بات زبان پر نہیں لا رہا تھا۔ میں سوچتا رہا کہ وہ یہ سوال آخر کیوں

WWW.PAKSOCIETY.COM

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف

ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ

کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ

ایڈ فری لنکس

ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر

ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety

پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بُک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بُک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

http://paksociety.com

Downloaded From Paksociety.com

پوچھ رہی ہے۔ کہ مجھے اس کے ساتھ بیٹھنا کیسا لگ رہا ہے۔ کیا اسے میرے ساتھ بیٹھ کر بھی میرے دل کے احساسات کا اندازہ نہیں ہوا؟ مگر میں یہ بھول بیٹھا تھا یا جانتا نہیں تھا کہ لڑکی ہمیشہ اظہار چاہتی ہے۔

پھر وقت گزرنے کا احساس بھی نہ ہوا۔ اتنے میں سردار جی اپنی کیب لے کر آدھمکے اور دور سے آواز دی۔ ''باؤ! چلنا نہیں۔''

میں اسے ٹیکسی پر گھر چھوڑنا چاہتا تھا مگر وہ بولی۔ ''بہت دور ہے۔ کرایہ زیادہ پڑے گا۔''

میں نے کہا۔ ''آج کرائے یا پیسوں کی بات نہ کرو۔ یہ حساب کتاب زمینوں کے ہیں جھیلوں کے نہیں۔''

میں اسے اس کے اپارٹمنٹ چھوڑنے آیا۔ پھر واپسی پر اسے فون کرنے کا وعدہ کیا اور سردار جی سے کہا کہ مجھے کیل سب وے پر اتار دے۔

میں واپسی پر سوچوں میں گم رہا۔ نسرین کی حالت زار کا مجھے آج اندازہ ہو گیا تھا۔ میرے خیال میں اسے واپس جا کر اپنا حق وصول کرنا چاہیے تھا یہاں اپنے چھوٹے بیٹے کے ساتھ اکیلی لڑکی کہیں کھو سکتی ہے۔ مجھے اسے ایسا مشورہ دینا تھا جو اس کے لیے بہتر ہو لیکن میں نے ابھی اپنی رائے کا اظہار نہیں کیا تھا۔ یہی سوچا کہ امریکا سے واپسی پر اسے قائل کروں گا۔ انہی خیالوں میں تھا کہ 46 نمبر بس نے مجھے میرے اسٹاپ پر اتار دیا۔ میں نے سوچوں کو جھٹک کر اپنے ذہن سے دور کیا اور قدم اپارٹمنٹ کی جانب اٹھا لیے۔

شام ہونے میں کچھ وقت باقی تھا جب میں اپارٹمنٹ میں داخل ہوا۔ اندر ہمیشہ کی طرح والا ماحول تھا یعنی کہ سرجی ... اپنے سینگ شہباز سے الجھا رہے تھے۔ سرجی یہ کہتے نظر آرہے تھے کہ شہباز کی زبان اور نظر دونوں کالی ہیں۔

شہباز طیش میں مکمل زرد پڑ چکا تھا اور کہہ رہا تھا۔ ''سرجی! آپ حدیں پھلانگ رہے ہیں۔ میرا اس میں کیا قصور ہے؟''

یہ جھگڑا چل رہا تھا اور میں واش روم میں کھڑا ہاتھ منہ دھوتے ہوئے انہیں لڑتے جھگڑتے سن رہا تھا۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہ تھی کہ ان کے جھگڑے کی بنیاد کیا ہے اور نہ اس چیز سے غرض تھی کہ یہ فساد کب تک چلے گا۔ مجھے تو بس چائے کا ایک کپ بنانا تھا اور اس دنگل کو دور سے بیٹھ کر سننا تھا۔

میں جب چائے بنا رہا تھا تو دیکھا ایک بڑا دیگچا چولہے پر چڑھا بلبلا رہا ہے۔ میں نے چائے بنائی اور ڈور وال سے ٹیک لگائے بیٹھ کر بھاپ اڑاتی چائے سے لطف اندوز ہونے لگا۔ وہ دونوں مجھے خاموش بیٹھا دیکھ کر ذرا دیر کے لیے خاموش ہوئے، مجھے دیکھا اور پھر دوبارہ سے الجھ پڑے۔ ان کے آپس میں لڑنے کی وجہ بھی بڑی عجیب وغریب تھی جو مجھے سرجی نے میرے نہ پوچھنے پر بھی سنا ڈالی۔

سرجی کہنے لگے کہ اچھی بھلی برف پڑ رہی تھی۔ موسم سہانا تھا اور ہر دوسرے دن برف باری ہوتی تھی مگر شہباز کی نظر بدلگی اور برف باری تو رکی مگر ساری برف بھی پگھل گئیں۔ شہباز کا نقطہ نظر واضح تھا کہ اس موسم کی تبدیلی میں اس کا ہاتھ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں نے بھی چھیڑ خوانی کی اور سرجی سے بھی کہا۔

''شہباز تو بے چارہ بے قصور ہے۔ یہ تو اللہ کے کام ہیں۔''

سرجی کی دلیل یہ تھی۔ ''شہباز پچھلے چند دن سے برف باری کو ماں، بہن کی ننگی ننگی گالیاں دیتا آرہا تھا۔ میں نے ایک دو بار اس کی سرزنش بھی کی مگر شہباز باز نہ آیا اور پھر آج صبح اس کی نحوست اپنا رنگ لے آئی۔''

شہباز نے سرخ آنکھوں اور زرد چہرے سے رحم بھری نظروں سے مجھے دیکھا تو میں نے پوچھا۔ ''کیا واقعی تم نے گالیاں دی تھیں؟''

وہ بولا۔ ''اس کو تو گالیاں نہیں دی تھیں۔ اگر ایک آدھ دی بھی تو اس ٹھنڈ اور برف باری کو دی تھی جو ہفتوں سے ہمارا پیچھا نہیں چھوڑ رہی تھی۔''

یہ سن کر سرجی فوراً بولے۔ ''دیکھا! میں تمہیں کہتا تھا کہ یہ مہینوں سے برف باری کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔'' پھر وہ بغیر رکے بولے۔ ''ایک ہم ہیں کہ اسے آنکھوں میں رکھتے ہیں اور ایک یہ ہے کہ مجھے آنکھوں سے گراتا ہے۔''

شہباز بولا۔ ''ایک تو یہ لکھنؤ والی اردو بولتا ہے جو غالب کے زمانے میں بولی جاتی تھی اور دوسرا اس کو ٹھنڈ اور برف سے پیار نہیں بلکہ اسے بہانہ چاہیے کہ اس موسم کی آڑ میں گرم دودھ میں جلیبیاں ڈال کر کھاتا ہے۔''

پھر اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ''معلوم نہیں اتنی جلیبیاں کھا چکا ہے مگر اسے کبھی گرمی نہیں ہوتی۔''

میں نے کہا۔ ''اردو ہماری قومی زبان ہے اور ہم کو چاہیے کہ سرجی سے اصل اردو سیکھ کر اپنا سر فخر سے بلند کریں۔ اس کو تنقید کا نشانہ نہ بنائیں۔''

شہباز کراہ کر بولا۔ ''خدانخواستہ اردو کو تو میں نے کچھ نہیں کہا۔ بلکہ یہ کہا ہے کہ جو بولے، ہمیں سمجھائے بھی تو۔ کیا معلوم اس کے محاوروں کے کیا معنی نکلتے ہیں۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

میں نے سرجی سے کہا۔ ''ہر آدمی کی اپنی پسند اور ناپسند ہوتی ہے اگر اسے برف باری سے چڑ ہے تو آپ ہی خاموش ہو جایا کریں۔''

پھر سر ہلا کر راضی ہوئے اور یہ کہا۔ ''آپ صحیح فرما رہے ہیں اسی لیے تو کہتے ہیں آدمی آدمی انتر کوئی ہیرا کوئی کنکر.....''

میں نے سر کھجاتے ہوئے پوچھا۔ ''ہیرا کون ہے اور کون کنکر ہے؟''

بولے۔ ''مطلب ہے کہ ہر آدمی کا مزاج یکساں نہیں ہوتا۔''

پھر ایسا لگا جیسے شہباز کو کچھ یاد آیا اور وہ شکوہ کناں ہوا۔ ''صبح سے دیگچا چولہے پر چڑھایا ہوا ہے، معلوم نہیں کیا بنا رہے ہیں۔''

میں یہ سن کر پوچھ بیٹھا۔ ''سرجی! ویسے کیا بنا رہے ہیں؟''

بڑی معصومیت سے بولے۔ ''بڑے کے پائے لایا تھا، وہی بنا رہا ہوں۔''

میں سن کر اٹھ بیٹھا۔ ''کیا بنا رہے ہیں؟''

دبی دبی ہنسی ان کے لبوں پر آئی، سر جھکایا اور شرما کر بولے۔ ''ماشاء اللہ بڑے کے پائے ہیں۔ بہت لذیذ بناتا ہوں، آپ کی بھابی بھی ذوق وشوق سے کھاتی ہیں۔''

میں اب اپنا سر پکڑے بیٹھا تھا۔ صبح سے بھوکا تھا اور ادھر سرجی نے پائے چڑھائے تھے اور مجھے یقین تھا کہ یہ کل صبح ہی تیار ہوں گے۔ شکر ہے کہ فریج میں خان اور واجد کا لایا ہوا کھانا پڑا تھا۔

میں نے دونوں سے پوچھا۔ ''کل کا کیا پروگرام ہے۔ کل شام ہی کو امریکا کے لیے نکلنا ہے۔''

سرجی بولے۔ ''ہم دونوں کے بیگ تیار ہیں۔ پاسپورٹ اور لینڈنگ پیپرز بھی رکھ لیے ہیں۔ انشاء اللہ کل شام یہاں سے سیدھا بس اڈے پر چلیں گے۔''

میں آرام کرنے کمرے میں چلا گیا جب کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے روٹھے آمنے سامنے بیٹھے رہے۔

میں دو گھنٹے بعد مکمل آرام کر کے بیدار ہو کر لیونگ روم میں آیا تو وہ دونوں اسی حالت میں تھکے ہارے بیٹھے تھے اور کچن میں وہی دیگچا ابھی تک بلبلا رہا تھا۔ شام کی سیاہی اب رات کی تاریکی میں بدل چکی تھی۔ ڈور وال کے شیشوں کے باہر لیمپ پوسٹوں پر بلب جگمگا رہے تھے، جو دو دن پہلے برف کی دھند میں مغموم تھے۔ میں لیونگ روم میں آیا تو اب سرجی کو خیال آیا کہ میں پورا دن کہاں تھا؟ میں نے سچ بول دیا کہ نسرین کے ساتھ تھا تو انہوں نے اسے میرا مذاق یا اکتاہٹ سمجھ کر پھر مجھ سے نہیں پوچھا کہ میں تھا کہاں؟ آج سچ بولا تو سوالوں سے جان چھوٹ گئی۔

کل جمعہ کا دن تھا۔ مجھے ہیموسال سے جاب لیٹر لینا تھا اور پھر جمعہ نماز پڑھنی تھی۔ شام کو نیو یارک جانے کے لیے گرے ہاؤنڈ کی بس ڈاؤن ٹاؤن سے لینی تھی۔ کل کا دن میرے لیے بہت اہم تھا۔ میری آج تک کی جدوجہد، جو میں نے پاکستان میں اور پھر یہاں آکر کی تھی، اس کا ثمر ملنے والا تھا۔ یہاں کینیڈا میں آبسنا اور کوئی مناسب جاب حاصل کرنا اور پھر امریکا دیکھنا میرا خواب تھا اور دونوں خواب ایک ہی دن پورے ہونے والے تھے۔ ہمیشہ سے میرے جیسے بہت سے لوگوں کی امریکا کی سرزمین پر قدم رکھنا اور بڑی آرزو رہی ہے۔ امریکا کے قصے اور داستانیں سننا بھی جسم میں سنسنی دوڑا دیتا تھا اور یہ خواہش کل تعبیر میں بدلنے والی تھی۔

پائے تو پکنے سے رہے میں نے فریج سے اسی کھانے کو نکال کر گرم کیا۔ مقتی اور میں نے کھانا کھایا پھر سونے چلا گیا مگر سرجی اور شہباز پایوں کی ضد میں بیٹھے رہے۔

صبح اٹھا تو موسم ایک دم ہی بدل چکا تھا۔ پھر سے ہلکی ہلکی بارش شروع تھی۔ یہاں کا موسم اور دل بدلتے کوئی دیر نہیں لگتی۔ دونوں ہی پل میں تولہ اور پل میں ماشہ۔ انسانی زندگی ہر ایک کو عجب تماشے دکھلاتی ہے۔ انسان ایسے ایسے تجربات سے گزرتا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ جب میں ٹورنٹو کی زمین پر پہلی بار اترا تو بالکل یہی موسم تھا۔ ٹھنڈ تھی، دھند چھائی تھی اور ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ بارش کیا تھی بس دھند زدہ آسمان کے نیچے تیرتے پانی کے قطرے تھے۔ بھیگا بھیگا سرد موسم تھا۔ آج بھی یہی آب و ہوا گرد و نواح میں پھیلی ہوئی تھی جب میں اپنا جاب لیٹر ہیموسال سے لے کر نکل رہا تھا۔ وہ کوئی ایک سفید رنگ کا لفافہ نہ تھا بلکہ ایک مطمئن کر دینے والا احساس تھا۔ میں نے سر اٹھا کر آسمان کی جانب دیکھا تو دھند کے سوا کچھ نہ تھا مگر رب کے ہونے کا احساس مسلم تھا۔ اس کی نوازشیں اور عنایتیں پانی کے قطروں کی صورت میرے چہرے پر گر رہی تھیں۔ آج ان میں وہ یخ بستگی نہ تھی جو پہلے ہوا کرتی تھی۔ آج ان میں ایک دعا کی قبولیت کی حرارت تھی۔ میں صاف طور پر عنایتوں کی حرارتوں سے پگھل رہا تھا اور برفانی قطرے پگھل کر آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ مجھے ایمان کی حد تک یقین تھا کہ یہ نوازشیں ختم نہ ہوں گی۔ میں وہ سفید لفافہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

پکڑے تادیر چلتا رہا۔ میں کسی بس میں بیٹھا مسجد کی جانب جمعہ نماز پڑھنے آرہا تھا اور یہی سوچ رہا تھا کہ مجھ میں ایسی کیا خاص بات تھی جو میری تنخواہ بھی میرے اندازوں سے زیادہ تھی۔

آج سجدوں میں میرا سر نہ تھا بلکہ میں خود پورا کا پورا تھا اور آنسو مسجد کے نرم گرم کارپٹ پر گر رہے تھے۔ مجھے یاد آرہا تھا کہ میں نے سالوں کینیڈا کی امیگریشن کا انتظار کیا تھا اور جب لینڈنگ پیپرز ملے تو خوشی سے زیادہ مطمئن تھا۔ آج بھی لگ بھگ وہی حالت تھی۔ اپارٹمنٹ پہنچا تو سرجی اپنا بیگ کمپیوٹر ٹیبل پر رکھے تیار بیٹھے تھے۔ جب پوچھا کہ ابھی تو نیویارک جانے میں تین گھنٹے باقی ہیں اور آپ تیار ہوئے بیٹھے ہیں تو بولے۔ ”جتنا جلدی جائیں گے تو آگے والی سیٹیں ملیں گی۔“

شہباز نماز پڑھنے گیا تھا اور ابھی آیا ہی چاہتا تھا۔ کھانے کا پوچھا تو انکشاف ہوا کہ ساری رات چولہے پر پکنے کے بعد پائے تیار ہیں۔ جاب لیٹر ملنے پر سرجی نے خوشی میں پائے کھلائے جو غیر متوقع طور پر بہت اچھے بنے تھے۔ پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ میرا بیگ تیار تھا اور اپنے جاب لیٹر کا اس میں اضافہ کرنے کے بعد کچھ دیر آرام کرنے کمرے میں جا کر سو گیا۔

میں گہری نیند میں تھا کہ سرجی نے میرا کمبل کھینچ کر دور پھینکا اور زبان سے کچھ اس قسم کے الفاظ نکال کر میرے کانوں کو چیرتے گئے۔ ”بس کے جانے کا ٹائم ہو رہا ہے اور لوگ مزے سے نیند میں بے ہوش پڑے ہیں۔“

دیوار پر لگے کلاک پر ٹائم دیکھا تو ابھی جانے میں بہت ٹائم تھا۔ میں نے کہا۔ ”سرجی ابھی چار گھنٹے باقی ہیں، ذرا سا آرام کرنے دیں۔“

وہ میرے سر پر کھڑے کہہ رہے تھے۔ ”آپ کو بسوں کا پتا نہیں نہایت ہی خبیث ہوتے ہیں۔ سواریاں پوری ہو گئیں تو بس چلا دیتے ہیں۔ آپ ان کو مجھ سے بہتر نہیں جانتے، میں نے آپ سے چار برس زیادہ دیکھی ہیں۔“

میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ معلوم نہیں انہوں نے اتنے محاورے یاد کیسے کر لیے تھے۔

ہم نے بس کی ٹکٹیں نہیں لی تھیں اور نہ ہی ایڈوانس میں ملتی تھیں۔ ہر آدھے گھنٹے بعد ٹورنٹو سے نیویارک کی بس روانہ ہوتی ہے۔ اسی لیے جب میں نے فون کیا تھا تو یہی کہا گیا کہ آپ جب بھی آئیں، آپ کو بس ہر وقت تیار ملے گی۔ پہلے سے ٹکٹ لینے کا سب سے بڑا مسئلہ بھی یہی ہوتا ہے کہ آپ وقت سے پہلے چوکنے ہو کر پھرتے رہتے ہیں کہ جیسے کوئی معرکہ ... مارنے کا وقت آیا چاہتا ہے۔ اب تو ہمیں بے فکری تھی۔ آٹھ والی نہ تو ساڑھے آٹھ والی بس مل جائے گی۔

میں نے شاور لیا اور اپنی یونیفارم پہنی۔ یونیفارم سے آپ یہ مطلب لیں کہ کوئی سے بھی کپڑوں پر وہی لیدر کی جیکٹ، اونی ٹوپی اور مفلر اور پھر پاؤں میں وہی سیکیورٹی شوز۔ سرجی اور شہباز بھی اپنے طور پر تیار تھے۔ سرجی نے ایک لفافے کو بڑی احتیاط سے پکڑا ہوا تھا جیسے بٹر بازٹر کو تھامے ہوتا ہے۔ کوئی برتن اس میں محسوس ہوتا تھا۔ پوچھا تو شہباز جھنجھنا کر بولا۔ ”اپنی سالی کے لیے پائے لے کر جا رہے ہیں۔“

میں نے پوچھا۔ ”کیا کچھ بچ گئے تھے؟“

شہباز بولا۔ ”نہیں! پہلے ہی سے ایک برتن میں ڈال کر نیچے الماری میں چھپائے ہوئے تھے۔“

میں نے سرجی سے کہا۔ ”اسے فریج میں رکھیں اور پھر اپنے بیگ کی تلاشی بھی دیں۔“

وہ بگڑ گئے۔ ”کیا میں کوئی چیز چرا کر لے جا رہا ہوں۔ یہ مجھ پر غلط الزام ہے۔ میں واپڈا میں بڑی پوسٹ پر رہا اور ایک روپے کی چوری نہیں کی اور آپ مجھ پر الزام دھر رہے ہیں۔“

وہ بولتے جا رہے تھے تو شہباز بھی گھبرا گیا تھا۔ وہ مجھے کچھ کہنے کا موقع بھی نہیں دے رہے تھے۔

بڑی مشکل سے انہیں چپ کروایا اور اصل وجہ بتائی۔ وہ پھر سن کر پہلے تو خاموش ہوئے، پھر کچھ سوچنے لگے اور شرمندہ ہوئے اور اپنا بیگ کمپیوٹر ٹیبل پر رکھا اور جھٹ سے زپ کھول دی۔ میں صاف دیکھ رہا تھا کہ انہوں نے اپنے بیگ پر ایک سفید کاغذ چپکایا تھا جس پر ان کا یہاں کا اور نیویارک کا ایڈریس بھی لکھا تھا۔ میں نے کسٹم آفیسر کی طرح ان کے بیگ کی تلاشی لی۔ اندر سے ٹافیاں، دیسی اسٹور سے خریدی گئی نمکو، سبز چائے کی کھلی پتی، اسپغول کا چھلکا، کھلا گرم مسالہ، سوکھا ساگ اور سوکھا شلغم اور اسی قسم کی چیزیں برآمد ہوئیں۔ میں نے نمکو اور ٹافیوں کے علاوہ سب چیزیں ایک سائیڈ پر رکھیں۔ میں نے کین سینٹر سے انٹرنیٹ پر دیکھ لیا تھا کہ کیا چیزیں امریکا لے جانا ممنوع ہیں۔ کوئی کھلی شے جو ان کے لیے اجنبی ہو تو وہ وہیں دھر لیتے ہیں۔ چائے کی پتی، اسپغول کا چھلکا اور سوکھا ساگ تو وہ کتوں کو سنگھاتے ہیں۔ پھینک تو دیتے ہیں اور اگر آپ نے زیادہ احتجاج کیا کہ ماں نے خصوصی طور پر یہ چیزیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

دی ہیں تو آپ کو واپس بھی بھیج سکتے ہیں۔ میں ہر بار ڈیرہ اسماعیل خان کا مشہور سوہن حلوا لاتا ہوں۔ اگر گتے کے ڈبے میں ہو تو وہ پھینک دیتے ہیں اور اگر ٹن پیک میں ہو تو جانے دیتے ہیں۔ وہ یہی سمجھتے ہیں کہ ٹن پیک میں کوئی بھی چیز بند ہو گی تو وہ کسی کمپنی کے برانڈ پیک میں ہو گی۔ اس کے علاوہ کوئی بھی کھلی ہوئی اور لفافے میں بند چیز ہو تو ان کے لیے منشیات کے زمرے میں آتی ہے۔

ایک بار میری بیوی کی ماں نے بیٹی کو بڑے پیار و محبت سے سویاں بنا کر دیں۔ بیٹی بھی بڑی خوش و خرم تھی اور سب سے یہی کہتی پھر رہی تھی۔ ''امی نے خاص طور پر اپنے ہاتھوں سے میرے لیے بنائی ہیں۔'' واپسی پر ٹورنٹو سے امریکا میں بذریعہ کار داخل ہوا تو کسٹم والوں کی تلاشی پر یہ سویاں پکڑی گئیں۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا۔ ''یہ کیا ہیں؟'' مجھے کچھ معلوم نہ تھا کہ سویاں کے لیے کوئی انگریزی کا لفظ دریافت ہوا ہے یا نہیں؟ میں نے اشاروں سے بتایا کہ آٹا اور میدہ ہوتا ہے۔ اسے گوندتے ہیں۔ پھر ایک مشین اور چالی سمجھانے کی کوشش کی کہ پھر اس ملیدے کو اس میں سے گزارتے ہیں۔ مشین کے لمبے ڈنڈے پر کسی بچہ کو بٹھا دیتے ہیں اور یہی حاصل ہوتا ہے جس کو آپ لوگوں نے ضبط کیا ہوا ہے۔ اس آفیسر نے بہت دلچسپی اور غور سے سارا طریقہ کار سمجھا اور پھر نہ میں سر ہلا کر بولا مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ میری بیوی اپنی ماں کی بنائی ہوئی سویوں کی درگت بنتے دیکھ کر مسکین صورت بنائے کھڑی تھی۔ ساتھ والی کرسی پر ایک اور کسٹم آفیسر بیٹھا اپنا کام کر رہا تھا مگر اس کے کان یہیں لگے تھے۔ ہمارے آفیسر کو سمجھ میں تب آیا جب دوسرے نے پکار کر یہ کہا He meansnoodles ''اس کا مطلب ہے کہ یہ نوڈلز ہیں''۔ ہم سب نے یک زبان ہو کر نوڈلز نوڈلز کہنا شروع کر دیا اور آخر کار انہوں نے ہمیں سویوں سمیت جانے دیا۔ گھر آ کر میں نے بیوی سے کہا کہ یہ میں تو نہیں کھاؤں گا اور سب تم ہی نے ختم کرنی ہیں۔

میں نے دراصل سرجی کو یہی سمجھایا تھا کہ کوئی ایسی چیز تو نہیں جن پر انہیں منشیات کے ہونے کا شبہ ہو۔ یہی سن کر وہ سر جھکائے خاموش ہو گئے تھے۔ میں نے اپنے آپ کو عقل مند ثابت کر دیا تھا مگر واپسی پر ایک ایسی چیز پر پکڑا گیا جس پر پکڑے جانے کا یقین ہونا چاہیے تھا اور میں پھر بھی اٹھا لایا تھا۔

میں نے سرجی کو بڑی عقل مندی سے یہ چیزیں نہ لے جانے کی وجہ بتائی اور انہوں نے نہایت دانشمندی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ہم سب وے سے ڈاؤن ٹاؤن میں ڈن داس اسٹیشن سے باہر نکلے تو ٹھنڈ میں وہ کاٹ نہ تھی جو فروری کے مہینے میں ہونی چاہیے تھی۔ آسمان پر بادل تھے مگر برسنے سے عاری تھے۔ تھوڑا سا چل کر بے اسٹریٹ کو آئے تو سامنے گرے ہاؤنڈ بس سروس کا ٹرمینل تھا۔

سرجی جواب تک خاموش تھے اب بول پڑے تھے۔ شہباز سے کہنے لگے۔ ''بسوں کے اڈے ہوں تو ایسے ہوں۔ دل چاہتا ہے کہ ہر وقت سفر کیا جائے۔'' شہباز نے کوئی جواب نہ دیا اور انہوں نے اپنی بات آگے بڑھائی۔ ''ماشاء اللہ ایسا لگتا ہے کے جہازوں کا ایئرپورٹ ہو۔ کینیڈا کی یہ بات مجھے بہت پسند ہے کہ یہاں بسوں کے اڈے نیو خان کے اڈوں سے بہت اچھے ہوتے ہیں۔'' وہ حالانکہ پہلی بار یہاں کے کسی بس ٹرمینل کو دور سے دیکھ کر اپنی حتمی رائے دے رہے تھے۔ ہم بھی پہلی بار کسی بس ٹرمینل کو سامنے دیکھ رہے تھے۔

اندر داخل ہوئے تو وہ کسی ایئرپورٹ کے ٹرمینل سے کم نہ تھا۔ لاؤنج میں آرام دہ کرسیاں تھیں۔ فرش پر گہرے رنگ کا دبیز کارپٹ تھا۔ اردگرد کافی شاپس، فاسٹ فوڈ کی مختلف چین اور خریداری کے لیے جنرل اسٹور تھے جنہیں یہاں Convenient اسٹور کہا جاتا ہے۔ چھتوں میں لگے اسپیکروں سے مختلف مقامات پر جانے کی بسوں اور ان کے اسٹینڈ نمبر اور جانے کا وقت بتایا جا رہا تھا۔ ابھی اعلان ہو رہا تھا کہ نیاگرا فال کے کیسینو کے لیے بس دس منٹ میں روانہ ہونے والی ہے۔ نیاگرا فال میں دو بڑے جوا خانے ہیں اور سستی ٹکٹ پر بسیں آپ کو وہاں لے جاتی ہیں۔ آپ بہت کچھ ہار کر اور تھوڑا بہت جیت کر انہی بسوں سے واپس آتے ہیں۔ مسافروں کو ٹکٹیں سستی بیچتے ہیں مگر کیسینو والے ان کا یہ نقصان خود پورا کر دیتے ہیں۔

چھتوں اور دیواروں سے لگے تیروں کے نشانات آپ کی رہنمائی کے لیے لگے تھے۔ پورا ٹرمینل روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔

شہباز بولا۔ ''پہلے واش روم ہو آتے ہیں۔''

سرجی بولے۔ ''بائے بھی تم نے بہت کھائے ہیں اور میری سالی کا حصہ بھی پی گئے ہو اب بھگتو۔''

شہباز اب خاموش نہ رہا اور سالی کو گالی دے کر سرجی کو بھڑکا دیا۔ سرجی مرنے مارنے پر تل گئے۔ میں نے معاملے کو

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ہمارا اپنا ملک پاکستان کتنی خوبیاں رکھتا ہے کیا آپ اس کے بارے میں کچھ جانتے ہیں۔ چلیں کچھ ایسی باتیں بتا دیں جن کو جان کر آپ خوشی محسوس کریں گے۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ دنیا کے بلند ترین پہاڑی سلسلے ہمالیہ اور ہندوکش پاکستان میں ہیں بلکہ دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی K2 بھی پاکستان ہی میں ہے اور دنیا کی سب سے بڑی اور سب سے گہری سمندری گودی بھی پاکستان میں ہے، گوادر۔ کسی بھی ملک کے لیے سمندر کا اتنا گہرا ہونا ایک بہت بڑا سرمایہ ہوتا ہے اور یہ خوشی کی بات ہے کہ یہ سرمایہ پاکستان میں ہے۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ دنیا کا آٹھواں عجوبہ کہاں ہے؟ جی ہاں یہ بھی پاکستان میں ہے۔ شاہراہ قراقرم۔ چین کے تعاون سے تیار کی ہوئی۔ یہ شاہراہ دنیا کا آٹھواں عجوبہ ہے۔ اس کی بلندی 15399 فٹ ہے۔ اتنی بلندی پر کسی سڑک کے بارے میں صرف سوچا ہی جاسکتا ہے اور یہ سڑک پاکستان میں ہے۔ دنیا کے سب سے بلند کھیل کے میدان بھی پاکستان میں ہیں۔ یہ دنیا کا سب سے اونچا پولو گراؤنڈ ہے۔ 12200 فٹ بلند۔ جی جناب، بارہ ہزار دو سو فٹ کی بلندی پر گھوڑوں پر سوار ہو کر مشہور ترین کھیل پولو کھیلا جاتا ہے۔ چترال اور گلگت کی مشہور ترین ٹیموں کے درمیان میچ کھیلے جاتے ہیں۔ جن کو دیکھنے کے لیے ہر سال ہزاروں سیاح آیا کرتے ہیں۔ ایک اور بات سن لیں۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ دنیا کا سب سے بڑا آب پاشی کا نظام بھی پاکستان میں ہے۔ جی ہاں یہ حقیقت ہے۔ یہ شاندار مقام 14.71 ملین ہیکٹر پر پھیلا ہوا ہے۔ اس نظام کو ترتیلا اور

یہ نصیحت دے کر سنبھالا۔ ''سفر پر جانے سے پہلے اللہ سے دعائیں مانگیں۔ کسی کی سالی کے لیے مہذب انداز اختیار کریں۔''

سرجی نے میری تائید کی اور کہا۔ ''میں اپنی سالی کے بارے میں بہت حساس ہوں اور سب کو ہونا چاہیے مگر اس نے میری سالی کے بارے میں نازیبا باتیں کر کے میری طبیعت کو اتھل پتھل کر دیا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''یہ طبیعت اتھل پتھل کب ہوتی ہے؟''

جواب دیا۔ ''جب سالی کو گالی پڑے تو تب ہوتی ہے۔''

شہباز بولا۔ ''میں خود بھی تمہاری سالی کے بارے میں بہت حساس ہوں اور انشاء اللہ رہوں گا۔''

شکر ہے سرجی اس کی بات کی تہہ تک نہ پہنچ سکے اور شہباز کا شکریہ بھی ادا کیا۔

واش روم اتنے صاف ستھرے تھے جتنے یہاں ہوتے ہیں۔ ایک بڑی لابی میں لاکرز تھے۔ ان میں مسافر اپنا سامان رکھ رہے تھے جنہوں نے دیر بعد جانا تھا یا کہیں جا کر واپس آنا تھا یہ ان کی سہولتوں کے لیے ہے۔ میں یہ سارا نظام دیکھ کر ان کا معترف ہو رہا تھا۔

نیو یارک کی ٹکٹیں ہمیں پونے نو بجے والی بس کی با آسانی مل گئیں دس گھنٹے سے زائد کا سفر تھا اور ٹکٹ کی قیمت ہمارے اندازوں سے انتہائی کم تھی۔ پاکستان میں جو کرایہ لاہور سے پشاور کا جو چھ گھنٹوں میں ہوتا ہے اس سے بھی کم۔

سرجی کا مشورہ تھا کہ جانے میں پون گھنٹا رہتا ہے، کیوں نہ کچھ کھا پی لیا جائے؟ سب متفق ہوئے تو سرجی مونگ پھلی کے دو بڑے لفافے اور کوک کے ٹن پیک پکڑ لائے۔ آتے ہی فخریہ انداز سے بولے۔ ''سفر میں بھوک بہت لگتی ہے۔ کھانے میں کچھ نہ ہو تو مونگ پھلی بھی ہوتی ہے اسی لیے مونگ پھلی لایا ہوں۔''

میں بولا۔ ''آپ کی پیٹ کی آگ مونگ پھلی سے بجھ جائے گی؟''

شہباز بڑبڑاتا ہوا گیا اور کچھ چپس، چاکلیٹ اور بسکٹ لے آیا۔ سرجی نے شہباز کا لفافہ ٹٹولا تو بولے۔ ''پاکستان میں تو سنگھاڑے کھاتے تھے اور یہاں آکر ایسے ہو گئے کہ جیسے جاٹ کی بیٹی برہمن کے گھر بیاہ کر آئی ہو۔'' اور شہباز غصے میں سر ہلا کر رہ گیا۔

ہماری روانگی کا اسپیکر سے اعلان ہوا تو برقی زینوں سے ہم نیچے سڑک پر اترے۔ لمبی اور شاندار چوڑی بسیں ایک لائن میں کھڑی جیسے ہمارے انتظار میں تھیں۔ زمین سے سیٹیں چھ فٹ بلند تھیں۔ دو اصحاب وردی پہنے دروازے کے ساتھ کھڑے تھے۔ ایک ہماری ٹکٹ چیک کرتا، کاغذ پر چیک مارک لگاتا اور دوسرا ہم سے ہمارا سامان لے کر نیچے والی کمپارٹمنٹ میں رکھ دیتا۔ سرجی بولے۔ ''ان۔ کے کنڈیکٹر بھی ماشاء اللہ پائلٹوں والی وردی پہنے ہوتے ہیں۔''

بعد میں معلوم ہوا کہ جو سامان رکھ رہا تھا یہی ڈرائیور تھا اور بس میں کوئی کنڈیکٹر نہ تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

چشمہ بیراج سے پانی ملتا ہے۔ اس میں 43 نہریں ہیں اور یہ نہریں 58500 کلومیٹر کا احاطہ کرتی ہیں۔ ہے نا حیرت کی بات۔ ایک اور قابلِ فخر بات دنیا کی سب سے بڑی ایمبولینس سروس بھی پاکستان میں ہے یعنی ایدھی۔ اب تو یہ سروس یو کے، امریکا، کینیڈا، جاپان اور چین تک پھیل چکی ہے۔ یہ کوئی عام یا معمولی بات نہیں ہے بلکہ بہت بڑی بات ہے۔ دنیا کی دوسری بڑی نمک کی کان بھی پاکستان میں ہے۔ آپ نے نام ضرور سنا ہوگا کھیوڑہ کی کانیں۔ یہ کانیں سکندر اعظم کے وقت سے ہیں۔ یعنی 320 قبل از مسیح سے۔ ان کانوں سے ہر سال تین لاکھ پچاس ہزار ٹن نمک نکالا جاتا ہے۔ اگر آپ نے پاکستان میں رہتے ہوئے کھیوڑہ کی کانیں نہیں دیکھیں تو ایک عظیم الشان نظارے سے محروم ہو گئے ہیں۔ ان کانوں میں کیا نہیں ہے۔ نمک کے بنے ہوئے شاپنگ مالز، مسجدیں، ریسٹ رومز وغیرہ۔ آپ اندر جا کر خود کو جادو نگری میں محسوس کرتے ہیں۔ اور جب نمک کے رنگین بلاکس پر روشنیاں پڑتی ہیں تو وہ سماں ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ اور یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ دنیا کا مقبول ترین کھیل فٹ بال ہے اور آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ پوری دنیا میں جتنے فٹ بال استعمال ہوتے ہیں وہ پچاس فی صد سے زیادہ پاکستان میں تیار ہوتے ہیں۔ ان حقائق کی موجودگی آپ کو اپنے ملک پر فخر کرنے پر مجبور کرسکتی ہے۔ بشرطیکہ آپ مخلص ہوں۔

مرسلہ: نورالعین۔ پشاور

ہم سوار ہوئے تو دیکھا کہ دو دو سیٹیں ہر ایک سائیڈ پر تھیں۔ شہباز اور سرجی اکٹھے بیٹھے۔ سرجی جھگڑا کر کے کھڑکی والی سیٹ پر براجمان تھے۔ میرے ہمراہ کھڑکی کے ساتھ ایک سیاہ فام لڑکی براجمان تھیں۔ ان دونوں کی سیٹوں کے پیچھے ایک گورا لڑکا اور ایک نہایت خوب صورت شکل والی لڑکی آپس میں ہنستے اور پھر بوسے لینا شروع ہو جاتے۔

سرجی تو مجھ سے گلہ کر رہے تھے۔ ”خود تو ایک حسینہ کے ساتھ جا بیٹھے ہیں، ہمیں شہباز کے حوالے کر دیا ہے اور ہماری جان بےکل ہو رہی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”شہباز کے ساتھ کیا تکلیف ہے آپ کو؟“

پھر بولے۔ ”دبستن لگے، وہی تن جانے۔“

میں نے انہیں کہا کہ مجھ سے سیٹ تبدیل کر لیں تو وہ پہلے کچھ دیر سیاہ فام لڑکی کو بغور دیکھتے رہے۔ پھر اپنی سیٹ سے اٹھے اور پھر سوچا کہ اس کالی لڑکی کے ساتھ بیٹھنا بے فائدہ ہے، آخر میں کسی نتیجے پر پہنچے اور پھر دوبارہ اپنی جگہ پر منہ پھیر کر بیٹھ گئے۔

میں اپنی آرام دہ اور کشادہ سیٹ پر بیٹھا، اپنے پاؤں پھیلائے تو سکون کا احساس ہوا اور پھر اپنی آنکھیں موندھ لیں۔ پورا دن تھکاوٹ کی نظر ہو چکا تھا۔ صبح سے دوڑ دھوپ جاری رہی تھی۔ تھوڑی دیر سویا تھا کہ سرجی کے محاوروں کے ہتھوڑے سر پر برسے تو جیسے تھکاوٹ پھر چڑھ آئی۔ سرجی کی ثقیل اردو کو میں کیا، کوئی بھی نہ سمجھتا تھا اور ہم سن کر درگزر کر جاتے تھے۔ پھر میں نے سوچا کہ کیوں نہ اس طرح سے اردو کے محاورے ان سے سیکھ لوں۔ پھر جب بھی وہ کوئی ایسی بات کرتے تو میں اس کا مطلب بھی پوچھ لیتا۔ وہ میرے اب استاد بنے تھے اور انہیں خبر نہ تھی کہ میں انہیں اپنا مرشد مان چکا ہوں۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر انہیں ذرا سی بھی شنید ہو جاتی کہ میں ان سے اپنی اردو صحیح کر وا رہا ہوں تو وہ مجھے کسی نہ کسی جگہ پر بلیک میل کرتے رہتے۔

میں آنکھیں بند کیے اپنی سیٹ پر اب حالتِ سکون میں بیٹھا تھا۔ میں کینیڈا سے امریکا جا رہا تھا۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ جس خواب کو میں بھول چکا تھا، وہ اب حقیقت کا روپ دھارنے والا ہے۔ مجھے امریکا جانے کا نہیں بلکہ دیکھنے کا اشتیاق تھا۔ اتنا کچھ سن رکھا تھا کہ اب اس کی زندگی کو قریب سے دیکھنا چاہتا تھا۔ کچھ سال پہلے جب میرا ویزا مسترد ہوا تھا تو امریکا کے خیال کو میں نے اپنے ذہن سے کھرچ کر نکال دیا تھا۔ میں پاکستان میں پہاڑوں کا شیدائی بن گیا تھا، ان کے حسن اور رعب و دبدبے کے سحر میں گرفتار ہو گیا تھا۔ میں قراقرم اور ہمالیہ کے پہاڑوں میں تین سال گھوما تھا اور پھر مجھے کینیڈا آنا پڑا۔ ابھی مجھ کو ان پہاڑوں میں بہت کچھ دیکھنا تھا اور دیکھنے کی تمنا بھی رکھتا تھا اور اب بھی رکھتا ہوں۔ مگر اللہ کی بنائی زمین کے کئی گوشے میرے سامنے کھلنے تھے اور میں ایک رسی سے بندھا یہاں آنکلا تھا۔ ابھی یورپ کے کوہ الپس دیکھنے تھے۔ مجھے الاسکا کے برف زار اور سرسبز وادیوں کو دیکھنا تھا۔ مجھے ایک گیٹ وے چاہیے تھا جو کینیڈا سے مل سکتا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

میرے وسائل نہ تھے کہ پاکستان سے میں ان مقامات کو دیکھنے آتا۔ میں انہی خیالوں میں گم تھا کہ بس کے ڈرائیور نے اعلان کیا کہ ہم کچھ دیر میں روانہ ہورہے ہیں اور نیاگرا سے گزرتے ہوئے ہمارا اگلا اسٹاپ امریکا کا سرحدی شہر بفلو ہوگا۔

میں نیاگرا کا نام سن کر بالکل سن ہوگیا نیاگرا فال کسے پسند نہ ہوگا۔ میں اس لیے خوش تھا کہ بس سے ہی اس آبشار کا دیدار کروں گا۔ اسی سوچ میں تھا کہ بس روانہ ہوگئی۔

سی این ٹاور کی دمکتی روشنیوں کے قریب سے اس نے دائیں طرف موڑ کاٹا اور QEW ہائی وے پر سرپٹ دوڑنے لگی۔ کچھ دیر میں پُرجوش رہا اور پھر نارمل ہونے لگا۔ میرے دونوں ساتھی خاموشی سے آس پاس سے گزرتی گاڑیوں کو کھڑکی کے شیشوں کے پار دیکھ رہے تھے۔

ٹورنٹو سے نکلے تو روشنیاں مدھم پڑتی گئیں۔ چھوٹے چھوٹے قصبے تھے جن کے سائن بورڈ دور سے چمکتے اور پھر چھپاک سے گزر جاتے۔ پھر ایک شہر ہملٹن آیا تو مجھے اپنا دوست شفیق یاد آگیا۔ اس نے یہیں سے ماسٹر کیا تھا اور پھر واپس ڈیرہ اسماعیل خان جاکر ہملٹن کو یاد کرتا اور خود ایک سائیکل کے بستر بند پر مولویوں والا بڑا رومال رکھے کسی کو ٹیوشن پڑھانے جارہا ہوتا۔ میں نے آنے سے پہلے اس سے بہت سی معلومات لیں جو میرے یا کسی کے بھی کام نہ آسکتی تھیں۔ مجھ سے اس نے پُرزور تاکید کی تھی کہ میں کینیڈا سے امریکا شفٹ نہ ہوں گا کیونکہ اگلے چند ماہ میں وہ دوبارہ یہاں آنے والا تھا۔

ہملٹن کے بعد سینٹ کیتھرین آیا اور پھر اعلان ہوا کہ ہم اب نیاگرا سے گزرنے والے ہیں۔ میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔ نیاگرا آبشار کا نظارہ میرے سامنے آنے والا تھا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ نیاگرا کا مقصد نیاگرا شہر ہے نہ کہ نیاگرا آبشار۔

باہر گھپ اندھیرا تھا اور میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر نیاگرا آبشار دیکھنے کی کوشش کررہا تھا۔ کبھی بائیں جانب دیکھتا اور کبھی دائیں جانب مگر ہر سو اندھیری چادر بچھی تھی اور حدِ نگاہ چند لمحوں بعد دم توڑ جاتی۔ میں بے بسی سے پہلو بدلنے لگا مگر اس اندھیرے میں گھپ اندھیرے کے سوا کچھ دکھلائی نہ دیتا تھا۔ کہیں کہیں روشنیاں جگمگاتی نظر آتیں مگر نیاگرا فال کہیں سے بھی گرتی نظر نہ آتی تھی۔ یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ یہ آبشار کسی بلندی سے نہیں گرتی بلکہ ایک دریا کسی کھڈے میں زوروں سے گرتا ہے۔ اس دن میں بے تحاشا ارد گرد دیکھتا رہا اور پھر ہماری بس اس اندھیری چادر میں کہیں گم ہوتی چلی گئی اور میں مایوسی میں نچڑا دوبارہ سے بیٹھ گیا۔

پھر ایک اور اعلان ہوا کہ اپنے امیگریشن کے کاغذات تیار کرلیں کیونکہ ہم امریکا کی سرحد پر پہنچ رہے ہیں۔ میری طرح سب نے اپنے اپنے بیگ کھولنا شروع کیے۔ میں نے پاکستانی پاسپورٹ، لینڈنگ پیپرز اور ہیموسال کا جاب لیٹر نکالا اور ہاتھ میں پکڑ کر انتظار کرنے لگا۔ سرجی اور شہباز میں بھی کچھ ہلچل پیدا ہوئی اور پھر وہ بھی اپنے کاغذات ہاتھوں میں پکڑے میری طرح انتظار کرنے لگے۔

امریکن کسٹم اور امیگریشن کی بڑی عمارت کے کمپاؤنڈ کے سامنے ایک پارکنگ میں ہماری بس دوسری متعدد بسوں کے ساتھ آرکی۔ بسوں کے علاوہ کئی کاریں بھی پارک تھیں۔ آتے جاتے کچھ مسافروں کو جانچ پڑتال کے لیے یہاں رکنا پڑتا تھا۔ بہت سے کاروں والے بوتھ پر رک کر اپنی شناخت دکھاتے اور گاڑی میں بیٹھے بیٹھے بارڈر کراس کرلیتے مگر جو بس کے ذریعے بارڈر کراس کرتے تھے، انہیں تو لامحالہ اس عمارت کے اندر جانا ہی جانا تھا۔

بلبوں کی روشنیوں سے عمارت جگمگا رہی تھی۔ ہم اپنے بیگ اور کاغذات ہاتھوں میں پکڑے اسی روشن عمارت میں لائن میں لگ کر داخل ہوئے۔

میں لائن میں آگے اپنا سامان اٹھائے کھڑا تھا۔ سرجی اور شہباز پیچھے تھے۔ اندر ایک آفیسر نے میرے بیگ کی تلاشی لی اور کچھ برآمد نہ ہوا تو اس نے مجھے آگے بھیج دیا۔ آگے آکر میں امیگریشن آفیسر کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ ڈیسک کے پیچھے کرسی پر بیٹھا وہ میرے پیپرز دیکھتا رہا۔ پوچھا کہ کیوں جارہا ہوں، کہاں جارہا ہوں، کتنے دن ٹھہروں گا اور کینیڈا میں کیا کرتے ہو۔ میں نے اپنا ہیموسال کا جاب لیٹر دکھایا اور کہا۔ ''واپسی پر جاب جوائن کرنی ہے اور اس سے پہلے کزن سے ملنے جارہا ہوں۔''

وہ مطمئن ہوا اور میں بھی۔ پھر مجھے اس نے فارغ کردیا۔ شہباز بھی اگلے مہینے کسی لیب میں انالسٹ ٹریننگ پر جارہا تھا۔ اسے اُمید تھی کہ وہیں اس کی جاب بھی ہوجائے گی۔ اس نے زبانی کلامی امیگریشن آفیسر کو یقین دلایا اور سرخرو نکل آیا۔ اب سرجی کی باری تھی۔ آفیسر نے پوچھا کہ کیا کام کرتے ہو تو جواب آیا کہ پاکستان میں ایکسن تھا۔ آفیسر نے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ذرا تلخی سے کہا۔ ''مجھے پاکستان کا نہیں بلکہ کینیڈا کا بتاؤ، کام کیا کرتے ہو۔'' اور یہیں سرجی پھنس گئے۔ اب وہ مجرموں کی طرح سر جھکائے سزا کے لیے تیار کھڑے تھے کہ شہباز نے کہا۔ ''سرجی سے سوال جواب میں پتا نہیں کتنی دیر لگے۔ چلو باہر کا ایک چکر لگا آئیں۔''

میں اس کے ساتھ باہر آ گیا اور اپنی بس کے پاس چلا آیا۔

ابھی اور مسافر امیگریشن کے مراحل سے گزر رہے تھے۔ ہم بس کے قریب کھڑے ڈرائیور سے باتیں کر رہے تھے۔ میرا سگریٹ پینے کو دل کر رہا تھا۔ کینیڈا میں آپ کسی پبلک مقام پر سگریٹ نہیں پی سکتے۔ میں نے ڈرائیور سے پوچھا۔ ''کیا میں یہاں اسموکنگ کر سکتا ہوں تو وہ ہنس پڑا اور بولا۔ یہ کینیڈا نہیں، امریکا ہے۔ جہاں مرضی آئے سگریٹ پی سکتے ہو۔''

اسی کے کہنے پر مجھے احساس ہوا کہ میں امریکا کی سرزمین پر کھڑا ہوں۔ پہلا قدم اور تجربہ ہر ایک کے لیے سنسنی خیز ہوتا ہے۔ میرے امریکا میں پڑے پہلے قدم میرے اندر نیا احساس بھرتے تھے۔ میں اس زمین پر کھڑا تھا جہاں کا ہر رہنے والا امیگرنٹ تھا یا ان کی نسل سے تھا۔ دنیا بھر سے لوگ بھر بھر کر بحری جہازوں سے یہاں پہنچے تھے۔ کچھ افریقا سے زبردستی غلام بنا کر لائے گئے اور کچھ بھوک افلاس اور تباہ حال یورپ سے یہاں آ کر اپنی قسمت آزمائی کرنے آ گئے۔ کئی ہنرمند کھلاڑی، سائنسدان اور فنکار یہاں آئے اور یہاں کی زمین نے ان کے ہنر کو جلا بخشی۔ امریکا کو امریکا امریکیوں نے نہیں، امیگرنٹس نے بنایا۔ اب تک میں امریکا کے طول و عرض پر کئی شہروں اور ریاستوں میں گھوم چکا ہوں مگر ایک بات میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر اسی امریکی قوم کو کسی اور علاقے میں بھیج دیا جائے کہ امریکا جیسا ایک اور ملک بنا کر دکھاؤ تو یہ کبھی نہیں بنا سکیں گے۔ امریکا کی سرزمین ہی ایسی ہے کہ اس جیسا ملک کہیں اور نہ بن سکا اور نہ بن پائے گا۔ یہاں کا موسم، دریا، جھیلیں، جنگلات، سمندر، وسائل کسی ایک خاص ترتیب سے قدرت نے بنائے ہیں کہ آپ کچھ بھی یہاں کرنا چاہیں کر سکتے ہیں۔ کہیں لہلہاتے کھیت ہیں تو ویسٹ کے ریگستان بھی ہیں۔ گھنے جنگلات ہیں تو برف پوش پہاڑ بھی ہیں۔ میلوں تک

نانگا پربت کا عقاب

عالمی شہرت یافتہ فوٹو گرافر ندیم اقبال کے قلم کا ایک یادگار شاہکار جو کتابی صورت میں آنے سے پہلے ہی مقبولیت کی معراج پر پہنچ گیا۔ سرگزشت کے قارئین ہر قسط کا بے چینی سے انتظار کرتے تھے۔ نئے اضافے کے ساتھ ایک الگ انداز کی سفر کہانی

منگوانے کا پتا

رنگِ ادب پبلی کیشن 5 نمبر کتاب، مارکیٹ اردو بازار۔ کراچی

فون نمبر: 0336-2085325 - 021-3276110

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

حزار فین احمد چلیبی

رائٹ برادران کو تاریخ میں پہلی کامیاب پرواز کرنے والوں کی حیثیت سے جانا جاتا ہے لیکن یہ بات بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ یہ کارنامہ سب سے پہلے استنبول (ترکی) سے تعلق رکھنے والے ہوا باز حزار فین احمد نے انجام دیا۔ جنہوں نے 300 سال پہلے یورپی استنبول سے مشرقی استنبول تک کامیاب پرواز کی۔ استنبول کے ایئرپورٹ Istanbul Hazarfan Havaalan کا نام بھی اسی ہوا باز کے نام پر رکھا گیا ہے۔

مرسلہ: نگہت زیدی۔ بہارہ کہو

پھیلے کھلے میدان ہیں تو انہیں سیراب کرنے کے لیے پانی کی بہتات بھی ہے۔ امریکا میں پہلے ہائی ویز کا جال بچھایا گیا۔ لاکھوں میل کی سڑکیں بنیں۔ ریلوے کا نظام ایک خاص ترتیب سے بچھایا گیا۔ کوئی بھی جہاز اس کی فضا میں ہے تو ہر پندرہ منٹ کے فلائٹ ٹائم پر ایک ائرپورٹ ہے۔ وسائل اتنے زیادہ کہ دنیا بھر کے بزنس مین یہاں آئے اور انڈسٹری کو عروج ملا۔ پچاس ریاستیں نہیں بلکہ پچاس ترقی یافتہ ملک ہیں جو اکٹھے مل کر امریکا کے قانون سے بندھے ہیں۔ ایک چھوٹا سا قصبہ بھی ہو تو وہاں زندگی کی ہر سہولت میسر ہے۔ جہاں ہر قسم کے سپر اسٹور، ریسٹورنٹ، اسپتال، پارک، اسکول، کالج، یونیورسٹی، پانی، بجلی اور گیس تک موجود ہے۔ ایک حصے میں برف پڑھ رہی ہوتی ہو تو دوسرا حصہ ہوسکتا ہے کہ گرمی سے تپ رہا ہو۔ امریکا کو سمندروں نے گھیرا ہوا ہے۔ ایک جانب کینیڈا کا طویل بارڈر ہے اور جنوب میں میکسیکو۔ اس کے اندر لاکھوں چھوٹی بڑی جھیلیں ہیں جو ہر وقت بھری رہتی ہیں۔ بارشیں اور برف اتنی پڑتی ہیں کہ خشک سالی کا انہیں کوئی خطرہ نہیں۔ بہت سارے جو اسے برا بھلا کہتے ہیں وہ بھی یہاں آنے کے لیے بے قرار رہتے ہیں۔ جس ملک نے بھی امریکا کی مثالی ترقی کی تقلید کی وہ عروج کی جانب گامزن ہوا۔ یہاں کا نظام دوسرے ملکوں کے لیے مثال بن چکا ہے۔ لوگ جو بھی کہیں مگر سچ یہی ہے کہ میں جس ملک بھی گیا وہاں کا ہر ملنے والا مجھے امریکا سے متاثر نظر آیا۔ یورپ میں بسنے والے بھی اس کو ایک نظر اٹھا کر دیکھتے ہیں جس کے پاس امریکا کا پاسپورٹ ہو۔ میں ایک بار لندن سے بذریعہ ٹرین اسکاٹ لینڈ کی جانب جارہا تھا۔ ٹرین کے جانے میں کچھ دیر تھی۔ وقت گزاری کے لیے میں ایک فارمیسی میں جا گھسا۔ فارماسٹ سے پوچھا کہ کسی امریکی فارماسٹ کو انگلینڈ میں کام کرنے کا لائسنس کیسے مل سکتا ہے؟ اس نے الٹا مجھ سے پوچھا کہ مجھے امریکا میں کام کرنے کے لیے کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے؟ میں حیران ہوا کہ لندن سے وہ امریکا کیوں جانا چاہتی ہے تو بولی۔ ''یہاں بہت سوں کا خواب ہے کہ امریکا میں جا کر سیٹل ہوں۔ پڑھنے والے خدا کے لیے یہ نہ سمجھیں کہ میں امریکا سے متاثر ہوں یا آپ لوگوں کو متاثر کرنے کی کوشش کررہا ہوں۔ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہتا ہوں کہ جو بھی بیان کر رہا ہوں وہ سچ ہے۔ اگر زندگی رہی تو اپنے پڑھنے والوں کو مختلف علاقوں کی انشاء اللہ سیر کرواؤں گا جن کو دیکھ کر عقل دنگ رہ جائے۔ فی الحال تو ہمارا ذہن سرجی میں الجھا ہوا تھا۔ میں واپس سرجی کے پاس والے کاؤنٹر پر آگیا۔ آفیسر پوچھ رہا تھا۔

''یہ بتائیں آپ کس کے پاس جارہے ہیں اور کہاں جارہے ہو؟''

اب اس نے دوسرا سوال کیا۔ ''کہاں جارہے ہو؟''

جواب دیا۔ ''سالی (Sister in Law) سے ملنے جارہا ہوں۔''

آفیسر بولا۔ ''کتنے دن وہاں ٹھہرو گے۔''

وہ بولے۔ ''میں تو آٹھ دس دنوں کے لیے جارہا ہوں مگر یہ سالی صہبا پر منحصر ہے کہ کتنے دن تک اجازت دیتی ہے۔''

میں حیران تھا کہ سرجی کوئی بیوقوف انسان نہیں ہیں مگر یہ گھما پھرا کر جواب کیوں دے رہے ہیں؟

سرجی کی گفتگو سن کر شہباز مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''یہ آج سیاپا ڈالے گا۔ خود تو پھنسے گا ہمیں بھی مروائے گا۔''

میں خود اب پریشان ہورہا تھا کہ جس طرح سرجی الٹے سیدھے جوابات دے رہے ہیں، کہیں دھر نہ لیے جائیں۔ آفیسر نے پوچھا۔ ''سالی صاحبہ کہاں رہتی ہیں؟''

تو جواب میں منمنائے۔ ''نیو جرسی میں۔''

پھر ایک کاغذ کا پرزہ نکال کر دکھایا جس پر نیو جرسی کا ایڈریس اور فون نمبر تھا۔ وہ آفیسر اٹھا اور اندر چلا گیا۔ اب سرجی پریشان کھڑے ہمیں اشارے کررہے تھے۔ ہم اپنی جگہ بے بس تھے کہ اب ہم کیا کرسکتے ہیں۔

(جاری ہے)

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

رقصِ آتش

امجد رئیس

حادثات کا ہونا تعجب خیز بات نہیں. ہر ملک میں بڑے چھوٹے حادثات رونما ہوتے رہتے ہیں لیکن امریکا جیسے ملک میں رونما ہونے والی اس آتش زدگی کی مثال ملنا مشکل ہے۔ لاس اینجلس کی اس اسکائی اسکریپر میں جو آگ بھڑکی تھی اس کی یاد آج بھی لوگوں کو دہلا دیتی ہے۔

امریکا سے برآمد ایک خوفناک آتش زدگی کا احوال

4 مئی 1988ء کی شب تھی۔ لاس اینجلس کی بلند ترین عمارت شان سے سر اٹھائے کھڑی تھی۔ یہ فرسٹ انٹر اسٹیٹ ٹاور کی عمارت تھی۔ اندر سینکڑوں افراد معمول کے کام سرانجام دینے میں مگن تھے۔

وہ اس بات سے قطعی بے خبر تھے کہ خاموش ٹاور میں آج کی شب ایک بھیانک ہنگامہ برپا ہونے کو ہے۔ ٹاور کی باسٹھ منزلیں تھیں۔ ''میلنڈا اسکار'' فرسٹ انٹر اسٹیٹ بینک آف کیلی فورنیا کی اٹھائیس سالہ مالی تجزیہ کار تھی۔ اکتیس سالہ اسٹیفن اوکساس اسسٹنٹ وائس پریزیڈنٹ تھا۔

آج کی رات وہ دیر تک کام کرنے کے لیے رکے تھے اور ٹاور کی 37 منزل پر تھے۔

9:45 بجے میلنڈا، بورڈ آف ڈائریکٹرز کی رپورٹ کے ساتھ مصروف تھی۔ اس نے اپنے بوائے فرینڈ، ڈیوڈ کرگ کو فون کیا اور جوابی مشین پر پیغام ریکارڈ کرا دیا۔ ''ہائے سوئیٹ

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

Downloaded From Paksociety.com

پارٹ مجھے توقع ہے کہ میں ساڑھے دس بجے تک کام نمٹالوں گی، جلد ملیں گے۔''

10:30 بجے پانچویں منزل پر ایک کارکن نے مصنوعی چھت کے قریب دھواں دیکھا اور فائرالارم بجادیا۔ دس منٹ کے اندر بارہویں اور تیرہویں منزل کے اسموک ڈیٹیکٹر بھی چیخنے لگے۔

10:35 بجے ایک سیکیورٹی گارڈ نے آپریٹنگ انجینئر الیگزینڈر رہنری کو چھان بین کے لیے روانہ کیا۔ ہنری ایلیویٹر نمبر 33 کے ذریعے بارہویں منزل تک پہنچا۔ اس کے سر پر چھایا لیس منزل اوپر فوروومن زورا نے اچانک واکی ٹاکی پر ہراساں چیخیں سنیں۔

وہ ہینڈی کی چیخیں تھیں جو ایلیویٹر نمبر 33 میں تھی جو بارہویں منزل پر دھوئیں سے بھر گیا تھا۔ ''آگ لگ گئی ہے۔'' ہینڈی کی چیخ سنائی دی۔ بظاہر بجلی کے نظام میں کسی خرابی کے باعث آگ بھڑک اٹھی تھی۔ ہینڈی موت کے چنگل میں پھنس گئی تھی۔ ایلیویٹر میں کثیف دھواں بھرتا جارہا تھا۔ زورا نے واکی ٹاکی پر سیکیورٹی گارڈ کی مدد طلب کی لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ ہینڈی دہشت اور اذیت کے مارے متواتر چلّا رہی تھی۔ زورا کے پیٹ میں گرہیں پڑگئیں۔ وہ بے بسی سے اس کی چیخ پکار سن رہی تھی۔ چلّانے کی آواز لہجہ کمزور پڑتے ہوئے بالکل ہی معدوم ہوگئی۔ ہولناک سناٹا۔

☆.....☆

سڑک کے دوسری جانب سے کسی گارڈ نے فلک بوس عمارت میں شعلوں کی جھلک دیکھ کر 911 پر فون کردیا۔

10:38 بجے لاس اینجلس سٹی فائر ڈیپارٹمنٹ نے آگ بجھانے والی چھ کمپنیوں کو مطلع کیا۔ ان کو ولشائر بولیوارڈ اور ہوپ اسٹریٹ پر پہنچنے کے لیے کہا گیا تھا۔

بٹالین چیف ڈان کیٹ جب وہاں پہنچا تو اس نے بارہویں منزل کی مشرقی اور جنوبی سمت کو بری طرح آگ کی لپیٹ میں دیکھا۔ ڈان نے پیش آمدہ صورتِ حال کا اندازہ لگا کر فوراً پندرہ مزید امدادی کمپنیوں کی درخواست روانہ کردی۔

بارہویں منزل پر جگہ جگہ پانی کے مخصوص فوارے لگے تھے جو تین اعشاریہ پانچ ملین کے حفاظتی نظام کا حصہ تھے لیکن شدید تپش اور شعلوں نے درجنوں اسپرنکلر کو ناکارہ کردیا تھا جن سے ایک قطرہ پانی بھی برآمد نہ ہوا۔

فائر ورکرز ابھی پائپ ہی جوڑ رہے تھے کہ ٹاور کا فائر فائٹنگ واٹر سسٹم بند ہوگیا۔

☆.....☆

جب میلنڈا اسکار اور اسٹیفن اوکساس نے سائرن کی آوازیں سنیں تو معاً ان کو دھوئیں کی بو کا احساس ہوا۔ دونوں 37 ویں منزل کے کوریڈور میں نکلے تو ہر جانب دھواں ہی دھواں تھا۔ دھواں، سیلنگ میں سے برآمد ہورہا تھا۔ وہ لفٹ کی جانب بھاگے لیکن وہاں بھی صورتِ حال نازک تھی۔ دونوں سیڑھیوں کی جانب سے چارزینے تھے۔ چاروں زینے گاڑھے زہریلے دھوئیں کی زد میں تھے۔ یقیناً آگ بڑے وسیع پیمانے پر لگی تھی۔ انہیں جلدی فیصلہ کرنا تھا کہ اگلا قدم کیا اٹھایا جائے۔

وہ فون کی طرف لپکے اور 911 پنچ کیا۔ ''ہم پھنس گئے ہیں۔'' اسٹیفن نے کہا۔ ''اور بہت اونچائی پر ہیں، اسی وقت فائر انجن، ہیلی کاپٹرز، فائر فائٹرز، ٹاور کو گھیر چکے تھے۔ میلنڈا نے پھر ڈیوڈ کو فون کرنے کا فیصلہ کیا۔ ڈیوڈ کے تصور سے اسے سکون ملتا تھا مگر جیسے ہی اس نے ریسیور اٹھایا، اسے کوئی ڈائل ٹون سنائی نہیں دی۔ باہر کی دنیا سے ایک رابطہ تھا۔ وہ بھی کٹ گیا۔''

☆.....☆

آگ چونکہ بہت بلند تھی۔ فائر فائٹرز، سیڑھیاں اور پانی کے پائپ استعمال نہیں کرسکتے تھے۔ انہیں عمارت میں گھسنا تھا۔ انہوں نے بھاری حفاظتی لباس زیب تن کیا تھا اور 80 پاؤنڈ وزنی سامان تھا جس میں کلہاڑیاں، سیلنڈرز اور ہوز پیک وغیرہ شامل تھے۔ وہ زینوں کے راستے اندر گھس گئے۔ عمارت کے فائر فائٹنگ سسٹم میں ڈیپارٹمنٹ نے پانی پمپ کرنے کی کوشش کی ٹاور کا مذکورہ نظام پہلے ہی ناکارہ ہوچکا تھا۔ تاہم کاوش جاری رکھی گئی۔

فائٹرز بارہویں منزل تک پہنچ گئے تھے۔ وہ جھکے ہوئے یا گھٹنوں کے بل تھے۔ مزید آگے بڑھنے کے لیے انہوں نے چوڑے منہ کے پائپوں کا رخ گن کی مانند دروازہ کی جانب کیا اور تیرہویں منزل پر جانے کے لیے زینے کا دروازہ کھول دیا۔ آگ کے شعلے لپکے۔ آگ کا سرخ دیو کسی بپھرے ہوئے بگولے کی مانند گرج رہا تھا۔ کھڑکیاں، روشندان، نمائشی چھت۔ سب کو آگ کی سرخ زبانوں نے چاٹ کر زمین بوس کردیا تھا۔

فائٹرز کے آلات پر درجہ حرارت دو ہزار ڈگری فارن ہائیٹ تھا۔ ہولناک تپش نے فضا کی ہیئت تبدیل کردی تھی۔ ہیلمٹ شیلڈ کے دوسری جانب نگاہ کی رسائی محض چھ انچ تھی۔

11:22 بجے ڈپٹی فائر چیف ڈونالڈ انتھونی، 25

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کمپنیوں اور 100 فائر فائٹرز کو جائے حادثہ پر بھیج چکا تھا۔ وہ نیچے بے قراری سے اسکائی اسکریپر کے اطراف چکرا رہا تھا۔ اس نے بارہویں منزل کے شعلے دیکھ لیے تھے۔ آگ بارہویں منزل کو نابود کر کے تیرہویں منزل کی طرف جارہی تھی۔ ڈونالڈ کے تجربے نے اسے احساس دلایا کہ آج کی رات ان لوگوں کا سامنا بدترین آتشزنی سے ہے۔

آگ سرعت سے چودھویں منزل تک جا پہنچی تھی۔ فائر چیف اومیتگ دفعتاً اس خیال کے تحت لرز اٹھا کہیں بے پناہ تپش فولادی ستونوں کو کمزور نہ کردے۔ آگ سے اوپر 50 منزلیں اور تھیں۔ ''اگر بیم بہت زیادہ گرم ہوگئے تو تاور گر بھی سکتا ہے۔'' اس نے ڈپٹی چیف انتھونی کو خطرے سے آگاہ کیا۔

☆.....☆

37 ویں منزل پر بیشتر دھواں مصنوعی چھت کی ٹائلوں سے خارج ہورہا تھا۔ دونوں آفس میں مقید ہوگئے اور جہاں جہاں سے دھواں اندر آرہا تھا، ان مقامات کو کپڑوں سے بند کرنے لگے۔ میلنڈا نے جیکٹ اور کاروباری سوٹ بھی اتار دیا۔

اسٹیفن متواتر کھڑکی پر میز کی ضربیں لگا رہا تھا لیکن اسے توڑنے میں ناکام تھا۔ کھڑکی سے دھواں باہر نکل سکتا تھا جو لمحہ بہ لمحہ اندرونی فضا کو ناقابل استعمال بنا رہا تھا۔ دونوں نے کئی کھڑکیوں پر ناکام طبع آزمائی کی۔ میلنڈا نے ٹوپیاں ٹائلنگے والا اسٹینڈ کھڑکی پر دے مارا لیکن کوئی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔

''ہمیں ہار نہیں ماننی چاہیے۔'' وہ بڑبڑائی۔ ''ہم ہار نہیں مان سکتے۔''

بالآخر آفس میں دھواں ناقابل برداشت ہوگیا اور ان کو پسپا ہونا پڑا۔ کھڑکی کے مضبوط شیشے اسی طرح توڑے نہیں جاسکتے تھے۔

دونوں قریب ہی اسٹور یج روم میں گھس گئے۔ یہاں کی فضا قدرے صاف تھی۔ واٹر کولر اور ریفریجریٹر بھی یہیں تھا۔ میلنڈا کو پلاسٹک کی خالی بوتلیں مل گئیں۔ اس نے بوتلوں کے پیندے کاٹ دیے اور وہاں گیلے کاغذی تولیے لپیٹ دیے۔ اب وہ بوتلوں کے منہ سے منہ لگا کر کافی حد تک فلٹر شدہ ہوا پھیپھڑوں میں لے رہے تھے۔ انہوں نے ریفریجریٹر کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا۔

لیکن یہ سب عارضی مہلت تھی۔ دھیرے دھیرے فضا کی کثافت بڑھتی گئی۔ بالآخر وہ فرش پر لیٹ گئے۔

فورو ومن زورا پہلے ہی 46 ویں منزل پر تھی۔ اس دوران اس نے ساتھی کارکنوں کو جمع کرلیا تھا اور دھواں دھار زینوں سے گزر کر وہ لوگ چھت تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ جہاں سے ان کو ہیلی کاپٹر کے ذریعے بچالیا گیا۔

آدھے گھنٹے میں آگ پندرہویں منزل تک جا پہنچی۔ جب کہ دھواں ہر جگہ بھرا تھا اور ٹاور کی چھت سے اوپر نظر آرہا تھا۔

انتھونی کو خدشہ پیدا ہوا کہ آگ سولہویں منزل سے آگے نکل گئی تو اندر موجود فائر فائٹرز کچھ نہیں کرپائیں گے۔ جن منزلوں پر آتشی رقص تباہی پھیلا رہا تھا۔ وہاں شعلے عمارت کے اطراف میں تیس تیس فٹ تک سرخ زبانیں لہرا رہے تھے۔

☆.....☆

ہوائی کمپنی ایئر بورن انجن 78، ہیلی کاپٹر کے ذریعے چھت پر اتر گئی تھی۔ ''ڈھونڈو اور بچاؤ'' ان کا مشن تھا۔ وہ زینوں کے ذریعے ابھی دو تین منزل ہی اترے تھے کہ بے پناہ حدت اور کثیف دھوئیں سے ان کا سامنا ہوا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ کسی بڑی سی چمنی کے اندر اترا جارہا ہے۔ وہ کسی نہ کسی طرح ایک منزل اور نیچے آئے، پھر انہیں پسپا ہونا پڑا۔

ڈسپیچ سینٹر میں آپریٹر مستقل 37 ویں منزل پر رابطہ کی کوشش کررہا تھا لیکن کوئی جواب نہیں آرہا تھا۔ گھنٹی بج رہی تھی۔ لگتا تھا کہ وہاں موجود لوگ 37 ویں منزل سے نکل گئے ہیں۔ غالباً کچھ تار بھی جل گئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد فون لائن بے جان ہوگئی۔

آدھی رات ہوگئی تھی جب میلنڈا کے دوست ڈیوڈ نے جوابی مشین کو ریوائنڈ کیا اور میلنڈا کا پیغام سن لیا کہ وہ 10:30 تک پہنچ جائے گی۔ اگلا پیغام میلنڈا کے کسی ساتھی کا تھا جسے سن کر ڈیوڈ کے بدن میں سنسنی پھیل گئی۔ پیغام میں عمارت کی آگ کی اطلاع تھی۔ ڈیوڈ نے فائر ڈیپارٹمنٹ فون کیا کہ میلنڈا 37 ویں منزل پر ہے۔

اسسٹنٹ چیف، رابرٹ رمپرز نے کارکنوں کو ہدایت کی کہ وہ 16 ویں منزل کے شیشے اوزاروں کی مدد سے توڑ دیں۔ فائرز نے سولہویں منزل کی کھڑکیوں کو ٹارگٹ کرلیا۔ رابرٹ بخوبی محسوس کررہا تھا کہ اگر سولہویں منزل بھی ان کے ہاتھ سے نکل گئی تو وہ بلند عمارت کو بچانے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

آگ کے جہنم زار نے قالین کے نیچے چپکانے والے مادے کو پگھلا دیا تھا جس کے باعث زہریلی گیس بن رہی تھی۔

ایک فائر فائٹر دسویں منزل سے واپس آگیا اور رپورٹ

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

دی کہ آتشزنی کے باعث نیچے سے اندر گھسنے والے فائٹرز A-6 کے زینے پر پھنس گئے ہیں۔ ان کی واپسی کا راستہ بھی مسدود ہو گیا ہے۔

رابرٹ نے کمانڈ پوسٹ کو ریڈیو پر اطلاع دی کہ ''ہم شکست کے قریب ہیں۔'' پھر اس نے ڈپٹی چیف انتھونی سے کہا کہ ہمیں اپنے آدمیوں کو باہر نکالنے کی فکر کرنی چاہیے۔ انتھونی نے اوپر عمارت میں بھڑکتے شعلوں کو دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ ''کسی طرح سولہویں منزل کو بچاؤ۔''

انتھونی اور چیف، ڈونالڈ خوفناک آگ کی غارت گری کو دیکھ رہے تھے جو سرعت سے منزل چاٹتی چلی جا رہی تھی۔ چیف فکرمند تھا۔ اس نے لاس اینجلس میں کسی اسکائی اسکریپر کی آتشزنی کا پیشتر سامنا نہیں کیا تھا اور آگ کی شدت وتباہ کاری بے پناہ تھی۔ (نئے زمانے میں تو اسکائی اسکریپرز کی دوڑ ہے اور منزلیں بہت پہلے 100 کا ہندسہ عبور کر گئی ہیں۔ نئے نئے ریکارڈ بن رہے ہیں۔ ساتھ ہی حفاظتی انتظامات بھی انتہائی جدید اور فول پروف ہیں اس وقت 62 منزلہ ٹاور ہی بہت بلند لگتا تھا جو تباہی کے دہانے پر تھا)

میلنڈا اور اسٹیفن اسٹور روم کے فرش پر پانی کی کٹی ہوئی بوتلوں کے ذریعے سانس لینے کی جدوجہد میں لگے تھے۔ دونوں کی آنکھیں اور حلق جل رہے تھے۔ دم گھونٹنے والا گاڑھا دھواں اتنا زیادہ ہو گیا تھا کہ وہ ایک دوسرے کو بمشکل دیکھ پا رہے تھے۔ میلنڈا کا کان فرش سے چپکا تھا جب معاً اسے محسوس ہوا کہ ایلیویٹر چلنے کی ہلکی سی آواز آ رہی ہے۔ اسے اُمید ہوئی کہ بچانے والے آ رہے ہیں۔ وہ گڑگڑائی۔ اس کی آخری اُمید یہ تھی کہ وہ پُراُمید رہے۔

''وہ ہمارے لیے آ رہے ہیں۔'' اس نے اسٹیفن کو بتایا۔

''ہاں ایسا ہی لگتا ہے۔'' اسٹیفن نے بھی آواز سن لی تھی۔

☆.....☆

سولہویں منزل پر جواں ہمت فائر فائٹرز، پانی اور ہاز پائپس کے ساتھ بپھرے ہوئے شعلوں سے نبرد آزما تھے۔ آگ اور پانی کی حقیقی جنگ تھی۔ دونوں ہی زندگی کے لیے اہم ہیں لیکن جب بے قابو ہوتے ہیں تو زندگیاں نگل جاتے ہیں۔ اس جنگ میں انسانی عزم و ہمت کی بنیادی اہمیت تھی۔ فائر فائٹرز نے اپنی زندگیوں کو داؤ پر لگا دیا تھا۔ انہیں اطلاع مل گئی تھی کہ آتشی اژدھا سولہ نمبر پر آ گیا تو پھر سترہ، اٹھارہ.....اور وہ ہار جائیں گے۔

عمارت فائر ڈپارٹمنٹ کے لوگوں سے گھری تھی، ہیلی کاپٹر اور سیڑھیوں سمیت ہر چیز آزمائی جا رہی تھی۔

دفعتاً حیرت انگیز طور پر پہلی بار سولہویں منزل کے میدان کارزار میں آگ پسپا ہوئی۔ کارکنوں کی جاں گسل محنت رنگ دکھا رہی تھی۔ ان کا جوش بڑھ گیا۔ مزید کارکن اس جنگ میں شامل ہو گئے تھے۔

2:00am بجے پائلٹ نے کمانڈ پوسٹ کو پیغام دیا کہ آگ پندرہویں منزل سے آگے جانے میں ناکام ہو گئی ہے۔ ہم ٹاور کو بچا لیں گے۔

ٹھیک 25 منٹ بعد دوسرا پیغام آیا۔ ''ہم نے ناک آؤٹ راؤنڈ جیت لیا ہے۔''

2:30am بجے میلنڈا اور اسٹیفن بے سدھ پڑے تھے۔ معاً میلنڈا نے ہیلی کاپٹر کی آواز سنی۔ کمرا نیم تاریک ہو چکا تھا۔ میلنڈا اندھیرے میں ہمت کر کے کھڑکی تک گئی لیکن ہیلی کاپٹر دور ہٹ گیا۔ میلنڈا نے ہاتھ ہلائے تاہم کسی نے نہیں دیکھا۔

''کیا مجھے یہاں مرنا پڑے گا۔'' اس نے سوچا۔ اسے والدین اور ڈیوڈ کا خیال آیا اور آنسو اس کے رخساروں پر پھسل پڑے۔ اتوار اس کی سالگرہ کا دن تھا۔ جب وہ 29 برس کی ہو جاتی.....لیکن 29 برس کی ہونے سے قبل ہی اختتام آ گیا تھا۔ اس نے خاموش زبان میں سب کو اور ڈیوڈ کو خدا حافظ کہا۔ ڈیوڈ کے ساتھ اس نے مستقبل کے کیا کیا منصوبے بنائے تھے۔ کیا وہ ادھورے رہ جائیں گے۔ ''میں مرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔'' دھوئیں سے بھرے کمرے میں اس کا سر میز کے ساتھ ٹک گیا۔ قریب آتے ہوئے ہیلی کاپٹر کی آواز اسے سنائی نہیں دی۔

4:00am بجے ڈیوڈ کرک کا دوبارہ رابطہ فائر ڈپارٹمنٹ سے ہوا تو اسے پتا چلا کہ آگ پر قابو پا لیا گیا ہے اور عمارت میں پھنسے ہوئے افراد کو نکال لیا گیا ہے۔ چار بجے سے پہلے ڈیوڈ متواتر فون کرتا رہا تھا۔ اس نے پھر بتایا کہ میلنڈا 37 ویں منزل پر تھی۔

میلنڈا نیم بے ہوشی کی حالت میں تھی جب اس نے کچھ آوازیں سنیں۔ وہ شادی مرگ کی کیفیت سے دوچار ہو گئی جب اس نے اندھیرے میں سے دو فائر مین کو برآمد ہوتے دیکھا۔ ''ڈھونڈو اور بچاؤ۔'' نیم کے یہ دونوں افراد فریڈ اور جارج تھے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اپریل کی شخصیات

صائمہ اقبال

شمسی کلینڈر کے اس چوتھے مہینے سے جڑی ان اہم شخصیات کا مختصر مختصر تذکرہ جنھوں نے کارہائے نمایاں انجام دے کر اپنی اہمیت کا احساس دلایا، جنھیں ہم بھول نہیں سکتے۔ ان کا ذکر برابر کرتے رہنا چاہیے تاکہ معلومات حاصل کرنے کے شائقین اپنی پیاس بجھا سکیں۔

ایک ایسی تحریر جسے سب سے زیادہ پسند کیا جارہا ہے

قابل اجمیری کا شعر ہے:

راستہ ہے کہ کٹتا جاتا ہے
فاصلہ ہے کہ کم نہیں ہوتا

قارئین، پاکستان کی صورتِ حال بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ وقت گزرتا جاتا ہے مگر حالات جوں کے توں ہیں۔ نہ تو غربت میں کمی ہوئی، نہ ہی نظامِ تعلیم بہتر ہوا، نہ ہی شعبۂ صحت میں انقلاب آیا۔ عوام کی حالت دگرگوں۔ وہ خستہ حال بسوں میں، تباہ حال سڑکوں پر سفر کرنے پر مجبور۔ ادویہ جعلی۔ علاج مہنگا۔ پانی کی قلت ہے، لوڈشیڈنگ عروج پر ہے۔ یوں لگتا ہے، فلاح و بہبود کے میدان میں جمود ہے۔ ہاں، کیلنڈر بدل رہا ہے... وقت گزرتا جارہا ہے۔ اپریل کا مہینا بھی شروع ہوگیا۔ یہ گریگورین سال کا چوتھا مہینا ہے۔ اس ماہ شمالی نصف کرے میں بہار کا موسم ختم ہوتا ہے اور گرمی کا موسم شروع ہوجاتا ہے۔ اس کا ماخذ لاطینی لفظ Aprilis ہے، جس کا مطلب شروع ہونا یا کھلنا ہے۔ اسے بہار کے آغاز سے جوڑا جاتا ہے، مگر تاریخ دانوں کی اکثریت اس سے متفق نہیں۔ اس کا نام اپریل کیسے پڑا، اس بارے میں حتمی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے۔

پاکستانی سیاست کے دو انتہائی اہم ناموں کا تعلق اس ماہ سے ہے۔ دونوں ہی کا تاسندھ کی زرخیز دھرتی سے تھا۔ ایک قوم پرستی کی علامت بنا، دوسرے نے زنداں اور مقتل کو استعارہ بنادیا۔

پہلا نام ہے سندھ کی سیاست پر گہرے نقوش چھوڑنے والے جی ایم سید کا، جو 17 جنوری 1904 کو سن، ضلع دادو میں پیدا ہوئے۔ انھیں ایک قوم پرست دانشور کی حیثیت سے شناخت کیا جاتا ہے۔ انھیں تصوف، شاعری، تاریخ، اسلامی فلسفہ پر اتھارٹی سمجھا جاتا تھا۔ انھوں نے 60 کے قریب کتابیں لکھیں۔ وہ معروف صوفی بزرگ سید حیدر شاہ کاظمی کے خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ سندھ ہاری کمیٹی کی بنیاد رکھنا اور سندھ اسمبلی میں قرارداد پاکستان پیش کرنا ان کے اہم ترین کارنامے تصور کیے جاتے ہیں، مگر قیامِ پاکستان کے بعد جب انھوں نے قوم پرستی کا علم اٹھایا تو ان کی شخصیت متنازعہ ہوگئی۔ وہ ''سندھ عوامی محاذ'' کے بانیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ نیشنل عوامی پارٹی (نیپ) سے بھی وابستگی رہی۔ بزم صوفی، سندھ یونائیٹڈ فرنٹ اور جیے سندھ محاذ جیسی تنظیمیں تشکیل دیں۔ بعد میں ''سندھو دیش'' کا مطالبہ کیا۔ آنے والے برسوں میں ان کی پارٹی مختلف دھڑوں میں بٹ گئی۔ 91 سال کی عمر میں 25 اپریل 1995 کو ان کا کراچی میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

انتقال ہوا۔

دوسرا نام ہے پاکستان کے سابق وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کا، جو پھانسی کے پھندے پر جھول کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے امر ہوگئے۔ اس ذہین فطین سیاست دان نے 5 جنوری 1928 کو لاڑکانہ میں آنکھ کھولی۔ وہ سرشاہ نواز بھٹو کے بیٹے تھے۔ انھوں نے آکسفورڈ یونیورسٹی سے قانون کی ڈگری حاصل کی۔ 1953 میں وکالت شروع کی۔ سیاست گھٹی میں پڑی تھی۔ وہ وزارت خارجہ کا حصہ بننا چاہتے تھے۔ ایوب کابینہ میں وزیر رہے، مگر پھر ایوب خان سے الگ ہو کر 1967 میں پاکستان پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھی۔ 1970 کے عام انتخابات میں پیپلز پارٹی نے مغربی پاکستان میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ یہ انتخابات ملک کے لیے بدقسمتی لائے۔ ملک تقسیم ہوا۔ دسمبر 1971 میں جنرل یحییٰ خان نے اقتدار بھٹو کو سونپ دیا۔ اگست 1973 تک وہ صدر رہے۔ پھر نئے آئین کے تحت وزیراعظم بنے۔ وہ مقبولیت کی بلندی پر تھے، مگر 1977 کے عام انتخابات میں دھاندلیوں کے الزامات ان کے لیے بدبختی لائے۔ ملک میں احتجاجی تحریک شروع ہوگئی۔ 5 جولائی 1977 کو جنرل ضیاء الحق نے مارشل لا نافذ کر دیا۔ ایک قتل کے الزام میں 18 مارچ 1978 کو لاہور ہائی کورٹ نے سزائے موت سنائی۔ 4 اپریل کو انھیں راولپنڈی جیل میں پھانسی دی گئی۔

آئیں، اب اِس ماہ کی دیگر شخصیات کا جائزہ لیتے ہیں۔

اے حمید

حسن... تب ہی حسن بنتا، جب اُسے اُن کا قلم میسر ہوتا۔ اسرار اپنی گہرائی تب آشکار کرتا، جب اسے ان کے الفاظ کا سہارا ملتا۔ رومان لکھنے میں انھیں یدطولیٰ حاصل تھا۔ فطری مناظر یوں قلم بند کرتے کہ آنکھوں کے سامنے تصویر بن جاتی۔ ہوا کے چلنے کا بیان ہوتا تو قاری کو جھونکا اپنے چہرے سے ٹکراتا ہوا محسوس ہوتا تھا، خوشبو کا تذکرہ کیا کرتے تو پڑھنے والے کے نتھنوں میں سرسراہٹ ہوتی۔ پرندوں کی چہچہاہٹ کانوں میں ارتی محسوس ہوتی۔ ان کی تحریر ایک نغمہ تھی۔ ان خصوصیات نے انھیں جوانی ہی میں ملک گیر شہرت عطا کر دی۔ ان کے کئی سینئرز شہرت کے میدان میں ان سے پیچھے رہ گئے۔

ایک سمت انھوں نے رومان، فطرت اور اسرار کو مہارت سے قلم بند کیا، دوسری طرح اپنے عہد کی ترجمانی بھی کی، انتہائی متاثر کن افسانے لکھے، جنھیں پاک و ہند میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ جزئیات اور کردار نگاری پر ان کی گرفت حیران کن تھی۔ شخصیت بھی بڑی جاذبِ نظر تھی۔ خوش گفتار، خوش لباس تھے۔ ایک نقاد کے مطابق ''اپنی تحریروں میں انھوں نے عجیب نوع کی رومانی فضا تعمیر کی اور پھر عمر بھر اسی فضا کے دھندلکوں میں رہنا پسند کیا۔'' مخالفین کی تعداد بھی کم نہیں۔ ان کی رومانویت پر خاصی تنقید ہوئی۔ ان کی ماضی پرستی کو پروگریسو رائٹرز نے آڑے ہاتھوں لیا۔ ان پر الزام لگا کہ وہ ماضی کی کہانیاں قارئین کو لبھانے کے لیے بیان کرتے ہیں۔ شعوری طور پر ان موضوعات پر لکھتے تھے، جن سے متاثر ہو کر قاری عملی زندگی کی سچائی کو بھلا دیتا۔ اندازِ بیان اتنا سحر انگیز اور دل نشین کہ عام سی جگہ اور انسان بھی جادوئی اور ماورائی معلوم ہوتے۔ ان کی تخلیقات منزل منزل، ڈربے، اردو شعر کی داستان، اردو نثر کی داستان، مرزا غالب لاہور میں، دیکھو شہر لاہور، یادوں کے گلاب، گلستان ادب کی سنہری یادیں، لاہور کی یادیں، امرتسر کی یادیں کے زیرِ عنوان شائع ہوئیں اور بہت پسند کی گئیں۔ امرتسر کی یادیں ان کی خودنوشت تھی۔

پورا نام عبدالحمید تھا۔ وہ 25 اگست 1928 کو امرتسر، برطانوی ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیمی وہیں سے حاصل کی۔ پھر پاکستان چلے آئے۔ اس زمانے میں لکھنا پڑھنا رواج تھا۔ نوجوان شاعر اور ادیب بننے کے خواب دیکھا کرتے تھے۔ ہاتھ میں کتابیں، جیب میں قلم ہوتا، وہ کافی اورینٹل ہاؤس میں بیٹھ جاتے۔ اے حمید کو بھی مطالعے کی لت پڑ گئی، جس نے قلم اٹھانے کی تحریک دی۔ پھر ریڈیو پاکستان کی سمت گئے۔ وہاں اس زمانے میں داخلہ انتہائی دشوار تھا، مگر ان کے فن کے سامنے بند باندھنا ممکن نہیں تھا۔ ادھر وہ اسسٹنٹ اسکرپٹ ایڈیٹر رہے۔ وائس آف امریکا سے تعلق رہا۔ ادبی سفر بھی جاری رہا۔ 1948 میں پہلا افسانہ ''منزل منزل'' ادب لطیف میں شائع ہوا۔ اسی وقت یہ کہہ دیا گیا تھا کہ وہ عام

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

واقعے کو خاص بنانے کا فن جانتے ہیں۔ بعد میں شائع ہونے والی تخلیقات نے اشارہ دے دیا کہ ان کا مستقبل تابناک ہے۔

جلد انھوں نے رومانوی افسانہ نگاری میں شناخت بنا لی۔ کتابوں نے مقبولیت کے ریکارڈ توڑ ڈالے۔ فکشن نگاری کے ساتھ وہ اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی وژن کے لیے بھی تواتر سے لکھتے رہے۔ ان کے ہاں معاشرتی شعور تھا، مگر رومانیت غالب رہی۔ بچوں کے لیے بھی خوب لکھا۔ عنبر ناگ ماریا سیریز کی بہت پذیرائی ہوئی۔ اس سیریز نے قارئین کو گرویدہ بنا لیا۔ 2011 میں ان پر بیماریوں نے حملہ کر دیا۔ انھیں سانس کی تکلیف کی شکایت پر اسپتال میں داخل کروایا گیا۔ 29 اپریل 2011 کو حالت بگڑ گئی اور وہ جہان فانی سے کوچ کر گئے۔

اے حمید تو چلے گئے مگر وہ اپنی کتابوں کی صورت آج بھی زندہ ہیں۔ آج بھی انھیں پڑھنے والے ہزاروں کی تعداد میں ہیں، جو اُن کے لکھے ہر لفظ سے عشق کرتے ہیں۔ ناقدین متفق ہیں کہ ان کا سحر ایک عرصے تک قائم رہے گا۔ انھوں نے منٹو، بیدی اور قاسمی صاحب کے زمانے میں خود کو منوایا اور اشفاق احمد، ممتاز مفتی، انتظار حسین کے دور میں اپنا اثر قائم رکھا۔ یہ ان کے فن کی عطا تھی۔

احمد رشدی

یوں تو پاکستانی سرزمین نے کئی منفرد گلوکار پیدا کیے، جن کی آواز نے نہ صرف لاکھوں دلوں کو گرمایا بلکہ اپنی قابلیت سے اُنھوں نے سرحدیں عبور کیں اور پوری دنیا میں اپنا لوہا منوایا مگر بات فلمی گائیکی کی ہو تو پہلا نام ہمارے ذہن میں احمد رشدی کا آتا ہے، جن کے گیت سن کر رقص کی خواہش ہمکتی ہے۔ انسان خواہش کرتا ہے کہ وہ جھوم اٹھے، گنگنائے، ہنسے مسکرائے۔ وہ واقعی گائیکی کے بادشاہ تھے۔ ان جیسا کوئی نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک عرصے تک فلمی گائیکی اُن کے اثر سے نہیں نکل سکی۔ روک اینڈ رول کے میدان میں وہ یکتا تھے۔ کئی گلوکاروں نے ان کی تقلید کر کے شہرت حاصل کی۔ انھوں نے 583 فلموں کے لیے 5000 گانے گائے۔

احمد رشدی 24 اپریل 1934 کو پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق سید گھرانے سے تھا۔ والد حیدر آباد دکن میں عربی اور فارسی کے استاد تھے۔ گانے کی صلاحیت بہ درجہ اتم موجود تھی، گو حالات ساز گار نہیں تھے مگر انھوں نے اپنے شوق کا دامن نہیں چھوڑا۔ اگرچہ استاد تو نہیں کیا مگر معروف موسیقاروں کی دھنوں کو اپنی تربیت گاہ بنا لیا۔ ریڈیو سے وابستگی رہی۔ خاصی جدوجہد کی۔ اس سفر میں کئی ناکامیاں ملیں۔ مشکل لمحات آئے مگر انھوں نے ہمت نہیں ہاری۔ 1951 میں ہندوستانی فلم ''عبرت'' کے ایک گانے میں اُن کی آواز سنائی دی۔ پھر ایک وقفہ آ گیا۔ حالات انھیں پاکستان لے آئے۔ یہاں قسمت کا ستارہ چمکا۔ اُن کا گیت ''بندر روڈ سے کیماڑی'' بہت مشہور ہوا۔ بس، پھر انھوں نے مڑ کر نہیں دیکھا۔

اس زمانے میں انڈسٹری میں غزل گائیکی غالب تھی۔ انھوں نے نئے تجربات کیے جنھیں سراہا گیا۔ وحید مراد کے ساتھ ان کی جوڑی بہت مقبول ہوئی۔ ان کے بیشتر مقبول گانے وحید مراد پر فلمائے گئے۔ یعنی ایک انگوٹھی میں دو ہیرے جڑ دیے گئے۔ تین عشروں تک ان کی پُراثر آواز نے لوگوں کو گرویدہ بنائے رکھا۔ دھیمے اور اونچے سروں سے وہ یکساں انصاف کرتے۔ انھوں نے معروف موسیقاروں کی دھنوں کو فنی مہارت سے گایا۔

کیریر کا آغاز ہندوستانی انڈسٹری سے کیا تھا مگر وہاں جگہ نہیں بنا سکے تو پاکستانی انڈسٹری میں قسمت آزمائی اور اس کا چہرہ بدل ڈالا۔ بعد میں ہندوستانی موسیقار انفسوس کا اظہار کیا کرتے کہ انھوں نے کیسا گوہر نایاب کھو دیا۔ کشور کمار جیسے ممتاز گلوکار بھی ان کا دم بھرتے تھے۔ انھیں کئی زبانوں پر گرفت تھی۔ اردو کے علاوہ گجراتی، بنگالی، بھوجپوری میں بھی انھوں نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ جس اداکار کے لیے گاتے، اس کا انداز اپنا لیتے۔ جب کبھی گلوکارہ مالا کے ساتھ ان کی آواز ملتی تو سامعین پر سحر طاری ہو جاتا۔ اس جوڑی نے فلموں میں 100 سے زائد گانے گائے۔ انھیں بے شمار ایوارڈز ملے۔ پرویز مشرف دور میں انھیں ''ستارۂ امتیاز'' سے نوازا گیا۔ انھوں نے بطور اداکار چند فلموں میں بھی کام کیا۔ وہ عظیم گلوکار کے ساتھ ایک اعلیٰ صفت انسان بھی تھے۔ بڑے بااخلاق اور شریف النفس آدمی تھے۔ کئی لوگوں کے لیے بلامعاوضہ پرفارم

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اپریل اور دو لیجنڈز

یہ دلچسپ امر ہے کہ پاکستانی تاریخ کے دو لیجنڈ اسٹینڈ اپ آرٹسٹوں کی قسمت اسی مہینے سے جڑی تھی۔ ایک نے اِس ماہ میں آنکھ کھولی، ایک نے اس مہینے جہان فانی سے کوچ کیا۔ دونوں ہی نے نسلوں کو متاثر کیا۔ دنوں سے یہ عہد منسوب۔ پہلا نام ہے معین اختر کا، جو اداکاری، میزبانی، Mimicry میں یکتا تھے۔ نت نئے تجربات کے لیے جانے جاتے تھے۔ کبھی گیت گاتے، کبھی عورت بن جاتے۔ جب ان کے فن کو انور مقصود کا اسکرپٹ اور بشریٰ انصاری کا ساتھ ملا تو جیسے ہنسی کا طوفان آ گیا۔ مگر یہ وہ قہقہے تھے، جو بڑے نمناک ہوتے ہیں۔ دراصل اس تکون نے جو مزاح پیش کیا، وہ سماج کی برائیوں اور ناہمواریوں پر گہرا طنز تھا۔ یوں تو کئی یادگار رول کیے، مرزا اور حمیدہ، آخری گھنٹی، ہیلو ہیلو، انتظار فرمائیے، مکان نمبر 47، ہاف پلیٹ، فیملی 93، عید ٹرین، بندر روڈ سے کیماڑی، سچ مچ، بے بی، نوکر کے آگے چاکر، رفتہ رفتہ، لاؤ تو میرا اعمال نامہ، سچ مچ پارٹ 2، کچھ کچھ سچ مچ، رانگ نمبر لوگوں کو آج بھی یاد ہے۔ مگر "روزی" کے کردار کو انھوں نے امر کر دیا۔ یہ ایک بولڈ اور پرخطر تجربہ تھا، جسے معین اختر نے کامیاب بنایا۔ فلمیں بھی کیں۔ تم سا نہیں دیکھا، مسٹر کے ٹو اور مسٹر تابعدار میں نظر آئے۔

وہ 24 دسمبر 1950 کو کراچی میں پیدا ہوئے۔ پیدائشی اداکار تھے، مگر اس سمت آنا دشوار تھا کہ گھرانا بہت مذہبی تھا۔ پہلے پہل نجی محافل میں پرفارم کیا۔ وہ جہدوجہد کا زمانہ تھا۔ 6 ستمبر 1966 کو یوم دفاع کی تقریب میں نوجوان معین اختر پہلی بار پی ٹی وی کی اسکرین پر نظر آئے تو لوگوں کو خبر ہوئی کہ ایک باصلاحیت فنکار کی آمد ہو چکی ہے۔ انھیں کئی زبانوں پر گرفت تھی۔ اس مہارت کو انھوں نے اسٹیج پر بخوبی برتا۔ انھیں Mimicry، یعنی معروف اداکاروں کی نقالی میں کمال حاصل تھا مگر انھوں نے اِسے اپنے فن کا محور بنانے کے بجائے کمرشل تھیٹر میں بطور اداکار قسمت آزمائی اور اپنا نام بنایا۔ وہ لہری سے متاثر تھے مگر اپنے فن کو ان کے سائے سے محفوظ رکھا۔ پی ٹی وی پر میزبانی نے انھیں ملک گیر شہرت عطا کی۔ انھوں نے کئی اہم اور یادگار پروگراموں کی میزبانی کی اور انھیں امر کر دیا۔

تھیٹر پر نام کمانے کے ساتھ ساتھ ففٹی ففٹی، شوشا، شو ٹائم، اسٹوڈیو ڈھائی، اسٹوڈیو پونے تین، یس سر نو سر اور معین اختر شو

کیا۔ ایک ہاتھ سے دیتے تو دوسرے کو خبر نہیں ہوتی۔

11 اپریل 1983 کو وہ 48 برس کی عمر میں دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئے۔ انھیں کراچی میں دفن کیا گیا۔ آج بھی دنیائے موسیقی پر اُن کا اثر باقی ہے۔ اگر ٹی وی پر ان کا کوئی گیت سنائی دے تو ماضی کا حسین دریچہ کھل جاتا ہے۔ ان کی موت نے ایک بڑے طبقے کو سوگوار کر دیا۔ ان کے لازوال گیتوں کی صورت آج بھی ان کی یاد ہمارے دلوں کو مہکا رہی ہے۔

غلام فرید صابری

گزشتہ برس جب نامور قوال امجد صابری کو کراچی میں شہید کیا گیا، تو یہ درحقیقت اس میراث کا قتل تھا جو پاکستانی تاریخ کے دو عظیم ترین قوال غلام فرید صابری اور مقبول صابری نے چھوڑی تھی جنھیں دنیا صابری برادرز کے نام سے جانتی ہے۔ امجد صابری مرحوم غلام فرید صابری کے سپوت تھے۔

غلام فرید صابری ایک بے مثال انسان تھے۔ ان کی آواز میں جادو تھا، ان کی شخصیت میں سحر تھا۔ ان کی قربت روحانی تجربے سے مماثل تھی، اُنھیں سننا انسان کی اعلیٰ صفات کی آب یاری کرنا تھا۔ ایسے کتنے ہی واقعات مشہور ہیں جب درجنوں افراد ان کا کلام سن کر دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ (امجد صابری مرحوم بھی اسی بیش قیمت تجربے سے گزرے، جب انگریزوں نے ان کے ہاتھ کلمہ پڑھا۔ یہ تجربہ ان کے والد کی ریاضت اور وسیلے کی عطا تھا)

صابری برادرز نے دنیائے قوالی کو تاجدارِ حرم، بھر دو جھولی، سرلا مکان سے طلب ہوئی جیسی لازوال قوالیاں دیں۔ وہ بلاشبہ اپنے عہد کے مقبول ترین فنکار تھے۔ ہندوستان ان کا دیوانہ تھا۔ خلیجی ممالک میں اُن کے سامنے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

جیسے یادگار پروگرام کیے۔ آخر کے برسوں میں وہ انور مقصود کے ساتھ لوز ٹاک میں جلوہ گر ہوئے۔ بھارت میں بھی بہت مقبول تھے۔ کئی بڑے اداکار اُن کے مداح تھے۔ عرب ممالک میں بھی اُن کا ڈنکا بجا کرتا۔ حکومت پاکستان کی طرف سے تمغۂ حسن کارکردگی اور ستارۂ امتیاز ان کے حصے میں آئے۔ 22 اپریل 2011 کو اس عظیم فنکار کا انتقال ہوا۔

دوسرا نام ایک ایسے آرٹسٹ کا ہے، جسے اُس کے بعد آنے والے ہر فنکار نے کاپی کیا۔ ہندوستان میں کتنے ہی اداکاروں نے اس کے ڈھب کو اختیار کیا۔ اس کے آمٹمز کو بالی ووڈ فلموں کا حصہ بنایا گیا۔ گووندا، جونی لیور اور اکشے کمار نے اس کے ڈائیلاگ بولے۔ ہندوستان ہی کیا، دبئی، برطانیہ، کینیڈا اور امریکا میں ڈنکا بجا۔ اس کے اسٹیج ڈرامے ''بکرا قسطوں پر'' نے نئی تاریخ رقم کی۔ اس کا اتنا چرچا ہوا کہ پوری ٹیم یہ ڈراما کرنے کے لیے امریکا مدعو کی گئی۔ یہ عمر شریف کا تذکرہ ہے، جن کی آڈیو کیسٹ لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہوئیں، ویڈیو کیسٹ یورپ اور امریکا تک پھیل گئیں۔

عمر شریف 19 اپریل 1955 کو کراچی میں پیدا ہوئے۔ 1974 میں فقط 14 سال کی عمر میں تھیٹر سے اپنے کیریر کا آغاز کیا۔ موسیقی سے بھی شغف تھا جسے وہ مستقبل میں بڑی مہارت سے برتنے والے تھے۔ شروع میں بڑے مسائل پیش آئے۔ اُس وقت معین اختر کا طوطی بولتا تھا۔ کمرشل تھیٹر میں جگہ بنانا مشکل تھا۔ عمر شریف گمنام تھے مگر پھر عمر شریف کو سید فرقان حیدر اور معین اختر کا ساتھ ملا۔ یوں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ اوائل میں ثانوی کردار ادا کرنے والے عمر شریف جلد مرکزی کرداروں میں نظر آنے لگے۔ معین اختر کے ٹی وی کی سمت جانے کے بعد وہ تھیٹر کے بے تاج بادشاہ بن گئے۔ ولیمہ تیار ہے، یہ ہے نیا تماشا، یہ ہے سلام کراچی، یہ تو ہاؤس فل ہو گیا، یس سر عید، نیاز مانہ، نو سر عید، فلائٹ 420، ہاف پلیٹ، ہنستے رہو چلتے رہو، ہم سے ملو، لوٹ سیل، ماموں مذاق مت کرو ان کے مقبول شوز ٹھہرے، مگر بکرا قسطوں کا تو کیا ہی کہنا... اس کے متعدد پارٹس آئے۔ کئی برس بعد اسے ری پروڈیوس کیا گیا۔ اس پورے عرصے میں انھوں نے کتنے ہی اداکاروں کو متعارف کروایا جنھوں نے بعد میں اس شعبے میں نام پیدا کیا۔ جب تھیٹر پر زوال آیا تو وہ اس سے دور ہو گئے۔ بعد میں شائقین کے اصرار پر لوٹے، اسے خرافات سے پاک کرنے کی اپنی سی کوشش کی مگر اب انٹرٹینمنٹ کی دنیا کے تقاضے بدل گئے تھے۔ وہ آج ٹی وی پر متحرک ہیں۔ اُن کے مداحوں کی تعداد لاکھوں میں ہے۔

احترام سے سر جھکا دیا جاتا۔ یورپ اور امریکا میں شائقین ان کے قدموں میں بچھ جاتے۔ جب وہ بیرونِ ملک پرفارم کیا کرتے، تو ان پر دینار اور ڈالرز کی بارش ہوتی تھی۔ انھیں متعدد ملکی اور غیر ملکی اعزازات سے نوازا گیا۔

یوں تو دونوں بھائیوں کی کہانی منفرد تھی، مگر آج ہمارا موضوع بڑے بھائی غلام فرید صابری ہیں۔ ان کا تعلق مشرقی پنجاب کے علاقے کلیانہ سے تھا۔ ان کے والد عنایت حسین بڑے باکمال گویے تھے۔ یہ گھرانا مغل دور میں اس شعبے سے وابستہ ہوا۔ کلیانہ میں حالات سازگار تھے کہ تقسیم کا واقعہ رونما ہو گیا، جس نے سب تلپٹ کر دیا۔ اس گھرانے کو اپنا جمع جمایا کام چھوڑ کر ہجرت کرنی پڑی۔ البتہ عنایت حسین نے حالات کی کٹھنائیوں کے باوجود اپنے بچوں کی خوب تربیت کی۔ بچے مزدوری کرتے ہوئے بھی گائیکی سے غافل نہیں ہوئے۔ ان بچوں میں غلام فرید صابری بھی شامل تھے، جو 1930 میں کلیانہ، ضلع روہتک مشرقی پنجاب میں پیدا ہوئے تھے۔ اوائل کی زندگی کا کچھ حصہ گوالیار میں بھی گزرا۔ خاندان کے استاذہ سے سیکھا۔ پھر بزرگوں کے ساتھ محفلوں میں پرفارم کرنے لگے۔ 1946 میں پہلی باقاعدہ پرفارمنس دی۔ یہ موقع تھا پیر مبارک شاہ کے عرس کا، جس میں بڑی تعداد میں عقیدت مند شریک تھے۔ پہلے وہ اکیلے گایا کرتے تھے، پھر ان کے چھوٹے بھائی غلام فرید صابری اُن کے ساتھ اسٹیج سنبھالنے لگے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ایک مہینا دو گلوکار

برصغیر کی تاریخ کے دو عظیم گویوں کا تعلق ماہ اپریل سے ہے۔ ایک کا رشتہ کلاسیکی گائیکی سے تھا، دوسرے کا غزل گائیکی سے۔ ایک مرد ایک عورت۔ پہلا نام ہے استاد بڑے غلام علی کا۔ وہ کلاسیکی موسیقی کے بے تاج بادشاہ تھے۔ ایک ایسا فن کار جو اپنی کلا میں یکتا تھا۔ گرفت کا یہ عالم تھا کہ کوئی ہم عصر ان کے آگے نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ انھوں نے کلاسیکی موسیقی کے عظیم ورثہ کو مزید تقویت بخشی اور اپنے بعد آنے والوں کے لیے معیارات کھڑے کر دیے۔ ہزاروں سران کے سامنے جھک گئے۔ آواز میں بڑا

تنوع تھا۔ لہجے کا اتار چڑھاؤ، لچک، چاشنی... ہر تال پر گرفت تھی۔ ہر ادا یکتا تھی۔ سازوں کی بھی حیران کن سمجھ تھی۔ یوں تو سرمنڈل کی ایجاد کے کئی دعوے دار ہیں، مگر اکثریت متفق ہے کہ یہ استاد بڑے غلام علی کی تخلیق ہے۔ مختلف ثقافتوں کا علم اور مختلف گھرانوں کی موسیقی سے واقفیت ان کی پہچان تھی۔

اسے المیہ ہی کہا جاسکتا ہے کہ ایک ایسا پھول جو مغربی پنجاب میں کھلا تھا جو پاکستان کی پہچان بن سکتا تھا وہ ہندوستانی موسیقی کے گلدستے کا حصہ بنا۔ قصہ کچھ یوں ہے کہ جب ہندوستان میں اُن کے نام کا ڈنکا بجنے لگا... اس خطے کے مسلمانوں کی آنکھوں میں آزادی کا خواب سج چکا تھا۔ تقسیم کے بعد وہ پاکستان آ گئے۔ اس اُمید پر اب اپنے وطن، قصور میں فن موسیقی کو اوج بخشیں گے۔ مگر جلد اُنھیں اندازہ ہو گیا کہ نوزائیدہ ریاست میں موسیقی کے لیے حالات سازگار نہیں۔ سو وہ واپس بھارت چلے گئے۔ وہاں انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ 1957 میں انھیں ہندوستانی شہریت مل گئی۔ وہاں کی سرکار نے ایک پوش علاقے میں بنگلا لے دیا۔

اس جید فن کار نے پنجاب کی زرخیز دھرتی سے جنم لیا تھا۔ وہ قصور کے تھے۔ قصور، جس کا ماضی شاندار ہے۔ جو مذہبی، ثقافتی اور روحانی روایات کا امین ہے۔ استاد بڑے غلام علی کا سن پیدائش 2 اپریل 1902 تھا۔ ان کی نسبت پٹیالہ گھرانے سے تھی، جسے کلاسیکی موسیقی میں مستند سمجھا جاتا ہے۔ اُن کے والد علی بخش خان کا شمار اپنے زمانے کے مسند گویوں میں ہوتا تھا۔ والد ہی کے زیر سایہ انھوں نے تیزی سے تربیت کے مراحل طے کیے۔ خاندان کے دیگر بزرگوں سے بھی اکتساب فیض کیا۔ چچا کالے خان کا کردار ان کی زندگی میں اہم رہا جنھوں نے سارنگی اور گائیکی کے اسرار و رموز سے آشنا کیا۔

قصور اور اس کے گرد و نواح میں ان کے گھرانے کا سکہ چلتا تھا۔ کالے خان بڑے گویے تھے۔ کلاسیکی موسیقی کے گھرانوں کی روایات کے مطابق نوجوان غلام علی نے اپنے بزرگوں کی دھنیں گائیں۔ مزارات پر فن کا مظاہرہ کیا۔ وہ پٹیالہ گھرانے سے تعلق رکھنے والے استاد اختر حسین خان اور استاد عاشق علی خان کے شاگرد بھی رہے۔ شہرت ملی، مگر وہ مطمئن نہیں تھے۔ اس عدم اطمینان نے سفر کی راہ سجھائی۔ 21 سال کی عمر میں وہ بنارس منتقل ہو گئے۔ بنارس سنیاسیوں کا شہر تھا، جہاں موسیقی مذہب کا درجہ رکھتی تھی۔ انھوں نے ہیرابائی نامی ایک فنکارہ کے ساتھ سارنگی بجانا شروع کر دی۔ ان کا فن عوام کے سامنے آنے لگا۔ معاش کا انتظام ہو گیا، مگر تلاش جاری رہی۔ بالآخر انھوں نے سارنگی نواز سے ابھر کر گلوکار کے طور پر بنارس میں شناخت حاصل کر لی۔ وہ فن کے قدر دانوں کا علاقہ تھا۔ جلد قریب و جوار میں ان کا چرچا ہونے لگا۔ کلکتہ میں ہونے والی ایک تقریب نے ان کے روشن مستقبل پر تصدیق کی مہر ثبت کر دی۔ تقسیم کے بعد انھوں نے ہندوستان کو مسکن بنایا، جہاں انھیں دیوتا کی طرح پوجا جاتا تھا۔ انھیں پدم بھوشن سمیت کئی بڑے اعزازات سے نوازا گیا۔ آخری برسوں میں وہ بیمار رہنے لگے

پاکستان آنے کے بعد کچھ دنوں تک انہوں نے راج مستری کا کام کیا لیکن انہیں اپنی صلاحیتوں پر اعتبار تھا۔ پھر بزرگوں کی دعا تھی۔ کراچی میں قوالی کا سلسلہ شروع کیا، تو جلد ہی لوگوں کو متوجہ کر لیا۔ گو اس زمانے میں بڑے جید قوال تھے مگر اس جوڑی نے تیزی سے نام پیدا کیا۔ پہلا البم 1958 میں ریلیز ہوا، جس کی قوالی ''میرا کوئی نہیں ہے تیرے سوا'' بہت پسند کی گئی۔ اسی زمانے میں ''بھر دو جھولی میری یا محمدؐ'' جیسی قوالی گائی۔ اوائل میں یہ قوالی اتنی مقبول نہیں ہوئی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

تھے۔ 23 اپریل 1968 کو حیدرآباد دکن میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کی موت سے کلاسیکی موسیقی کی کتاب کا ایک عظیم باب بند ہوا۔

پیشہ وارانہ سفر میں وہ کلاسیکی موسیقی تک محدود رہے۔ فلمی دنیا سے خود کو دور رکھا۔ یہ تو ''مغلِ اعظم'' کے ڈائریکٹر خان آصف تھے جنھوں نے ہاتھ پاؤں جوڑ کر منہ مانگا معاوضہ ادا کر کے انھیں گانے پر راضی کیا۔ واضح رہے کہ اس وقت اُنھوں نے ایک گیت کے لیے ڈھائی ہزار روپے لیے تھے۔ یہ رقم لتا اور رفیع کے معاوضے سے تین گنا تھی۔ اُس لازوال فلم کے لیے انھوں نے دو گانے گائے۔ فلم کے موسیقار نوشاد تھے جنھوں نے استاد بڑے غلام علی کے فن سے اپنی کلا کو ہم آہنگ کرنے کے لیے پورا زور لگا دیا تھا۔

اس تذکرے میں دوسرا نام ایک ایسی فنکارہ کا ہے جس نے جو غزل گائی، جو نظم منتخب کی... اسے امر کر دیا۔ اپنا نام دے دیا۔ لوگ غزل کے شاعر کو بھول گئے اور اسے اقبال بانو کی غزل کہنے لگے۔ یہاں تک کہ فیض صاحب کی عظمت اور شہرت بھی اقبال بانو کی مقبولیت میں رکاوٹ نہیں بنی۔ ایک ایسا زمانہ بھی آیا جب فیض صاحب سے لوگ فرمائش کرتے کہ وہ اقبال بانو والی نظم سنا دیں۔ فیض صاحب بھی اس صورتِ حال سے خوب محظوظ ہوتے۔ کہا کرتے تھے: ہاں اب یہ اقبال بانو ہی کی غزل ہے۔ اقبال بانو نے ان کے جو آئٹم گائے وہ فیض صاحب نے ان کے نام کر دیے۔

یوں تو اقبال بانو نے فلموں کے لیے بھی گایا مگر غزل ان کی توجہ کا اصل محور تھی۔ نیم کلاسیکی موسیقی کو غزل سے ہم آہنگ کر کے اُسے نیا آہنگ دیا۔ زبان پر انھیں خوب گرفت تھی۔ آواز نکھرتی ہوئی۔ شخصیت باوقار۔ اطوار نفیس۔ انھوں نے فقط کلام فیض نہیں، ہر غزل کو سلیقے سے گایا۔ ناصر کاظمی کو بھی بڑی مہارت سے گایا کرتی تھیں۔ فارسی پر بھی خوب گرفت تھی۔ اسی باعث ایران اور افغانستان میں بھی بہت مقبول ہوئیں۔

وہ 1935 میں دہلی میں پیدا ہوئیں۔ گانے کا شوق تھا مگر اس زمانے میں اس شعبے کو نا پسند کیا جاتا تھا۔ لڑکیوں کے لیے زیادہ گنجائش نہیں تھی۔ انھیں بمشکل موسیقی سیکھنے کی اجازت ملی۔ وہ دہلی گھرانے کے استاد چاند خان کی شاگرد ہوگئیں۔ ان کی سرپرستی میں تربیتی مراحل طے کیے۔ استاد کی رہنمائی اور قابلیت ریڈیو تک لے گئی۔ شادی کے بعد وہ پاکستان آگئیں۔ یہاں بھی ریڈیو سے آغاز کیا۔ ترقی کا سفر جست تھا۔ البتہ لائیو پرفارمینس کے میدان میں جلد جھنڈے گاڑ دیے۔ فلم انڈسٹری کے لیے گایا۔ ''تو لاکھ چلے ری گوری تھم تھم کے'' اور ''الفت کی نئی منزل کو چلا'' جیسے یادگار گیت گائے۔ گم نام، قاتل، انتقام، سرفروش اور ناگن جیسی فلموں میں ان کی آواز سنائی دی۔ البتہ جب کلام فیض کو اپنی آواز سے سجایا تو نئی اقبال بانو کا جنم ہوا۔ ''دشت تنہائی میں'' اِس کی عمدہ مثال ہے جسے سن کر روح کو سکون ملتا ہے۔

فیض کی نظم ''ہم دیکھیں گے'' ترقی پسندوں کا ترانہ بنی تو اس کا سبب اقبال بانو ہی ٹھہریں۔ دورِ آمریت میں اقبال بانو کا یہ گیت کچلے ہوئے طبقات کو نیا حوصلہ دیتا۔ اس کی لائیو ریکارڈنگ آج بھی سنیں تو انسان سرشار ہو جاتا ہے۔ بھی حاضرین تالیاں بجاتے ہیں، بھی نعرے لگاتے ہیں۔ مشرف دور میں جب جمہوریت بحالی کی تحریک شروع ہوئی تو اقبال بانو کی جادوئی آواز ایک بار پھر سنائی دی۔ نئی نسل کو احساس ہوا کہ اُن کے بزرگوں نے کس طرح آمریت کے خلاف جدوجہد کی تھی۔ کہتے ہیں، جب 1985 میں اُنھوں نے یہ نظم گائی تھی تب پچاس ہزار کا مجمع موجود تھا۔ آنے والے برسوں میں ہر محفل میں اُن سے اِس کی فرمائش کی گئی۔ انھیں پرائیڈ آف پرفارمینس سمیت کئی اعزازات سے نوازا گیا۔ 21 اپریل 2009 کو اس ممتاز گلوکارہ کا لاہور میں انتقال ہوا۔

جب مدینہ منورہ گئے، تو یہی الفاظ دعا کی صورت زبان سے ادا ہوئے۔ جب لوٹے، تو خبر ہوئی، اس کلام نے سامعین پر رقت طاری کر دی ہے۔ ریڈیو اور ٹی وی نے اُن کی مقبولیت کو مہمیز کیا۔ کئی البمز ریلیز ہوئے۔ اُنھیں بیرونِ ملک پرفارم کرنے کی دعوتیں ملنے لگیں۔ پھر تو اُنھوں نے پوری دنیا میں اپنی آواز کا جادو جگایا۔ 70 اور 80 کی دہائی اِن کے عروج کا دور تھا۔ اُن کی کیسٹیں ریکارڈ سیل ہوا کرتی تھیں۔ ان کی قوالیوں کو فلموں میں بھی استعمال کیا گیا۔ اردو کے علاوہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

پنجابی، سرائیکی اور سندھی زبان میں بھی تو الیاں پیش کیں۔

صابری برادرز کے عروج میں ان کے چھوٹے بھائی مقبول صابری نے بھی بھرپور حصہ ڈالا۔ کسی زمانے میں اخبارات میں دونوں بھائیوں کے اختلافات کی خبریں آئیں۔ مالی معاملات نے تنازعات کو جنم دیا۔ کچھ عرصے کے لیے الگ بھی ہوئے، مگر پھر ایک ہوگئے۔ شروع میں مقبول صابری غزلیں بھی گاتے تھے، مگر پھر بڑے بھائی کی ہدایت پر انھوں نے یہ سلسلہ ترک کردیا۔

پانچ اپریل 1994 کو کراچی میں اس عظیم فن کار کو دل کا دورہ پڑا، جو جان لیوا ثابت ہوا۔ اُن کے انتقال کے بعد ایک عرصے تک ان کے بھائی مقبول صابری پرفارم کرتے رہے، مگر دھیرے دھیرے اس شعبے سے دور ہوگئے۔ غلام فرید صابری کے انتقال کے بعد اُن کے بیٹے امجد صابری سامنے آئے، انھوں نے اپنے چچا سے الگ ہوکر اپنی راہ بنائی اور خوب نام کمایا۔

ایوب خان

یہ عجب اتفاق ہے کہ غلام محمد کے غلط فیصلوں کے نتیجے میں جن صاحب نے جمہوریت پر شب خون مارا، ملک میں پہلا مارشل لا لگایا، ان کا تعلق بھی اسی ماہ سے بنتا ہے۔ ہم بات کر رہے ہیں ایوب خان کی، جو پاک فوج کے سربراہ اور ملک کے دوسرے صدر رہے۔ کچھ لوگ ان کے حق میں یہ دلیل تراشتے ہیں کہ اس دور میں ملک نے بے پناہ ترقی کی، ان کے دامن پر کرپشن کا کوئی داغ نہیں، ان کا دور باقی ادوار سے بہت بہتر تھا وغیرہ وغیرہ... ان باتوں میں وزن ہے، مگر یہ باتیں کسی بھی طرح جمہوریت کی بساط لپیٹنے اور آمریت کے نفاذ کا جواز نہیں بن سکتیں۔ اپنے تمام تر خلوص اور کوششوں کے باوجود ایوب خان کے فیصلے سے ملک کو شدید نقصان پہنچا، جس کا خمیازہ ہم آج تک بھگت رہے ہیں۔

وہ 14 مئی 1907 کو پیدا ہوئے۔ والد کا نام میر داد خان تھا۔ ابتدائی تعلیم سرائے صالح کے ایک اسکول سے حاصل کی۔ علی گڑھ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا تھا، لیکن اسی زمانے میں فوج سے وابستہ ہوگئے۔ جنگ عظیم دوم میں بطور کپتان حصہ لیا۔ برما کے محاذ پر میجر تعینات رہے۔ قیام پاکستان کے کچھ عرصے بعد بریگیڈیئر ہوگئے۔ 1948 میں انھیں مشرقی پاکستان میں فوج کا سربراہ بنایا گیا۔ پھر ڈپٹی کمانڈر انچیف کا عہدہ سنبھالا۔ محمد علی بوگرہ کے دور میں وزیر دفاع کے طور پر کام کیا۔ غلام محمد کو گھر بھیج کر اسکندر مرزا نے 7 اکتوبر 1958 کو مارشل لا لگایا تو انھیں چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بنادیا۔ کہتے ہیں

وہ ایوب خان پر بہت اعتماد کرتے تھے۔ یہ فیصلہ ایوب خان اور ملک دونوں کے لیے مہلک ثابت ہوا۔

اسکندر مرزا اور ایوب خان میں اختلاف بڑھنے لگے۔ آخر اسکندر مرزا کو اقتدار چھوڑنا پڑا۔ ایوب خان سیاہ و سفید کے مالک بن گئے۔ اس فیصلے پر سیاسی سے زیادہ عوامی محاذ سے ردِعمل آیا۔ طلبا اور مزدور تنظیموں نے اس اقدام کی بھرپور مذمت کی، مگر ریاست سے لڑنا دشوار تھا۔ مشرقی پاکستان میں بھی اس اقدام کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ لاوا پکنے لگا۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ ایوب خان اپنے اختیارات میں اضافہ کرتے رہے۔ 1961 میں صدارتی طرز کا آئین بنوایا، جس کے تحت عام انتخابات ہوئے۔ صدارتی انتخابات میں ایوب خان فاتح ٹھہرے، مگر اسی سے ان کا زوال شروع ہوا کہ فتح کے لیے انھیں ایک انتہائی محترم اور معتبر شخصیت کو شکست دینے پڑی۔ یہ تھیں مادرِ ملت، فاطمہ جناح۔

انتخابات میں جیت کے لیے نہ صرف فاطمہ جناح کے خلاف غیر اخلاقی مہم چلائی گئی بلکہ دھاندلی کا سہنہ بھی برتا گیا۔ کراچی کے عوام نے فاطمہ جناح کا بھرپور ساتھ دیا۔ کہتے ہیں، بعد میں کراچی میں جو لسانی فسادات کروائے گئے، اُن کے پیچھے فاطمہ جناح کا ساتھ دینے کا غصہ تھا۔

ترقی پسند تنظیمیں، مزدور اور طلبا فاطمہ جناح کے ساتھ تھے۔ اس دھاندلی سے ایوب مخالف تحریک میں جان پڑ گئی۔ ادھر ذوالفقار علی بھٹو نے، جو ایوب کابینہ میں وزیر تھے، الگ ہو کر اپنی جماعت پیپلز پارٹی بنالی۔ انھوں نے اسلامی سوشلزم کا نعرہ لگایا، جس نے محنت کش تنظیموں کو ان سے الحاق کی تحریک دی۔ یوں ایوب مخالف تحریک زوروں پر آگئی۔ ملک ہنگاموں کی لپیٹ میں تھا۔ صدر ایوب نے عوامی دباؤ کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ اقتدار یحییٰ خان کو سونپ دیا۔ جنھوں نے مارشل لا کی توسیع کی۔ ریاستی پالیسیوں نے مشرقی پاکستان کو علیحدگی کی راہ پر ڈال دیا۔ ایوب خان عملی طور پر غیر فعال ہوگئے۔ سقوط

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ڈھاکا ان کے لیے بڑا صدمہ تھا، جس پر انھوں نے کبھی تبصرہ نہیں کیا۔ 19 اپریل 1974 کو 66 برس کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔

غلام محمد

عام خیال ہے کہ قیام پاکستان کے بعد جن شخصیات نے اقتدار سنبھالا تھا، وہ ریاست اور نظام سے مخلص تھے، انھوں نے نیک نیتی سے اپنے فرائض انجام دیے۔ یہ تو بعد میں آنے والے تھے، جنھوں نے ملکی مفاد پر اپنے فائدے کو ترجیح دی۔ البتہ حقیقت اس تصور کے برعکس ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ قیام پاکستان کے بعد ہی اسے کھوکھلا کرنے کی سازشیں شروع ہو چکی تھیں اور اس کا سبب وہ کمزور حکمران تھے، جنھوں نے اپنے اقتدار کو طول دینے کے لیے غیر قانونی، غیر آئینی فیصلے کیے۔ کرسی چھوڑنے سے انکار کر دیا اور یوں ملک مصائب کی دلدل میں دھنستا چلا گیا۔

اس ضمن میں جو پہلا نام ذہن میں آتا ہے، وہ پاکستان کے تیسرے گورنر جنرل غلام محمد کا ہے۔ ان ہی کے دور میں بیورو کریسی کی ہولناک سازشوں کا آغاز ہوا۔ وہ 25 اپریل 1895 کو لاہور کے ایک متمول خاندان میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ سے گریجویشن کیا۔ سول سروس میں آنے کے بعد تیزی سے ترقی کے مراحل طے کیے۔ ریلوے بورڈ میں وہ اہم عہدے پر فائز رہے۔ نواب آف بہاولپور اور نظام آف حیدرآباد کے لیے اہم ذمے داریاں نبھائیں۔ تقسیم سے قبل لیاقت علی خان کے معاون کا منصب سنبھالا۔ لیاقت علی خان نے جو بجٹ پیش کیا تھا، اس کی تیاری میں غلام محمد کا کردار کلیدی رہا۔ پاکستان بن گیا، تو انھوں نے وزیر خزانہ کا عہدہ سنبھال لیا۔ اسلامی ممالک کا معاشی بلاک قائم کرنے کی تجویز پیش کی جسے بہت سراہا گیا۔ غلام محمد کی کہانی، یہاں تو درست سمت میں جا رہی تھی مگر پھر ان کی صحت گرنے لگی۔ وہ لگ بھگ غیر معطل ہو گئے۔ اس وقت کے وزیر اعظم لیاقت علی خان انھیں برطرف کرنے کا ارادہ باندھ چکے تھے مگر پھر ایک سانحہ ہوا۔ پنڈی میں انھیں شہید کر دیا گیا۔ خواجہ ناظم الدین نے وزارت عظمیٰ کی ذمے داری سنبھالی۔ غلام محمد کو گورنر جنرل کا عہدہ دیا گیا۔ بس، بگاڑ کا آغاز ہو چکا تھا۔ خواجہ ناظم الدین کی بڑھتی قوت سے وہ خوف زدہ تھے۔ اسمبلی کی جانب سے اعتماد کا ووٹ حاصل کرنے والے وزیر اعظم کو انھوں نے برطرف کرنے کا فیصلہ کیا، تو ایک معنوں میں مشرقی پاکستان میں بے چینی کی بیج بو دیا۔ جمہوری نظام پر شب خون مارنے کی راہ ہموار ہونے لگی۔ انھوں نے دستور ساز اسمبلی کو برخاست کر دیا۔

ان غیر جمہوری اقدامات پر بڑا شور مچا۔ مقدمہ ہوا۔ سندھ ہائی کورٹ نے گورنر جنرل کا فیصلہ غیر آئینی قرار دیا۔ حکومت نے سپریم کورٹ میں اپیل کر دی۔ یوں جسٹس منیر کا وہ متنازعہ فیصلہ آیا، جس نے پاکستان کی تاریخ کا رخ بدل دیا۔ گورنر جنرل کے فیصلے کو نظریۂ ضرورت کے تحت جائز قرار دے دیا۔ نظریۂ ضرورت کے تباہ کن اثرات سے ملک کو شدید نقصان پہنچا۔ موقع پرستی اور مصلحت پسندی کا دروازہ کھل گیا۔ غلام محمد بلڈ پریشر اور فالج کے مریض تھے۔ آخری دنوں میں وہ بولنے سے بھی قاصر تھے۔ قدرت اللہ شہاب نے اپنی کتاب ''شہاب نامہ'' میں جہاں ان پر کڑی تنقید کی، وہاں ان کے مسند اقتدار کے آخری ایام کی منظر کشی بھی کی ہے، جب اُن کی غوں غاں فقط ان کی سیکریٹری سمجھ سکتی تھی۔ شدید علالت کے باعث آخر اسکندر مرزا کو قائم مقام گورنر جنرل کی ذمے داریاں دی گئیں۔ غلام محمد نے 12 ستمبر 1956 کو لاہور میں وفات پائی۔

نازیہ حسن

وہ ایک سحر انگیز شخصیت تھیں۔ جادو تھا ان کی آواز میں۔ چہرے پر ملکوتی حسن تھا۔ جہاں ہوتیں، محفل پر چھا جاتیں۔ ہر ایک کو گرویدہ بنا لیتیں۔ انھیں جنوبی ایشیا میں پاپ موسیقی کی ملکہ کہا جاتا تھا، تو اس کا سبب بھی تھا۔ ان کے البمز کی 60 ملین سے زاید کاپیاں فروخت ہوئیں۔ وہ پہلی پاکستانی گلوکارہ تھیں، جن کی آواز برٹش چارٹ تک پہنچی۔

نازیہ حسن کی کہانی عجیب ہے۔ 80 کی دہائی میں وہ برصغیر کی گائیکی کے افق پر ابھریں اور ایک عرصے تک انڈسٹری پر چھائی رہیں۔ انھوں نے پاکستانی میوزک کا چہرہ ہی بدل دیا۔ انتہائی کم عمری میں گانا شروع کر دیا تھا۔ جب انھیں بین الاقوامی شہرت ملی، وہ اتنی کم عمر تھیں کہ انھیں اس کی اہمیت اور اثرات کا اندازہ ہی نہیں تھا۔ گیت ''آپ جیسا کوئی میری زندگی

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

میں آئے تو بات بن جائے'' کی مقبولیت کے بعد جب ہندوستان میں ان کا اوّلین ٹی وی انٹرویو ہوا، تو ناظرین کو پتا چلا کہ یہ تو ایک سیدھی سادی، بھولی بھالی لڑکی ہے، جسے نہ تو اپنے کارنامے کی خبر ہے، نہ ہی اندازہ کہ میڈیا کے سامنے کس طرح اپنا اسٹارڈم پیش کیا جائے۔ ان کے بھائی زوہیب حسن نے بھی گلوکاری کے میدان میں خود کو منوایا۔ بعد میں وہ ساتھ ساتھ نظر

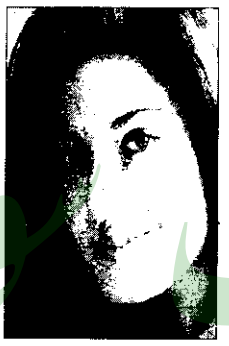

آتے۔ ان کے گیت فلموں میں استعمال کیے گئے۔ سچ تو یہ ہے کہ نازیہ ایک ''آئی کون'' بن گئی تھیں۔

وہ 3 اپریل 1965 کو کراچی میں پیدا ہوئیں۔ لندن سے بزنس ایڈمنسٹریشن کی ڈگری لی۔ بطور چائلڈ آرٹسٹ پی ٹی وی کے مختلف پروگراموں میں پرفارم کیا۔ 15 برس کی عمر میں لندن کی ایک تقریب میں ان کی ملاقات بالی ووڈ ہدایت کار، فیروز خان سے ہوئی۔ انھوں نے نازیہ کو گاتے سنا تو اپنی فلم ''قربانی'' کے لیے گانے کی پیشکش کر دی۔ فلم کی موسیقی معروف موسیقار Biddu نے ترتیب دی تھی۔ آنے والے برسوں میں بھی نازیہ کو اس موسیقار کی سرپرستی حاصل رہی۔ ''آپ جیسا کوئی میری زندگی میں آئے تو بات بن جائے'' نے دھوم مچادی۔ انھیں اِس گیت کے لیے فلم فیئر ایوارڈز سے نوازا گیا۔ پھر اُن کا البم ''ڈسکو دیوانے'' ریلیز ہوا، جسے بے پناہ پذیرائی ملی۔ صرف ممبئی میں ایک دن میں اِس کی ایک لاکھ کاپیاں فروخت ہوئیں۔ اس نے ایشیائی مارکیٹ میں ریکارڈ بزنس کیا۔ اب وہ اپنے بھائی کے ساتھ گانے لگیں۔ ان کا دوسرا البم ''بوم بوم'' بھی بہت مقبول ہوا۔ کامیابی کے کئی ریکارڈ بنے۔ تیسرے البم ''ینگ ترنگ'' 1984 میں ریلیز ہوا۔ 1987 میں چوتھا البم ''ہاٹ لائن'' آیا۔ 92ء میں اُن کا آخری البم ''کیمرا کیمرا'' منظرِ عام پر آیا۔

اُن کے گیتوں کی ویڈیوز نے نئے رجحانات متعارف کروائے۔ پہلے گیت اسٹوڈیو میں ریکارڈ کیے جاتے تھے، مگر نازیہ کی میوزک ویڈیوز میں فلمی انداز اختیار کیا گیا۔ ''آنکھیں ملانے والے'' کی ویڈیو آج بھی لوگوں کو یاد۔ وہ پی ٹی وی کے کئی مقبول پروگراموں میں دکھائی دیں۔ ''سنگ سنگ'' اور ''میوزک 89'' ان میں نمایاں ہے۔ انڈین فلم انڈسٹری میں بھی ان کی آواز سنائی دیتی رہی۔ انھیں ایک گیت ''میڈ ان انڈیا'' گانے کی پیشکش ہوئی تھی، مگر انھوں نے انکار کر دیا۔ بعد میں علیشاہ چنائے نے یہ گیت گایا اور ریکارڈ بزنس کیا۔ انھیں ملکی اور بین الاقوامی اعزازات سے نوازا گیا۔ پرائیڈ آف پرفارمینس دیا گیا۔

دھیرے دھیرے وہ انڈسٹری سے دور ہوگئیں۔ پھر ان کی شادی کی خبر آئی۔ کچھ ہی عرصے بعد انکشاف ہوا کہ وہ کینسر میں مبتلا ہیں۔ 13 اگست 2000 کو وہ خالقِ حقیقی سے جا ملیں۔ اس سانحے کے بعد ان کے بھائی زوہیب حسن نے گلوکاری سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی، مگر کچھ برس بعد مداحوں کے اصرار پر وہ انڈسٹری کی طرف واپس آ گئے۔

فقط دس برس کی عمر میں گائیکی کا سفر شروع کرنے والی یہ فنکارہ جب بیس برس کی ہوئی، تو پاک و ہند کی مقبول ترین شخصیت بن چکی تھی۔ اس شہرت کی انھیں بھاری قیمت چکانی پڑی۔ کئی اسکینڈلز بنے۔ ان کے بیانات کو متنازعہ ٹھہرایا گیا۔ ہندوستان میں ملنے والی پذیرائی کی وجہ سے پاکستان کے چند حلقوں کے نزدیک وہ ناپسندیدہ بھی ٹھہریں۔ گو ان کی موت کے بعد حدیقہ کیانی، فریحہ پرویز سمیت کئی سنگرز آئیں مگر نازیہ کا خلا کبھی پُر نہیں ہو سکا۔

شان

وہ جتنے باصلاحیت اداکار ہیں، اتنے ہی باکمال ہدایت کار ہیں۔ دراصل فن انھیں وراثت میں ملا۔ ان کی والدہ ایک متاثر کن اداکارہ تھیں اور والد ایک سنجیدہ ہدایت کار۔ اُن میں سپر اسٹار بننے کے تمام گن تھے مگر بدقسمتی سے جس زمانے میں اس اداکار نے انڈسٹری میں قدم رکھا، زوال کا دور شروع ہو چکا تھا۔ اردو فلمیں سطحی ہوگئیں۔ روایتی نسخے آزمائے جانے لگے۔ ایسے میں جن ہدایتکاروں نے معیاری فلمیں بنا کر ڈوبتی انڈسٹری کو بچانے کی کوشش کی، شان خود بھی اُن میں شامل تھے۔ پہلے انھوں نے ''گنز اینڈ روزز'' جیسی مہنگی اور معیاری فلم بنائی، مگر وہ باکس آفس پر کوئی خاص کمال نہیں دکھا سکی۔ دراصل اتنی بڑی اور تجرباتی فلم کے لیے سنیما ابھی تیار نہیں تھا۔ ان کی اگلی فلم ''مجھے چاند چاہیے'' بھی متاثر کن تھی، مگر اسے بھی متوقع کامیابی نہیں ملی۔

اِدھر اردو فلموں کا زوال ہوا اور چوڑیاں کی ریکارڈ کامیابی کے ساتھ پنجابی فلموں کا دور شروع ہوگیا۔ بعد میں شان

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

بھی اسی رنگ میں رنگ گئے۔ انھوں نے دھڑا دھڑ پنجابی فلمیں کیں، جن میں نہ تو اسکرپٹ ہوتا، نہ ہی معیار۔ ہدایت کاری کی، تو روایتی فارمولے پر عمل کرتے ہوئے ''موسیٰ خان'' بنائی، جو پچھلی دو فلموں کے مقابلے میں تو کامیاب ٹھہری، مگر سنیما کے فروغ میں کوئی کردار ادا نہ کرسکی۔ بعد میں جب نیا دور آیا، انڈسٹری کی تجدید ہوئی، اداکاروں نے ہندوستان جا کر کام کرنا شروع کیا، تو انھوں نے انتہائی سخت گیر، اختیار کیا۔ نہ صرف خود ادھر کام کرنے کی آفر زرد کیں، بلکہ وہاں جانے والوں پر کڑی تنقید کرتے نظر آئے۔ کبھی بیانات دیے، کبھی ایوارڈز شو میں انھیں آڑے ہاتھوں لیا۔ ہاں، انھوں نے نئے

ڈائریکٹروں کی کچھ معیاری فلمیں کیں، مگر جس موثر کردار کی ان سے توقع کی جارہی تھی، وہ اُس سے دور رہے۔ البتہ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انھوں نے تن تنہا دو عشروں تک انڈسٹری پر راج کیا۔ ایک زمانے میں ان کا سکہ چلتا تھا۔ گوبابر علی، ریما اور سعود نے انڈسٹری میں جگہ بنائی مگر کوئی شان کا مقابلہ نہیں کرسکا۔ وہ سب ایک ایک کرکے انڈسٹری سے دور ہوئے، مگر شان انڈسٹری سے جڑے رہے اور اپنا دبدبا قائم رکھا۔ وہ 500 سے زاید فلمیں کرچکے ہیں۔

شان 27 اپریل 1971 کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ وہ اداکارہ نیلو اور ہدایتکار ریاض شاہد کے بیٹے ہیں۔ انھوں نے ایچی سن کالج سے تعلیم حاصل کی۔ چائلڈ آرٹسٹ کے طور پر ''الف نون'' میں نظر آئے۔ پھر امریکا چلے گئے۔ سات برس بعد لوٹے، تو اپنے والد کی کمپنی ریاض شاہد فلمز سے وابستہ ہوگئے۔ پہلی فلم ''بلندی'' تھی۔ ریما ان کے مدمقابل تھیں۔ 1990 میں ریلیز ہونے والی اس فلم کی جوڑی شائقین کے دلوں میں گھر کرگئی۔ بعد میں دونوں نے کئی فلموں میں ساتھ کام کیا۔

آنے والے برسوں میں چند فلمیں فلاپ بھی ہوئیں، مگر ان کا سفر بلندی کی سمت جاتا رہا۔ بطور ہدایت کار ان کی پہلی فلم ''گنز اینڈ روزیز'' 1999 میں ریلیز ہوئی۔ وہ اس زمانے کی مہنگی ترین فلم تھی۔ انڈسٹری کے زوال کے بعد وہ پنجابی فلموں میں نظر آنے لگے۔ انھوں نے ایک ٹی وی چینل کی میزبانی

خدارا۔ خدارا

بے اولاد حضرات

مایوسی اختیار نہ کریں

کیونکہ خدا کی رحمت سے مایوس ہونا تو سخت گناہ ہے۔ آج بھی ہزاروں گھرانے اولاد کی نعمت سے محروم سخت پریشان ہیں۔ ہم نے دیسی طبی یونانی قدرتی جڑی بوٹیوں سے ایک خاص قسم کا بے اولادی کورس تیار کرلیا ہے۔ خدا کی رحمت سے آپکے گھر بھی چاند سا خوبصورت بیٹا پیدا ہوسکتا ہے۔ خواتین کے پوشیدہ مسائل ہوں یا مردانہ کمزوری یا مردوں میں جراثیم کا مسئلہ ہو۔ آپ پریشان ہونے کی بجائے آج ہی فون پر اپنی تمام علامات سے آگاہ کرکے بے اولادی کورس منگوالیں۔ خدا کے لئے ایک بار ہمارا بے اولادی کورس آزما کر تو دیکھ لیں۔ خدا کی رحمت سے آپ کے آنگن میں بھی خوشیوں کے پھول کھل سکتے ہیں۔

المُسلم دارلحکمت (رجسٹرڈ)

(دیسی طبی یونانی دواخانہ)

ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061

0301-6690383

فون پر رابطہ صبح 10 بجے سے رات 8 بجے تک

WWW.PAKSOCIETY.COM

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

http://paksociety.com

Downloaded From Paksociety.com

بھی کی۔ وہ مہنگے ترین میزبان تھے مگر یہ تجربہ ناکام رہا۔ ہاں، جب انڈسٹری دھیرے دھیرے اپنے پیروں پر کھڑی ہو رہی تھی، وہ شعیب منصور کی ''خدا کے لیے'' اور بلال لاشاری کی ''وار'' جیسی معیاری فلموں میں جلوہ گر ہوئے اور اس عمل میں حصہ ڈالا۔

شکور رانا

یوں تو پاکستان کرکٹ نے کئی ممتاز امپائر پیدا کیے جنھوں نے متعدد اعزازات اپنے نام کیے۔ دُور کیوں جائیں، علیم ڈار کی مثال ہمارے سامنے ہے، جن کی صلاحیتوں کا ایک زمانہ قائل۔ جنھیں آئی سی سی سمیت کئی اداروں نے نشان سپاس پیش کیے۔ اور بھی روشن مثالیں ہیں۔ البتہ ایک صاحب ایسے بھی گزرے جو اپنی مہارت اور قابلیت کے علاوہ ایک تنازعے کے باعث بھی ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ سچ تو یہ ہے کہ 3 اپریل 1936 کو امرتسر میں پیدا ہونے والے شکور رانا کے تذکرے کے بنا امپائرنگ کی تاریخ ادھوری ہے۔

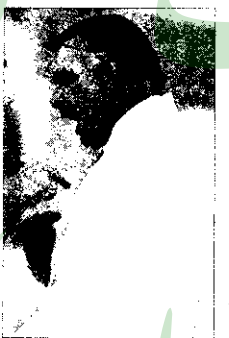

کرکٹ ان کی خون میں تھی۔ ان کے خاندان نے شفقت رانا اور عظمت رانا جیسے کرکٹر پیدا کیے۔ البتہ شکور رانا خود کو اس پائے کا کرکٹر ثابت نہیں کر سکے۔ 1957 سے 1973 تک انھوں نے فقط گیارہ میچ کھیلے۔ 226 رنز بنائے، 12 وکٹیں لیں۔ یوں لگتا تھا کہ اب وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بھلا دیے جائیں گے مگر قسمت کو کچھ اور منظور تھا۔ وہ امپائرنگ کی سمت آ گئے۔ کیریر دو عشروں پر محیط تھا۔ 1975 میں انھوں نے ویسٹ انڈیز اور پاکستان کے درمیان لاہور میں ہونے والے ٹیسٹ میچز سے کیریر شروع کیا۔ 1996 میں وہ پاکستان اور نیوزی لینڈ کے درمیان ہونے والے مقابلے میں آخری بار ایکشن میں نظر آئے۔ انھوں نے 18 ٹیسٹ میچز اور 22 ون ڈے مقابلوں میں فیصلے صادر کیے۔ بظاہر یہ ایک عام سا کیریر تھا مگر شکور رانا کے کیس میں 1987 میں ایک عجیب و غریب واقعہ ہوا۔

فیصل آباد میں پاکستان اور انگلینڈ کے درمیان میچ جاری تھا۔ ٹیسٹ کا دوسرا دن تھا۔ ایڈی ہیمنگز بولنگ کر رہے تھے۔ بولر گیند پھینکنے کو تھا کہ شکور رانا نے لیگ امپائر کی حیثیت سے کھیل رکواتے ہوئے اعتراض کیا کہ انگلش کپتان مائیک گیٹنگ نے ضوابط کی خلاف ورزی کی تھی۔ اُن کا کہنا تھا کہ گیٹنگ نے بولر کے رن اپ کے دوران ہاتھ ہلا کر فیلڈ تبدیل کی ہے، جو غیر قانونی ہے۔

گیٹنگ ہتھے سے اکھڑ گئے۔ تلخ جملوں کا تبادلہ ہوا۔ حالات اس وقت بگڑ گئے، جب گیٹنگ نے ایک متعصبانہ جملہ کہا۔ اُن کے الفاظ تھے: ''کھیل کے قواعد وضوابط ہم بناتے ہیں۔''

خاصی لے دے ہوئی۔ مزید کھیل ممکن نہیں تھا۔ وہ اگلے روز امپائرنگ کے لیے میدان میں نہیں اترے۔ شکور رانا نے گیٹنگ سے معافی مانگنے کا مطالبہ کر دیا۔ انگریز کی انا کو یہ گوارا نہیں تھا مگر جب لوگوں نے سمجھایا تو گیٹنگ نے شرط رکھ دی کہ پہلے شکور رانا معافی مانگیں۔ ایک ہولناک ڈیڈلاک پیدا ہو گیا تھا۔ انگلش ٹیم کچھ دیر میدان میں موجود رہی مگر امپائر نہیں اترے۔ ٹیمیں واپس چلی گئیں۔ انگلش ٹیم کی انتظامیہ نے معافی کا ایک ڈرافٹ تیار کیا تھا مگر گیٹنگ اس پر دستخط کرنے کو تیار نہیں تھے، یوں تیسرے دن بھی میچ نہیں ہوا اور حالات بگاڑ کی سمت جانے لگے۔ سیریز منسوخ ہونے کا اندیشہ بڑھنے لگا۔ یہ خدشہ ظاہر کیا جانے لگا کہ پاکستان اور برطانیہ کے تعلقات میں دراڑ پڑنے کو ہے۔ آخر دونوں ممالک کی وزارت خارجہ کو معاملے میں کودنا پڑا۔ سیریز کی منسوخی کا خطرہ ٹلا۔ میچ کے چوتھے روز مائیک گیٹنگ نے ایک تحریری معافی نامہ شکور رانا کو تھما دیا۔ بالآخر میچ شروع ہوا۔ اس واقعے کا ایک عرصے تک چرچا رہا۔ ان کی ریٹائرمنٹ کے بعد ایک انگلش میگزین نے انھیں کثیر رقم خرچ کر کے انگلینڈ بلوایا، تا کہ وہ مائیک گیٹنگ سے مل سکیں۔ لارڈز کے گیٹ پر دونوں کی مختصر سی ملاقات بھی ہوئی۔

عام خیال ہے کہ شکور رانا اور مائیک گیٹنگ تنازعہ کے باعث ہی آئی سی سی نے ٹیسٹ میچز میں نیوٹرل امپائر کی شرط عائد کی۔ پہلے ہوم سائیڈ امپائرز کا اہتمام کرتی تھی۔ ویسے گیٹنگ کے علاوہ 1984 میں ہونے والے ایک ٹیسٹ میچ میں ان کا نیوزی لینڈ کے کپتان Jeremy Coney سے بھی جھگڑا ہوا تھا مگر اس میں بھی وہ بے قصور قرار پائے تھے۔ شکور رانا کا 9 اپریل 2001 کو انتقال ہوا۔ معروف اداکار معمر رانا ان ہی کے صاحب زادے ہیں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

خواب

منظر امام

لوگ خواب دیکھتے ہیں، کچھ لوگ سوتے ہوئے اور کچھ لوگ جاگتے ہوئے۔ جاگتی آنکھوں کے خواب دبی کچلی خواہشوں کا عکس ہوتا ہے اور نیند کے عالم میں نظر آنے والے خواب کی مکمل تشریح ہنوز ایک الجھی ڈور ہے۔ یہ خواب کیوں، کیسے اور کب نظر آتے ہیں اس پر ماہرین نفسیات بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ اس بارے میں بیان کردہ تشریحات سے اخذ کی گئی معلومات نہایت مختصر پیرے میں دی جارہی ہے۔

خواب کی حقیقت کیا ہے؟ ایک مختصر سا جائزہ

خواب ہمارے زندگی کا ایک لازمی حصہ ہیں۔ ذہنی گھٹن کو دور کرنے کے لیے خواب دیکھنا بہت ضروری ہے۔ فرائڈ نے کہا تھا کہ ناآسودہ خواہشات کی تکمیل خوابوں کے ذریعے ہوتی ہے۔

خوابوں کا موضوع بہت وسیع ہے۔ خوابوں کے بے شمار پہلو اور بے شمار کیفیات ہیں لیکن اس مضمون میں ہم نے ان خوابوں کے حوالے سے بات کی ہے جو دنیا کے مشہور لوگوں نے دیکھے اور ان کے خواب سچ ثابت ہوئے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

Downloaded From Paksociety.com

ان کے خوابوں کا ذکر مذہبی کتابوں میں موجود ہے۔

تو آئیں سب سے پہلے حضرت یوسفؑ اور ان کے حوالے سے فرعون کا خواب دیکھتے ہیں۔

جس وقت زلیخا کے الزام لگانے پر حضرت یوسفؑ کو قید ہوئی تو ان کے ساتھ دو اور کو بھی قید کیا گیا۔ ایک فرعون کا ساقی تھا اور دوسرا ایک داروغہ۔ ایک رات دونوں نے خواب دیکھا اور حضرت یوسفؑ سے آکر بیان کیا۔ ساقی نے کہا کہ میں نے انگور کا ایک درخت دیکھا۔ اس کی تین شاخیں نکلیں اور اس کے پھل پھول آئے پھر انگور کے گچھے پک گئے۔ میرے ہاتھ میں فرعون کا پیالہ تھا۔ میں نے شراب کشید کی اور فرعون کو پلا دی۔

دوسرے نے کہا کہ میں دیکھتا ہوں کہ میرے سر پر تین ٹوکرے روٹیوں کے ہیں، اوپر کے ٹوکرے سے پرندے روٹیاں کھا رہے ہیں۔

حضرت یوسفؑ نے ساقی کو خواب کی تعبیر بتائی۔

''انگور کی 3 شاخوں سے مراد تین روز ہیں۔ سو تین روز کے بعد تو فرعون کو شراب پلانے کے عہدے پر بحال ہو جائے گا اور دوسرے سے کہا کہ 3 ٹوکروں سے مراد 3 دن ہیں۔ 3 روز کے بعد تجھے سولی دی جائے گی اور پرندے تیرا مغز کھائیں گے۔''

اور یہی ہوا۔ ساقی اپنے عہدے پر بحال ہو گیا اور دوسرے کو پھانسی دے دی گئی۔

اور اب فرعون کا خواب دیکھیں۔

اس نے دیکھا کہ وہ چپ چاپ دریا پر کھڑا ہے کہ دریا سے سات موٹی اور خوب صورت گائیں نکلیں اور گھاس چرنے لگیں۔

ان کے بعد سات اور بدشکل اور دبلی گائیں دریا سے نکلیں اور ان موٹی اور خوب صورت گائیوں کو کھا گئیں۔

فرعون ان خوابوں سے بہت ڈر گیا۔ اس نے دربار میں اپنا خواب بیان کیا۔ اتفاق سے ساقی کو یاد آ گیا کہ جس وقت وہ قید میں تھا اس نے اور داروغہ نے خواب دیکھے تھے اور قید خانے میں موجود ایک قیدی یوسفؑ نے خوابوں کی تعبیر بتا دی تھی۔

فرعون نے حکم دیا کہ جاؤ میرے خوابوں کی تعبیر معلوم کرو۔

حضرت یوسفؑ نے تعبیر بیان فرمائی کہ وہ سات اچھی اور خوب صورت گائیں اچھی فصلوں اور غلے کی فراوانی ہیں۔ یعنی سات برسوں تک خوب اچھی فصل ہوتی رہے گی۔ اس کے بعد سات گائیں یعنی سات سال ایسے آئیں گے جو قحط کے ہوں گے اور سب کچھ برباد ہو جائے گا۔

اس لیے ہوشیاری اسی میں ہے کہ اچھے دنوں کی فصلوں کو تھوڑا سا بچا کر رکھا جائے تاکہ کام آسکیں۔

آپ خود حضرت یوسفؑ کا ایک خواب ملاحظہ فرمائیں۔

یہ خواب آپ نے اپنے آخری دنوں میں دیکھا تھا جب حضرت یعقوبؑ کا انتقال ہو چکا تھا اور حضرت یوسفؑ مصر میں بہت اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔

آپ دیکھتے ہیں۔ ایک نہایت پُرفضا جگہ ہے۔ وہاں پر چند کرسیاں رکھی ہیں۔ ایک پر حضرت ابراہیمؑ ایک پر حضرت اسحاقؑ اور ایک پر حضرت یعقوبؑ تشریف فرما ہیں۔ جب کہ ایک کرسی خالی ہے اور ایک طرف یوسفؑ کی والدہ ماجدہ تشریف رکھتی ہیں۔

حضرت یوسفؑ وہاں پہنچتے ہیں اور سب ان سے لپٹ کر رونے لگتے ہیں۔ حضرت یعقوبؑ فرماتے ہیں۔

''اے فرزند تو کب تک اپنے راہ دکھائے گا آہم تیرے انتظار میں ہیں۔''

آنکھ کھلی تو آپ کی روح پر اپنے بزرگوں سے ملنے کی سخت بے قراری تھی۔ آپ نے بارگاہ الٰہی میں دعا فرمائی۔

''اے اللہ مجھے صالحین سے ملوا دے۔''

بس کچھ دنوں کے بعد آپ کا انتقال ہو گیا۔

ان خوابوں کا ذکر قرآن کے علاوہ ہماری مذہبی کتابوں میں بھی ہے۔

ایک اور مشہور خواب جولیس سیزر کی بیوی کیلی فورنیا کے حوالے سے ہے۔ اس نے خواب میں دیکھا تھا کہ اس کا شوہر جب سینیٹ کے اجلاس میں شرکت کے لیے پہنچا تو چاروں طرف سے لوگ تلواریں لے کر اس پر ٹوٹ پڑے۔ ان میں سیزر کا دوست بروٹس بھی شامل تھا۔

فرانسس بیکن

مشہور ادیب اور سائنس دان۔ پیرس میں مقیم تھا۔ جب کہ اس کا باپ لندن برطانیہ میں بیمار پڑا ہوا تھا۔ ایک شب جب برطانیہ میں اس کا باپ قریب المرگ تھا بیکن نے خواب میں اپنا آبائی گھر دیکھا۔ جس کی دیواروں پر کالا پلاستر چڑھا ہوا تھا۔

اس سے اسے یقین ہوا کہ خونی رشتوں کے درمیان

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

نیلی پیتھی کا رشتہ بہت ممکن ہے۔

آبائی مکان اس کے باپ کا تھا اور دیواروں پر آئی ہوئی سیاہی باپ کی موت تھی۔

آلیور کرامویل

اس شخص نے ایک رات دیکھا کہ وہ اپنے کمرے میں ہے کوئی کتاب پڑھ رہا ہے اچانک کمرے کا پردہ ایک طرف ہٹتا ہے اور ایک خوب صورت اور باوقار عورت کرامویل کے سامنے آکر کہتی ہے۔ ''تم ایک دن انگلینڈ کے عظیم ترین انسان بنو گے۔'' اور ہوا بھی یہی۔

ملکہ میری ارطونیسٹے

اس کو فرانسیسی انقلابیوں نے تخت سے اتار کر نظر بند کر دیا تھا۔

اس نے ایک رات طلوع سحر کا منظر دیکھا جو دھاری دار تھا اور کسی عبادت گاہ کے ستون سے مشابہ تھا۔

اچانک وہ ستون بیٹھ گیا اور زمین پر گر گیا۔ اس کی تعبیر یہ نکالی گئی کہ کوئی بڑی شخصیت چل بسے گی اور یہی ہوا خود میری ارطونیسٹے کا انتقال ہو گیا تھا۔

مشہور شاعر شیلے نے سفر کر کے سمندر میں ڈوبنے سے پندرہ دن پہلے ایک خواب دیکھا تھا۔

جس میں اس کے دوست اس کی خواب گاہ میں زخمی اور خون آلود حالت میں داخل ہو کر اس سے کہتے ہیں کہ تمہارا مکان سیلاب میں بہہ گیا ہے۔ پھر اس نے دیکھا کہ وہ اپنے ایک دوست ولیمز کا گلا گھونٹ رہا ہے۔

پندرہ دنوں کے بعد یہ خواب سچ ہو گیا۔ شیلے اور اس کا وہ دوست جس کا گلا اس نے خواب میں گھونٹا تھا دونوں ایک ساتھ ڈوب کر مرے تھے۔

مشہور افسانہ نگار اور ناول نگار چارلس ڈکسنز نے اپنا ایک خواب بیان کیا ہے کہ وہ کسی پارٹی میں ہے اور اس کے کچھ دوست ایک عورت سے اس کا تعارف کروا رہے ہیں کہ یہ مس نیپئر ہیں۔ چارلس اس عورت کو بالکل نہیں جانتا لیکن کچھ دنوں کے بعد بالکل ایسا ہی ہوتا ہے۔ ایک پارٹی ہوتی ہے جس میں نیپئر نام کی ایک عورت سے اس کا تعارف کروایا جاتا ہے۔

بسمارک انیسویں صدی کا جرمن مرد آہن تھا اس نے خواب میں دیکھا کہ دیگر جرمن صوبوں پر روس کا قبضہ ہو گیا ہے۔ یہ بات بعد میں درست ثابت ہوئی اور پہلی عالمی جنگ کا سبب بن گئی۔

عوام کی زندگی

نویں صدی کی عورت کو اتنی ہی آزادی حاصل تھی جتنی کہ اگلے زمانے کی..... بہنیں اس سے لطف اندوز ہوتی تھیں لیکن دسویں صدی کے آخر میں عورتوں کی سختی کے ساتھ پردہ نشینی اور مردوں کی صف سے ان کی کامل علیحدگی کا رواج عام ہو چکا تھا لیکن عباسیوں کے ابتدائی دور کے اونچے طبقوں کی عورتوں کے متعلق تاریخوں میں ہم نہ صرف یہ پڑھتے ہیں کہ انہوں نے امتیاز حاصل کیے ہیں اور مملکت کے کاموں پر اثر انداز ہوئی ہیں، بلکہ یہ بھی ہمارے دیکھنے میں آتا ہے کہ عرب دوشیزائیں میدان جنگ میں جاتی ہیں، فوجوں کی کمان کرتی ہیں۔ شعر کہتی ہیں ادبی میدان میں مردوں کے ساتھ مقابلہ کرتی ہیں یا اپنی ذکاوت و خوش طبعی، موسیقی میں مہارت اور خوش گلوئی سے معاشرے کی رونق بڑھاتی ہیں۔

مرسلہ: عباس شیرازی، ملتان

مشہور امریکی صدر ابراہام لنکن کا یہ خواب بھی بہت مشہور ہے جس میں اس نے اپنی لاش کے ٹکڑے دیکھے تھے اور اس خواب کا ذکر کر دیا تھا۔

اوڈلف ہٹلر نے پہلی عالمی جنگ کے دوران ایک نوجوان کی حیثیت سے سب سے زیادہ غیر معمولی خواب دیکھے۔

وہ جرمن پیادہ فوج میں تھا اور فرانس کے محاذ پر ایک خندق میں گرا ہوا تھا۔ ایک رات اس نے خواب میں دیکھا کہ وہ زینے کے اندر دھنس گیا ہے اور پگھلے ہوئے لوہے کے نیچے دبا ہوا ہے اور بہت زخمی ہے۔

وہ نیند سے بیدار ہوا اور اپنے ساتھیوں کے منع کرنے اور دھمکانے کے باوجود خندق سے باہر نکل آیا۔

جوں ہی وہ اس کھلی ہوئی سرنگ سے نکل کر چند قدم چلا اس کے پیچھے ایک دھماکا ہوا اس نے مڑ کر دیکھا وہ سرنگ یا خندق بالکل مسمار ہو چکی تھی اور تمام سپاہی زمین میں دھنس چکے تھے اور سرخ دھکتی ہوئی دھات ان کے اوپر جمی ہوئی تھی۔

لارڈ ٹین سن نے خواب میں دیکھا کہ پرنس البرٹ اس سے ملنے آیا ہے اور اس کے رخسار کا بوسہ لے رہا ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

دوسرے ہی دن اسے درباری شاعر بنادیا گیا تھا۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ بہت سے ایسے خواب بھی ہیں جن میں سائنس دانوں کی رہنمائی کی گئی تھی اور انہوں نے اپنے خوابوں کے مطابق کامیابیاں حاصل کرلیں۔

ایک مثال ئیلس پروکی کی ہے۔

یہ ایک ذہین انسان تھا۔ یہ دیکھا کرتا کہ کپڑے سینے والے (درزی) کتنی محنت سے کپڑے سیتے ہیں۔ یعنی ہاتھوں سے کپڑے میں کسی نوکدار سوئی سے سوراخ کرتے ہیں۔ پھراس سوراخ کے برابر دوسرا سوراخ کیا جاتا ہے اور دھاگے کو دونوں سوراخوں کے درمیان سے گزارا جاتا ہے۔

بہت ہی پریشان کن اور دشوار صورت حال تھی۔

سوئی سے دھاگا نکل جایا کرتا تھا۔ ایک رات اس نے ایک خواب دیکھا اس نے دیکھا کہ وہ کسی جگہ سے گزر رہا ہے کہ آدمی اس پہ خنجر سے حملہ کررہا ہے۔ وہ ایلس کے پیٹ میں خنجر ڈال کر جب باہر نکالتا ہے تو اس کے ساتھ ایلس کی آنتیں بھی باہر آجاتی ہیں۔ وہ پھر خنجر ڈالتا ہے اور پھر آنتیں آتی ہیں۔

اس خواب نے ایلس کو خوف زدہ تو کیا لیکن اس خواب نے صدیوں پرانے ایک مسئلے کا حل نکال لیا تھا۔ یعنی خنجر کی نوک پر اگر سوراخ ہو تو پھر بڑی آسانی سے دھاگا کپڑوں کے درمیان گزر سکتا ہے اور یہی خیال اس کو عظیم ایجاد کی طرف لے گیا۔

جانتے ہیں وہ ایجاد کیا ہے سلائی مشین۔ اس خواب نے ایلس کو سلائی مشین کی راہ بتادی تھی۔

وہ ہالی ووڈ کا ایک عام سا ہدایت کار تھا۔ اس کے کریڈٹ پر کوئی خاص فلمیں نہیں تھیں۔ کبھی کبھی اسے کوئی کام مل جایا کرتا۔ پھراس نے ایک خواب دیکھا اور اس خواب نے اس کی دنیا بدل دی۔

اس نے دیکھا کہ اس کا جہاز خلا میں پرواز کررہا ہے اور کوئی مخلوق جہاز پر آکر حملہ آور ہوجاتی ہے۔

اس نے یہ خواب 1981ء میں دیکھا تھا۔ اس کے بعد وہ اس خواب کی تعبیر کے حصول میں لگ گیا اور کئی برسوں کے بعد اس نے اس خواب پر منحصر ایک فلم بناڈالی جس کا نام ہے ”ٹرمینیٹر“۔ پوری دنیا میں دھوم مچاڈالی اور اس ڈائریکٹر کا نام ہے جیمز کیمرون۔

آئن اسٹائن، کون اس کو نہیں جانتا۔ اس شخص نے تھیوری آف Relatively کا تصور اپنے ایک خواب سے ہی تھا۔

وہ خواب کیا تھا۔ ایک چراگاہ ہے جس کے اندر بے شمار گائیں گھومتی پھر رہی ہیں۔ اس چراگاہ کے اطراف میں تاروں کی ایک ہلکی سی باڑھ ہے۔

وہ ایک طرف کھڑا ہوا یہ سوچ رہا ہے کہ اگر یہ مویشی بھڑک اٹھے تو تاروں کا یہ باڑھ انہیں روک نہیں سکے گا۔

پھر اس نے چراگاہ کے مالک کو دیکھا جو ایک طرف کھڑا ہوا اپنے مویشیوں کو دیکھ رہا تھا اچانک کسی وجہ سے مویشی بھڑک کر بھاگ اٹھے اور ان کا رخ باڑھ کی طرف تھا۔

چراگاہ کے مالک نے فوراً ہی ایک سوئچ دبا کر ان تاروں میں ہلکا کرنٹ چھوڑ دیا۔ اب وہ مویشی تاروں کے پاس آئے اور اچھل اچھل کر پیچھے بھاگنے لگے۔

آئن اسٹائن دیکھ رہا تھا کہ مویشی خوف اور تکلیف سے اچھل کود کررہے ہیں لیکن چراگاہ کے مالک کی نگاہ میں یہ ان کی ایکسرسائز کا وقت تھا۔

آئن اسٹائن بیدار ہوگیا اور اس کے دھیان میں یہ بات آگئی کہ کبھی کبھی ایک واقعہ دو مختلف پوائنٹس پر کھڑے ہوئے لوگوں کے لیے مختلف تصور اور ردعمل پیش کرتا ہے۔ یہیں سے اس نے تھیوری آف Relatively حاصل کی۔

تاریخ میں اس قسم کے بے شمار خواب ہیں۔ ایک خواب تو وہ ہوتے ہیں جو آنے والے واقعات کی خبر دے دیتے ہیں۔ دوسری قسم کے خواب وہ ہوتے ہیں جو علامات کے ذریعے اپنا اظہار کرتا، جیسے فرعون نے سات گائیوں کو علامات کے طور پر دیکھا اور تیسری قسم کے خواب وہ ہوتے ہیں جو اس طرح پیش آتے ہیں جس طرح دیکھے گئے تھے۔

جیسے ہٹلر کا خواب کہ اس کی خندق زمین میں دھنس گئی ہے اور وہ سب پگھلے ہوئے لوہے کے نیچے دبے ہوئے ہیں۔

اس خواب میں فطرت نے علامت سے کام نہیں لیا بلکہ اس خواب کو اس انداز سے پیش کردیا جس انداز سے وہ واقعہ پیش آیا تھا۔

خواب دراصل بہت ہی پیچیدہ اسرار ہیں۔ سائنس ابھی تک مکمل طور پر خوابوں کے بھید سے پردہ نہیں ہٹاسکی ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

شہروں کے نام

رانا محمد شاہد

ارضِ پاک کا ہر خطہ ہمیں عزیز ہے اس کے بارے میں معلومات رکھنا بھی ضروری ہے اسی نکتے کو ذہن میں رکھ کر ایسے چند شہروں کا تذکرہ کہ ان کی پہچان کے لیے جو نام رکھا گیا اس کے پیچھے تاریخی اہمیت کیا ہے؟

ایک مختصر سی مگر دلچسپ تحریر

پاکستان کے شہروں کو اللہ تعالیٰ نے طرح طرح کی نعمتوں سے نوازا ہے۔ کہیں لق و دق صحرا ہے تو کہیں ٹھاٹھیں مارتا سمندر۔ کہیں لہلہاتے سرسبز و شاداب کھیت سونا اگلتے ہیں تو کہیں معدنیات سے بھری سرزمین ہے۔ پاکستان کے بہت سے شہروں میں تاریخ کے بہت اہم آثار بھی موجود ہیں۔ ایک پاکستانی کی حیثیت سے پاکستان کے ان شہروں سے محبت فطری امر ہے۔ ان شہروں کے نام کیسے رکھے گئے اس حوالے سے معلوماتی مضمون پیشِ خدمت ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

Downloaded From Paksociety.com

اسلام آباد

906 کلومیٹر کے رقبے پر پھیلے تقریباً دو ملین کی آبادی پر محیط یہ شہر 1959ء میں مرکزی دارالحکومت کا علاقہ قرار پایا۔ چودھواں بڑا شہر ہے۔ راولپنڈی کے نزدیک پوٹھوہار کے علاقے میں مارگلہ پہاڑی کے دامن میں یہ شہر تعمیر کیا گیا ہے۔ پہلے اس شہر کا نام جناح آباد، جناح پور، ایوب آباد اور مسلم آباد رکھا جانے کے لیے کہا گیا۔ تاہم بعد میں اسلام آباد کا انتخاب ہوا۔ اس کا نام مسلمانانِ پاکستان کے مذہب اسلام کے نام پر اسلام آباد رکھا گیا ہے۔

راولپنڈی

259 کلومیٹر پر پھیلا ہوا ہے۔ یہ شہر راول قوم کا گھر تھا جو زمانہ قدیم میں بدھ مذہب کے ماننے والوں کا شہر ٹیکسلا کے قریب ہے۔ محمود غزنوی کے حملے نے اس شہر کو تباہ کر دیا تھا اور یہاں کی حکمرانی گکھڑ قبیلے کو سونپ دی اور 1493ء میں چوہدری جھنڈے خان راول نے پندرہویں صدی میں اسے نظم کیا۔ اس شہر کا پرانا نام ''گزنی پور'' تھا۔ یہ شہر پاکستانی فوج کا صدر مقام بھی ہے۔

کراچی

تقریباً225 سال پہلے یہ ماہی گیروں کی بستی تھی۔ کلاچو نامی بلوچ کے نام پر اس کا نام کلاچی پڑ گیا۔ کراچی شہر کا نام قدیم تاریخی کتابوں میں نظر نہیں آتا۔ اکثر مؤرخ اس بات سے متفق ہیں کہ اس شہر کی بنیاد مچھیروں نے رکھی۔ 1740ء تک یہ شہر ایک چھوٹی سی بستی کی صورت مچھیروں کے قبضہ میں رہا۔ اس وقت اس علاقے کا کل رقبہ صرف 135 ایکڑ تھا۔ البتہ اس علاقے کے اردگرد صحرائی قزاقوں اور وحشی جانوروں کے حملوں و کارروائیوں سے بچنے کے لیے دیواریں تعمیر کی گئیں۔ مچھیروں کا یہ خاندان ایک بوڑھی عورت کی سربراہی میں اکٹھا تھا۔ مؤرخین کے مطابق اس بوڑھی عورت کا نام ''کلاچی'' تھا۔ اس لیے اس بوڑھی عورت کو کلاچی جو گوٹھ کہا جانے لگا اور پھر آہستہ آہستہ یہ نام کراچی میں تبدیل ہوگیا۔

لاہور

مؤرخین کی اکثریت کے مطابق لاہور کی بنیاد ہزاروں برس پہلے ہندوؤں کے بھگوان رام چندر کے بیٹے راجا لو نے رکھی تھی۔ یوں راجا کے نام سے آباد ہونے والا ''لوپور'' ہزاروں سال کی مسافت طے کرنے کے بعد ''لاہور'' بنا۔ ہیوسانگ Hientsang ایک چینی سیاح نے 630 عیسوی میں یہاں کی سیاحت کی اور اپنے سفرنامے میں اس شہر کا ذکر کیا۔ وہ لکھتا ہے کہ بیاس اور دریائے سندھ کے درمیان ہندو برہمنوں کا شہر ہے۔ 580 عیسوی میں اس شہر پر راجا... بمبرا کی حکومت تھی پھر چھتری قبائل نے قبضہ کیا اور اس شہر کا نام لوہارانا رکھا جو لوہارانا کے نام سے پہچانا جاتا تھا یعنی تلواروں کا شہر مختلف زمانوں میں اسے لاہاوار، لہور اور لوہاور بھی لکھا اور پکارا جاتا رہا۔

حیدرآباد

اس شہر کا پرانا نام نیرون کوٹ تھا۔ کلہوڑوں نے اسے حضرت علیؓ کے نام سے منسوب کر کے اس کا نام حیدرآباد رکھ دیا۔ اس کی بنیاد غلام کلہوڑہ نے 1768ء میں رکھی۔ 1843ء میں انگریزوں نے اس شہر پر قبضہ کر لیا۔ 1935ء میں حیدرآباد کو ضلع کا درجہ ملا۔ یہ پاکستان کا چوتھا بڑا شہر ہے۔

کوئٹہ

لفظ کوئٹہ، کواٹا سے بنا ہے۔ پشتو زبان میں اس کے معنی قلعے کے ہیں۔ بگڑتے بگڑتے یہ کواٹا سے کوئٹہ بن گیا۔ قلعہ اسے اس وجہ سے کہہ سکتے ہیں کہ کوئٹہ چاروں طرف سے بلند و بالا پہاڑوں میں گھرا ہوا ہے اور یوں قدرتی طور پر قلعہ کا کام کرتا ہے۔ کوئٹہ میں مختلف قبیلوں کے لوگ آباد ہیں۔ سردیوں میں یہاں سخت سردی اور برف باری بھی ہوتی ہے۔ یہ صوبہ بلوچستان کا دارالحکومت ہے۔

پشاور

پیشہ ور لوگوں کی نسبت سے اس کا نام پشاور پڑ گیا۔ ایک روایت کے مطابق محمود غزنوی نے اسے یہ نام دیا۔ اسے تاریخ میں مختلف ناموں سے یاد کیا گیا۔ اسے ''شہر ہفت زبان'' بھی کہا جاتا ہے کہ آج بھی اس شہر میں بے شمار زبانیں بولی جاتی ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ یہاں کی اکثریتی زبان ''ہندکو'' رہی ہے۔ کیونکہ ہندکو زبان میں اس شہر کے قدیم اور جدید لہجے اور مزاج کا احساس ہوتا ہے۔ اسے پھولوں کا شہر بھی کہتے ہیں۔ یہ خیبر پختونخواہ کا دارالحکومت اور پاکستان کا نواں بڑا شہر ہے۔

فیصل آباد

اس شہر کو ایک انگریز گورنر سر جیمز لائل نے آباد کیا۔ اسی کے نام پر اس شہر کا نام لائل پور تھا۔ یکم ستمبر 1977ء کو حکومت نے لائل پور کا نام فیصل آباد رکھنے کا فیصلہ کیا۔ یہ نام سعودی فرمانروا شاہ فیصل شہید کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے رکھا گیا۔ یہ گنجان آباد شہر صنعتی ترقی میں پیش پیش ہے۔ خصوصاً ٹیکسٹائل کی صنعت میں پاکستان کی ریڑھ کی ہڈی تصور کیا جاتا

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ہے۔اسی مناسبت سے اسے ایشیا کا مانچسٹر بھی کہا جاتا ہے۔

سرگودھا

یہ سرا اور گودھا سے مل کر بنا ہے۔ ہندی میں سر تالاب کو کہتے ہیں اور گودھا ایک فقیر کا نام تھا۔ جو تالاب کے کنارے رہتا تھا۔اسی لیے اس کا نام گودھے والا سر بن گیا جو بعد میں سرگودھا کہلایا۔1903ء میں باقاعدہ یہ شہر آباد ہوا۔سرگودھا کینو کے مختلف اقسام کی افزائش کے لیے بھی مشہور ہے۔ سرگودھا کو پاک فضائیہ کے بیس کیمپ کی وجہ سے شاہینوں کا شہر بھی کہتے ہیں۔

بہاولپور

نواب بہاول خان کا آباد کردہ شہر جو انہی کے نام پر باول پور کہلایا۔ایک مدت تک یہ ریاست بہاولپور کا صدر مقام رہا۔ پاکستان کے ساتھ الحاق کرنے والی یہ پہلی ریاست تھی۔ ون یونٹ کے قیام تک یہاں عباسی خاندان کی حکومت تھی۔ بہاولپور شہر کی پہچان نواب کی تعمیر کردہ مختلف تعمیرات ہیں۔ان میں نور محل، گلزار محل اور دربار محل مشہور ہیں۔یہ عمارات فنِ تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔بہاولپور شہر کے قریب ایک سولر پارک کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔یہ پارک قائداعظم سولر پارک کے نام سے جانا جاتا ہے۔

ملتان

کہا جاتا ہے کہ ملتان کی تاریخ چار ہزار سال قدیم ہے۔ البیرونی کے مطابق اسے ہزاروں سال پہلے کرت سکیا کے زمانے میں آباد کیا گیا۔ملتان شہر کا ابتدائی نام ''کیساپور'' بتایا جاتا ہے۔مسلمانوں نے 712ء میں ملتان میں قدم رکھے جب محمد بن قاسم سندھ فتح کرنے کے بعد اِدھر آیا۔اولیاء کرام کے مزارات اس شہر کی خاص پہچان ہیں۔کاشی کاری اور قالین بافی میں ملتان دنیا بھر میں مشہور ہے۔سوہن حلوا اور آم یہاں کی خاص سوغات ہیں۔

سیالکوٹ

دو ہزار سال قبل مسیح میں راجا سل یا سلا نے اس شہر کی بنیاد رکھی۔ ہندوؤں کی مذہبی کتاب ''گیان شکتی'' میں لکھا ہے کہ راجا سل نے ''نالہ ایک'' کے کنارے سیالکوٹ کی بنیاد رکھی تھی۔ برطانوی عہد میں اس کا نام سیالکوٹ رکھا گیا۔ یہ شہر کھیلوں کا سامان اور آلاتِ جراحی بنانے کے حوالے سے دنیا بھر میں مشہور ہے۔

ساہیوال

یہ شہر ساہی قوم کا مسکن تھا۔اسی لیے ساہی وال کہلایا۔ انگریز دور میں پنجاب کے انگریز گورنر منٹگمری کے نام پر اس کا نام ''منٹگمری'' تھا۔نومبر 1966ء میں اس شہر کا پرانا نام یعنی ساہی وال بحال کر دیا گیا۔اعلیٰ نسل کے مویشیوں کی وجہ سے یہ شہر دنیا بھر میں مشہور ہے۔

گوجرانوالہ

ایک جاٹ مسمی خان ساہنسی نے 1365ء میں اسے آباد کیا اور اس کا نام ''خان پور ساہنسی'' رکھا۔سو سال حکومت کرنے کے بعد ساہنسی قبیلہ آپس کے اختلافات کی وجہ سے حکومت سے دستبردار ہو گیا۔ جاٹوں کے ساہنسی قبیلہ کے بعد امرتسر سے آئے گوجر قبیلہ کے سرداروں نے یہاں قبضہ کر لیا اور اس شہر کا نام تبدیل کر کے گوجرانوالہ رکھ دیا۔ مغلیہ عہد میں گوجرانوالہ ایک گوجر ریاست کی حیثیت سے مغلیہ سلطنت میں شامل تھا۔ یہ شہر کھانے پینے کی وجہ سے دنیا بھر میں شہرت رکھتا ہے۔اس کے علاوہ یہ پہلوانوں کا شہر بھی کہلاتا ہے۔

شیخوپورہ

مغل حکمران اکبر اپنے چہیتے بیٹے سلیم جہانگیر کو پیار سے ''شیخو'' کہہ کر بلاتا تھا۔اسی مناسبت سے اس کا نام شیخوپورہ پڑ گیا۔ یہ علاقہ چاول کی کاشت کے حوالے سے مشہور ہے۔ تفریحی مقامات میں ہرن مینار دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے جو ہمیں مغل سلطنت کی یاد دلاتا ہے۔

ہڑپہ

اس شہر کا شمار دنیا کے قدیم ترین شہروں میں ہوتا ہے۔کہا جاتا ہے کہ یہ موہنجوداڑو کا ہم عصر شہر ہے جو پانچ ہزار سال قبل اچانک ختم ہو گیا۔ رگ وید کے قدیم منتروں میں اس شہر کا نام ''ہری روپا'' لکھا گیا ہے۔ان منتروں میں یہاں کی ایک بڑی جنگ کا ذکر بھی ملتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ ہری روپا سے ہڑپہ ہو گیا۔

ٹیکسلا

آریاؤں کی مذہبی کتاب وایو پران کے مطابق ''گندھارا کے تمام عظیم شہروں میں ''تکشا سیلا'' سب سے بڑا اور خوب صورت شہر ہے اور اس کا نام ایک مقامی قبیلے کے سردار تکشا کے نام پر رکھا گیا ہے۔'' اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ شہر کا نام کیسے وجود میں آیا۔ سر جان مارشل کے مطابق ''یونانی

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اور رومی مؤرخین نے شہر کے مشکل نام کا مخفف یعنی ٹیکسلا بنا دیا اور پھر یہی نام مغربی مصنفین میں مقبول ہو گیا۔ جب البیرونی ہندوستان آیا تو اسے اس نے ''مارقلعہ'' کا نام دیا۔ سنسکرت میں تکشا کا مطلب ہے کاٹنا اور سیلا کا پتھر، چٹان یا پہاڑ ہے۔ اس لفظی معنی کی بنیاد پر سر جان مارشل نے نتیجہ اخذ کیا کہ تکشا سیلا کا مطلب ہوا ''قاطع پتھروں کا شہر'' پھر وقت کی دھول میں یہ تکشا سیلا سے ٹیکسلا ہو گیا۔

جھنگ

صوبہ پنجاب کا یہ شہر کبھی چند جھونپڑیوں پر مشتمل تھا۔ اس شہر کی ابتداء صدیوں پہلے رائے سرجا سیال نے رکھی تھی اور یوں یہ اسی کے نام پر ''جھگی سیال'' کہلایا جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ''جھنگ سیال'' بن گیا اور پھر صرف ''جھنگ'' رہ گیا۔ مشہور صوفی بزرگ سلطان باہو کا مزار اس شہر کی پہچان ہے۔ جھنگ دو دریاؤں جہلم اور چناب کے جنکشن پر واقع ہے۔ جو تریموں کے نام سے مشہور ہے۔

میانوالی

ایک صوفی بزرگ میاں علی کے نام سے موسم شہر میانوالی 16ویں صدی میں آباد کیا گیا۔ یہ صوبہ خیبر پختونخواہ کی سرحد پر واقع ہے۔ عالمی شہرت یافتہ گلوکار عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی اس شہر کی پہچان ہیں۔

مظفر گڑھ

والی ملتان نواب مظفر خان کا آباد کردہ شہر۔ 1880ء تک اس کا نام خان گڑھ رہا۔ پھر نواب مظفر خان کے نام پر مظفر گڑھ رکھ دیا گیا۔ اسے یہ نام انگریز حکومت نے دیا۔

گجرات

گجرات کا شمار بھی قدیم ترین شہروں میں ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ گجرات جو اکبر بادشاہ نے آباد کیا تھا۔ وہ صنعت و حرفت اور ترقی میں بہت پیچھے رہ گیا۔ اس وقت شہر کا نام گجرات اکبر آباد تھا۔ شاہ دولہ کا مزار ہونے کی وجہ سے اس کا قدیم نام گجرات شاہ دولہ بھی تھا۔ جو اب صرف گجرات ہے۔

خانیوال

یہ شہر زیادہ پرانا نہیں۔ ابتداء میں یہ پنجاب کی ایک مشہور برادری ڈاہا برادری کی چھوٹی سی بستی تھی۔ اس برادری کے لوگ خان کہلاتے تھے۔ یوں یہ بستی خان والا سے مشہور ہو گئی جو آہستہ آہستہ خانیوال بن گئی۔

ٹوبہ ٹیک سنگھ

اس شہر کا نام ایک سکھ ٹیکو سنگھ کے نام پر تھا۔ ٹوبہ تالاب کو کہتے ہیں۔ یہ درویش صفت سکھ ٹیکو سنگھ شہر کے ریلوے اسٹیشن کے پاس ایک درخت کے نیچے بیٹھا رہتا تھا اور ٹوبہ یعنی تالاب سے پانی بھر کر اپنے پاس رکھتا تھا۔ اسٹیشن سے آنے والے مسافروں کو پانی پلایا کرتا تھا۔ یوں یہ ٹوبہ ٹیک سنگھ بن گیا۔ یہ شہر موسمی کی پیداوار کے لیے مشہور ہے۔

چترال

چترال دنیا بھر میں اپنے قدرتی حسن اور پُرکشش مقامات کی وجہ سے خاص پہچان رکھتا ہے۔ چترال کا شمار پاکستان کے بلند ترین مقامات میں ہوتا ہے۔ یہ 15 سے 25 ہزار فٹ اونچے پہاڑوں کا خطہ ہے۔ چترال کا پرانا نام چھترار تھا جو بدلتے بدلتے چترال ہو گیا۔

اوچ شریف

اوچ شریف کے نام کے حوالے سے مختلف روایات ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ سید جلال الدین شیر شاہ بخاری نے اوچ شریف کا نام تجویز کیا تھا۔ ابتداء میں اس کا نام ''اوسایا اوچا'' تھا۔ یہ بھی کہتے ہیں، کہ محمد بن قاسم کے جنگی حریف راجا داہر کے باپ کا نام چچ تھا۔ وہ ایک ہندو راجے ہود کا صوبیدار تھا۔ اوچ شریف کا قدیم نام ہود تھا۔ تاہم جب راجا داہر کے باپ چچ نے اس کی کمان سنبھالی تو اس علاقے کا نام چچ رکھ دیا۔ جو بعد میں بگڑ کر اوچ اور پھر اوچ شریف بن گیا۔

چکوال

1985ء میں چکوال کو ضلع کا درجہ دیا گیا۔ چکوال کا پرانا نام چوہدری چکو خان جو کہ منہاس قبیلے کے سردار تھے، کے نام پر رکھا گیا تھا جو آہستہ آہستہ چکوال میں بدل گیا۔

خوشاب

معروف بادشاہ شیر شاہ سوری کا اس علاقے سے گزر ہوا تو اس نے یہاں کا پانی پیا اور کہا۔ ''ایں چہ خوش آب است'' یعنی کہ ''یہ بہترین پانی ہے'' وہیں سے اس خطے کا نام خوشاب رکھا گیا۔

بہاولنگر

ماضی میں ریاست بہاولپور کا ایک ضلع تھا۔ نواب سر صادق محمد خان عباسی خامس پنجم کے مورثِ اعلیٰ کے نام پر بہاول نگر رکھا گیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

فلم نگری

دو نگینے

انور فرہاد

پاک فلم انڈسٹری میں بے شمار و بے مثال نگینے ہیں لیکن ان میں سے دو نگینے ایسے ہیں جن کا تذکرہ دل اداس کر گیا ہے۔ یہ دونوں ہم سے ابھی ابھی بچھڑے ہیں۔ ان میں سے ایک نے پاکستانی فلمی دنیا کے دورِ عروج میں اپنے فن سے شائقین فلم کو متاثر کیا تو دوسرے نگینے نے فلمی دنیا کو اس دور میں سہارا دینے کی کوشش کی جب وہ سسک رہی تھی۔

فلموں سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک دلچسپ تحریر

''میری اس جیب میں شولا روپے ڈال دو اور اس جیب میں شولا آنے۔''

ایک نوجوان جس نے امریکی کاؤبوائے کی طرح کا لباس زیب تن کیے ہوئے تھا، اس کی پینٹ اور شرٹ میں متعدد جیبیں تھیں اور وہ ہر ملنے والے سے ان میں سولہ روپے اور سولہ آنے ڈالنے کو کہتا تھا۔

یہ ہماری دلجیت مرزا سے پہلی ملاقات تھی اور یہ ملاقات ان کی پہلی فلم ''جلن'' کے حوالے سے ہوئی تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

یہ ہماری نوجوانی کا دور تھا جب ہم کئی دوست ہر ریلیز ہونے والی فلم کو اس کے پہلے ہی شو میں دیکھ لیتے تھے۔ اس خیال سے دیکھتے تھے کہ اگر ہم نے فلم نہیں دیکھی تو ہماری فلم انڈسٹری ترقی کیسے کرے گی۔ ان دنوں زیادہ تر فلمیں ڈبہ ثابت ہوتی تھیں۔ چند ایک ہی کامیابی سے ہمکنار ہوتی تھیں۔ ہم لوگ اپنے آپ کو فلمی پنڈت سمجھتے تھے۔ دلجیت مرزا کی پہلی فلم دیکھ کر بھی ہم لوگ آپس میں باتیں کرنے لگے۔

''یار! یہ شباب کیرانوی نے کیا بکواس فلم بنائی ہے۔''

''شاید انہوں نے یہ سمجھ کر یہ فلم بنائی ہوگی کہ پرچے کی ایڈیٹری کی طرح فلم بنانا بھی بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔''

شباب کیرانوی ماہنامہ ''ڈائریکٹر'' کے ایڈیٹر تھے۔ انہیں فلم بنانے کا شوق چرایا تو جانے کس کس طرح اس کے لیے پیسے جوڑے۔ اپنے قارئین میں اس فلم کے شیئرز بھی بیچے کہ آپ کی رقم فلم کی کامیابی کی صورت میں معقول منافع کے ساتھ واپس کی جائے گی۔ مگر اسے بکا آرزو کہ خاک شدہ۔ ''جلن'' فلاپ ہی نہیں بری طرح فلاپ ہو گئی۔ فیل ہوگئی۔

مگر ہم دوستوں نے دلجیت مرزا کو پاس کر دیا۔ ''یہ نیا کامیڈین آگے چل کر بڑی ترقی کرے گا۔''

''مگر یار!'' عقیل پرویز نے کہا۔ ''اس نے تو اوور ایکٹنگ کی ہے۔''

''اسے بتانے والا اور سمجھانے والا ہدایت کار ہوتا تو اسے اوور ایکٹنگ سے روکتا مگر یہ بات ضرور ہے کہ اس میں ٹیلنٹ ہے۔''

اور ہم لوگوں کی یہ پیش گوئی سچ ثابت ہوئی۔ دلجیت مرزا نے نہ صرف کامیڈی میں اپنا رنگ جمایا اور ایک اچھے کامیڈین کی حیثیت سے اپنا لوہا منوایا بلکہ فلساز اور ہدایت کار کے طور پر بھی اپنی مزاحیہ اداکاری سے زیادہ کامیاب ثابت ہوا۔

نوخیز دلجیت مرزا نے جلد ہی اپنی شگفتہ مزاجی کا بڑی خوب صورتی سے استعمال کیا اور مزاحیہ اداکاری میں سکہ جما دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک اچھے کامیڈین کا مقام حاصل کرلیا۔ ہم لوگ جو گزرتے وقت کے ساتھ بڑے ہو رہے تھے۔ آپس میں ملتے تو کہتے۔ ''دیکھو میں نے کہا تھا نا کہ دلجیت مرزا کا مستقبل روشن ہے۔ اسے اچھے ہدایت کار ملے تو ان کی سرپرستی اور رہنمائی میں اس کا ٹیلنٹ کھل کر سامنے آئے۔''

''ہاں! ''جلن'' جو 2 ستمبر 1955ء کو ریلیز ہوئی تھی۔ وہ تو فلمی تاریخ میں شباب کیرانوی کی ناکام ترین فلم کی حیثیت سے یاد کی جائے گی مگر اس فلم کے حوالے سے ہی ہماری فلم انڈسٹری کو ایک ہونہار اداکار مل گیا۔''

اس طرح کی باتیں کرتے ہوئے ہم لوگ جب بڑے ہو گئے تو ہماری فلم دیکھنے کی عادت اور ان پر تبصرہ کرنے کی لت نے ہمیں کسی نہ کسی صورت میں فلم انڈسٹری سے وابستہ کر دیا۔ میں نے فلمی صحافی کی حیثیت سے اپنا کیریئر شروع کیا۔ عقیل پرویز نے کچھ دنوں تک اپنے مرحوم والد کا کام تعمیراتی ٹھیکے داری کی مگر وہ اس میں سروائیو نہیں کر سکا اور پہنچی وہیں پہ خاک کے مصداق اس نے بھی فلم جرنلزم اختیار کیا اور پھر لاہور میں کئی فلموں کی نائب ہدایت کاری بھی کی۔ اللہ اس کی مغفرت کرے وہ شوگر کے موذی مرض میں مبتلا ہو کر کراچی میں داغ مفارقت دے گیا۔

خیر جناب، بات دلجیت مرزا کی ہو رہی تھی جن کا اصل نام غلام حسین تھا۔ غلام حسین سے وہ دلجیت مرزا کیسے بنے؟ یہ بھی سن لیں۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کہ دلجیت مرزا کی طبیعت میں شگفتگی اور شوخی تھی۔ وہ اپنی اس فطری خوبی کی وجہ سے بڑی خوشگوار باتیں کیا کرتا تھا۔ روایت ہے کہ وہ کسی فلم کے سیٹ پر کچھ ایسی ہی باتیں کر رہے تھے کہ اداکارہ مسرت نذیر اور اداکارہ بہار ان کی کسی بات پر بے ساختہ کہہ اٹھیں۔ ''آپ نے تو ہمارے دل جیت لیے۔''

یہ بات دلجیت مرزا کے دل کو لگی اور انہوں نے سوچا غلام حسین کو فلم کے حوالے سے اگر دلجیت میں بدل دیا جائے تو کیسا رہے گا؟

''اچھا رہے گا۔'' انہوں نے خود ہی اپنے آپ کو جواب دیا اور دلجیت کے ساتھ مرزا کا اضافہ کر کے اعلان کر دیا۔

''میں مسمی غلام حسین یہ اعلان کرتا ہوں کہ آج سے میں دلجیت مرزا بن گیا ہوں۔ یہی میرا فلمی نام ہے۔ مجھے اسی کے حوالے سے یاد کیا جائے۔''

بزرگوں نے کہا ہے کہ ''اگر عزم و ہمت جوان ہو تو بڑی سے بڑی ناکامی کے بعد بھی بندہ کامیابی کی شاہراہ پر

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

گامزن ہو جاتا ہے۔ شباب کیرانوی نے بھی جلن کی ناکامی کے بعد کمر ہمت کس لی اور ایک کے بعد ایک فلم بنا کر کامیاب فلم سازوں کی صف میں شامل ہو گئے۔ اسی طرح دلجیت مرزا نے بھی اپنی پہلی ناکام فلم جلن کے بعد اپنا سفر جاری رکھا۔ طنز و مزاح کے حوالے سے ان کا ایک مخصوص انداز اور جداگانہ اسلوب تھا۔ وہ ترقی پسند اور روشن خیال ذہن کے مالک تھے۔ حقیقت پسندی کے قائل تھے۔ اگرچہ بطور کامیڈین وہ پسند کیے جا رہے تھے مگر انہوں نے کامیڈی اور اداکاری کو آگے بڑھنے کی راہ میں زیادہ موثر نہیں سمجھا اور یہ فیصلہ کیا کہ اگر اپنے مستقبل کو زیادہ مستحکم بنانا ہے تو اداکاری سے زیادہ ہدایت کاری کا سہارا لینا پڑے گا اور انہوں نے اپنے اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ڈی ایم فلمز (دلجیت مرزا فلمز) کی بنیاد رکھی اور اپنی پہلی فلم ''برسات'' کی ابتدا کر دی جس کے وہ فلم ساز و ہدایت کار کے علاوہ کہانی نویس بھی تھے۔ اس کے مکالمے انہوں نے اپنے یار ریاض شاہد سے لکھوائے۔ حسن لطیف کو موسیقی کی ذمہ داری سونپی اور تنویر نقوی سے اس کے گیت لکھوائے اداکاری کے شعبے میں نیلو، اعجاز، منیر سلطانہ، علاؤ الدین، اسلم پرویز کے علاوہ خود کو بھی شامل کیا۔ یہ فلم برسات 28 دسمبر 1962ء کو ریلیز ہوئی مگر باکس آفس پر خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ کر سکی۔ چونکہ وہ ایک حقیقت پسند شخص تھے اس لیے سوچا اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ یہ میری بطور فلم ساز و ہدایت کار پہلی فلم ہے۔ اس میں اگر میری توقعات پوری نہ ہو سکیں تو کوئی بات نہیں۔ اگلی فلموں میں اس کی کو پوری کرنے کی کوشش کروں گا۔

دلجیت مرزا کی فلم سازی اور ہدایت کاری پر مزید بات کرنے سے پہلے ان کی اداکاری کی داستان زیادہ ضروری ہے۔ لہٰذا اس کے بعد ہدایت کاری اور فلم سازی کی بات آگے بڑھاؤں گا۔

''جلن'' کے بعد دلجیت مرزا کا بطور اداکار آگے بڑھنے کا سفر جاری رہا۔ کامیڈین کی حیثیت سے انہیں فلموں میں کاسٹ کیا جاتا رہا۔ فلم ''انوکھی'' میں ایک مزاحیہ گیت بھی فلمایا گیا جو اس دور میں بہت مقبول ہوا۔ اس کے گلوکار احمد رشدی تھے اور بول تھے۔

ماری لیلیٰ نے ایسی کٹار
میاں مجنوں کو آیا بخار

زندگی نامہ

اصل نام: غلام حسین
فلمی نام: دلجیت مرزا
پیدائش: انبالہ (بھارت)
سن پیدائش: 1930ء
موت: ہوسٹن (امریکا)
تاریخ وفات: 2 فروری 2017ء
لواحقین: دو صاحبزادے، جن میں ایک امریکا میں مقیم ہے اور دوسرا لاہور کے قبرستان میں سو رہا ہے۔
پہلی فلم: (بطور اداکار) ''جلن'' (بطور ہدایت کار) ''برسات''
آخری فلم: (بطور ہدایت کار) ''رقعہ''
ہجرت: تقسیم ہند کے بعد وہ اپنے خاندان کے ساتھ ہجرت کر کے ملتان آ گئے۔ پھر فلموں میں اداکاری کی نیت سے لاہور آئے تو یہیں کے ہو رہے۔
فلمی کیریئر: بطور کامیڈین کیریئر کا آغاز کیا۔ پھر ہر طرح کی اداکاری کر کے ورسٹائل اداکار کا مرتبہ حاصل کیا۔ فلم سازی بھی کی اور ہدایت کاری بھی۔ اپنے لیے بھی فلمیں ڈائریکٹ کیں اور دوسروں کے لیے بھی۔

بیٹا! اور کر و پیار
چھوٹی بیگم، حاتم، داتا، ٹھنڈی سڑک، بڑا آدمی، دل ناداں (اس کے ہدایت کار نجم نقوی تھے اور اس فلم میں دلجیت مرزا نے مرکزی ولن کا کردار ادا کیا تھا۔ اداکار ایس گل ان کے ہمراہ دوسرے ولن تھے جب کہ اداکار کمال اس کے ہیرو تھے)، آنکھ کا نشہ، معصوم، نیا دور، جان بہار، آدمی (ہدایت کار لقمان کی اس معاشرتی فلم میں دلجیت مرزا نے آغا طالش کے ساتھ فراڈیے کا کردار ادا کیا تھا)، سہارا، تیرے بغیر، راز (ہمایوں مرزا کی اس جاسوسی فلم میں بھی دلجیت مرزا پر احمد رشدی کا یہ گیت پکچرائز کیا گیا تھا۔

چل نہ سکے گی 420
خطرے کی سن لو گھنٹی

للکار، نیند (حسن طارق کی بطور ہدایت کار پہلی فلم

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

تھیں اور اس میں دلجیت مرزا نے اداکار اسلم پرویز کے چالاک اور عیار منشی کا رول ادا کیا تھا)، جھومر، راہ گزر، یہ دنیا، نوکری، بھابی، ہمسفر، ڈاکو کی لڑکی، سنہرے سپنے، فرشتہ، زمین کا چاند، غالب، بارہ بجے، چیک بینڈ، اجنبی، سسرال (ریاض شاہد کی بطور ہدایت کار پہلی فلم، دلجیت مرزا نے ایک حجام کا کردار ادا کیا تھا)، اونچے محل، برسات میں خون کی پیاس، دھوپ چھاؤں، پیار نہ کرنا رانی، بیٹی، رواج، سرتاج، کوہ قاف، مجبور، انگارے (فرید احمد کی اس فلم میں دلجیت مرزا نے ولن کا کردار نبھایا تھا)، شہید (خلیل قیصر کی اس کلاسک فلم میں دلجیت مرزا نے اداکارہ حسنہ کے والد اور ایک غدار کا کردار کیا تھا)، وطن کے نام سے حسن طارق نے شہید کاری میک بنایا تھا جس میں دلجیت مرزا نورین تاجک کے باپ بنے تھے۔ امیر (نذر اسلام کی اس پلاٹینیم جوبلی فلم میں دلجیت مرزا ایک شوخ مزاج فوٹو گرافر کے کردار میں جلوہ گر ہوئے تھے)۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ متذکرہ بالا فلموں میں جلن کے بعد کی فلموں کے علاوہ بطور ہدایت کار دلجیت مرزا کی آخری فلم ''رقعہ'' کے بعد کی بھی فلمیں ہیں۔ رقعہ کے بعد انہوں نے اداکاری پر توجہ دینا شروع کردی تھی اور ہر طرح کی کردار نگاری شروع کرنے لگے تھے اور اس میں کامیاب بھی رہے تھے۔

ہماری فلم انڈسٹری کے ابتدائی دور میں جس طرح بہت سے لوگ تعلیم و تربیت سے نابلد ہوتے تھے اور فلم میں کسی سہارے یا سفارش کی بنیاد پر آجاتے تھے۔ اداکاری یا کسی فنی شعبہ سے منسلک ہوجاتے تھے۔ دلجیت مرزا کے ساتھ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ پڑھے لکھے تھے۔ ان کی سوچ اور فکر میں روشنی تھی۔ احساسات و جذبات میں روشن خیالی تھی۔ مقصدیت اور اثر انگیزی تھی جنہیں وہ فلموں کے توسط سے عوام تک پہنچانا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے ہدایت کاری کا ذریعہ منتخب کیا۔ انہیں اداکاری سے زیادہ فلموں کی ڈائریکشن اس کام کے لیے زیادہ کارآمد معلوم ہوا اور یقیناً یہ ان کا مستحسن فیصلہ تھا۔ اس میں وہ خاصے کامیاب رہے۔ تھوڑے عرصے میں انہوں نے بہت کام کیا۔ اردو فلمیں بھی ڈائریکٹ کیں اور پنجابی فلمیں بھی۔ اپنی ذاتی فلموں کی بھی ہدایت دیں اور دوسرے پروڈیوسرز کے لیے بھی فلمیں ڈائریکٹ کیں اور جب انہوں نے محسوس کیا کہ اب وہ تھک گئے ہیں اور اپنے مقاصد پر پورا نہیں اتر رہے ہیں تو انہوں نے ہدایت کاری سے کنارہ کشی اختیار کرلی اور دوبارہ اداکاری کر کے اپنے آپ کو مصروف رکھا۔

دلجیت مرزا کی پہلی ذاتی فلم بطور فلمساز، ہدایت کار برسات جس کا ذکر اوپر کرچکا ہوں۔ جو ان کی توقعات پر پوری نہ اتری۔ جبکہ وہ فلم اتنی بری بھی نہیں تھی برسات کا ایک گانا

زندگی مجبور ہے لاچار ہے
سانس بھی لینا یہاں دشوار ہے

بہت پسند کیا گیا۔ یہ گیت گلوکار سلیم رضا اور نور جہاں کی آوازوں میں الگ الگ ریکارڈ کیا گیا تھا اور علاؤ الدین اور نیلو پر اسے فلمایا گیا تھا۔

''برسات'' کے بعد دلجیت مرزا نے بطور فلم ساز و ہدایت کار دوسری اردو فلم ''رواج'' بنائی جو باکس آفس پر خاصی کامیاب رہی۔ مجموعی طور پر کراچی میں 36 ہفتے چلی اور ناقدین اور مبصرین کے علاوہ فلم بین طبقے نے بھی اپنی پسندیدگی کی سند عطا کی۔ ''رواج'' اپنی پُراثر کہانی، انتہائی جاندار حسین اور برجستہ مکالموں، دلکش موسیقی اور لاجواب اداکاری کی وجہ سے خاص و عام میں پسند کی گئی۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ آج کا نامور فنکار قوی اور پاکستانی فلموں کے معروف نغمہ نگار خواجہ پرویز نے اسی فلم سے اپنے فلمی کیریئر کا آغاز کیا تھا۔ خواجہ پرویز نے اس فلم میں ریاض شاہد کے مکالمے بھی لکھے تھے۔ ریاض شاہد کے ساتھ معاون کے طور پر کام کیا تھا۔ دلجیت مرزا نے ایک ڈاکٹر کے ملازم کا کردار بڑی خوب صورتی سے ادا کیا تھا جس کا تکیہ کلام۔

''قسم کھانے والے پر خدا کی لعنت، خدا کی قسم''

بہت مقبول ہوا تھا۔ ڈاکٹر کا کردار محمد علی نے کیا تھا۔ دلجیت مرزا کا یہ تکیہ کلام فلم کی نمائش کے بعد بہت مقبول ہوا تھا۔

رواج کی دیگر کاسٹ میں زیبا، یاسمین، اسلم پرویز، فریدہ، رضیہ، قوی، سلیم چشتی اور طالش قابلِ ذکر تھے۔ دیبا اور جعفری نے مہمان اداکاروں کی حیثیت سے کام کیا تھا۔ کہانی اور اسکرین پلے دلجیت مرزا نے خود لکھا تھا۔ نغمہ نگاروں میں قتیل شفائی، تنویر نقوی اور خواجہ پرویز شامل تھے۔ عکاسی مسعود بن اسلم نے کی تھی۔ اس کے معاون

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کے طور پر دلجیت مرزا کے بھانجے عاشق مرزا نے معاون کیمرامین کی خدمات انجام دی تھیں۔

''رواج'' کو اس بات کا بھی اعزاز حاصل ہے کہ یہ محمد علی اور زیبا کی بطور ہیرو ہیروئن پہلی فلم ہے۔ یہ فلم 26 مارچ 1965ء میں نمائش پذیر ہوئی تھی۔

دو اردو فلمیں بنانے کے بعد دلجیت مرزا نے پنجابی فلم بنانے کا عزم کیا کہ پاکستان میں اردو کے ساتھ پنجابی فلمیں بھی بنائی اور دیکھی جاتی ہیں۔ ان کی فلم ''جنابِ عالی'' تھی اور پھر اس کے بعد ان کی اگلی فلم ''راجا رانی'' تھی جو پنجابی زبان کے علاوہ اردو میں بھی پیش کی گئی تھی۔ یعنی ڈبل ورژن فلم تھی۔ اس فلم میں دلجیت مرزا نے ایک غریب بے کس اور مجبور باپ کا کردار ادا کیا تھا۔ سلونی ان کی بیٹی تھیں۔ یہ پنجابی فلم بزنس کے لحاظ سے فلاپ فلم ثابت ہوئی مگر دھن کے پکے دلجیت مرزا نے یہ نہیں سوچا کہ وہ پنجابی فلم کے لیے مس فٹ تھی۔ انہوں نے اگلی فلم بھی پنجابی زبان میں بنائی۔ یہ ''ٹھاہ'' تھی اس کے ایک گیت ''آ سینے نال لگ جا ٹھاہ کر کے'' بے حد مقبول ہوا۔ دیگر گانوں نے بھی دھوم مچا دی۔ باکس آفس پر اس فلم نے شاندار کامیابی حاصل کی۔ یہ دلجیت مرزا کی ذاتی فلم نہیں تھی۔ اس کے فلم ساز میاں جاوید تھے جس نے پنجاب کے علاوہ سندھ سرکٹ میں بھی خاطر خواہ کامیابی حاصل کی۔ یہ فلم 8 دسمبر 1972ء کو ریلیز ہوئی تھی۔

''ٹھاہ'' کی خوشگوار کامیابی سے متاثر ہو کر فلم ساز محمد اسلم نے بھی دلجیت مرزا کو دعوت دی کہ ان کے لیے بھی وہ ایک پنجابی فلم بنائے۔ لہٰذا دونوں کے اشتراک سے ''پہلا وار'' نامی پنجابی فلم بنائی گئی جو سلطان راہی کی اس لحاظ سے قابلِ ذکر فلم تھی کہ اس نے اپنے کردار میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے اپنا سر منڈوا دیا تھا۔ یہ فلم باکس آفس پر وہ کامیابی حاصل نہ کر سکی جو ٹھاہ نے حاصل کی تھی۔ اس فلم کی نمائش 28 اکتوبر 1973ء کو ہوئی تھی۔

راجا رانی، ٹھاہ اور پہلا وار تینوں فلموں کے موسیقار صفدر حسین تھے۔ ''پہلا وار'' کے بعد فلم ساز عطا محمد نے دلجیت مرزا سے پنجابی فلم ''خبردار'' بنوائی۔ اس فلم میں بھی دلجیت مرزا نے سلطان کو ''ٹھاہ'' کی طرح ہیرو کے رول میں پیش کیا جب کہ صفدر حسین سے موسیقی کمپوز کرائی۔ کامیابی کے لحاظ سے یہ فلم اوسط درجے کی رہی۔ خبردار 21 دسمبر 1973ء کو نمائش پذیر ہوئی۔

دلجیت مرزا کی کچھ فلموں کے گیتوں کی جھلکیاں

☆ دور دورہ کے گزرا نہیں ہوگا
ہمارا نہیں ہوگا تمہارا نہیں ہوگا
(فلم رواج۔ آواز مالا، بول خواجہ پرویز، موسیقی ماسٹر عنایت حسین)

☆ ایویں تھاں تھاں دل نہیں ہاری وا
(فلم جنابِ عالی، آواز مسعود رانا، بول خواجہ پرویز، موسیقی صفدر حسین)

☆ پہلی واری اج جناں انکھیاں نے تکیا
(فلم ٹھاہ، آواز غلام علی، بول وارث لدھیانوی، موسیقی صفدر حسین)

☆ نی چنے دیئے بن کلئے
تینوں میرے ویلے رب نے بنایا
(فلم پہلا وار، آواز غلام علی، بول وارث لدھیانوی، موسیقی صفدر حسین)

☆ وے توں نیڑے نیڑے دس ڈھولن
(فلم مرداں ہتھ میدان، آواز نور جہاں، بول وارث لدھیانوی، موسیقی صفدر حسین)

☆ شالا تیری خیر بجنا میں کردی سلام
(فلم خبردار، آواز نور جہاں، بول حزیں قادری، موسیقی صفدر حسین)

☆ جیہے لہور نہیں ویکھیا اوجمیا نہیں
(فلم فائٹ، آواز رجب علی، بول خواجہ پرویز، موسیقی صفدر حسین)

☆ پیراں دی پجیب کھل گئی ہائے ربا
(فلم وڈا خان، آواز نور جہاں، بول وارث لدھیانوی، موسیقی صفدر حسین)

☆ اکھاں اکھاں وچ کہانی اج بے کئی اے
(فلم رقعہ، آواز مسعود رانا، بول زاہد میر، موسیقی عباس صفدر)

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

دلجیت مرزا کی اگلی فلم ''مرداں جھ میدان'' تھی جو انہوں نے فلم ساز محمد سلیم کے لیے بنائی تھی۔ اس پنجابی فلم کے ہیرو لالہ سدھیر تھے اور موسیقار دلجیت مرزا کے پسندیدہ صفدر حسین، اس فلم نے بھی درمیانے درجے کا بزنس کیا۔

تین سال کے وقفے کے بعد 1976ء میں دلجیت مرزا نے جو فلم بنائی وہ ''واردات'' تھی اور پنجابی زبان میں تھی۔ یہ ان کی ذاتی فلم تھی۔ یہ فلم 4 جون 1976ء کو ریلیز ہوئی تھی۔ لالہ سدھیر اس فلم کے ہیرو تھے اور صفدر حسین موسیقار۔ اس فلم نے بھی اوسط درجے کا بزنس کیا۔

دلجیت مرزا نے اگلی فلم اردو زبان کی بنائی جس کا نام تھا ''دشمن کی تلاش'' اور اس کے فلم ساز تھے شاہ زمان اور یہ فلم سدھیر فلمز کے بینر تلے بنائی گئی تھی۔ پہلے اس فلم کا نام ''ببرک'' رکھا گیا تھا مگر نمائش سے پہلے ببرک کی بجائے ''دشمن کی تلاش'' کر دیا گیا۔ سدھیر نے اس فلم میں بڑی جاندار اداکاری کی تھی اور اس فلم سے بڑی توقعات وابستہ تھیں مگر اس فلم کی نمائش عیدالفطر کے موقع پر ہوئی تھی اور اس موقع پر ہدایت کار اقبال اختر کی اردو فلم ''اچھے میاں'' بھی ان کی فلم کے ساتھ ریلیز ہوئی تھی۔ ''اچھے میاں'' جس نے گولڈن جوبلی کی اس کے سامنے ''دشمن کی تلاش'' ٹھہر نہ سکی اور اچھی خاصی فلم مقابلہ بازی کی نذر ہو گئی۔ ''دشمن کی تلاش'' 12 نومبر 1978ء میں ریلیز ہوئی تھی۔ اس فلم کے موسیقار طافو تھے۔ کچھ لوگوں نے دلجیت مرزا سے کہا۔ ''اس فلم میں تم نے صفدر حسین کو موسیقار نہیں لیا۔ یہ انہی کی بددعاؤں کا اثر تھا کہ.....''

دلجیت مرزا مسکرا دیئے۔ ''ارے نہیں یار! وہ بڑے پیارے آدمی ہیں۔ اچھے موسیقار کے ساتھ ساتھ بہت اچھے انسان بھی ہیں۔ وہ کسی کو بددعا نہیں دے سکتے۔''

''پھر تم نے اس فلم میں ان کی جگہ طافو کو کیوں لیا؟''

''ارے یار! طافو کا انتخاب فلم ساز نے کیا تھا میں نے نہیں۔''

دلجیت مرزا کی اگلی فلم ''بدلہ'' تھی جو پنجابی زبان کی تھی اور اس کے فلم ساز چوہدری اسلم تھے۔ نجمہ، مصطفیٰ قریشی، آصف خان، چکوری اور ادیب کاسٹ میں شامل تھے۔ جب کہ دھنیں وجاہت عطرے نے کمپوز کی تھیں۔ یہ فلم کامیابی کے لحاظ سے نرم رہی تھی۔

اس فلم کے بعد دلجیت مرزا نے ''فائٹ'' پیش کی۔ یہ بھی پنجابی فلم تھی اور اس کے فلم ساز ریاض پرویز تھے۔ نشا، ممتاز خانم، شاہد، محبوب عالم کاسٹ میں شامل تھے۔ موسیقی صفدر حسین کی تھی۔ یہ فلم بھی قدرے نرم رہی۔

ایک بار پھر انہیں اپنی ذاتی فلم بنانے کا خیال آیا تو انہوں نے ڈی ایم فلمز کے بینر تلے پنجابی فلم ''وڈا خان'' شروع کی۔ ٹائیٹل رول محمد علی سے کروایا، دیگر فنکاروں میں سلطان راہی، مصطفیٰ قریشی اور رانی کو کلیدی کردار دیئے۔ موسیقی کی ذمہ داریاں صفدر حسین کو دیں۔ ان کی اس فلم کی نمائش 18 نومبر 1983ء کو ہوئی۔ بزنس کے لحاظ سے یہ فلم درمیانے درجے کی ثابت ہوئی۔

اس کے بعد ان کی فلم ''رقعہ'' تھی جو 22 جنوری 1993ء میں نمائش پذیر ہوئی۔ اس فلم میں انہوں نے اپنے صاحبزادے دلاور مرزا کو بطور ہیرو پیش کیا جب کہ صفدر حسین کے صاحبزادے عباس صفدر اس فلم کے موسیقار تھے۔ اس فلم کے فلم ساز حامد حسن تھے دیگر کاسٹ میں منزہ شیخ، افضال احمد، سلطان راہی اور ہمایوں قریشی شامل تھے۔ ''رقعہ'' بطور ہدایت کار دلجیت مرزا کی آخری فلم تھی جس نے تجارتی طور پر انہیں مایوس کیا تھا۔

اس کے بعد وہ صرف اداکاری کرتے رہے اور یہ اداکاری بھی محض کامیڈی نہیں تھی۔ ہر طرح کے کردار کر کے یہ ثابت کیا کہ وہ وراسٹائل اداکار ہیں۔ وہ ایک محنتی اور اپنے کام سے محبت کرنے والے فنکار تھے۔ انہوں نے جس لگن اور دلچسپی سے اپنی فلمیں بنائیں یا ان میں کام کیا اسی نیک نیتی کے ساتھ دوسروں کی فلمیں بھی ڈائریکٹ کیں اور ان میں اداکاری کی۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ فلم کی تکمیل میں کوتاہی نہیں کرنی چاہیے۔ جتنی جلد ممکن ہو سکے فلم مکمل کر لینی چاہیے۔ آپ نے دلجیت مرزا کی ڈائریکٹ کی ہوئی فلموں کی روداد پڑھتے ہوئے محسوس کیا ہوگا کہ وہ کس قدر تیز رفتاری کے ساتھ کام کر کے فلمیں مکمل کرتے تھے۔ جیسا پہلے عرض کر چکا ہوں کہ وہ روشن خیال اور حقیقت پسند فنکار تھے۔ اس لیے عام فلم والوں کی طرح ہیر پھیر کے چکر میں نہیں رہتے تھے۔ اپنا کام ہو یا دوسروں کا اس میں تساہل نہیں برتتے تھے۔ کوتاہی نہیں کرتے تھے۔ دیانت داری کے ساتھ ہر کام کرتے تھے۔

عام لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ فلم والے لوگ ان سے مختلف ہوتے ہیں جیسے وہ کسی اور دنیا کی مخلوق ہوں مگر ایسی

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

بات نہیں ہے۔ وہ آپ کے اور ہمارے جیسے ہی لوگ ہوتے ہیں۔ ہمارے جیسے طبقے سے ہی نکل کر فلم نگری آباد کرتے ہیں۔ ان کے دکھ سکھ بھی ہمارے ہی جیسے ہوتے ہیں۔ دلجیت مرزا بھی ہمارے جیسے ہی انسان تھے۔ انہوں نے اپنی آخری فلم ''رقعہ'' میں اپنے صاحبزادے کو یہ سوچ کر ہیرو بنایا تھا کہ ان کے بعد ان کی نسل کا کوئی بندہ فلم انڈسٹری کی خدمت کرے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے اپنے بیٹے دلاور مرزا کو خاص طور پر امریکا سے بلایا جو اپنے بڑے بھائی کے ساتھ وہاں مقیم تھا۔ وہ آیا۔ اس نے ان کی فلم ''رقعہ'' میں بطور ہیرو کام کیا اس نے اپنے کام سے ثابت کیا تھا کہ وہ بھی اپنے والد کی طرح محنت کرسکتا ہے۔ جس کام سے دلجیت مرزا مطمئن تھے اور ان کا خیال تھا کہ آگے چل کر وہ نمایاں کامیابی حاصل کرے گا مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اس فلم کی تکمیل کے بعد لاہور میں وہ اپنے گھر کی پلائی چھت پر بنی پانی کی ٹنکی کی صفائی کررہا تھا کہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور نیچے آگرا۔ چوٹ سر میں آئی تھی۔ ڈاکٹروں نے بہت کوشش کی مگر اسے بچا نہ سکے اور وہ اللہ کو پیارا ہوگیا۔

دلجیت مرزا کو جواں سال بیٹے کی بے وقت موت کا بے حد صدمہ ہوا۔

''ہائے! وہ تو اچھا خاصا اپنے بڑے بھائی کے پاس امریکا میں تھا۔'' وہ آنسوؤں کی جھڑی میں کہتے۔ ''کیا میں نے اسے یہاں اس لیے بلایا تھا کہ وہ یہاں آکر موت کو گلے لگالے۔''

ان کے گھر والے انہیں سمجھاتے، دلاسا دیتے۔

''آپ ایسا کیوں سوچتے ہیں؟ یہی مشیت ایزدی تھی۔ اس کی موت اسی طرح لکھی تھی۔ اس میں آپ کا کیا قصور؟ اس کی موت اسی طرح ہونی تھی۔ موت کو تو بس ایک بہانہ چاہیے۔ اسے لاہور ہی میں مدفون ہونا تھا۔ اس لیے اس کا لاہور آنا ہوا۔''

اپنے پیاروں کا غم برداشت کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ دلجیت مرزا کو بھی یہ دکھ، یہ صدمہ برداشت کرنا بہت بھاری تھا۔ لوگوں کے دم دلاسوں نے کوئی خاص اثر نہیں کیا۔ اس صدمے سے وہ بیمار پڑ گئے۔ علاج شروع ہوا تو یہ انکشاف ہوا کہ وہ آنتوں کے کینسر میں مبتلا ہیں۔ اس بات کی آگاہی پر پورے خاندان میں رنج و غم کی لہر دوڑ گئی۔ امریکا میں مقیم ان کے بڑے صاحبزادے کو یہ افسوس ناک خبر ملی تو اس نے بصد اصرار والد کو اپنے پاس ہوسٹن میں بلالیا اور ان کا علاج شروع کردیا کہ جلد صحت یاب ہوجائیں گے۔ مگر ڈیڑھ برس تک علاج کے باوجود ایسا نہ ہوا۔ بیٹے کا صدمہ اتنا کاری تھا کہ اس ناسور کو امریکی ڈاکٹرز بھی ختم نہ کرسکے اور وہ 2 فروری 2017ء کو اپنے سارے چاہنے والوں کو داغ مفارقت دے گئے۔ لوگوں کو ہنسانے والا اور خوشیوں کے گل بوٹے تقسیم کرنے والا سب کو اشکبار کرگیا۔

دلجیت مرزا کی مٹی وہیں ہوسٹن امریکا کی تھی اسی لیے وہیں وہ بروز جمعۃ المبارک 3 فروری 2017ء کو ہوسٹن کے مسلم قبرستان میں منوں مٹی اوڑھ کر ابدی نیند سو گئے۔

ان کا وہ بیٹا جس کے غم میں وہ جانبر نہ ہوسکے عرصے تک امریکا میں رہنے کے باوجود وہاں سپرد خاک نہ ہو سکا۔ کیونکہ اس کا خمیر تو لاہور کی مٹی سے بنا تھا۔ جہاں جس کی مٹی ہوتی ہے اس کی موت اسے وہیں لے جاکر دفن کردیتی ہے۔ یہ قدرت کا کھیل ہے۔ اس میں ہم انسانوں کا کوئی عمل دخل نہیں۔

☆☆☆

عجیب اتفاق ہے کہ گزرنے والا سال 2016ء کی دسمبر کی 12 تاریخ پاکستانی فلمی صنعت کو اس کے ایک بڑے اور نامور اداکار رتن کمار کی موت کی خبر سنا کر غمزدہ کر گیا اور آنے والے سال 2017ء کی 12 جنوری کو یہ دل خراش خبر سنا کر فلم انڈسٹری اور فلموں کے شائقین کو آبدیدہ کردیا کہ بے باک صحافی، کالم نگار، مینیجر رائٹر، شاعرہ، نغمہ نگار اور فلموں کی نامور اسکرپٹ رائٹر رخسانہ نور اس جہان فانی سے عالم جاودانی کوچ کرگئی ہیں۔ جانے والے برس نے شوبز کو اور بھی دکھ دیئے تھے۔ اپنے آخری مہینے میں بھی ایک کاری زخم لگانے سے نہیں چوکا۔ جب کہ نئے سال نے جس سے خوشی اور بہتری کی توقعات وابستہ ہوتی ہیں، اس نے بھی آتے ہی بچھو کی طرح ڈنک مار کر کسی رو رعایت سے کام نہیں لیا۔ ناقطہ سر بہ گریباں کہ اسے کیا کہیے۔

بچھو کے ڈنک کی طرح جس خبر نے بے آرام کیا وہ رخسانہ نور کے انتقال کی خبر ہے۔

رخسانہ نور کی وجہ شہرت صرف یہ نہیں تھی کہ وہ پاکستانی فلم انڈسٹری کے شومین اور منفرد و کامیاب فلموں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کے مصنف اور ہدایت کار کی شریک حیات تھیں اس شادی سے پہلے وہ رخسانہ نور نہیں، رخسانہ آرزو تھیں، اس وقت بھی اپنی نظم ونثر کی وجہ سے، ایک صحافی، ایک کالم نگار اور فیچر رائٹر کی حیثیت سے ادبی حلقوں میں خاصی مشہور اور مقبول تھیں۔

انہوں نے یہ شہرت، عزت اور مقبولیت اپنی خداداد صلاحیتوں کے بل بوتے پر حاصل کی تھی۔ سیالکوٹ کے ایک کشمیری باپردہ خاندان میں جنم لینے والی یہ لڑکی جس کا نام ان کے بزرگوں نے ثروت رکھا تھا۔ اس وقت کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ لڑکی ایک دن زبردست قلم کار کے روپ میں اپنی ذہنی اور فنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کر کے ادبی اور صحافتی دنیا میں دھوم مچائے گی۔ فلموں کی اسکرپٹ رائٹر بنے گی۔ کہانیاں، مکالمے اور اسکرین پلے تحریر کرے گی، دلوں کو چھو لینے والے نغمات تخلیق کرے گی اور شائقین فلم سے ہی نہیں، فلمی پنڈتوں سے بھی خراج تحسین حاصل کرے گی۔ قومی اور پرائیویٹ ایوارڈز حاصل کرے گی۔ وہ جو کہا ہے کسی شاعر نے

وقت کرتا ہے پرورش برسوں
حادثہ ایک دم نہیں ہوتا

جب وہ لڑکی ثروت سن شعور کو پہنچی تو اسے پڑھنے کے ساتھ ساتھ لکھنے کا بھی شوق ہوا۔ وہ چھوٹے چھوٹے کاغذوں پر ننھی منی کہانیاں لکھ کر اپنی سکھیوں کو سناتی۔

''کہانی تو بہت اچھی ہے مگر یہ تو بتاؤ تم نے کہاں سے نقل کی ہے؟''

''ایسا تھپڑ رسید کروں گی کہ.....''

''بتا دو نا، تم نے کس اخبار یا رسالے سے نقل کی ہے۔ سچ ہم کسی سے نہیں کہیں گے۔''

''ارے یار! میں نے کہیں سے نقل نہیں کی ہے خود لکھی ہے۔''

ثروت جب ذرا اور بڑی ہوئی اور اسکول میں پڑھنے لگی تو اکثر سوچتی میں بڑی ہو کر صحافت میں ایم اے کروں گی۔

پھر جب وہ ہائی اسکول کا امتحان پاس کر کے کالج گئی تو ایک دن اس نے گھر میں دھماکا کر دیا یہ کہہ کر کہ ''میں لاہور جاؤں گی۔ وہاں کے کالج اور یونیورسٹی میں پڑھوں گی۔''

''کیوں؟ یہاں سیالکوٹ میں اچھے تعلیمی ادارے نہیں کہ تم لاہور جاؤ گی؟''

''ہیں..... مگر لاہور کی بات کچھ اور ہے۔''

''لاہور میں کیا خاص بات ہے؟''

''لاہور..... لاہور ہے۔ وہاں جانے والوں کے بارے میں کہا جاتا ہے غربت میں آ کے چمکا گمنام تھا وطن میں۔''

''اے لڑکی! تیرے سر میں یہ کیا بھوت سوار ہو گیا ہے لاہور کا؟''

''آپ لوگ سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟ یہاں رہ کر کوئی ترقی نہیں کر سکتا۔ ہمارے علامہ اقبال بھی تو سیالکوٹی تھے۔ جب تک یہاں رہے بس عام سے شاعر تھے۔ لاہور گئے تو شاعرِ مشرق بن گئے۔''

''مگر.....!''

''صرف علامہ اقبال پر ہی کیا منحصر۔ ساحر لدھیانوی بھی لدھیانہ سے لاہور پہنچے تو ان کی صلاحیتیں کھل کر سامنے آئیں۔ احمد ندیم قاسمی بھی اپنے چھوٹے سے شہر سے لاہور آئے تو ادیب و شاعر کی حیثیت سے ادبی دنیا میں اپنے لیے ممتاز مقام بنایا۔ لاہور میں لوگ یوں ہی نہیں آتے۔ ذرے سے آفتاب بنتے آتے ہیں۔''

''چلو تمہاری بات تسلیم۔ مگر جن لوگوں کا تم نے نام لیا۔ وہ سب مرد تھے۔''

''تھے۔ میں کب کہہ رہی ہوں کہ وہ مرد نہیں تھے۔''

''ہمارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ نئی جگہ..... نئے شہر میں جا کر جو مسائل سامنے آتے ہیں ان سے مرد تو مقابلہ کر لیتے ہیں۔ تم لڑکی ہو۔''

گھر والوں کے بہت سمجھانے بجھانے پر وقتی طور پر تو ثروت چپکی بیٹھ گئی مگر لاہور کا بھوت اس کے سر سے نہیں اترا۔ کچھ دنوں کے بعد پھر ضد کرنے لگی کہ میں لاہور جاؤں گی۔ مجھے لاہور جانے دیں۔ یہاں سیالکوٹ میں رہ کر میں کچھ نہ کر سکوں گی۔ کچھ نہ بن سکوں گی۔

گھر میں سب کی لاڈلی تھی۔ اس لیے اس کی ساری ضدیں پوری کی جاتی تھیں..... مگر اس کی یہ ضد وہ کیسے پوری کرتے؟

''میں لاہور اکیلے بھی جا سکتی ہوں۔ رہ سکتی ہوں۔'' اس نے اپنی ماں کو سمجھاتے ہوئے کہا لیکن اگر میرے اکیلے جانے اور رہنے پر آپ لوگوں کو اعتراض ہے تو..... تو میرے ساتھ آپ بھی چلیے۔ سب نہیں تو کچھ لوگ

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

چلیے۔''

کچھ دنوں تک گھر والے سر جوڑ کر اس بارے میں سوچتے رہے۔ پھر انہیں ایسا ہی کرنا پڑا جیسا ثروت نے کہا تھا۔ کچھ لوگ اس کے ساتھ آئے۔ ایک کرائے کا مکان لیا اور ثروت کی لاہور آنے کی ضد پوری ہوگئی۔

اگر عزم مصمم ہو تو راستے کی ساری رکاوٹیں دور ہو جاتی ہیں۔ لاہور آنے کے بعد ثروت نے پنجاب یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ نیا شہر، نیا ماحول تھا مگر خوش قسمتی سے اسے اچھے ساتھی اچھے دوست ملے۔ توقیر ناصر اور حفیظ طاہر اس کے کلاس فیلو تھے۔

حسن طارق کی فلم ''بیگم جان'' کے لیے ان دونوں نے اس کی مدد اور رہنمائی کی اور کسی مرحلے میں بھی اسے بے آسرا اور تنہا ہونے کا موقع نہیں دیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد توقیر ناصر نے بھی اداکاری کا شعبہ اپنایا اور بہت نام کمایا۔ حفیظ طاہر نے پی ٹی وی کے پروڈیوسر کی حیثیت سے بڑی شہرت حاصل کی۔ ان دونوں نے بھی صحافت میں ماسٹر کی ڈگری حاصل کی تھی۔ ان دونوں کی رہنمائی میں سیالکوٹی منڈی نے بہت فائدہ اٹھایا۔ اسے آئندہ کے لائحہ عمل اختیار کرنے میں ان دونوں کی رہنمائی بہت کام آئی۔

یونیورسٹی سے صحافت میں ایم اے کرنے کے بعد اس نے عبدالقادر حسن کے جریدے ''افریشا'' میں لکھنے کا آغاز کیا۔ افریشا کے بعد کئی اور جریدوں میں بھی لکھتی رہیں۔ یہ بات بتانے کی ہے کہ یونیورسٹی کے زمانے ہی سے انہوں نے رخسانہ کے نام سے اپنی شناخت بنانا شروع کردی تھی۔ پھر یوں ہوا کہ حلقہ ارباب ذوق کی نشستوں میں بھی شرکت کرنے لگیں اور اپنی غزلیں اور نظمیں تنقیدی نشستوں میں نقد ونظر کے لیے پیش کرنے لگیں۔ اس دوران مقبول شاعر و ادیب اعزاز احمد آذر (اللہ انہیں غریق رحمت کرے) نے رخسانہ کو مشورہ دیا کہ آپ ایک شاعرہ ہیں۔ اس لیے دیگر شاعروں کی طرح آپ کو بھی ایک تخلص رکھنا چاہیے۔ صرف رخسانہ کچھ اچھا نہیں لگتا۔ لہٰذا نوخیز شاعرہ رخسانہ نے اعزاز احمد آذر کے کہنے پر اپنے نام کے ساتھ آرزو کا اضافہ کردیا۔

دوسری جگہوں سے لاہور آنے والوں کو یونہی سرفرازی اور ناموری حاصل نہیں ہوتی۔ نئے شہر اور نئے ماحول میں ایڈجسٹ ہونے میں بڑی جدوجہد کرنی پڑتی

رخسانہ نور کی جیون کہانی ایک نظر میں

اصل نام: ثروت

قلمی نام: رخسانہ آرزو

شادی کے بعد: رخسانہ نور

ولادت: سیالکوٹ

سن پیدائش: 1959ء

تعلیم: ایم اے صحافت، پنجابی فلموں پر تھیسس لکھا۔

پیشہ: صحافت۔ فلموں کے لیے کہانیاں، مکالمے، اسکرین پلے اور نغمہ نگاری۔ یونیورسٹی میں تدریس۔

فلمی نغموں کی تعداد: 69

شعری مجموعہ: الہام، اشاعت 1977ء۔ اس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔

آپ پیار دل میں جگا، اشاعت 2015ء، فلمی اور غیر فلمی نغمات پر مشتمل مجموعہ انتقال سے چند ماہ قبل ان کے گیتوں کی گورمکھی، ہندی اور اردو زبان پر کتاب شائع ہوئی۔

اعزازات: سنگم، ہوائیں، چوڑیاں، مہندی والے ہتھ پر بہترین کہانی نویس اور بہترین نغمہ نگار کے نگار اور قومی ایوارڈز ملے۔

شادی: سید نور سے شادی کے بعد صحافت چھوڑ دی۔ فلموں کے لیے لکھتی رہیں اور گھریلو ذمہ داری نبھانے لگیں۔

وفات: 12 جنوری 2017ء۔ کینسر کے مرض میں مبتلا تھیں۔ موت کے وقت عمر 58 سال تھی۔

☆☆☆

رخسانہ نور نے جن اخبارات و جرائد میں لکھا

''افریشیا'' عبدالقادر حسن کا جریدہ۔ ماہنامہ ''سورج'' لاہور۔ ''جلوہ'' حمید اختر کا جریدہ۔ روزنامہ ''جنگ'' لاہور۔ ''مسکراہٹ'' طفیل اختر کا رسالہ۔ ''دھنک'' سرور سکھیرا کا منفرد جریدہ۔ ان سب میں انہوں نے فیچر بھی لکھے اور انٹرویوز بھی کیے۔ کالم بھی تحریر کیے۔ جب کہ روزنامہ ''جنگ'' میں خواتین کا میگزین بھی ترتیب دیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ہے۔ دکھ تکلیف بھی برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ تب کہیں جا کر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوتے ہیں۔ رخسانہ آرزو کو بھی ان حالات سے گزرنا پڑا۔ ہر طرح کے واقعات و حالات کا سامنا کرنا پڑا مگر ان سب باتوں کے باوجود انہوں نے ہمت اور حوصلے سے کام لیا۔ کبھی بھی اپنے آپ کو تنہا اور مجبور محسوس نہیں کیا۔ صحافت کا پیشہ اختیار کرنے اور صحافی بننے کا جو خواب انہوں نے دیکھا تھا۔ اس کے لیے اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ جہاں بھی بہتر موقع ملا وہاں اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ لاہور سے جب سرور سکھیرا نے ''دھنک'' کے نام سے ایک جریدہ نکالا جو اپنے رنگ ڈھنگ اور اسلوب نگارش کے طور پر عام ڈگر سے ذرا ہٹ کر تھا جس نے اپنے منفرد، تیز تند اور کاٹ دار لب ولہجہ کی وجہ سے جلد ہی ادبی اور فلمی دنیا میں ہلچل مچا دی۔ رخسانہ آرزو نے بھی سرور سکھیرا کے زیر تربیت اپنی صحافتی صلاحیتوں کو اس نئے رنگ میں رنگنے کا عزم کیا اور اس میگزین میں لکھنا شروع کر دیا۔ جس میں آج کے بہت سے بڑے بڑے نامور صحافی بھی اس کی طرح اپنی نو آموزی کے دنوں میں ''دھنک'' کے قلم کار تھے۔ جن میں حسن نثار، طفیل اختر، ندیم سیلمی اور توقیر ناصر کے علاوہ بھی کئی اہلِ قلم شامل تھے۔ ان بڑے لوگوں کی محبت اور تربیت نے رخسانہ آرزو کی تحریروں میں ایسے رنگ بھرے کہ وہ بھی دھنک کے ان قلم کاروں کی صف میں شامل ہو گئی جن کی تیز اور کاٹ دار تحریروں کی وجہ سے قارئین کی بڑی تعداد اس میگزین کے گرویدہ ہو گئے اور یہ سب سے زیادہ بکنے والا جریدہ ثابت ہوا۔

سرور سکھیرا نے جب دھنک سے بہت کما لیا تو وہ سنگیتا کے عشق میں مبتلا ہو گئے اور اس سے ایک فلم ''لال آندھی'' بنوائی۔ یہ فلم تو کسی نہ کسی طرح بن گئی مگر دھنک کا دیوالیہ نکل گیا اور یہ اچھا خاصا چلتا ہوا پرچہ بند ہو گیا۔

دھنک کے بند ہونے پر اس کے سارے لکھنے والے تتر بتر ہو گئے۔ رخسانہ آرزو نے بھی اپنی بقاء کے لیے نیس پاک کے پبلی کیشن ڈیپارٹمنٹ میں ملازمت کر لی مگر یہ ان کی منزل نہیں تھی۔

اسی دوران ان کی ایک سہیلی نے ان سے پوچھا۔

''آج کل کہاں ہو؟ کیا کر رہی ہو؟''

''نیس پاک کے پبلی کیشن ڈیپارٹمنٹ میں بس اپنے آپ کو مصروف رکھا ہوا ہے۔''

''کراچی کا جنگ اخبار اب لاہور سے بھی نکل رہا ہے۔'' سہیلی بولی۔ ''تم وہاں جا کر کام کرنے کی کوشش کرو۔''

''یار! اخبار تو بہت اچھا ہے۔'' رخسانہ بولیں۔ ''مگر میں نے سنا ہے اس میں بڑے بڑے اور توپ قسم کے صحافیوں کی ہی انٹری ممکن ہے۔ جب کہ میں ٹھہری.....''

''اب تم ایسی بھی گئی گزری نہیں۔ وہاں جاؤ اور قسمت آزماؤ۔''

سہیلی کے مفت مگر مفید مشورے پر عمل کرتے ہوئے رخسانہ آرزو جنگ لاہور کے دفتر پہنچ گئیں۔ وہاں کا تقریباً سارا ہی عملہ لاہور کا تھا اور لاہور کے صحافیوں اور ادیبوں کے نام اور کام سے واقف تھا۔ رخسانہ آرزو بھی ان کے لیے نئی نہیں تھیں۔ سرور سکھیرا کے دھنک کی وجہ سے وہ بھی بے باک صحافیوں کی صف میں شمار کی جانے لگی تھیں۔ وہاں انہیں ان کی سوچ سے بڑھ کر پذیرائی ملی۔

''ٹھیک ہے آپ ہمارے اخبار کے لیے لکھیں۔''

اور انہیں میگزین سیکشن کے لیے بطور فیچر رائٹر ملازمت مل گئی۔ انہوں نے اللہ کا شکر ادا کیا اور پھر اپنی سہیلی کو دل ہی دل میں تھینک یو کہا کہ تمہارا مفت مشورہ میرے لیے بڑا قیمتی ثابت ہوا۔

رخسانہ آرزو نے فیچر، انٹرویوز اور مضامین لکھنے شروع کیے تو پڑھنے والوں نے انہیں بہت پسند کیا۔ پسندیدگی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کے لکھے ہوئے مضامین معاشرے کے پسے ہوئے لوگوں کے بارے میں بڑے کھلے ہوئے انداز میں ہوتے تھے۔ عالمانہ اور ڈھکا چھپا انداز انہیں پسند تھا نہ وہ اس پر عمل کرتی تھیں۔ ان کی تحریریں تجربے کا نچوڑ ہوتی تھیں اور یہ سب کچھ انہوں نے دھنک کے دور میں سیکھا تھا۔

پھر کرنا خدا کا یہ ہوا کہ ایک دن مفرد رائٹر اور ڈائریکٹر سید نور کے بارے میں کچھ ایسا شائع ہو گیا جس کی تردید کے لیے سید نور کو جنگ کے دفتر آنا پڑا۔ واضح رہے کہ سید نور نے بھی اپنی ابتدا صحافت سے کی تھی۔ اس لیے وہ میڈیا کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ وہ اپنے نام اور مقام کے تحفظ کے لیے بہت محتاط رویہ اختیار کرتے ہیں۔ اپنے بارے میں شائع ہونے والی بات کی تردید کے لیے جنگ کے دفتر گئے تو انہیں رخسانہ آرزو سے ملوا دیا گیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

سید نور کوئی معمولی آدمی نہیں تھے۔ انہوں نے اپنی صفائی میں بہت بھرپور کردار ادا کیا۔ دوسری طرف رخسانہ آرزو بھی ایک ذمہ دار اور تجربہ کار صحافی تھیں۔ وہ محض ہوا میں تیر چلانے کی قائل نہیں تھیں جو کچھ لکھتی تھیں اچھی طرح چھان پھٹک کر تحقیق و تصدیق کے بعد لکھتی تھیں۔

دونوں کے درمیان بہت طویل مکالمے ہوئے۔ سید نور کو کئی دنوں تک رخسانہ آرزو کو قائل کرنے کے لیے جنگ کے دفتر جانا پڑا۔ اس دوران انہیں یہ تسلیم کرنا پڑا کہ یہ لڑکی بھی معمولی صلاحیت کی نہیں۔ عام صحافیوں کی طرح اسے قائل کرنا آسان نہیں۔

دوسری طرف رخسانہ آرزو بھی سید نور سے بہت متاثر ہوئی تھیں۔ ان کی گفتگو، اپنے دلائل پر بحث اور لب و لہجہ انہیں بہت اچھا لگا۔ عام فلم والوں کی طرح ان میں ذرا بھی عامیانہ رنگ نہیں تھا۔ ایک پڑھے لکھے اور مہذب شخص کی خوبیاں نظر آئیں۔

یہ دونوں طرف کی وہ باتیں تھیں جن کی وجہ سے دونوں غیر محسوس طور پر ایک دوسرے کے قریب سے قریب تر ہوتے گئے۔ یوں کہنا چاہیے کہ ان میں دوستی ہو گئی۔ چند ملاقاتوں کے بعد یہ دوستی محبت کا روپ دھار گئی اور پھر ان کی محبت نے انگڑائی لی تو دونوں دو بولوں کے بندھن میں بندھ کر ایک دوسرے کے جیون ساتھی بن گئے۔ رخسانہ آرزو، رخسانہ نور بن گئیں۔ مگر ٹھہریے۔ یہ مرحلہ اتنی آسانی سے طے نہیں ہوا۔ دو دلوں کو ملانے میں دوسروں کا بھی کردار ہوتا ہے۔ ماں باپ، عزیز و اقارب اور بڑوں کی رکاوٹیں بھی درپیش ہوتی ہیں۔ جن سے ان دو پریمیوں کو بھی گزرنا پڑا۔

جب شادی کا مرحلہ آیا تو رخسانہ کو گھر میں بتانا پڑا کہ میں شادی کرنا چاہتی ہوں۔

''ہم بھی یہی چاہتے ہیں کہ بس اب تم شادی کرلو۔ جیسے ہی ہمیں کوئی اچھا لڑکا نظر آیا......''

''میں نے لڑکا پسند کرلیا ہے۔'' رخسانہ نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔

''اچھا۔'' انداز بہت ناپسندیدہ تھا۔ ''کون ہے یہ لڑکا جو تم نے پسند کرلیا ہے؟''

''سید نور۔''

''نام تو کچھ سنا سنا سا ہے۔''

''رائٹر اور ڈائریکٹر سید نور۔''

رخسانہ نور کے موسیقار

وہ موسیقار جن کی ترتیب دی ہوئی دھنوں پر رخسانہ نور نے لفظوں کے موتی بکھیرے۔

امجد بوبی، واجد علی ناشاد، ایم ارشد، ایم اشرف، ارشد محمود، ذوالفقار علی، نجات علی، زین، وزیر افضل۔

امجد بوبی کی فلمیں:

سنگم، گھونگھٹ میں چاند، کالی بارش، راجو بن گیا جنٹل مین، دیواریں، گھونگھٹ، ہوائیں۔

واجد علی ناشاد کی فلمیں: عقابوں کا نشیمن۔

ایم ارشد کی فلمیں: ہوائیں۔

ایم اشرف کی فلمیں: ناگ اور ناگن۔ ارشد محمود کی فلمیں: دوپٹا جل رہا ہے۔

ذوالفقار علی کی فلمیں: چوڑیاں، مہندی والے ہتھ، مجاجن، دل کچ دا کھڑونا، ٹکا متھے دا، سپنے اپنے اپنے۔

نجات علی کی فلمیں: جھومر چور۔

زین نے ایک البم کے لیے موسیقی ترتیب دی۔

بہترین کارکردگی پر ملنے والے ایوارڈز

فلم ''ہوائیں'': بہترین کہانی نویس کا نگار ایوارڈ۔ فلم ''چوڑیاں'' بہترین کہانی نویس کا نگار ایوارڈ۔ فلم ''مہندی والے ہتھ'' بہترین کہانی نویس کا نگار ایوارڈ۔ فلم ''سنگم'' بہترین کہانی نویس کا قومی ایوارڈ۔ فلم ''سنگم'' بہترین نغمہ نگار کا قومی ایوارڈ۔ فلم ''چوڑیاں'' بہترین کہانی نویس کا قومی ایوارڈ۔

''یعنی...... وہ کوئی فلم والا ہے؟''

''جی ہاں۔''

''نہ بھئی! یہ لڑکا تو ہمیں بالکل پسند نہیں آیا۔''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ فلمی لوگوں کے مستقبل کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔ دو فلمیں فلاپ ہو جاتی ہیں تو سڑک پر آجاتے ہیں۔ ایک دو نہیں۔ ہم نے بہت سے فلمی طرم خاں کا بہت برا حشر دیکھا ہے۔''

رخسانہ پڑھی لکھی اور باشعور لڑکی تھیں۔ انہیں اپنے بڑوں اور بزرگوں کے اعتراض میں وزن محسوس ہوا۔ ہر ماں باپ کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنی بیٹی کا ہاتھ ایسے شخص کے ہاتھ میں دیں جو زندگی بھر اسے سکھی رکھے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

سید نور سے ان کی ملاقات ہوئی تو انہوں نے پوچھا۔ ''کیا ہوا، تم نے گھر والوں سے شادی کے بارے میں بات کی؟''

''کی تھی۔''

''کیا کہا انہوں نے؟''

''یہ شادی نہیں ہوسکتی۔''

''ارے! تم یہ کیا کہہ رہی ہو؟ مذاق تو نہیں کر رہی ہو؟''

''نہیں میں بالکل سنجیدہ ہوں۔ انہوں نے یہی فیصلہ صادر فرمایا ہے۔''

''انکار کی کوئی وجہ بھی بتائی انہوں نے؟''

''ہاں بتائی۔'' اور انہوں نے اپنی فیملی کا وہ خدشہ ظاہر کردیا جو فلم والوں کے بارے میں تھا۔ سید نور کو بھی ان کا یہ اعتراض مناسب معلوم ہوا۔ اچھے لوگ ہمیشہ اپنی بیٹیوں کا بر تلاش کرتے وقت اچھے لوگوں کا انتخاب کرتے ہیں ایسے لوگ جن کا مستقبل محفوظ ہو۔

اس سوچ کے تناظر میں سید نور نے اقبال ٹاؤن میں رخسانہ کے لیے ایک کوٹھی بنوائی تاکہ اس کے بزرگوں کو کم از کم اس بات کا احساس ہو کہ سید نور کوئی گیا گزرا آدمی نہیں۔ ان کی بیٹی کو ہمیشہ شاد اور آباد رکھے گا۔

اس طرح شادی کا مرحلہ آیا۔ رخسانہ آرزو کی آرزو پوری ہوئی اور وہ رخسانہ نور بن گئیں۔ شادی خانہ آبادی کے بعد یہ تبدیلی آئی کہ وہ صحافتی سرگرمیوں میں پہلے کی طرح سرگرم نہیں رہیں۔ ان کی زیادہ تر توجہ گھر اور گھر داری پر مرکوز ہوگئی۔ شوہر کی خدمت کے بعد بچوں کی پرورش و پرداخت پر توجہ دینے لگیں۔ لکھنے لکھانے کی لت لکھنے والوں سے نہیں چھوٹتی۔ ان پر بھی یہ مصرعہ صادق آتا ہے کہ

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

انہوں نے فلم نگاری شروع کردی۔ فلموں کا اسکرپٹ لکھنا شروع کردیا۔ فلموں کے لیے کہانیاں، مکالمے اور اسکرین پلے کے علاوہ فلموں کے لیے نغمہ نگاری بھی کرنے لگیں۔

رخسانہ نور نے اپنے شریکِ حیات سید نور کی بیشتر فلموں کے لیے نغمہ نگاری کی۔ کئی فلموں کی کہانیاں اور مکالمے بھی لکھے۔ دوسرے فلم ساز اداروں کی چند فلموں کے لیے گیت بھی لکھے۔

ادبی کلام کے نمونے

چبھن نہیں ہے مگر اضطراب کافی ہے
ہماری آنکھ کو تیرا ہی خواب کافی ہے
وہ چٹنا رہتا ہے کلیاں نہ جانے کیوں دن بھر
مرے چمن کو فقط اک گلاب کافی ہے
میں اس کی یادوں کو اوڑھوں کہ پھینک دوں باہر
خیال یہ ہے کہ میرا جواب کافی ہے
کبھی تو آنکھ تمہاری بھی زیرِ آب آئے
مجھے تو ریت کا دریا سراب کافی ہے

☆☆

خواب بن کر بکھر گیا چہرہ
جو نظر سے اتر گیا چہرہ
چھین کر سانس لے گیا میری
رنگ پی کر نکھر گیا چہرہ
بیتی شب میں جو آنکھ سے ٹپکا
کیسا گیلا سا کر گیا چہرہ
میں رِدا میں چھپا رہی تھی مگر
زخم ایسے تھے بھر گیا یہ چہرہ
خالی ہاتھوں کو تکتی رہتی تھی
یوں ہوا پھر اتر گیا چہرہ

ٹی وی کے پروگراموں میں بھی شرکت کی۔ پی ٹی وی کے کئی پروگرام بطور اسکرپٹ رائٹر کیے۔ اپنے وقت کی منفرد اور نامور گلوکارہ زبیدہ خانم کی وفات کے فوراً بعد پی ٹی وی کی جانب سے زبیدہ خانم کی فلمی خدمات پر ڈاکومنٹری بنائی اسی طرح ورسٹائل اداکار افضال احمد کی فلمی زندگی پر بھی پی ٹی وی کے لیے ڈاکومنٹری بنائی گئی تو دونوں میاں بیوی نے بہت تعاون کیا۔

علی سفیان آفاقی صاحب کی یاد میں الحمرا میں تعزیتی جلسہ کا اہتمام کیا گیا تو اس وقت وہ بیمار تھیں۔ اس کے باوجود انہوں نے شرکت کی۔ اس تعزیتی ریفرنس میں فلم انڈسٹری سے وابستہ افراد کی تعداد کم دیکھ کر وہ افسردہ ہوئیں کہ اتنی بڑی فلمی شخصیت کے لیے اتنے کم لوگ کیوں آئے؟

انہیں بتایا گیا۔ ''دراصل انتظامیہ کے افراد نے کم وقت میں یہ تقریب ترتیب دی۔ اس وجہ سے فلمی صنعت سے وابستہ افراد کو صحیح معنوں میں مدعو نہ کرسکے۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''اوہ! یہ بات ہے۔'' کہہ کر وہ کسی قدر مطمئن ہوئیں۔

شادی کے کچھ عرصے کے بعد انہوں نے پنجابی فلموں پر تھیسس لکھنا شروع کیا تھا اس سلسلے میں وہ سینئر صحافیوں سے مل کر پنجابی فلموں کے مواد اور تصاویر جمع کرتی رہتی تھیں۔

صحافت سے عملی طور پر رخسانہ نور کا رشتہ برقرار نہیں رہا تھا مگر سینئر صحافیوں سے وہ ہمیشہ رابطے میں رہتی تھیں اور بوقت ضرورت ان سے مشاورت بھی کرتی تھیں۔ ساجد یزدانی، ندیم سلیمی، طفیل اختر اور فیاض احمد اشعر سے ان کے گہرے مراسم تھے۔ فیصل اختر کے جریدہ ''مسکراہٹ'' میں وہ 25 سال تک اعزازی ایڈیٹر کے طور پر خدمات انجام دیتی رہیں۔

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ رخسانہ نور نے یونیورسٹی میں تدریس کی خدمات بھی سرانجام دیں۔ پنجاب یونیورسٹی میں ایک عرصہ تک ماس کمیونی کیشنز کا سبجیکٹ پڑھاتی رہیں۔

رخسانہ نور کی وجہ شہرت ان کی صحافیانہ خدمات ہیں۔ انہوں نے جب تک صحافت کی، تمام صحافتی تقاضوں پر پوری اتریں۔ جہاں وہ حقائق کو اس کے حقیقی روپ میں پیش کرتی تھیں وہیں وہ زبان و بیان پر بھی خصوصی توجہ دیتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ کالم نگاری میں انہیں دیگر خواتین کالم نگاروں کے مقابلے میں زیادہ سراہا گیا۔

نثر نگاری میں انہوں نے اپنی منفرد اسلوب نگارش کا ثبوت دیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ابتداء سے انتہا تک جس جریدے یا اخبار سے منسلک رہیں اور جو کچھ بھی تحریر کیا ان کا صحافتی معیار قابلِ ستائش رہا۔ پھر جب فلموں کے لیے لکھنا شروع کیا تو وہاں بھی ان کے معیار پر آنچ نہیں آئی۔

رخسانہ نور ایک اچھی نثر نگار کے ساتھ ساتھ ایک اچھی نظم نگار بھی تھیں۔ شاعرات میں اپنی ایک الگ پہچان اور شناخت رکھتی تھیں۔ باضابطہ صاحبہ دیوان شاعرہ تھیں۔ ان کے دو شعری مجموعے ان کی زندگی میں شائع ہو چکے تھے۔

ان کا پہلا مجموعۂ کلام ''الہام'' تھا جو 1977ء میں پرائم پبلی کیشنز کے زیر اہتمام شائع ہوا تھا اور شائقین ادب میں بے حد مقبول ہوا تھا۔ اس مقبولیت کے پیشِ نظر اس کے اگلے ایڈیشن مختلف اداروں نے شائع کیے جب کہ ان

رخسانہ نور کی فلمی شاعری

☆ آ پیار دل میں جگا
آ دھڑکنوں میں سما
تجھ کو قسم میری جاناں
آ کے نہ پھر دور جانا
(فلم سنگم، آواز یں حمیرا چنا، وارث بیگ)

☆ آ جا میں تیوں پیار کراں
میں جندڑی شار کراں
(فلم مہندی والے ہتھ، آواز عذرا جہاں، ذوالفقار علی)

☆ نیڑے آ آ ظالما دے
میں ٹھرگی آں میں مرگئی آں
(فلم چوڑیاں، آواز سائرہ نسیم، ذوالفقار علی)

☆ جا اڑ جالے جا چھٹی
میرے ڈھولے دی دے کبوترا
(فلم مہندی والے ہتھ، آواز سائرہ نسیم)

☆ دل دیاں لگیاں نوں کون جاندا
میں جاندی یا میرا رب جاندا
(فلم مجاجن، آواز عذرا جہاں، ذوالفقار علی)

☆ پلکاں دا چنا وجا کے
تیرے نال محبتاں پا کے
(فلم مہندی والے ہتھ، آواز عذرا جہاں، ذوالفقار علی)

☆ دل کچ دا کھڈونا
(فلم دل کچ دا کھڈونا، آواز عذرا جہاں)

☆ سرمئی بادلوں کے پیچھے چھپ گیا کیوں روٹھ کر
آ لپٹ جا مجھ سے میری قسمت کے تارے ٹوٹ کر
(فلم سنگم، آواز وارث بیگ)

☆ کیوں چپ ہو، کیوں ہو کھوئے کھوئے
کیوں روٹھے ہو کیوں ہو روئے روئے
(فلم سنگم۔ آواز حمیرا چنا)

☆ دیکھ کے تجھ کو دل میرا دھڑکا
آ گلے لگ جا شعلہ بھڑکا
(فلم سنگم، آواز وارث بیگ)

☆ دل توڑ کے نہ جا مجھے چھوڑ کے نہ جا
میرے رم جھم آنسو دیکھ لے
کھ موڑ کے نہ جا
(فلم سنگم، آواز سائرہ نسیم)

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کے فلمی اور غیر فلمی گیتوں کا مجموعہ ''آ پیار دل میں جگا'' 2015ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ان کی وفات سے چند ماہ قبل ان کے گیتوں کی اردو، ہندی اور گورمکھی زبانوں میں بھی کتاب شائع ہوئی تھی۔

بطور شاعرہ انہوں نے اپنا ایک ممتاز مقام تو حاصل کرلیا تھا مگر انہیں عوامی مقبولیت فلموں کی نغمہ نگاری سے حاصل ہوئی۔ وہ غالباً واحد خاتون نغمہ نگار تھیں جنہوں نے برصغیر کی فلموں کے تناظر میں یہ اعزاز حاصل کیا۔ بطور خاتون نغمہ نگار کے انہوں نے ایک اندازے کے مطابق کوئی 20 فلموں کے لیے گیت لکھے۔ جن میں بیشتر مقبول بھی ہوئے۔ فلمی شاعری کا ایک مشکل مرحلہ یہ ہوتا ہے کہ فلمی شاعر کو موسیقار کے ترتیب دیئے ہوئے دھنوں پر شاعری کرنی پڑتی ہے۔ دھنوں کو سمجھنا اور ان میں لفظوں کو سمونا کوئی آسان کام نہیں ہوتا لیکن رخسانہ نور اس آزمائش میں پوری اترتی تھیں اور یہ کام بے حد مہارت کے ساتھ کرتی تھیں۔ انہی خوبیوں کی وجہ سے وہ بحیثیت نغمہ نگار کامیاب رہیں۔ انہیں بطور نغمہ نویس نگار ایوارڈز سے بھی نوازا گیا۔ ''مہندی والے ہتھ'' کے لیے انہیں نگار ایوارڈ ملا جب کہ سنگم کے گیت پر قومی ایوارڈ ملا۔

عام طور پر فلموں کے لیے ایک سے زیادہ نغمہ نگاروں کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔ اس تناظر میں اگر رخسانہ نور کی گیت نگاری کا جائزہ لیا جائے تو وہ کچھ یوں ہو گا فلم سنگم کے 8 گیت، عقابوں کا نشیمن کے لیے دو گیت، دیواریں کے لیے 4 گانے، راجو بن گیا جنٹل مین کے لیے 4 گیت، گھونگھٹ کے لیے 2 گیت، ہوائیں کے لیے 2 گانے، دوپٹا جل رہا ہے کے لیے 2 نغمے، سپنے اپنے کے لیے 2 گیت، ناگ اور ناگن کے لیے 4 گانے، جھومر چوک کے لیے 2 گیت، مہندی والے ہتھ کے لیے 4 گیت، چوڑیاں کے لیے 4 گیت، مجاجن کے لیے 2 گیت، جگنی کے لیے ایک گیت، دل کچ دا کھڈونا کے لیے 3 گیت، نکا متھے دا کے لیے 5 گیت، اجنبی کے لیے ایک گیت۔ ان فلموں کے علاوہ یہ فلمیں جو ریلیز نہ ہو سکیں۔ کالی بارش 3. گیت، گھونگھٹ میں چاند کے لیے 4 گیت، دل دریا کے لیے 6 گیت۔ جب کہ ایک البم کے لیے 3 گیت اور لاہور ٹی وی کے لیے ایک گیت۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کہ نغمہ نگاری کے ساتھ ساتھ نثر نگاری میں بھی رخسانہ نور ممتاز مقام رکھتی تھیں۔

اس لحاظ سے فلموں میں بھی ان کی کارکردگی قابلِ ذکر ہے۔ انہوں نے فلموں کے لیے کہانیاں، مکالمے اور منظر نامے بھی لکھے اور انہیں خاطر خواہ پذیرائی بھی ملی۔ ان کی اس خوبی کو دیکھتے ہوئے ان کے شریکِ حیات سید نور نے انہیں اپنی فلموں کی کہانیاں اور مکالمے لکھنے کا بھی موقع دیا۔ ان فلموں میں ہوائیں، سنگم، دیوانے تیرے پیار کے، زیور، دیواریں، چوڑیاں، مہندی والے ہتھ، دوپٹا جل رہا ہے، جنگل کوئین، دل دیوانہ ہے، باغی لڑکی، مجاجن اور جھومر قابلِ ذکر ہیں۔

جس طرح رخسانہ نور نے دیگر فلم سازاداروں کے لیے کچھ گیت لکھے اس طرح سید نور کے علاوہ کچھ فلم سازوں کے لیے نثر شعبوں میں بھی خدمات انجام دیں۔

رخسانہ نور کی فلمی شاعری

☆ ساتھی میرے تیرے بنا تھے خواب سونے میرے
آجا بسالیں اک دل کا نگر
جس میں کریں سارا جیون بسر
ساتھی میرے ساتھی میرے
(فلم سنگم، آواز وارث بیگ)

☆ تو نے چھوا مجھ کو اچھا لگا
اب مجھ کو دلہن بنا دو پیا
(فلم عقابوں کا نشیمن۔ آواز مہناز)

☆ ہونٹوں نے تیرے نام میرا لیا
قابو میں نہ رہا ہائے میرا جیا
(فلم دیواریں، آواز وارث بیگ)

☆ پیاری ماں دعا کرو میں جلد بڑا ہو جاؤں
دیس کا ذرہ ذرہ اپنے ہاتھوں سے چمکاؤں
(فلم ہوائیں، آواز شازیہ منظور)

☆ کھلے آسمان کے نیچے
آگے اور نہ پیچھے
دیوانگی میری مجھے ہر پل
تیری اور کھینچے
(فلم دیواریں، آواز سائرہ نسیم)

☆ عشق میں جینا عشق میں مرنا
کام یہی بس آتا ہے
(فلم ناگ اور ناگن، آواز امیر علی ناشاد، سائرہ نسیم)

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

English

اُبٹن ٹرمیرک کریم

خوبصورتی کی ابتداء
اُبٹن سے!

انگلش اُبٹن ٹرمیرک کریم چہرے اور بدن کے لئے ایک منفرد کریم ہے جو قدرتی جڑی بوٹیوں، اُبٹن، صندل اور ہلدی سے تیار کی گئی ہے۔ یہ چہرے کو کیل، مہاسوں، پھائیوں اور داغ دھبوں سے محفوظ رکھتی ہے۔ اس کے باقاعدہ استعمال سے جلد بے داغ اور رنگت گوری اور نکھری ہو جاتی ہے۔ انگلش اُبٹن ٹرمیرک کریم پورے بدن پر استعمال کرنے سے جلد ریشم کی طرح نرم و ملائم ہو جاتی ہے۔ بدن میں خوشگوار مہک اور تر و تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ بہترین نتائج کے لئے صبح اور رات کو سونے سے پہلے استعمال کریں۔

A Quality Product of
Sarwana & Sohzsi

SnScares @SnScare

WWW.PAKSOCIETY.COM

http://paksociety.com

پاک سوسائٹی پر مُوجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

Downloaded From Paksociety.com

ان میں جمشید نقوی مرحوم کی فلم ''ناگ اور ناگن'' اس لحاظ سے خصوصیت کی حامل ہے کہ اس کا مکمل اسکرپٹ انہوں نے لکھا۔ کہانی، مکالمے اور اسکرین پلے سب رخسانہ نور کے زورِ قلم کا نتیجہ تھے۔ ان کے لکھے کو خاطر خواہ پذیرائی بھی حاصل ہوتی رہی۔ انہیں کئی فلموں کی کہانی نویسی پر ایوارڈ بھی ملے۔ فلم ہوائیں، مہندی والے ہتھ، چوڑیاں کی کہانیوں پر انہیں بہترین کہانی نویس کا نگار ایوارڈ ملا۔ جب کہ سنگم اور چوڑیاں کے لیے انہیں بہترین کہانی نویس کے قومی ایوارڈز سے بھی نوازا گیا۔

رخسانہ نور اپنی متعدد خوبیوں کی وجہ سے اپنے حلقۂ احباب میں بہت مقبول تھیں۔ ان کی سادہ لوحی، درویشانہ انداز، حساس طبیعت اور محبتیں نچھاور کرنے والی شخصیت کی وجہ سے وہ ہر دلعزیز تھیں۔

رخسانہ نور ایک طویل عرصے تک اپنی گھریلو زندگی سے بے حد مطمئن رہیں۔ وہ دنیا میں خود کو خوش قسمت ترین عورت تصور کرتی تھیں۔ انہیں اس بات کی بھی خوشی حاصل تھی کہ انہوں نے جسے چاہا اسے حاصل بھی کرلیا۔ ان کا جیون ساتھی ایک مقبول اور معروف فلم رائٹر اور ڈائریکٹر تھا۔ اس بات پر بھی ان کی خوشی کی انتہا نہیں تھی۔

پھر ان کی زندگی میں ایک ایسا انقلاب آیا جس نے انہیں ہلا کر رکھ دیا۔ ان کی ساری خوشیوں کو غموں، آہوں اور کراہوں میں بدل دیا۔ ان کے اطمینان اور سکون کے شیش محل کو مسمار کردیا، کرچی کرچی کردیا۔ وہ جسے ٹوٹ کر چاہ رہی تھیں اس نے ان کے اعتماد کو زبردست دھچکا پہنچایا تھا۔ انہیں معلوم ہوا کہ ان کے محبوب شوہر سید نور نے اپنی فلموں کی فیورٹ ہیروئن صائمہ سے خفیہ طور پر شادی کرلی ہے۔ ایسی خفیہ شادیاں زیادہ دنوں تک چھپی نہیں رہتیں۔ آخر ایک دن اس کا بھانڈا پھوٹ جاتا ہے۔ یہ خبر بھی منظر عام پر آگئی اور سید نور کو اس کا باضابطہ اعلان کرنا پڑا کہ صائمہ، صائمہ نور بن گئی ہیں۔

رخسانہ صحافی تھیں۔ بہت دنوں تک انہوں نے فلم والوں کو قریب سے دیکھا تھا پھر جب ایک فلم والے کی بیوی بنیں تب اور قریب سے فلم والوں کی اچھائیوں اور برائیوں کو دیکھتی رہی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ فلم نگری کے مردوں کی یہ پرانی ریت ہے کہ وہ فلموں میں کام کرنے والی عورتوں کے ساتھ خوش گوار لمحات گزارنا اپنا بنیادی حق تصور کرتے ہیں۔ خاص طور پر فلم ساز ہدایت کار، عکاس اور ہیرو کی تفریح طبع کا فلمی خواتین بہترین ذریعہ ہوتی ہیں۔ سید نور کے بارے میں بھی وہ زیادہ خوش فہم نہیں تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ فلم سازی اور ہدایت کاری کی تھکن اتارنے کے لیے وہ ایسی تفریح کا سہارا لے لیتے ہوں گے مگر انہیں اس بات کا ہرگز یقین نہیں تھا کہ وہ اپنی فلموں کی ہیروئن کو اپنی حقیقی ہیروئن بنالیں گے۔ یہ دکھ، یہ غم، یہ صدمہ وہ برداشت نہ کرسکیں۔ اس سانحے نے ناسور کی صورت میں ان کو زندہ درگور کردیا۔ امریکا چلی گئیں کہ ان کے رونے اور تڑپنے کو ان کے چاہنے والے نہ دیکھ سکیں۔ جب انہیں یقین ہوگیا کہ یہ ناسور، یہ کینسر انہیں موت کی دہلیز کے قریب لے آیا ہے تو وہ واپس لاہور آگئیں کہ اپنی مٹی ہی میں سپرد خاک ہوسکیں۔ یہاں ان کے چاہنے والے بے شمار ہیں۔ وہ سید نور سے شادی کے بعد جگت بھابی بن گئی تھیں۔ انہوں نے سوچا اپنا آخری سفر ان کے کندھوں پر سوار ہوکر کرنا چاہیے اور ایسا ہی ہوا۔

رخسانہ نور کے انتقال پُرملال کے بعد اخبارات اور جرائد میں جو تعزیتی مضامین شائع ہوئے ان میں رخسانہ نور کی موت کا سبب کینسر بتایا گیا مگر کسی نے اس کینسر کا سبب نہیں بتایا کہ کہیں سید نور کی دل شکنی نہ ہو۔ سید نور بہت بڑے آدمی ہیں۔ بہت بڑے فلم میکر ہیں۔ اخبارات و جرائد کو مرنے والوں سے زیادہ ایسے زندہ آدمی کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس لیے بھلا وہ کینسر کا راز کیوں فاش کرتے؟

رخصت ہونے والے سال 2016ء کے دسمبر کی 12 تاریخ کو جہاں رتن کمار کی موت کی افسوس ناک خبر آئی تھی وہیں نئے سال کی جنوری کی 12 تاریخ کو رخسانہ نور کے اس عالم فانی سے کوچ کی خبر آئی۔

رخسانہ نور کو سید نور کے آبائی قبرستان شاہ ابوالمعالی میں سپرد خاک کیا گیا۔ ان کی نماز جنازہ دو بار پڑھائی گئی۔ ایک نماز جنازہ ان کی رہائش گاہ ڈرائی کون ویلی میں ادا کی گئی۔ دوسری تدفین کے موقع پر مسجد شاہ ابوالمعالی فلیمنگ روڈ پر پڑھائی گئی۔ فلمی صنعت سے وابستہ افراد کی کثیر تعداد نے شرکت کی جن میں فلم انڈسٹری کی تمام اہم شخصیتیں شامل تھیں۔ اللہ انہیں غریق رحمت کرے۔ انہوں نے اپنے قلم سے جو نور پھیلایا ہے اس نور میں ان کا کام اور نام ہمیشہ روشن رہے گا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

دانا و بینا

سلیم فرخی

جب دشمن سامنے ہو اور اعضائے رئیسہ کام نہ کررہے ہوں تو پھر عقل ہی سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ اس نے بھی عقل سے کام لیا۔

مغرب سے درآمد ایک دلچسپ واقعہ

شام کا دھندلکا پھیل چکا تھا اور ہر چیز تاریکی میں مدغم ہوتی جارہی تھی۔ وہ کلف اور اس کی بیوی ڈولیٹی اپنے ڈیلاس، ٹیکساس والے مکان میں بیٹھے شام کو اترتا دیکھ رہے تھے۔ کلف نے حال ہی میں غدہ قدامیہ (پروسٹیٹ گلینڈ) کا آپریشن کرایا تھا اس لیے وہ ان دنوں گھر پر آرام کررہا تھا۔ اس کی بیوی کا کہنا تھا کہ اب اسے آرام ہی کرنا چاہیے، وہ کہاں تک کام کرے گا۔

وہ دو دن پہلے آپریشن کرا کے آیا تھا اور خود کو آرام

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

Downloaded From Paksociety.com

دینے کے لیے پاجامہ پہنے بیٹھا تھا۔اس کا خیال تھا کہ ہندوستانیوں نے ڈھیلا ڈھالا لباس ایجاد کر کے بنی نوع انسان کو کافی آرام پہنچایا ہے۔

شام ہوتے ہی ہوا میں خنکی پیدا ہوگئی اور آنگن میں ایستادہ درختوں پر بیٹھے پرندے چہچہانے لگے تو فضا میں نغمگی سی گھل گئی۔

یہ 8 مارچ 2015 کی شام تھی اور 70 سالہ کلف اس سے قطعی بے خبر تھا کہ ان کی نگرانی کی جارہی ہے۔ سامنے والے ڈرائنگ روم کے دروازے پر سیاہ بالوں والا شخص کھڑا تھا جس کے چہرے پر زخموں کے نشانات تھے اور جسم پر ملگجے سے کپڑے۔صورت اور وضع قطع سے وہ جرائم پیشہ لگتا تھا۔ڈولیٹی کی خواب گاہ سے وہ ان لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔خواب گاہ سے آگے باورچی خانہ تھا اور اس کے بعد صحن جہاں وہ دونوں بیٹھے تھے۔ڈولیٹی کے جسم پر پیلا لباس تھا جب کہ کلف ڈھیلا ڈھالا لباس پہنے تھا۔

اس دو منزلہ عمارت کا جائزہ لینے کے بعد وہ اندر چلا گیا۔صحن میں بھی ایک جالی والا دروازہ تھا۔وہ اسے کھولتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔چونکہ ٹیلی ویژن آن تھا اس لیے اجنبی کے قدموں کی چاپ ان میں سے کسی نے نہیں سنی۔وہ داڑھی والا بے ڈھنگا اور بدوضع شخص ان کے درمیان آکر کھڑا ہوگیا۔وہ فوری طور پر اس کی طرف متوجہ نہ ہوسکے۔کلف نے محسوس کیا کہ کرسی کے ہتھوں پر اس کی گرفت سخت ہوتی جا رہی ہے۔اس نے ریموٹ سے ٹیلی ویژن کی آواز دھیمی کر دی اور پوچھا۔''تم یہاں کیا کرنے آئے ہو؟''

''اگر تم مجھ سے تعاون کرو گے تو تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔مجھے تمہارا سونا اور رقم چاہیے۔'' پھر اس نے ٹیلی ویژن اسکرین پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی اور پوچھا۔''تم کیا دیکھ رہے تھے؟''

''یہ بلی گراہم کا شو ہے۔'' ڈولیٹی نے اسے بتایا۔

''اس کا مطلب ہے کہ تم عیسائی ہو؟'' اس نے ان لوگوں کو مسکرا کر دیکھا اور بولا''میں بھی عیسائی ہوں۔''

کلف نے اندازہ لگایا کہ وہ ایک خراب کردار کا چلتا پرزہ ہے جو اپنی مطلب براری کے لیے کسی چیز کی پروا نہیں کرتا۔ریوالور والے نے ان کی طرف مڑتے ہوئے کہا''مجھے اپنے وکیل کے لیے پانچ ہزار ڈالر کی ضرورت ہے۔میں جیل سے باہر رہنا چاہتا ہوں۔حقیقت میں اس وقت میں پے رول پر ہوں۔میں نے ایک ٹک شاپ کو لوٹا ہے اور اب میں کوئی ہوشیار وکیل کرنا چاہتا ہوں۔''

کلف نے سوچا کہ وہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے نہیں جانا چاہتا۔اور چہرے کو چھپائے بغیر ان کے سامنے آگیا تھا۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسے اپنے اوپر اعتماد تھا اور وہ آخر میں ان لوگوں کو ہلاک بھی کرسکتا تھا۔

اجنبی کے پہلے پاجامہ پہنے کلف جس کے سر کے بال خاکستری تھے اور مونچھیں سفید،اس کا خیال تھا کہ اس سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔مگر کلف ریسلر تھا اور ایک عمدہ باکسر۔وہ اب بھی ہفتے میں تین دن پریکٹس کیا کرتا تھا۔اس کے علاوہ اسے وحشی اور بے ڈھنگے افراد سے نمٹنے کی تربیت دی گئی تھی۔اس نے 37 سال ایک کمرشل فضائی کمپنی میں پائلٹ کی حیثیت سے کام کیا تھا۔وہ فلائٹ اسٹینڈرڈ کا ڈائرکٹر تھا۔یہ اس کے فرائض منصبی میں شامل تھا کہ غلط بیانی اور دروغ گوئی کرنے والوں سے سچ اگلوائے۔کلف نے سوچا کہ اگر وہ اس کی تعریف و توصیف کر ڈالے تو ممکن ہے کہ اسے جھانسے میں لے لے۔

''یہ تمہاری گردن میں کیا پڑا ہوا ہے؟'' اجنبی نے اچانک ڈولیٹی سے پوچھا۔

''سونے کا نیکلس ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''میں اسے لینا چاہوں گا۔'' اس نے کہا۔''اور یہ تمہاری انگلی میں کیا ہے؟ شادی کی انگوٹھی؟''

''مگر میں اسے اتارتی نہیں ہوں۔''

''چلو کوئی بات نہیں۔میں تمہاری شادی کی انگوٹھی نہیں لوں گا۔''

رقم اور سونا لینے کے لیے ہمیں جان سے مارنے کی دھمکی دے رہا ہے۔مگر شادی کی انگوٹھی نہیں لے گا۔یہ اس کی متضاد خیالی ہے۔کلف نے سوچا۔اسے اپنی پچاس سالہ بیوی کی سلامتی کی طرف سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ان کی ازدواجی زندگی مستحکم بنیادوں پر قائم تھی۔وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی لفنگا آکر اس کی بیوی کو نقصان پہنچادے۔

''تمہیں جو لینا ہے وہ لے لو اور یہاں سے چلتے بنو۔'' کلف نے کہا۔''ہم کسی کو نہیں بتائیں گے کہ تم یہاں آئے تھے۔''

اجنبی نے بے پروائی سے اپنے شانے جھٹک دیے۔

کلف کو اس کی بائیں کلائی پر پھول پتیاں گدی ہوئی نظر آئیں۔اس کے رخساروں پر بھی نشانات تھے۔ان نشانات سے اس اجنبی کی شخصیت کا پتا چلتا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اجنبی اس کی طرف بڑھا اور اس نے مطالبہ کیا۔
''تمہارا کیش کہاں ہے؟''
''میرے پرس میں۔'' کلف نے اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ اس نے سوچا کہ اگر میں اس سے نزدیک ہو جاؤں تو اس پر چھلانگ لگا سکتا ہوں۔
''اپنی جگہ پر بیٹھ جاؤ۔'' اجنبی غرایا۔ ''میں جانتا ہوں کہ تم کیا سوچ رہے ہو۔ میں ایک شخص کو ہلاک کر چکا ہوں۔ تم پر گولی چلانا میرے لیے کوئی دشوار نہیں ہوگا۔''
''او کے، او کے۔ میں کوئی احمقانہ بات نہیں سوچ رہا ہوں۔'' ''تم نے ہی تو کہا تھا کہ رقم چاہیے۔ وہ اس پرس میں رکھی ہے جو ٹیلی وژن پر رکھا ہے۔''
اجنبی نے پرس اٹھا کر کلف کی طرف اچھال دیا۔ کلف نے اس میں سے دو ہزار ڈالر نکالے اور کافی کی میز پر رکھ دیے۔
''مجھے یہ سب کرتے ہوئے اچھا نہیں لگ رہا ہے۔'' لٹیرے نے کہا۔ ''اس لیے کہ تم شریف لوگ ہو۔''
''میں جانتا ہوں کہ تم اس وقت مصیبت کا شکار ہو۔ اس ریوالور کو اپنی جیب میں رکھ لو۔ میں تمہارے وکیل کو رقم دے دوں گا۔ میں کوشش کروں گا کہ تمہیں کوئی ملازمت بھی مل جائے۔''
''کیا تم ایسا کر سکتے ہو؟''
''ہاں، یقیناً۔''
''ہمیں تمہاری فکر ہے۔ اتنی کم عمری میں تم ایک غلط راہ پر چل پڑے۔'' ڈولیٹی نے کہا۔ کلف سے شادی ہونے کے بعد اس کی تین لڑکیاں ہوئی تھیں۔ اپنی بیماری کی وجہ سے کلف اب اسٹیٹ ایجنسی کا کام کرتا تھا اور ہلکی پھلکی ورزش۔
''تم نے اپنی زندگی برباد کر لی ہے۔''
''تم لوگ اتنے شائستہ اور مہذب ہو کہ تمہیں لوٹنے کو دل نہیں چاہتا۔'' اس نے کہا اور سارا سونا بیگ میں ڈال دیا۔ پھر چند سیکنڈوں کے بعد اس کا ارادہ تبدیل ہو گیا۔ اس نے سونا اٹھا کر پتلون کی جیب میں رکھ لیا۔
''مجھے تمہارے ریوالور اور اسلحہ چاہیے۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارے پاس اسلحہ ہوگا۔ تم مجھے نکال کر دے دو۔ ورنہ اگر مجھے تلاش کرنا پڑا تو میں تمہاری بیوی کو گولی مار دوں گا۔''
اس لٹیرے کو کیسے معلوم ہو گیا کہ اس کے پاس اسلحہ ہے۔ مگر یہ حقیقت تھی کہ کلف کے پاس مختلف ریوالور

جڑواں مقدر والیاں

اکثر دیکھا جاتا ہے کہ جڑواں بچے شکل و صورت، قد کاٹھ اور شخصیت میں ایک دوسرے سے کافی مشابہہ ہوتے ہیں لیکن یہ دلچسپ کہانی برطانیہ میں پیدا ہونے والی دو ایسی جڑواں بہنوں کی ہے جن کی نا صرف شکل بلکہ تقدیر بھی کافی ملتی جلتی ہے۔ 35 سالہ سارہ فائڈلر اور ہیدر رچرڈسن کا رنگ و روپ ایک جیسا ہے۔ دونوں بہنوں کی تعلیم بھی ایک جیسی ہے اور دونوں ایک ہی جگہ کام کرتی ہیں۔ دونوں بہنیں شادی کے بعد خوش حال زندگی گزار رہی ہیں۔ ان کی زندگی کی اس ملتی جلتی کہانی میں ایک حیرت انگیز بات یہ ہوئی کہ انہیں ایک ہی دن حاملہ ہونے کا علم ہوا اور دونوں نے یہ خوش خبری ایک ہی دن ایک دوسرے کو سنائی۔ اس کہانی میں ٹوئسٹ اس وقت آیا جب جڑواں بہنوں کے ڈاکٹرز نے انہیں بچے کی ولادت کے لیے دو مختلف تاریخیں دیں لیکن قدرت نے اس ڈبل کہانی میں ایک اور خوشگوار واقعہ کا اضافہ کر دیا ان دونوں جڑواں بہنوں نے ایک ہی دن دو مختلف اسپتالوں میں اپنے بچوں کو بھی جنم دیا۔

مرسلہ: نوشین ملک، کراچی

مریم زمانی

نورالدین جہانگیر کی ماں راجا بہارا مل کچھواہہ کی بیٹی اور راجا بھگوان داس کی بہن تھی۔ تاریخی کتب اور تذکروں میں اس کا نام مریم زمانی ملتا ہے مگر یہ اس کا اصل نام نہیں بلکہ لقب تھا۔ جہانگیر کی ماں مریم زمانی جب تک زندہ رہی جہانگیر کے شہزادوں کا بھی نکاح اس کے محل میں ہوتا رہا۔ جہانگیر کی ماں مریم زمانی کا انتقال جہانگیر کے اٹھارویں سال جلوس میں ہوا۔ جہانگیر اس کا ذکر اپنی تزک میں یوں کرتا ہے کہ ''دریں والا از آگرہ خبر رسید کہ حضرت مریم الزمانی بقضائے ایزد سبحانہ بخلوت سرائے جاودانی شافتند، امید کہ اللہ تعالیٰ را غریق بحر رحمت خویش گرداناد۔''
(تزک جہانگیری)

مرسلہ: اشفاق حسین، گجرات

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

تھے۔ایک شاٹ گن اوپری خواب گاہ میں۔ اعشاریہ 357 کا میگنم ریوالور جو اس کی خواب گاہ کی سائڈ میز کی دراز میں رکھا تھا۔اعشاریہ 22 کا کیلیبر ریوالور جو نچلے ہال کی الماری میں تھا۔

''اب ہم اوپری منزل کی طرف چلیں گے تاکہ میں تم لوگوں کے زیورات اور نقدی لوٹ سکوں۔''لٹیرے نے اپنا ریوالور لہرایا اور انہیں آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔''تم آگے چلو۔''اس نے کلف سے کہا۔

کلف نے محسوس کیا کہ اس کی بیوی ڈولیٹی خوف زدہ ہے۔اس کا چہرہ دھلے ہوئے کپڑے کی طرح سے سفید تھا۔لیکن وہ لٹیرے کی ہدایت کے مطابق سارا کام کر رہی تھی۔تاکہ ٹھنڈے دماغ کے ساتھ اس پر قابو پایا جاسکے۔

''کوئی ہوشیاری دکھانے کی کوشش نہ کرنا ورنہ میں تمہاری بیوی کا بھیجا اڑادوں گا۔''لٹیرا کرخت لہجے میں بولا۔

جب وہ زینے کے قریب پہنچے تو کلف کے ذہن میں ایک منصوبہ پرورش پانے لگا۔اس نے سوچا کہ اگر وہ زینے کے پاس پہنچ کر ایک طرف ہٹ جائے جیسے ڈولیٹی اور لٹیرے کو راستہ دینا چاہتا ہے۔لامحالہ لٹیرا نزدیک آجائے گا۔چنانچہ کلف اس کے ریوالور پر جھپٹ پڑے گا۔ممکن ہے ریوالور چل جائے اور اسے گولی لگ جائے۔اس اثنا میں ڈولیٹی کو فرار ہونے کا موقع مل جائے گا۔وہ پولیس کے ایمرجنسی نمبروں پر فون کرانہیں اطلاع دے سکتی ہے۔میں مرجاؤں گا تو کیا ہوا۔بیوی تو بچ جائے گی۔

''ڈولیٹی آگے جاؤ۔''کلف نے رسانیت سے کہا۔

''تم کتے کے بچے۔ایسی کوئی حرکت نہ کرو کہ تمہاری بیوی کی جان چلی جائے۔''وہ اوپر پہنچے تو لٹیرے نے کلف کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔''تمہارا ریوالور کہاں ہے؟''

''یہ ایک الماری میں رکھا ہے۔''کلف نے کہا اور ریوالور نکال کر اسے دکھایا۔

''ہاں،اسے میز پر رکھ دو۔''لٹیرے نے کہا۔

''یہ شاٹ گن ہے۔''کلف نے معصومیت سے کہا۔اور اسے میز پر نہیں رکھا۔وہ چاہتا تھا کہ موقع مل جانے پر وہ اس شاٹ گن کو استعمال کرسکے گا۔

''مجھے شاٹ گن نہیں چاہیے۔''لٹیرا بولا''تم نے اسے جہاں سے نکالا ہے وہیں رکھ دو۔''

کلف نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔پھر یہ سوچ کر کہ اگر وہ اپنی شاٹ گن کو استعمال کرنا چاہتا ہے تو اسے زیادہ دور نہیں رہنا چاہیے۔اس نے اپنا پیٹ تھام لیا اور گلوگیر آواز میں بولا۔''میرے پیٹ میں درد ہو رہا ہے میں بیٹھنا چاہتا ہوں۔''وہ بستر کی طرف چلا گیا۔ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ گرنے والا ہو۔''مجھے سرطان ہے۔''

کلف خود کو کمزور محسوس کر رہا تھا،لیکن اسے یقین تھا کہ اب لٹیرے کے انداز میں پہلے جیسی سختی نہیں رہے گی۔''اگر تمہیں سرطان ہے تو تمہیں مارکر میں غلطی کروں گا۔تم تو کبھی بھی اور کسی وقت بھی موت کی نیند سو سکتے ہو۔''

پھر اس نے کہا۔''تمہاری بڑی خواب گاہ کہاں ہے جہاں تم نے اپنے ریوالور چھپائے ہوئے ہیں۔''

کلف اسے خواب گاہ تک لے گیا۔''اس الماری میں ہے۔اگر تم کہو تو میں اسے نکال کر دوں؟''

''اس کی ضرورت نہیں۔اپنی جگہ سے نہ ہلو۔میں تم سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں اگر تم نے کوئی چالبازی دکھائی تو تمہاری بیوی سلامت نہیں رہے گی۔''اس نے غصیلے لہجے میں کہا پھر الماری کی طرف بڑھا اور۔۔۔اعشاریہ 357 میگنم کا ریوالور نکال لیا۔ریوالور کے چیمبر میں پانچ گولیاں بھری ہوئی تھیں۔اس نے اپنا ریوالور جیب میں رکھ لیا۔

خوف کی ایک لہر کلف کے جسم میں دوڑنے لگی۔اب لٹیرے کے پاس پہلے سے زیادہ طاقت ور ریوالور تھا جس کی ایک گولی کھا کر ڈولیٹی جانبر نہیں ہوسکتی ہے۔

''اس کمرے میں کوئی اور نقصان پہنچانے والی چیز تو نہیں ہے؟''لٹیرے نے پوچھا۔

جب کلف نے نفی میں سر ہلایا تو لٹیرے نے کہا۔''تو پھر ہمیں نیچے چلنا چاہیے۔''اس نے الماری سے ڈولیٹی کی ایک سنہری زنجیر اٹھا کر جیب میں رکھ لی۔ڈولیٹی مزید خوف زدہ ہوگئی۔اس لیے نہیں کہ اب لٹیرے کے ہاتھ میں ایک خوفناک ریوالور تھا،بلکہ لٹیرے کا انداز جارحانہ ہوتا جارہا تھا۔

جب وہ نیچے جارہے تھے تو بھاری اور بڑے ریوالور کی نال لٹیرے نے ڈولیٹی کی گردن پر رکھی ہوئی تھی۔نیچے پہنچتے ہی لٹیرے نے اعشاریہ 22 کا ریوالور الماری سے نکال لیا۔پھر سارے ریوالور کھانے کی میز پر رکھ دیے۔اس نے ان دونوں کو کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔اس کے بعد اس نے اعشاریہ 357 کی نال کلف کے سینے کی طرف کرتے ہوئے کہا۔''معاف کرنا تمہیں ہلاک کرنا میرے لیے ضروری ہوگیا ہے۔اس لیے کہ تم مجھے شناخت کرلو گے۔میں دوبارہ جیل نہیں جانا چاہتا۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ڈولیٹی نے مایوسی سے ایک گہرا سانس لیا۔ یہ ان کے بچوں کے لیے برا ہوگا۔ مگر زندہ رہنا ہے تو دونوں ساتھ زندہ رہیں گے۔ ورنہ ایک ساتھ مر جائیں گے۔

''ذرا ایک منٹ کے لیے ٹھہرو۔'' کلف نے ملتجیانہ لہجے میں کہا۔ ''اگر تم مجھے اس ریوالور سے گولی مارو گے تو اس پورے بلاک میں رہنے والے افراد جان لیں گے کہ یہاں کوئی واردات ہوئی ہے وہ اس طرف دوڑ پڑیں گے۔''

''تم درست کہتے ہو۔'' اس نے کہا اور میز سے اعشاریہ 22 کا ریوالور اٹھالیا۔ ''یہ زیادہ شور نہیں مچائے گا۔'' پھر وہ کلف کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ کلف نے سوچا کہ جان بچانے یا گنوانے کے لیے اس سے بہتر کوئی اور موقع نہیں ہوسکتا، اس لیے کہ ڈولیٹی درمیان میں نہیں آرہی تھی۔

''مگر نہیں، میں تمہاری بیوی کو پہلے ختم کروں گا۔'' وہ اس کی طرف گھوما اور اس نے ریوالور کی نال کا رخ ڈولیٹی کے دل کی طرف کر دیا۔ کلف نے اس کے ریوالور والے ہاتھ کو اس طرح سے جکڑ لیا کہ وہ فائر نہ کر سکے۔ اس نے اپنی ایک انگلی ٹریگر میں پھنسا دی تھی۔ پھر اس نے اپنے جسم کا سارا وزن اس لٹیرے پر ڈال دیا۔ وہ سامنے والی میز پر گر گیا۔ کلف نے اپنا دایاں ہاتھ ریوالور کے ٹریگر مین پھنسایا ہوا تھا جب کہ اس کی کوشش یہ تھی کہ بایاں اس کی گردن کے نیچے جما کر زور لگائے، تاکہ ریوالور سے لٹیرے کا فاصلہ بڑھ جائے۔

لٹیرا بار بار کوشش کر رہا تھا کہ فائر کر دے۔ اس لیے کہ اس کی نال کا رخ اب بھی ڈولیٹی کے دل کی طرف تھا۔ مگر وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا، اس لیے کہ کلف کی ایک انگلی بھی ٹریگر میں پھنسی ہوئی تھی۔

کلف نے پروسٹیٹ گلینڈ کا جو حال ہی میں آپریشن کرایا تھا اس کے ٹانکوں میں کھنچاؤ پیدا ہو رہا تھا۔ اس وقت وہی توانائی کام آرہی تھی جو اس نے تربیت کے دوران حاصل کی تھی۔ بالآخر اس نے ریوالور لٹیرے کی گرفت سے چھڑا کر دور پھینک دیا۔ پھر اس نے اعشاریہ 357 کا بڑا ریوالور میز سے اٹھالیا اور دو قدم پیچھے ہٹ کر باورچی خانے کی طرف چلا گیا۔

اس اثنا میں جب کہ ان کے درمیان جدوجہد ہو رہی تھی ڈولیٹی دوڑ کر باورچی خانے کے ٹیلی فون کی طرف گئی اور ایمرجنسی پولیس کے نمبر ڈائل کرنے لگی۔ کلف کے اس ہاتھ سے خون بہہ رہا تھا جس سے وہ جدوجہد کرتا رہا تھا۔ اس دوران لٹیرا فرش سے اٹھ گیا۔

''کوئی احمقانہ حرکت نہ کرنا ورنہ تم میری چلائی ہوئی گولی سے مارے جاؤ گے۔'' کلف نے دبنگ لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے، تم مجھے گولی مار سکتے ہو۔'' اس نے بے پروائی سے کہا۔ ''اس لیے میں دوبارہ جیل نہیں جانا چاہتا۔'' پھر وہ ایک قدم اس کی طرف بڑھا۔

ڈولیٹی نے ریسیور رکھنے کے بعد میز سے ایک ریوالور اٹھایا اور اس لٹیرے کی طرف تان لیا۔ اس کا انداز اتنا جارحانہ تھا کہ لٹیرا ٹھٹک گیا۔

''اگر میرا شوہر تمہیں نہیں مار سکا تو میں ضرور تمہارے دل میں سوراخ کر دوں گی۔''

لٹیرا مضمحل دکھائی دینے لگا۔

''اس طرف چلو ورنہ تمہارے جسم میں ایک کے بجائے دو گولیاں پیوست ہو جائیں گی۔'' کلف نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ لٹیرا الٹے قدموں سے صحن کے دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔

اپنا ریوالور کلف کو تھما کر ڈولیٹی نے پولیس کو دوبارہ فون کیا۔ لٹیرا کمرے کی طرف جاتے ہوئے جھجکا تو کلف نے ہوائی فائر کر دیا۔ ''دوسری گولی تمہارے جسم میں بھی اتر سکتی ہے۔'' اس نے کہا۔

جب پولیس آئی تو لٹیرا فرش پر پڑا تھا۔ انہوں نے لٹیرے کو ہتھکڑی لگا دی اور گاڑی میں بٹھا دیا۔ کلف نے اپنی بیوی کو بانہوں میں لے لیا۔ تم بہت عظیم خاتون ہو، تم نے حالات پر حسن خوبی سے قابو پالیا۔

''نہیں، یہ سب تمہاری دانائی کا کرشمہ ہے۔'' ڈولیٹی نے کہا۔

☆☆☆

ایک ماہ بعد پولیس نے اس جوڑے کو نقد رقم کا ایوارڈ دیا اور ایک اچھے شہری کا سرٹیفکیٹ بھی جو شاذ ہی کسی کو دیا جاتا تھا۔ ''وہ شہری جو اعلا کارکردگی اور حسن سلوک کا مظاہرہ کرتے ہیں ان کے لیے خصوصیت سے۔''

اکیس سالہ مارکوس انتونی اسپرازو کے کیس کی سماعت کے بعد اسلحہ رکھنے اور ڈاکا زنی کی سزا دی۔ اس پر تین لاکھ ڈالر کا جرمانہ عائد کیا گیا۔ اس کے ساتھ ساری زندگی قید تنہائی کی سزا۔

▲▲▲

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

قسط:3

ناسور

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

وہ ایک سیدھا سادہ معصوم فطرت نوجوان تھا اور اس کے گرد سازشی ذہنیت والوں کا انبوہ تھا۔ ایسے سازشیوں کے لیے وہ ترنوالہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ان کے پھیلائے ہوئے تارعنکبوت میں پھنسا چلا جارہا تھا کہ اسے احساس ہوا کہ اب مفر کی کوئی راہ نہیں ہے۔ اسے بھی ان کا جواب دینے کے لیے خم ٹھونکنا ضروری ہے اور پھر اس نے کمر کس لی۔ انہی کے لہجے میں انہیں جواب دینے کی کوشش کی۔

ایک ایسی طویل کہانی جس کا ہر باب ایک نئی کہانی ہے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

www.paksociety.com

Downloaded From
paksociety.com
WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

Downloaded From Paksociety.com

میرے لیے وہ دوسری ''شاکنگ نیوز'' جس نے مجھے اندر سے بری طرح جھنجوڑ کے رکھ دیا تھا، میری پھٹی پھٹی نظروں کے سامنے تھی۔

یہ دوسری مذکورہ خبر بھی پہلی خبر کے حوالے سے ہی تھی بلکہ یہ ایک بیانیہ خبر تھی اور میں کوئی تیسری، چوتھی بار یہ خبر پڑھ رہا تھا یوں جیسے خود کو یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ واقعی یہ خبر اس وقت میری نظروں کے سامنے تھی؟ یا نظروں کا مغالطہ تھا؟

اس دوسری خبر کے مطابق، انتظامیہ اور ضلعی ٹرانسپورٹرز کے درمیان جو ''کامیاب'' مذاکرات ہوئے تھے اسے ایک ڈھونگ قرار دیتے ہوئے ایک الزام لگایا گیا تھا جس کے مطابق میرا نام واضح حروف میں ظاہر کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ میں نے درحقیقت اس مذاکرات کو انتظامیہ کے حق میں ''ہموار'' اور کامیاب کرانے کے لیے افسروں سے ملی بھگت کرتے ہوئے ان سے بھاری رشوت لی تھی۔ میرے علاوہ اس میں چاچا انور شاہ کا بھی نام دیا گیا تھا۔

ان پے در پے جھوٹی خبروں نے میرا دماغ جھنجھنا کے رکھ دیا اور میں نے غصے اور جھنجلاہٹ کے مارے وہ اخبار اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر اس کا گولا بنا ڈالا۔

اسی وقت ایک استہزائیہ اور شناسا سا آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔

''اخبار پھاڑ دینے سے حقیقت ختم نہیں ہو جاتی مسٹر پھنے خاں!''

میں نے چونک کر کوٹھڑی نما کمرے کے دروازے کی طرف دیکھا اور وہاں بڑے منشی دادن خان کو دیکھ کر میرے پورے وجود میں طیش کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ اس کے مکروہ چہرے پر بڑی زہریلی مسکراہٹ رقصاں تھی اور پھر وہ اسی لہجے میں مزید بولا۔ ''تمہارے اور تمہارے اس منہ بولے مامے چاچے انور شاہ کے ڈھونگ کا پردہ چاک ہو چکا ہے، مسٹر پھنے خاں! ویسے تم دونوں جعلی چاچا بھتیجا نے اپنے صدر صاحب (عطا محمد) کو بھی خوب بے وقوف بنایا، اس سے بھی خرچے کی مد میں بہت سے روپے اینٹھ لیے۔ واہ بھئی! اسے کہتے ہیں ایک تیر سے دو شکار۔''

اس کا ایک ایک لفظ زہر میں بجھا ہوا محسوس ہوتا تھا اور بلاشبہ یہ وہی زہر تھا جس کا شکار یہ مجھے بنا چکا تھا۔ بعض سانپ ڈس کر اپنا زہر جسم میں منتقل کرتے ہیں اور کچھ چہرے پر زہر پھینکتے ہیں مگر دادن خان ایک ایسا دو منہ والا سانپ ثابت ہوا تھا کہ جو ایک منہ سے ڈستا تھا اور دوسرے سے زہر اچھالتا تھا۔

میری جلتی سلگتی نظریں اسی پر مرکوز تھیں اور اس کے ایک ہاتھ میں ایک سے زائد اخبارات کا پلندہ سا بھی جکڑا ہوا مجھے نظر آیا تھا۔

میری فطرت میں یک دم بھڑک اٹھنا نہیں تھا لیکن پتا چلتا تھا کہ سماج کے ایسے بھیانک رویے کس طرح ایک پرامن اور صلح جو انسان کو بھی نفسیاتی دباؤ میں مبتلا کر کے اسے اس کی فطرت کے برخلاف چلنے پر مجبور کر ڈالتے ہیں۔ یہی میرے ساتھ ہوا، باوصف اپنی تحمل مزاجی کے مجھے ایک دم طیش چڑھ گیا اور دماغ میں لاوا ابل پڑا، پھر میں اپنے آپے میں نہ رہ سکا اور جوشِ جنوں میں مجھے پتا بھی نہ چلا کہ کب میں دادن خان پر پل پڑا، ہوش اس وقت آیا جب میں اس کی ٹھیک ٹھاک ٹھکائی لگا چکا تھا اور اسی دوران خود میری اپنی بھی ''مرمت'' ہو چکی تھی۔ مجھے پیٹنے والے اسی کے ساتھی تھے بلکہ ایک افسوس ناک امر یہ بھی تھا اس میں اب وہ لوگ بھی شامل ہو چکے تھے جو کبھی میرے اور چاچا انور شاہ کے ساتھ تھے۔ ان کی بددلی کی وجہ وہ خبر تھی جو میرے حوالے سے اخبار میں چھپی تھی بلکہ اخبارات میں چھپی تھیں۔ ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت اسے ملک کے تقریباً ہر اخبار کی زینت بنایا گیا تھا۔

میرے اور دادن شاہ کے کپڑے لیروں لیر ہو چکے تھے۔ اسے سنبھالا ہوا تھا جبکہ مجھے ''دبوچے'' رکھا ہوا تھا اور سب لوگ مجھے ہی لعن طعن کر رہے تھے یہ حقیقت جانے بنا کہ ایک جھوٹی خبر نے میرے خلاف کیسی غلط فہمی پیدا کر دی تھی اور مجھے اس میں صفائی پیش کرنے کا موقع بھی نہیں دیا گیا تھا۔

شاید اس میں غلطی میری بھی تھی، مجھے طیش میں نہیں آنا چاہیے تھا۔ بات وہی ہو گئی تھی یعنی مجرم مظلوم بن گیا تھا اور مظلوم مجرم۔

انور چاچا کے ساتھ بھی مار کٹائی کی گئی تھی حالانکہ اس نے صرف درمیان میں مجھے اور دادن خان کو چھڑانے کی کوشش کی تھی۔

مجھے میرے اپنے ہی ہم خیال ساتھیوں نے جس طرح دبوچ رکھا تھا یہ دیکھ کر میرے اندر ایک چھنا کا سا ہوا تھا۔ جن کی خاطر میں نے خود کو حتیٰ کہ اپنے گھر والوں کو بھی خطرے میں ڈالا تھا۔ وہی میرے ساتھ یوں مجرموں جیسا سلوک کر رہے تھے۔

میں بپھر گیا اور غصے سے چلایا۔

''چھوڑ دو مجھے۔ یہ میرے خلاف ہی نہیں بلکہ تم سب

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کے خلاف ایک زہریلی سازش ہے۔''

''سازش تو تم نے اور چھوٹے منشی نے کی ہے ہمارے ساتھ۔ چھوکرے!'' ایک نے میری طرف گھورتے ہوئے کہا تو دوسرے نے بھی لقمہ دیا۔

''اور کیا۔ یہ دونوں چاچا بھتیجا ہمیں بے وقوف بناتے رہے اور ہم ان کی باتوں میں آتے رہے، پتا چلا یہ تو اندر ہی اندر مال بنا رہے تھے۔''

تیسرے نے بھی زہر اگلا۔ ''یہ تم دونوں نے اچھا نہیں کیا ہم غریبوں کے ساتھ۔ بابو! مذاکرات کامیاب ہو گئے، پیسوں کا لین دین بھی ہو گیا۔ اندر ہی اندر، اب ہمارا کیا ہوگا۔ تم دونوں نے تو مال بنا لیا ہمیں بے وقوف بنا کر۔''

''بھائیو! ہم تو گئے روزگار سے۔'' ایک بے چارے نے تو اپنا سر پکڑ لیا۔

میں نے انہیں بہت بار یہ باور کرانے کی کوشش چاہی کہ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔ یہ ایک سازش ہوئی ہے۔ ہمارے علم میں لائے بغیر مذاکرات کا وقت مقرر کر دیا گیا، پھر خود اس میں دادن خان نے شرکت کیے بنا مجھے اور انور شاہ کو آگے کر دیا جبکہ ہم اپنے اصولی موقف پر ڈٹے رہے تھے لیکن دشمنوں کی سازش کامیاب ہو چکی تھی۔ اصل ملی بھگت دادن خان نے پیسا لے کر لینڈ مافیا سے کی ہے میں نے نہیں۔ جھوٹی خبر بھی اسی کی چلائی ہوئی ہے وغیرہ۔

مگر کسی نے میری اس بات کو تسلیم نہیں کیا۔ اس دوران دادن خان کے آدمیوں کو میرے خلاف پورا پورا گل کھلانے کا موقع ملتا رہا اور کسی نے عطا محمد تک بھی یہ خبر پہنچا دی تھی بلکہ میرے چند مخالفین نے خود عطا محمد کے ہاں جا کر میرے خلاف کان بھی اس طرح بھرے کہ وہ خود بھی وہاں آن پہنچا۔

اخبارات کی خبریں اس تک بھی پہنچ چکی تھیں۔ وہ کوئی حقیقت سنے بغیر مجھ پر ہی برفروختہ ہو گیا۔

''تم دونوں چاچا بھتیجے نے ہم سب کی پیٹھ پر خنجر گھونپا ہے۔ کتنی عزت دی تھی میں نے تمہیں۔ نعمان! لیکن تم نے اپنی اصلیت دکھا دی۔ تم نے اس سارے گمبھیر معاملے کو سدھارنے ..... کے لیے مجھ سے بھی پیسے لیے تھے اور انتظامیہ سے بھی درون خانہ ساز باز کر ڈالی..... حیف صد حیف ہے تم پر۔''

ٹرانسپورٹ کے ضلعی صدر عطا محمد کے یہ الفاظ مجھے اندر سے بری طرح پھلنی کر گئے تھے۔

مجھے خود ان کی سوچ پر افسوس ہوا تھا کہ انہوں نے میری اب تک کی وفاداری اور دیانت داری پر کتنی آسانی سے بغیر سوچے سمجھے پانی پھیر دیا تھا۔

تاہم میں نے خود کو پُرسکون رکھتے ہوئے کہا۔ ''جناب! یہ سب ایک پہلے سے سوچی سمجھی سازش کے تحت کیا گیا ہے میرے ساتھ، دشمن میری کامیابی سے خوف زدہ ہو گئے تھے۔ انتظامیہ سے ہی نہیں بلکہ ان سے بھی پیسے کھانے والا میں نہیں بڑا منشی دادن خان ہے۔ جن کے وسیع تر مفادات کی خاطر اس نے یہ سازش چلی ہے۔''

''اگر تم اتنے ہی سچے تھے تو پھر تمہیں بڑے منشی پر اس طرح حملہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ تم صدر صاحب سے اس کی شکایت کر سکتے تھے؟'' دادن خان کے ایک بھتیجے نے میرے خلاف زہر اگلا۔ تو میری بجائے چاچا انور شاہ نے اس کا جواب دیتے ہوئے اس سے کہا۔

''جب کسی سچے آدمی کے خلاف اس طرح کا جھوٹا اور گھناؤنا الزام لگایا جاتا ہے تو اس کا بھڑک جانا ایک فطری عمل ہوتا ہے۔ تم لوگوں کو کیا معلوم کہ نعمان احمد نے نہ صرف اپنی جان پر کھیل کر تم سب کا روزگار بچانے کی خاطر یہ سب کیا تھا۔ ایک بڑے لینڈ مافیا کے چیف نے اسے دھمکی بھی دے ڈالی تھی کہ وہ اپنے اس ارادے سے باز آجائے ورنہ اس کی جوان بہن اور بھائی کو نہیں چھوڑیں گے لیکن..... اس نے پھر بھی پروا نہ کی۔ آج تم اس کی قربانیوں کا یہ صلہ دے رہے ہو؟ حیف تو تم پر ہے۔''

صدر عطا محمد کو الٹا چاچا انور شاہ پر غصہ آ گیا۔ اس نے یہ حیف اپنے آپ پر سمجھ لی تھی۔ اور کیا خبر انور شاہ نے غصے میں اور عطا محمد جیسے آدمی کی بھی اس بات کا برا منا کر اشارہ اسی طرف ہی کیا ہو۔

صدر عطا نے اس سے برہم ہو کر کہا۔ ''تم تو چھوٹے منشی تھے۔ تم پر بھی تو لازم تھا کہ اس کی خبر پہلے مجھ تک پہنچاتے۔ تم نے بھی اس لڑائی کو روکنے کی کوشش نہ کی؟''

''میں لڑائی روکنے کے لیے ہی آیا تھا۔ اپنے منہ بولے بھتیجے کی حمایت نہیں کی تھی میں نے جناب! لیکن مجھے بھی دانستہ زدوکوب کیا گیا۔''

''جناب صدر صاحب! دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو چکا ہے..... اب بھلا ان دونوں چاچا بھتیجے کی بدنیتی پر یقین کرنے کی کیا گنجائش باقی رہ جاتی ہے۔ بڑے منشی کی حالت آپ دیکھ نہیں رہے ہیں۔ مال خود ان دونوں نے کھایا اور مارا اس دادن خان کو۔ اسے پولیس کے حوالے کر دیا جائے۔ سارا کچا چٹھا وہ خود ہی معلوم کر لے گی۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ایک دوسری کالی بھیڑ نے میرے خلاف عطا محمد کے کان بھرے اور اسی وقت پولیس سائرن کی بھی آواز آگئی۔ کسی نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چالاکی سے پولیس کو بھی بلالیا۔ پولیس مجھے گرفتار کرکے لے گئی، پھر دادن خان اور اس کے آدمیوں سمیت میرے ہم خیال ساتھیوں سے، جواب مجھ سے بددل ہو چکے تھے، میرے خلاف دیئے گئے چشم دید بیانات کی روشنی میں مجھے لاک اپ کردیا گیا۔

☆☆☆

لاک اپ میں مجھے رہتے ہوئے دو گھنٹے بیت چکے تھے۔ اس دوران چاچا انور شاہ نے مجھے ایک لمحے کے لیے بھی اکیلا نہیں چھوڑا تھا۔ وہ تھانے میں ہی رہا تھا اور میری رہائی وغیرہ کے سلسلے میں وہ بے چارہ تھانے دار کی منت سماجت ہی کرتا رہا تھا مگر ابھی تک اس کی کسی نے نہ سنی تھی۔ بلکہ اسے تھانے کی عمارت سے ہی باہر نکال دیا گیا تھا اور مجھ سے دوبارہ ملنے بھی نہیں دیا گیا تھا۔ تیسرا گھنٹا لگنے کو تھا اور میں حوالات میں پریشان رہتے ہوئے پریشان ہو رہا تھا اور تشویش زدہ بھی کیوں کہ میں پہلے کبھی ایسے ''حوالاتی'' نہیں گزرا تھا۔

حوالات میں میری جامع تلاشی لینے کے بعد میرے پیسے اور سیل فون سمیت وہ تمام چیزیں قبضے میں کرلی گئی تھیں جو عموماً حبیبوں کی زینت ہوتی ہیں۔ تاہم عام شہری کی حیثیت سے مجھے علم تھا کہ یہاں قانون کی آڑ میں کیسی کیسی غیر قانونی باتیں جنم لیتی رہتی ہیں اور اچھے بھلے آدمی کا حشر کیا جاتا تھا یہاں۔ بس! میں اسی بات سے خوف زدہ تھا اگرچہ ابھی تک میرے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ تھانے دار بھی مجھے خلاف توقع ایک عام سا متحمل مزاج آدمی نظر آرہا تھا۔ میں نے اس سے ریکوئسٹ کی تھی کہ وہ کم از کم میرا سیل فون میرے حوالے کردے مگر اس نے انکار کردیا تھا۔

میں حوالات میں بیٹھا نہیں تھا بلکہ اس کے دروازے کی سلاخوں کو تھامے کھڑا تھا۔ اس کا ماحول مجھے بڑا پر ہول سا محسوس ہو رہا تھا۔ سیلن زدہ دیواریں، جس کی چھت اور فرش کا پلستر جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا۔ اس سے ایک وحشت سی پھوٹ رہی تھی اور اکا دکا ایسے ہی وقت میں میری آنکھوں کے سامنے وہ منظر بھی گھوم گیا جب میں نے ایک دن اپنے بے گناہ باپ کو بھی اسی طرح سلاخوں کے پیچھے کھڑے پایا تھا اور باوجود ہم سب کی سرتوڑ کوششوں کے وہ باہر نہیں آسکا تھا، بالآخر ایک دن اسے تختہ دار پر لٹکا دیا گیا تھا اور وہ ایک لاش ہی کی صورت میں باہر آیا تھا۔

وہ عبرت انگیز وقت یاد کرکے میں اندر سے لرز سا گیا۔ ایک پُر اندیش خیال۔ ایک ہولناک خدشے نے لمحے بھر کو میرے اندر سر ابھارا تھا کہ کیا مجھے بھی کہیں ایسی کسی بھیانک سازش میں تو نہیں پھنسانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ جس میں میرے بے گناہ باپ کو پھنسایا گیا تھا؟ اس اندیشناک تصور سے ہی میں کانپ گیا تھا اور سوچنے لگا کہ ایسا تو نہیں کہ میں اپنے دیدہ دشمنوں کے دھوکے میں کہیں ان ''نادیدہ'' دشمنوں کی سازش کے تارعنکبوت میں تو نہیں پھنسایا جارہا جنہوں نے آج سے کئی برس قبل میرے بے گناہ باپ کو پھنسا کر اسے بے گناہ پھانسی دلوادی تھی؟

ایک اور بات بھی وجہ پریشانی بن رہی تھی کہ میں نے تو اپنے باپ کی بے گناہی ثابت کرنے کا عزم کرتے ہوئے اس راہ پُرخار پر قدم رکھا تھا اور اپنے مرحوم باپ سے کیے گئے وعدے کا پاس کرنا چاہا تھا کہ اپنے خاندان کی پیشانی سے بدنامی کا یہ داغ ہمیشہ کے لیے دھو ڈالوں گا اور قدرت مجھے یہ موقع دے رہی تھی، قسمت بھی کسی حد تک ساتھ تھی کہ اچانک یہ سب ہوگیا اور میں خود اب حوالات میں تھا۔ کیا سوچیں گے اب محلے والے ہمارے بارے میں؟ یہی کہ ان کا باپ بھی ایک خونی مجرم تھا اور اب بیٹا بھی اسی راہ پہ چل نکلا۔ جبکہ میرے ساتھ ایک جوان بہن کا بھی ساتھ تھا۔ اف..... کس قدر تلخ اور زہریلی تھی یہ دنیا۔ کسی کو جینے نہ دیتی تھی۔ کیا پھر کوئی ارشاد مٹن جیسا سماجی ناسور میرے بھائی اور بہن کے لیے وبال جاں بننے والا تھا؟ میں کانپ سا گیا۔

جب تیسرا گھنٹا بھی بیت چلا تو میری تشویش اور پریشانی عروج پر پہنچ چکی تھی۔ تب ہی اچانک ایڈووکیٹ زنیرہ کو میں نے ایک اُمید کی کرن کی طرح اندر داخل ہوتے دیکھا، تھانیدار کا کمرا خاصا وسیع تھا اور اسی ایک کونے میں وہ لاک اپ تھا جس کے سلاخ دار دروازے پر میں کافی دیر سے ... اپنی آنکھوں میں امید لیے کھڑا تھا۔

زنیرہ کو دیکھتے ہی میں نے بے اختیار ایک طمانیت بھری سانس خارج کی تھی۔ اس کے ہمراہ چاچا انور شاہ بھی تھے، شاید انہوں نے ہی یہاں سے ناامید ہونے کے بعد زنیرہ کو مطلع کرکے اس سے مدد لی تھی۔

اندر داخل ہوتے ہی زنیرہ کی مجھ پر بھی نگاہ پڑی تھی مگر صرف ایک لمحے کے لیے، اس کے بعد وہ فوراً ہی تھانے دار سے پہلے اپنا تعارف کرانے کے بعد اس سے مخاطب ہوکر بولی تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''میں نعمان احمد کی ضمانت کے سلسلے میں آئی ہوں۔ میرا نام ایڈووکیٹ زنیرہ اقبال ہے۔''

تھانے دار نے ایک نظر اس پر ڈالی تھی اور اسے اپنی میز کی سامنے والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر زنیرہ کے کرسی سنبھالتے ہی وہ بولا۔

''اس کی ضمانت کا بندوبست آپ کو کورٹ میں کرنا پڑے گا۔ میں بہت جلد اس کا چالان عدالت میں پیش کرنے والا ہوں۔''

''ایک معمولی جھگڑے پر آپ نے اس کا چالان بھی بنا ڈالا۔ تھانے دار صاحب؟ کیا آپ پر مخالف دھڑے کا اتنا ہی دباؤ ہے؟'' زنیرہ نے اپنے پروفیشن کے مطابق اپنی بات میں دلیل پیدا کرتے ہوئے کہا تو تھانے دار سنجیدگی سے بولا۔

''مجھ پر کسی دھڑے کا دباؤ نہیں ہے، ملزم نعمان احمد عرف نومی پر C-R نمبر کے ساتھ ایف آئی آر کاٹی گئی ہے اور پانچ سے زائد چشم دید گواہوں نے اسے۔ دادن خان نامی آدمی کو بری طرح مارتے پیٹتے اور زخمی کرتے دیکھا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنی دراز سے ایک کاغذ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا اور آگے بولا۔

''یہ ایم۔ایل۔او (میڈیکو لیگل آفیسر) کا سرٹیفکیٹ ہے۔''

میں نے دیکھا، زنیرہ نے ایک نگاہ بھی اس کاغذ پر ڈالنا گوارہ نہ کی تھی، اس کے برعکس وہ تھانے دار پر ایک طنزیہ نظر ڈالتے ہوئے اسی لہجے میں اس سے بولی۔ ''کمال ہو گیا یہ تو تھانے دار صاحب! اتنی جلدی ایم ایل سی بھی تیار کر لی گئی جبکہ اس کی تیاری میں قانونی طور پر تین دن لگتے ہیں۔''

میں حوالات کی سلاخوں کے پیچھے کھڑا ان دونوں کی طرف تکے جا رہا تھا اور ان کی آپس کی بحث کو بھی غور سے سن رہا تھا۔

میں نے دیکھا زنیرہ کی اس بات پر تھانے دار نے بلا جھجک جواب دیا تھا۔ بولا۔ ''یہ پروویژنل سرٹیفکیٹ ہے محترمہ! اور کیا آپ کو علم نہیں کہ فوری رپورٹ کروانے کے لیے سب سے پہلے اسی کا سہارا لیا جاتا ہے، پکا کاغذ تو بعد میں بنتا ہے۔''

تب زنیرہ نے وہ سرٹیفکیٹ میز کی سطح سے اٹھا کر ایک نگاہ اس پر ڈالنا گوارا کی، وہ بھی سرسری سی، پھر بولی۔ ''مگر یہ لڑائی دو بدو ہوئی تھی۔ کیا آپ نہیں دیکھ رہے ہیں کہ نعمان احمد کو زدوکوب کیا گیا ہے۔ چلیں پھر میں دادن خان کے خلاف ایف آئی آر کٹوائے دیتی ہوں اور ایک ایسا کاغذ میں بھی تیار کروا دیتی ہوں۔ کیا پھر آپ دادن خان کو گرفتار کر لیں گے؟''

اسی وقت قریب والی کرسی پر بیٹھا چاچا انور شاہ بول پڑا۔ ''میں نے تو رپورٹ کی تھی دادن خان کے خلاف مگر انہوں نے کوئی توجہ نہ دی تھی۔''

اس پر تھانے دار نے بڑی سخت نظروں سے چاچا انور شاہ کی طرف گھورتے ہوئے کہا۔ ''کیا تمہارے ایک کے کہنے پر میں دس آدمیوں کو اندر کر دیتا اور وہ جو پچاس لوگ تھے تمہارے ساتھی کے خلاف گواہی دینے والے انہیں رد کر دیتا، یہی چاہتے تھے تم۔''

تھانے دار بھی اب گرم ہونے لگا تھا، بالآخر زنیرہ کو بھی خاطر میں لائے بغیر تلخ لہجہ اختیار کرتے ہوئے اس سے بولا۔ ''بی بی! آپ اب عدالت جا کر ہی ملزم نعمان احمد کی ضمانت کا بندوبست کیجیے گا، میرا وقت ضائع نہ کریں۔''

میں نے زنیرہ کو بے بسی سے ہونٹ چباتے ہوئے دیکھا، ایسے ہی وقت اس کی ایک ذرا نگاہ مجھ پر بھی پڑی تھی۔ میرا چہرہ، جو اسے دیکھ کر ذرا اُمید و بیم کی صورت روشن ہوا تھا، وہ اب تھانے دار کی ہٹ دھرمی دیکھ کر مانند پڑنے لگا تھا۔ جسے زنیرہ کی نگاہوں نے بھی شاید محسوس کر لیا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور تھانے دار سے اجازت لیے بغیر میری طرف بڑھی۔ پھر قریب آ کر مجھ سے ازراہ تشفی بولی۔ ''نومی! دل چھوٹا مت کرنا۔ میں کچھ کرتی ہوں۔'' میں نے کوئی جواب نہ دیا تو وہ چند ثانیوں کی خاموشی کے بعد دوبارہ گویا ہوئی۔

''تم تو لڑائی بھڑائی سے اجتناب ہی کیا کرتے تھے، پھر یہ سب کیسے ہو گیا؟''

مجھے اس کا سوال کچھ عجیب ہی لگا تھا۔ میں نے آہنی سلاخوں کے پیچھے سے اس کے چہرے کی طرف بہ غور دیکھتے ہوئے کہا۔ ''زنیرہ صاحبہ! میں ایک انسان بھی ہوں، پتھر نہیں، جوش اور جذبات میں بھی رکھتا ہوں، کوئی غلط بات میری آنکھوں کے سامنے ہوتی رہے اور میں بے حسی کے ساتھ اسے ہوتا دیکھتا رہوں۔ کیا یہ ممکن ہے؟ کیا کبھی آپ کو غصہ نہیں آیا ہو گا۔ جب کسی بے گناہ کے سلسلے میں آپ کوئی کیس، محنت شاقہ کے بعد ہاری ہوں؟''

میری بات پر اس کے اسمارٹ سے چہرے پر ایک رمق سی لہرا گئی، پھر وہ ایک گہری ہمکاری خارج کرتے ہوئے اپنی بات کی وضاحت میں بولی۔ ''میرا یہ مطلب نہیں تھا نومی!

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

دراصل تمہاری فطرت کی متحمل مزاجی کو ہی میں تمہارا اصل ہتھیار سمجھتی ہوں۔ کیا تم ارشد ملٹن والے کیس کو بھول گئے تھے؟ جس نے اپنے کالے کرتوتوں سے تمہارا خون تک کھولا دیا تھا، لیکن تم نے اسے کس طرح صبر واستقامت سے اسے ایسی شکست دی تھی کہ وہ کسی کو بھی منہ دکھانے کے قابل بھی نہ رہا تھا، تو پھر۔ اب تمہارے ساتھ ایسا کیا ہوا کہ تم.....'' وہ کہتے کہتے رک گئی۔ اسی وقت پیچھے سے تھانے دار نے سیاہ رول اپنی میز پر بجا کر یہ ملاقات ختم کرنے کا اعلان کیا تو زنیرہ مجھے سوائے تسلی دینے کے، واپس لوٹ گئی۔

چاچا انور شاہ بھی مایوس اور پریشان سا لوٹ گیا اور میں ایک بار پھر گویا در زنداں ہو کے خاموش بیٹھ رہا۔

مایوسی اور پریشانی نے مجھے اب تھکا ڈالا تھا، مجھ سے کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا، میں ایک نسبتاً بہتر کونا دیکھ کر وہاں سڑک کی سیلن زدہ دیوار سے پشت ٹکا کر بیٹھ گیا۔

کافی دیر گزر گئی، باہر شام جھکنے لگی تھی، حوالات کی چھتیلی دیوار کے قریب بنے چھوٹے روشن دان سے مقدور بھر آسمان کو تاریک پڑتے دیکھ کر یہ اندازہ ہوا تھا۔

مجھے اب زیادہ پریشانی بہنا عاصمہ اور بھائی فہیم کی طرف سے ہو رہی تھی۔ ممکن تھا کہ زنیرہ یا چاچا انور شاہ نے انہیں میرے بارے میں اب تک بتا دیا ہو اور اس اطلاع کے بعد وہ کہاں نچلا بیٹھتے بھلا؟ ضرور وہ یہاں کا رخ کرتے۔ جبکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ دونوں یہاں آتے۔ تاہم میرے ایک محتاط اندازے کے مطابق انہیں اب تب میں آ جانا چاہیے تھا۔

''نہ ہی آتے تو اچھا تھا۔'' میں نے کڑھے دل سے سوچا۔

رات ہونے لگی اور میں نے حوالات کی دیوار کے ساتھ لگے بیٹھے ایک بار پھر وقت کا اندازہ کرنے کی خاطر ذرا اپنا سر اٹھا کے اوپر روشندان کی طرف دیکھا تو مقدور بھر نظر آنے والے تاریک پڑتے آسمان پر تارے ٹمٹماتے دیکھے تو مجھے ایک نئی تفکیر نے گھیر لیا۔

مجھے عاصمہ اور فہیم کی طرف سے فکر ہونے لگی۔ وہ کہاں تھے؟ کیا انہیں، ابھی تک زنیرہ نے میرے بارے میں کچھ نہیں بتایا ہوگا؟ یا کم از کم چاچا انور شاہ نے تو بتایا ہی ہوگا، آخر وہ ہمارے فیملی ممبر کی حیثیت رکھتے تھے؟ یہ کیا ماجرا تھا؟ ایک خیال اور کلک ہوا میرے سوچتے ذہن میں کہ ہو سکتا ہے انہیں کسی نئی پریشانی سے بچانے کی خاطر بتایا ہی نہ گیا ہو اور اس عرصے تک میری ضمانت وغیرہ کے لیے بھاگ دوڑ کی جا رہی ہو؟

یہی وہ وقت تھا جب میرا دھیان اچانک عطا محمد اور اس کی بیٹی فوزیہ کی طرف گیا، تو بے اختیار میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ کیا وہ دونوں بھی مجھے ہی قصوروار سمجھتے ہوں گے؟ جبکہ میری ان دونوں باپ بیٹی سے اچھی خاصی انڈر اسٹینڈنگ بھی ہو چکی تھی لیکن اس نئی سازش کے تانے بانے میں کیا میرے دشمنوں نے اسے بھی جکڑ لیا ہوگا؟ وہ بھی میری طرف سے بدظن ہو گئے ہوں گے۔ کیا فوزیہ بھی مجھے یہی سمجھے گی کہ میں نے ان کے پیٹھ پیچھے چھری گھونپ دی ہے۔ نیز اب لاری اڈے کا مستقبل کیا تھا؟ یہ سب مجھے اندر کرانے کی سازش تھی تاکہ میں کچھ نہ کر سکوں اور دشمن اپنا کام آسانی سے کرتے رہیں؟

عطا محمد تو مجھ سے بدظن ہو ہی چکا تھا۔ تو کیا فوزیہ بھی مجھے ایسا ہی سمجھتی ہوگی؟

ایسے گنجلک خیالات کی یلغار نے مجھے زدیدہ کر کے رکھ دیا۔

میں نے یونہی۔ ذرا گردن اپنی گھما کے تھانے دار کی میز کی طرف دیکھا، وہ خالی تھی وہ کافی دیر سے اٹھ کے کہیں جا چکا تھا۔ اِکا دُکا کوئی سپاہی یا اردلی اندر آتا جاتا دکھائی دے جاتا تھا۔

ٹھیک اسی وقت دو سنتری اندر آئے اور میں نے انہیں سیدھا اپنی طرف آتے دیکھا تو خود ہی میکانیکی انداز میں، میں اٹھ کھڑا ہوا، یوں، جیسے وہ میری رہائی کا پروانہ لائے ہوں۔ مگر ایسا نہیں تھا، وہ مجھے ہتھکڑی ڈال کر ایک دوسرے کمرے میں لے آئے۔ میں ہونق سا بنا ان کا چہرہ تکتا رہا، بالآخر پوچھا۔

''مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟''

''ابھی تھوڑی دیر میں پتا چل جائے گا۔'' ایک نے کہا۔

مجھے اس کا لہجہ بڑا عجیب سا لگا تھا۔ یہ کمرا بھی ایک چھوٹی حوالات سے کم نہیں تھا۔ یہاں اندھیرا تھا، کسی قریبی مختصر راہداری سے روشنی اس طرف کو آ رہی تھی اور اس مدھم سی روشنی میں مجھے یہ حوالاتی کوٹھڑی بھی ہولناک ہی نظر آ رہی تھی۔

یہ تنگ و تاریک سی کوٹھڑی شاید تھانے کی عمارت کے کسی الگ تھلگ گوشے میں واقع تھی، جس کا اندازہ مجھے اس بات سے ہوا تھا کہ یہاں لوگوں کے باتیں وغیرہ کرنے کی آوازیں بہت کم آ رہی تھیں۔

کافی دیر بیت گئی۔ وہی دونوں سنتری دوبارہ نمودار ہوئے۔ ان کے ہمراہ ایک اور شخص بھی تھا جسے ہتھکڑی لگی ہوئی

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

تھی۔ وہ شاید کسی اور حوالاتی کو بھی پیوند زنداں کرنے کے لیے لا رہے تھے۔ میں آنکھیں پھاڑے اس نئے حوالاتی کو تکے جا رہا تھا۔

مدھم روشنی کے باعث ابھی میں اس کا چہرہ صحیح طور نہیں دیکھ پا رہا تھا۔ تاہم وہ اپنی چال سے بے نیاز اور بے پرواہ سا نظر آ رہا تھا۔ اور اسی انداز میں ہنس ہنس کر وہ ان دونوں سنتریوں سے جگت بازی بھی کیے جا رہا تھا۔ جس کا وہ کوئی جواب نہیں دے رہے تھے۔ پھر ایک سنتری نے لاک اپ کا دروازہ کھولا اور اسے اندر دھکیل دیا۔

اس نے میری طرف ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی تھی، میرے چہرے پر تاریک سایہ پڑ رہا تھا اور کچھ اس کا بے پروانہ انداز تھا کہ اس نے منہ دوسری طرف موڑ لیا تھا۔ لیکن اندر داخل ہوتے وقت میں اس کا چہرہ دیکھ چکا تھا اور اسے پہچان کر مجھے عجیب سی حیرت کا ایک جھٹکا بھی لگا تھا۔

کوئی ایسی بات تو تھی کہ میں اسے پہچاننے کے باوجود۔ اپنی جگہ گنگ اور یہ سوچتا رہ گیا تھا کہ آخر یہ معاملہ کیا تھا؟ کیوں میرا ہمیشہ اس کے ساتھ ایسے ہی حالات میں سامنا ہوتا تھا؟ اتفاقات۔ بار بار تو نہیں ہوتے۔ تو کیا تھا پھر یہ سب؟ تقدیر کا کوئی کھلواڑ۔ یا پھر مشیت ایزدی؟

''ابے لے..... یہ تو ہے جگری؟ یا میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں؟''

ایسے ہی وقت میں جب میں اس کی جانب سوچتا بنا یک ٹک کے جا رہا تھا، اس کی دوسری بار میرے چہرے پہ نظر پڑی تھی اور اب کے شاید میرا چہرہ کچھ روشنی میں ہونے کی بناء پر اسے بھی واضح دکھائی دے گیا تھا تو پل کے پل اس کے منہ سے یہ برآمد ہوا تھا۔

''ہاں دوست! یہ میں ہی ہوں۔ نعمان۔ مگر۔'' میری آواز دب گئی۔ کیوں کہ اس نے مجھے جملہ ہی مکمل نہیں کرنے دیا اور مجھ سے بغل گیر ہو گیا، پھر علیحدہ ہوتے ہوئے بولا۔

''ابے لے۔ جگری! یہ بھی کیسا اتفاق ہے کہ ہم دونوں ہمیشہ ہی حادثاتی انداز میں ملتے ہیں۔ لگتا ہے تیری میری قسمت ایک ہی لکیر کی راہی بننے چلی ہے۔'' اس نے کہا اور میں بس پھیکی سی مسکراہٹ اپنے چہرے پہ بکھیر کر رہ گیا۔ نجانے کیا بات تھی کہ میں اس کی موجودگی میں ایک عجیب سی طمانیت محسوس کرنے لگا تھا۔ حالاں کہ خود وہ بھی میری طرح حوالات میں ہی تھا۔

''ابے لے۔ جگری! میں تو تیرے سے یہ پوچھنا ہی بھول گیا کہ تیرے جیسا شریف آدمی کیسے یہاں آن پھنسا؟''

میں ذرا تھکے تھکے سے چہرے کے ساتھ اس کی طرف دیکھنے لگا تو وہ میرے کاندھے پر دوستانہ انداز میں ہاتھ رکھے مجھے بھی اپنے ساتھ لے کر فرش پر بیٹھ گیا۔

جانے کیوں میرا جی چاہتا تھا کہ آج اسے سب کچھ بتا دوں۔ اپنے بارے میں، اپنے کاز اور اپنے عزم دیرینہ سے متعلق وہ سب کچھ بتا ڈالوں۔ کچھ نہ چھپاؤں اس سے۔ ایسا شاید اس کے اپنائیت بھرے دوستانہ لہجے کا اثر تھا یا پھر اس وقت کا جب دو بار ہمارا سامنا ہوا تھا تو اس نے مجھ سے بھی اسی نوعیت کی باتیں اشاروں کنایوں میں سہی کی تو تھیں۔

پھر دھیرے دھیرے میں نے اسے سب کچھ بتا ڈالا۔

میری ساری روئیداد دکھا سننے کے بعد وہ جیسے گومگو سا ہو گیا۔ کچھ نہیں چھپایا تھا میں نے اس سے۔ یہی مجھے اپنا اور بے حد قریبی، سچا ہمدرد اور غم گسار محسوس ہوا تھا۔

''ابے لے۔ جگری! تو بھی اپنے جیسا ہی نکلا۔''

بہت دھیرے سے بہت ہلکی آواز میں اس نے یہ کہا اور وہ بھی اسی طرح گومگو کے عالم میں کہ جیسے وہ منہ سے نہیں..... دل سے بول رہا ہو۔ پھر میں نے اس سے پوچھا۔

''تو بتا دوست! تو یہاں کیسے؟ کہیں خدانخواستہ کسی لمبے چکر میں تو نہیں آ گیا؟'' میری بات پر وہ جیسے خیالات سے چونکا۔ وہ میرے بارے میں ہی سوچ رہا تھا شاید، اسی لیے میری بات کو سرسری نگاہ کرتے ہوئے بولا۔

''میری فکر چھوڑ جگری۔ میرے لیے تو یہ جگہ سرکاری مہمان خانے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی ہے۔ پر یار! تیرے ساتھ لگتا ہے بہت لمبی گیم کھیلی جا رہی ہے۔ بہت دور تک۔ ایسے دشمنوں سے میرا اپنا بھی واسطہ پڑتا رہا ہے۔ ابے لے۔ پھر بھٹک رہا ہوں میں۔ ٹھہر۔ مجھے کچھ سوچنے دے ذرا۔'' وہ چپ اور انتہائی سنجیدہ نظر آنے لگا، میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا، وہاں اب لاابالی پن اور بے پروائی نام کو بھی نہ تھی۔

اس نے چند ثانیوں کی پُرسوچ خاموشی کے بعد جیسے کسی نتیجہ خیز فیصلے پر پہنچتے ہوئے کہا۔

''نعمان جگری! باقی باتیں چھوڑ، وہ بعد میں بھی ہوتی رہیں گی، پہلے تجھے یہاں سے نکالنے کا بندوبست کرنا پڑے گا۔'' مجھے اس کی یہ بات کچھ عجیب سی لگی کہ وہ خود اندر تھا اور مجھے باہر نکالنے کی باتیں کر رہا تھا۔

میں چپ رہا مگر وہ بولتا رہا۔ اسے آپوں آپ اور خود کلامیہ باتیں کرنے کا جیسے خبط سا تھا۔ خود ہی اپنے آپ سے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

جانے کیا کیا سوچتے سوچتے باتیں کرتا چلا جاتا تھا۔

''استاد بھابھا کے آدمی کو آلینے دے۔ پھر سوچتے ہیں وہ تیرے لیے کیا کرتے ہیں؟ لیکن۔ بات وہی ہے کہ کیا کیا جائے؟ میں ایسا نہیں چاہ رہا۔ کہیں۔ کہیں۔ وہ لوگ بھی۔ زندگی میں پہلی بار آج میں اتنا پریشان اور الجھ سا گیا ہوں۔'' کہتے کہتے اس نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ اس کے الفاظ بے ربط سے ہونے لگے تھے۔

میں نے پھیکی سی مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''یہ تو کیا خود ہی خود سے باتیں کیے جا رہا ہے؟ اگر میری وجہ سے پریشان ہو رہا ہے تو میری فکر چھوڑ تو۔ اپنی کر۔ میری خیر ہے۔'' میری بات پر اسے ایک جھٹکا سا لگا اور اپنے مخصوص لہجے میں مجھ سے بولا۔

''ابے لے۔ جگری! بڑی بات کر دی تو نے۔ یہ لے ہاتھ پکڑتا ہے میرا؟ مگر سوچ سمجھ کے پکڑنا۔ یہ پھر چھوٹے نہیں۔ اور یاد رکھنا۔ یہ شیراز عرف کالیا کا ہاتھ ہے، جو دوستی نبھانا بھی جانتا ہے اور قربان ہونا بھی پر..... تو کیا سمجھ رہا ہے مجھے؟ دوست یا پھر۔ بس ایسے ہی۔''

اس نے یہ کہتے ہوئے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھا لیا۔ میں اس کے اپنی طرف بڑھے ہوئے ہاتھ کو گھورنے لگا۔ بہت نگڑا ہاتھ تھا۔ لگتا تھا اس ہاتھ نے بڑی جانفشانی کی ہے۔ مگر میں کچھ اور سوچنے میں محو ہو گیا تھا۔ اس نے ایسے ہی نہیں اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا تھا، وہ زبان کا پکا اور ساتھ نبھانے کا دھنی لگتا تھا۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ مجھے کیا اس کا ہاتھ پکڑ لینا چاہیے تھا؟ کیا۔ میرے لیے۔ ایڈووکیٹ زنیرہ، چاچا انور شاہ جیسے لوگ کافی نہیں تھے؟ کیا معاشرے میں شریفوں کے علاوہ۔ کالیا جیسے لوگوں کا بھی ساتھ حاصل رہنا ضروری ہوتا ہے۔ تا کہ۔ تا کہ۔ لوہے کو لوہے سے کاٹا جا سکے؟

میرے ہاتھ بڑھانے کی دیری پر وہ مایوس سا ہو کر جس وقت اپنا خالی ہاتھ ہولے ہولے سے واپس پیچھے لے جانا چاہ رہا تھا۔ عین اسی وقت میں نے پوری گرمجوشی کے ساتھ اپنا دائیاں ہاتھ آگے بڑھا کر اس کا واپس پلٹتا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اور مستحکم لہجے میں بولا۔

''تو ٹھیک ہے دوست! اس ہاتھ کو بھی تو اب پیچھے پلٹتے نہیں پائے گا۔ دوستی میں اب یہ ہاتھ بھی۔ دوست کو سہارا دینے سے پیچھے نہیں ہٹے گا۔''

''ابے لے..... جگری! گیا کالیا! سچی کہوں گا تیرے سے۔ آج تک میں نے کسی کو اس لائق ہی نہیں سمجھا تھا کہ کسی کی طرف اس طرح دوستی کا ہاتھ بڑھاؤں گا، پر یار جگری! تیرے ساتھ اپنا من لگ رہا ہے۔ کچھ ایسا تو ہے کہ دل تجھے اپنا ہی سنگی ساتھی سمجھنے پر مجبور ہو رہا ہے۔ ورنہ تو اپنے سارے لونڈے لپاڑے، بس! اپنے لمڈے ہی ہیں۔ یہ حکم دیا وہ حکم دیا..... پر شیر جیسا ساتھ کسی کا نہیں ملا، سوائے تیرے۔''

بڑے عجیب لہجے اور جوش جذبات میں وہ پتا نہیں کیا کیا کہتا چلا گیا، مگر حقیقت یہی تھی کہ وہ ایسا کچھ غلط بھی نہیں کہہ رہا تھا، ایک جی دار کو دوسرا جی دار ہی پہچانتا ہے۔ اور ہم شاید ایک دوسرے کو پہچان رہے تھے۔

تھانے کی اس تنگ و تاریک کوٹھڑی میں ایک عجیب دوستی پروان چڑھ رہی تھی۔ تو ایسے میں بے اختیار ہی میرے منہ سے نکلا۔

''کالیا! ایک بات تو بتا..... تو آخر ہے کون؟ بہت اشتیاق ہے مجھے تیرے بارے میں بھی جاننے کا.....'' وہ میری اس عجیب سی بات پر ہلکا سا قہقہہ مار کے ہنسا تھا۔ اور پھر بولا۔

''میں کون ہوں کیا ہوں؟ اس کا اندازہ تو خیر اب تک تجھے بھی ہو ہی گیا ہوگا۔ پر کہانی میری بھی تجھ سے مختلف نہیں ہے۔ میں نے شرافت کا لبادہ اتار پھینکا ہے، اور تو نے چڑھا رکھا ہے۔ لیکن میں تجھے یہ لبادہ اتارنے بھی نہیں دوں گا۔ یہ کالیا کا اپنے جگری یار سے۔ یاروں والا وعدہ ہے کہ میں اس کی شرافت کو گہن لگنے نہیں دوں گا۔''

مجھے اس کی بات پر یک گونہ ایک سکون اور تسلی ہونے لگی۔ ورنہ حقیقت یہی تھی کہ اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتے ہوئے۔ میں اسی وجہ سے ہی گومگو میں مبتلا ہو گیا تھا کہ نجانے۔ یہ کس قماش کا تھا اور کہیں میں بھی اس کے رنگ میں نہ رنگ جاؤں۔

اسی وقت ایک سنتری نے آ کر فرش پر ڈنڈا بجایا اور قدرے بلند آواز میں بولا۔

''اوئے کالیا! تیری ملاقات آئی ہے۔ چل باہر نکل۔''

''او۔ سنتری بادشاہو! ملاقاتی کو ادھر ہی بلا لاؤ۔'' کالیا نے سنتری سے یوں کہا جیسے وہ اسے کہیں باہر سیر کو لے جانے کی بات کر رہا ہو۔

''نہیں، وہ تم سے تنہائی میں بات کرنا چاہتا ہے۔'' سنتری نے کہا تو کالیا اسی بے پروائی سے بولا۔

''اس سے کہو کہ بالکل بے غم ہو کر یہاں آ جائے۔ کالیا یہاں اکیلا ہی ہے۔'' وہ ڈٹا رہا۔ سنتری بیزاری سے منہ ہی منہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

میں بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔

سنتری کو وہاں سے گئے ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ میں نے ایک چھریری جسامت کے آدمی کو سامنے نیم تاریکی سے ابھرتے ہوئے دیکھا۔ اس نے میل خورے رنگ کی شلوار قمیص پہن رکھی تھی، وہ چند قدم چلتا ہوا سلاخ دار دروازے کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ خاکستری صورت کا یہ آدمی مجھے کالیا کے قبیل ہی کا معلوم دیتا تھا۔ اس نے پہلے ایک نگاہ میرے چہرے پہ ڈالی اور پھر کالیا کی طرف دیکھ کر بولا۔

''یہ کون ہے؟''

''اپنا یار ہے۔ تو بتا، یہاں سے مجھے نکالنے آیا ہے، یا پھر ابھی کچھ روز اور اس مہمان خانے میں مجھے رہنا ہوگا۔'' کالیا نے اس نووارد سے پوچھا مگر اس کی شاید سوئی مجھ پر ہی اٹکی ہوئی تھی۔ وہ اس کا سوال نظر انداز کرتا ہوا ایک بار پھر میرے بشرے پر نگاہ ڈال کر کالیا سے بولا۔

''میں نے اس کے بارے میں پوچھا ہے، کون ہے یہ، تیرا یار کب سے بن گیا؟ پہلے کبھی تو نہیں دیکھا تیرے ساتھ۔''

مجھے ان دونوں کے انداز گفتگو پر حیرت سی ہو رہی تھی۔ نووارد کا انداز تخاطب کالیا کے ساتھ تحکمانہ تھا، جبکہ کالیا کے انداز سے کہیں سے بھی یہ نہیں لگ رہا تھا کہ وہ اس کا ماتحت ہو۔

اس بار کالیا سنجیدہ اور قدرے تلخ لہجے میں اس سے بولا..... ''تارا جانی! یہ میرا ذاتی معاملہ ہے، اسے چھوڑو، وہ بتاؤ تم جو میں نے پوچھا ہے۔''

تارا نامی شخص نے فوراً کہا۔ ''استاد نے مجھے تمہاری ضمانت کے لیے ہی یہاں بھیجا تھا مگر۔ تھانے دار.....'' یہ کہہ کر وہ رکا اور پھر میری جانب دیکھنے لگا۔

''بولتا رہے تارا جانی! اس کی فکر نہ کر۔ ہاں؟'' کالیا نے اس کی طرف دیکھ کر سوالیہ کہا تو تارا آگے بولا۔

''یہ اپنا تھانے دار کہتا ہے وہ تجھے چھوڑ تو دے گا، پر تجھے ایک بیان پر دستخط کرنا ہوں گے۔''

''ابے لے..... کیسا بیان؟ پہلے تو کبھی ایسا کوئی سین پاٹ نہیں ہوا تھا؟ کیا استاد بھابھا کے پاس پیسے ختم ہو گئے ہیں یا پھر۔ اس کا مجھ سے جی بھر گیا ہے؟'' کالیا کا تلخ لہجہ برقرار تھا۔

''جا استاد سے کہہ دے جا کر کہ وہ میرے یار نعمان کی بھی ضمانت کا بندوبست کرے، میں اس کے بغیر باہر نہیں آؤں گا۔'' اس کی بات پر تارا کے چہرے پہ الجھن آمیز شکنیں نمودار ہو گئیں۔ اسی لہجے میں کالیا سے بولا۔

''لل۔ لیکن اس وقت تو تیری اپنی ضمانت کے لالے پڑے ہوئے ہیں، اب تو اس کی بات بھی کر رہا ہے؟''

''میں نے جو کہنا تھا کہہ دیا تارا جانی! اپنا راستہ لے اب۔'' کالیا نے اپنے مخصوص بے پروانہ لہجے میں اس سے کہا اور مجھے لیے پلٹنے لگا تو میں اپنی جگہ سے حرکت کیے بغیر اس سے بولا۔

''کالیا! تو میری فکر چھوڑ، میرا اللہ مالک ہے۔ تو چلا جا یہاں سے۔''

''ابے لے۔ جگری! یہ کیا بولنا پڑا ہے تو؟ اللہ تو سب کا ہی مالک ہے۔ پر کالیا بھی یاروں کا یار ہے۔ مصیبت کی اس گھڑی میں اپنی کشتی آگے بڑھا لے اور یار کی کشتی بیچ منجھدار میں چھوڑ دے یہ کالیا کا شیوا نہیں۔ رک ذرا۔'' اتنا کہہ کر وہ پھر تارا نامی اپنے ساتھی کی طرف پلٹا اور اس سے بولا۔

''میں نے جو تجھ سے کہا، وہ تو نے سن لیا، اب یہ بتا یہ سالا تھانے دار مجھ سے کس بیان پر دستخط کروانا چاہتا ہے؟ پتا تو چلے معاملہ کیا ہے؟'' اس کی بات پر تارا بہ یک ترنت بولا۔

''تو نے جس آدمی کو زخمی کیا تھا، وہ مر چکا ہے اور.....''

''ابے لے..... کیا بولنا پڑا ہے۔ تو۔ کالیا برا ضرور ہے لیکن اس نے آج تک کسی کی جان نہیں لی۔ نہ کسی بے گناہ کے خون سے ہاتھ رنگے ہیں۔ وہ سالا سیٹھ کیسے مر گیا؟ میں نے تو اسے معمولی زخمی کیا تھا؟ ڈرانے دھمکانے کے لیے۔''

''مر گیا وہ، لگ گیا ہوگا اسے زخم، کسی نازک جگہ پر، پہلے ہی وہ دل کا مریض تھا۔'' تارا بولا۔

''پر اب تجھے یہی بیان دینا ہے کہ تو اسے لاڈلہ سائیں کے آدمیوں سے بچانا چاہتا تھا۔ اس کے آدمی اسے لوٹ کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ اور تجھے دھر لیا گیا۔''

''ہم۔ ٹھیک ہے۔ چلے گا۔'' کالیا نے لمحے بھر کو کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''پر سمجھ میں نہیں آرہا۔ یہ قصہ کیا ہے؟ وہ سیٹھ مر کیسے گیا؟ کہیں استاد نے تو؟'' اس نے کہتے ہوئے، تارا کی طرف تشکیک بھری نظروں سے دیکھا تو وہ جھلا کر بولا۔

''ابھی یہ ساری باتیں چھوڑ، وقت کو دیکھ، کیا کہتا ہے پھر، تیار ہے اس بیان پر دستخط کرنے پر؟''

''ابے لے۔ کہا ناں۔ چلے گا۔ کردوں گا دستخط۔ پر میرے اس یار کا بھی استاد کو بندوبست کرنا ہوگا۔''

کالیا کی بات پر تارا چند ثانیے اپنے ہونٹ بھینچے کچھ سوچتا رہا۔ اس کے بعد بولا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

"ٹھیک ہے میں استاد کو بتا دوں، وہی اوپر والوں سے بات کرے گا، ابھی آتا ہوں۔"

تارا یہ کہہ کر جس تاریکی سے آیا تھا اسی طرف لوٹ کر غائب ہوگیا۔

حوالاتی کوٹھڑی میں کچھ لمحے کے لیے دھڑکتی ہوئی خاموشی چھائی رہی۔ پھر میں نے کالیا سے پوچھا۔

"یار کالیا! یہ کیا چکر ہے؟ کون مر گیا اس جھگڑے میں؟ کیا واقعی ایسا ہوا تھا کہ تو نے......" میں نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ بولا۔

"ہاں!" کالیا نے کہا۔ "لیکن، یہ واردات کوئی اور تھی، میں اسے انجام دے رہا تھا مگر پتا نہیں یہ سالا سیٹھ کو کس نے ہلاک کر دیا۔"

"تو پھر تم اس جھوٹے بیان پر دستخط کر دو گے؟"

"یہاں سے نکلنے کے لیے کرنا ہی پڑے گا۔"

"کیا تم نہیں سمجھتے ہو کہ تمہارے اس طرح کے بیان پر دستخط کرنے سے کوئی اور بے گناہ پھانس لیا جائے گا؟" میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا تو وہ میری طرف کچھ چونکتی ہوئی نظروں سے تکنے لگا، پھر ہنسا اور اسی انداز میں بولا۔

"ابے لے۔ ہماری اس کالی دنیا میں یہ سب چلتا ہے۔ کم کوئی بھی نہیں ہوتا، نہ مارنے والا نہ مرنے والا۔ اب جو یہ سیٹھ تھا، کیا نام تھا۔ سالے کا۔ اپنے جیسا جیسا گول مٹول ہی نام تھا اس کا۔ ہاں! یاد آیا۔ سیٹھ گلاب...... ایک نمبر کا جواری، عیاش پرست اور دوسروں کا مال غصب کرنے والا مگر میں تو اس سے صرف بھتا وصول کرنے گیا تھا، اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ کہ اتنے میں چند اور لڑکے بھی آن کودے، یہ ہمارا مخالف گروپ تھا، جس کا تعلق لاڈلہ سائیں سے تھا۔ وہ سیٹھ انہی لوگوں کو باقاعدگی سے بھتا دیا کرتا تھا۔ اسی لیے وہ اسی کی مدد کو کودے تھے۔"

"سمجھ گیا، مگر اس کا مرڈر کس نے کیا آخر؟" میں نے کہا۔

"یہی تو میری سمجھ میں نہیں آرہا؟" وہ بولا، تو مجھے اس کی ابھی تھوڑی دیر پہلے اپنے ساتھی تارا سے کہے ہوئے الفاظ یاد آگئے۔ لہٰذا میں نے کہا۔

"لیکن ابھی تو تھوڑی دیر پہلے ہی تم نے ایک خدشہ ظاہر کرتے ہوئے اپنے ساتھی تارا سے کہا تھا کہ۔ یہ تمہارے اپنے استاد بھا بھانے ہی کروایا ہوگا۔"

"ابے لے۔ تیرا تو بڑا دماغ چلتا ہے۔" وہ مسکرا کر معنی خیز انداز میں بولا۔ "فوراً بات پکڑ لی میری۔ ہاں! مجھے کچھ ایسا شک ہوتا تو ہے۔ کیوں کہ بھتے کے سلسلے میں یہ معاملہ "اور لپٹنگ" کا ہو چلا تھا، یعنی ایک ہی آدمی سے دو مخالف گروپوں کا بھتا لینا۔ چل چھوڑ۔ جگری! یہ لمبے چکر ہیں۔ ابھی یہاں سے نکلنے کی بات کر۔"

اس نے کہا اور میں بھی اپنا سر جھٹک کر خاموش ہو رہا۔

کافی دیر بیت چلی۔ اسی وقت انسپکٹر کی وردی میں ایک افسر وہاں آیا، اپنی وردی سے ہی مجھے اس تھانے کا ایس ایچ او نظر آرہا تھا۔ وہ دوسرا شاید اس کا ماتحت تھا اور غالباً یہی کالیا سے اس ٹائپ شدہ تحریری بیان پر دستخط لینا چاہتا تھا۔

اپنی مخصوص وردی سے ایس ایچ او نظر آنے والا یہ پولیس افسر خاصا موٹا تازہ اور کچھ توندیل سا تھا۔ رنگت سانولی اور قدرے جھلسی ہوئی تھی۔ آنکھیں بیل کی طرح موٹی اور صورت سے ہی یہ ایک بلا کا راشی دکھائی دیتا تھا۔

وہ اکیلا تھا۔ قریب آکر اس نے ہمیں انگلی کے اشارے سے بلایا۔ میں اور کالیا اٹھ کر سلاخ دار دروازے کی طرف آگئے۔ اس کا چہرہ واضح ہوتے ہی مجھے ایک نامعلوم سی بے چینی کا احساس ہونے لگا۔ اس کا سبب اس کی جھلسی ہوئی رنگت والے چہرے کی کرختگی اور بیل جیسی موٹی آنکھوں میں ہلکورے لیتی وہ وحشت تھی جو مجھے اس کے فرعون صفت مزاج کا پتا دیتی محسوس ہوتی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں موٹا سا سیاہ رول تھا۔

اس کے سینے پر لگے ٹیگ پر مجھے اس کا نام، انسپکٹر راجا دلاور معلوم ہوا۔

بہر طور۔ قریب پہنچتے پر اس نے صرف ایک نظر سلاخوں کے باہر سے میرے ساتھ کھڑے کالیا پر ڈالی تھی، اس کے بعد مجھے گھورنے لگا اور پھر جیسے کالیا کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہو کر بھاری آواز میں بولا۔

"ضمانت کرانے کے لیے کیا تمہارا کوئی اپنا نہیں ملا جو تم نے یہاں کے انجان قیدیوں سے مدد کی بھیک مانگ لی۔" اس کا انداز تضحیک آمیز تھا۔ مجھے واقعی اپنی سبکی کا احساس ہوا، مجھ سے کوئی جواب نہ بن پا رہا تھا کہ اچانک کالیا نے درمیان میں اس سے کہا۔

"انسپکٹر صاحب! یہ اپنا ہی یار ہے۔ آپ دستخط کی بات کرو، میں تیار ہوں۔"

انسپکٹر نے اس کی طرف ایک خشمگیں سی نگاہ ڈالی تو کالیا پھر اس سے بولا۔ "صاحب! اس کا کوئی اتنا بڑا جرم بھی نہیں ہے۔ بس اب نکلنے کی بات کریں۔"

"ابے چپ قینچی کی طرح تیری زبان چلتی جاتی

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ہے۔'' انسپکٹر نے اسے جھڑک دیا۔ اور کالیا نے فوراً مٹھکہ خیز انداز میں اپنے ہونٹوں پہ انگلی رکھ دی۔ مجھے کچھ ایسا ہی لگا تھا کہ دونوں کے درمیان بہت پہلے سے شناسائی تھی۔ پھر انسپکٹر نے مجھ سے میرے جرم کی زبانی کلامی تفصیل چاہی جو میں نے اسے دے دی۔ اس کے بعد وہ کچھ دیر تک سوچتا رہا۔ پھر کالیا سے گمبھیر لہجے میں بولا۔

''تم ذرا باہر آؤ۔ ایک بات کرنی ہے تم سے، پھر اس کا بھی کچھ سوچتے ہیں۔'' وہ یہ کہہ کر واپس پلٹ گیا۔ اسی وقت ایک سنتری آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں چابیوں کا بڑا سا گچھا تھا۔ وہ کالیا کو نکالنے آیا تھا۔ جبکہ کالیا کے چہرے پہ الجھن کے آثار تھے۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی اور کہا۔

''کالیا! تو ابھی چلا جا۔ ضد نہ کر۔ انسپکٹر کی بات تو سن لے وہ کہتا کیا ہے؟'' میری بات پر کالیا نے مجھ سے ایسی بات کہہ ڈالی کہ جسے سن کر ایک طرف تو مجھے کسی گہری تشویش نے آن گھیرا تو دوسری طرف مجھے اس کی ذہانت کا بھی معترف ہونا پڑا تھا۔

''ابے لے۔ جگری! مجھے تو تیرا معاملہ کچھ اور ہی رخ اختیار کرتا ہوا نظر آ رہا ہے۔ تیرے سے زیادہ سنگین جرم تو میرا ہے۔ تیرا تو کچھ بھی نہیں ٹھہرتا ہے تجھے کسی سوچی سمجھی سازش کے تحت۔ پھنسانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔''

یہی وہ اس کے الفاظ تھے جس نے مجھے پریشان کر دیا تھا۔ وہ آگے بولا۔

''ایک بات بتا۔ جس آدمی سے تیرا پنگا ہوا تھا وہ اسپتال وغیرہ میں تو داخل نہیں ہے ناں؟ میرا مطلب ہے وہ زندہ تو ہے ناں؟ اس کی کوئی خیریت کی اطلاع ملی ہے تجھے اب تک؟'' اس کے ذومعنی سنسنی خیز لہجے نے جانے کیوں مجھے اندر سے لرزا کر رکھ دیا۔

''ابے لے۔ جگری! تو تو پریشان ہو گیا۔ خیر، تو فکر نہ کر۔ مجھے ذرا انسپکٹر سے ملنے دے۔ آتا ہوں۔ پریشان مت ہونا۔'' وہ دوستانہ انداز میں میرا کاندھا تھپتھپا کر سنتری کے ہمراہ چلتا بنا اور میں وہیں اکیلا کھڑا سوچتا رہ گیا۔

☆☆☆

کیا تھا یہ سب؟ کیا برسوں پرانی کہانی کو دوبارہ دہرایا جانے والا تھا۔ یا پھر ظلم و ناانصافی کی ایک اور نئی داستان رقم ہونے والی تھی؟ کالیا کا اس انداز سے میرے سامنے بہ عین ایسے ہی اپنے خدشات کا اظہار کرنا جس کا یہاں آتے ہی مجھے بھی احساس ہونے لگا تھا، وہ اب معمولی بات نہیں رہی تھی۔

دال میں کچھ کالا ضرور تھا۔ میں اب بے چینی سے اگلے پلوں کا انتظار کرنے لگا۔

کافی دیر انہی وسوسوں اور اندیشناک سوچوں میں بیت گئی، تو کالیا کی آمد ہوئی۔ میں جیسے یک ٹک اس کا چہرہ تکتا رہا جب تک کہ وہ قریب نہیں آ گیا۔ اس کے ہمراہ سنتری بھی تھا۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ کالیا کے ہاتھوں میں کوئی ہتھکڑی بھی نہیں تھی لگتا کچھ ایسا ہی تھا مجھے جیسے اس کی ضمانت یا بالفاظ دیگر ''مک مکا'' ہو چکا تھا۔

''تم جاؤ ذرا۔ میں اس سے اکیلے میں کچھ باتیں کر کے آتا ہوں۔'' کالیا نے ساتھ آئے سنتری سے کہا۔ اس کا لہجہ مجھے انتہائی سنجیدہ محسوس ہوا۔ سنتری چلا گیا۔ کالیا کے یہاں انداز و اطوار سے مجھے صاف لگتا تھا کہ اس کی یہاں اکثر ''ضیافت'' ہوتی رہتی تھی۔

''جگری! تیرا ایک ذرا سا معمولی مسئلہ جان بوجھ کر الجھایا جا رہا ہے، میں تیرے سے ایک بات پوچھنے آیا ہوں۔ فیصلہ تیرے ہاتھ میں ہے ذرا سوچ سمجھ کر جواب دینا مجھے۔''

میری تیز نظریں، گویا سماعت بن گئی تھیں اور اسی کے چہرے پہ ثبت تھیں، وہ بولا۔

''میری ضمانت ہو چکی ہے، مگر ابھی میں نے باہر جانے کا فیصلہ نہیں کیا ہے۔ ضد یہی ہے میری کہ میں تیرے ساتھ ہی باہر نکلوں گا۔ اب دو راستے ہیں میرے پاس یا تو ادھر ہی رکا رہوں تیرے پاس اور اپنی آنکھوں سے دیکھتا رہوں کہ تیرے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟ یا میں تیرے لیے کیا کر سکتا ہوں یہاں رہتے ہوئے، مگر اس میں ایک مسئلہ ہے، تیرے ساتھ یہاں جو کچھ کیا جائے گا۔ وہ میری نظروں کے سامنے نہیں آنے دیا جائے گا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ میں باہر نکل کر تیری رہائی کے سلسلے میں کچھ کروں، اور میرا خیال ہے اس طرح میں تیرے لیے بہت کچھ کر سکتا ہوں۔ بول کیا کہتا ہے اب تو؟ یہ میں اسی لیے تجھے بتا رہا ہوں کہ تو کسی غلط فہمی میں نہ پڑے۔ کالیا تیرا یار بن چکا ہے، وہ اب اس یاری سے پیچھے نہیں ہٹے گا۔''

میں نے غور سے اس کی بات سنی تھی اور اس دوران میرا ذہن بھی تیزی سے کام کر رہا تھا، اس میں کوئی شبہ نہ تھا کہ جو خدشہ اور جس سازش کی بو میں محسوس کر چکا تھا، وہ اس نے بھی سونگھ لی تھی، اب اگر یہ ضد لگا بیٹھتا تو اس کا کوئی فائدہ نہ ہوتا، کیوں کہ بہرحال اس کا اور میرا جرم الگ الگ نوعیت کا تھا، نہ ہی ہمارا کوئی ایسا آپس کا تعلق تھا، پھر یہ کوئی ضروری بھی نہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

تھا کہ ہم دونوں کو زیادہ عرصہ ایک ساتھ رکھا جاتا، لیکن میرے نزدیک قابلِ غور بات یہ تھی کہ..... یہاں سے جا کر کالیا میری کیا مدد کر سکتا تھا؟ اور اندر میرے ساتھ رہتا تو کیا کرتا؟

مجھ پر شدت سے مایوسی کا غلبہ طاری ہونے لگا، جانے مجھے کس بھیانک سازش میں پھنسایا جانے والا تھا کہ کبھی میری رہائی کے سلسلے میں بے بس ہی نظر آرہے تھے۔ میرا ستا ہوا، مایوس اور دل گرفتہ پڑتا چہرہ دیکھ کر کالیا نے بے اختیار اپنے دونوں ہاتھ سلاخوں کے اندر کر کے مجھے اپنے ساتھ لگانے کی کوشش کی اور بولا۔

''ابے لے۔ جگری! تیرا تو چہرہ ہی اتر گیا۔ ہمت پکڑ یار! تو میری داستان سنے تو اپنا کلیجہ ہی تھام لے۔ یہ تو کچھ بھی نہیں، حوصلہ کر جگر! سب ٹھیک ہو جائے گا ایک دن۔ شاباش!'' اس نے تھپکی دی مجھے اور آہستگی سے الگ ہوا، میں نے بہ مشکل اپنے امڈتے آنسوؤں کو پیا تھا مگر جب کالیا سے بولا تو ایک دبی دبی رقت تلے میری آواز واضح طور پر لڑکھڑا رہی تھی۔ بولا۔

''میرے دوست! تو جو بہتر سمجھتا ہے وہی کر۔ ابھی میرا دماغ کام نہیں کر رہا۔ میں نے سب کچھ اپنے اللہ پر چھوڑ دیا ہے۔'' اس پر وہ بولا۔

''میری ایک بات سن لے غور سے۔ یہ انسپکٹر راجا دلاور ایک نمبر کا کرپٹ پولیس آفیسر ہے۔ رشوت تو یہ مگر مچھ کی طرح منہ پھاڑ کر لیتا ہے۔ اور دوسرے درجے کی فطرت کا مالک ہے، ہوسکتا ہے یہ تجھے سبز باغ دکھا کر تیرے ساتھ کسی طرح کی معاملہ داری کرنے کی کوشش کرے، خبردار! ایسا کچھ نہیں کرنا ہے تو نے اس کے ساتھ۔ یہ تجھ پر ابھی تشدد نہیں کر سکتا، ہاں! تجھے ڈرا دھمکا کر اپنا ایسا کوئی کام نکلوانے کی کوشش ضرور کرے گا۔ بس تو اس کی کوئی بات مت ماننا۔ میں ابھی جا رہا ہوں۔ تو فکر نہ کرنا۔ کل صبح سے پہلے تیری رہائی کے احکامات جاری ہو جائیں گے۔ چلتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ مجھ سے مضبوطی کے ساتھ مصافحہ کر کے چلا گیا۔

میں واپس فرش پر آ کر بیٹھ گیا۔ کالیا نے جس طرح مضبوط لہجے میں میری رہائی کا یقین دلایا تھا، سچی بات تو یہ تھی کہ مجھے اس کا بھی یقین نہ تھا۔ تاہم اس کی رخصت ہوتے وقت مجھے اس کی ایک بات نے نئی پُرتفکر سوچ میں ڈال دیا تھا کہ آخر اسے ایسا کیوں کر اندازہ ہوا تھا کہ اس کے جانے کے بعد یہ انسپکٹر راجا دلاور میری رہائی کے بدلے میں، مجھ سے کسی ایسی خطرناک معاملہ داری کرنے کی کوشش کرے گا جس میں اس کا (میرے دشمنوں) کا فائدہ اور میرا نقصان ہوگا۔ یا پھر شاید کالیا اپنی اب تک کی زندگی کے تلخ تجربے کی بناء پر ایسا کہہ گیا تھا۔ ممکن ہو ایسا کچھ سرے سے ہی نہ ہو۔ بہرطور۔ میں نے اس کی یہ بات پلے سے باندھ تو لی تھی۔

وقت گزرتا رہا۔ اس دوران مجھے کھانے پینے کا بھی کچھ ہوش نہ رہا تھا۔ نہ ہی دیا..... گیا تھا۔ مگر کالیا کے جاتے ہی ایک سنتری بڑی سی ایک ٹرے میں میرے لیے کھانے پینے کی اشیاء لے آیا، جسے دیکھ کر مجھے ایک عجیب سی حیرت ہوئی تھی۔ میں نے تو سن رکھا تھا کہ قیدیوں کے ساتھ جہاں اور برا سلوک کیا جاتا ہے وہاں کھانے پینے کے نام پر بھی سڑا بسا کھانا دیا جاتا ہے مگر یہاں تو اس ٹرے کو دیکھ کر ہی میں حیران ... رہ گیا تھا۔ اس میں مرغی کا سالن اور روغنی روٹیوں کے علاوہ ٹھنڈے پانی کی بوتل بھی تھی۔ بھوکا پیاسا تو میں تھا ہی، ایسا کھانا دیکھ کر دیوانہ سا ہو گیا اور ٹوٹ پڑا۔ کھانا ابھی ختم ہی کیا تھا کہ وہی سنتری دوبارہ آیا اور بولا۔

''چلو، صاحب نے تمہیں بلایا ہے۔'' میں سمجھ گیا کہ ''صاحب'' سے اس کی مراد وہی انسپکٹر راجا دلاور تھا، جس کی طرف سے مجھے کالیا پہلے ہی ''بریف'' کر چکا تھا۔ بہرطور، میں خاموشی سے اس کے ساتھ چل پڑا اور ایک کمرے میں آ گیا۔ یہ دوسرا کمرا تھا اور پہلے والے کمرے سے نسبتاً بہتر حالت میں تھا۔ یوں تو یہ بھی آف ٹائپ کمرا ہی تھا۔

ایک بڑی سی میز کے پیچھے بھاری بھرکم چیئر پر وہ بڑے غصے کے ساتھ برا جمان تھا۔ اس کی وحشتیں لی ہوئی نظریں میرے چہرے پہ گڑی ہوئی تھیں۔

''بیٹھو۔'' اس نے کھرکھراتی آواز میں مجھے اپنے سامنے والی کرسی میں بیٹھنے کو کہا۔

پھر پشت گاہ سے ٹیک لگا کر مجھ سے استفسار یہ بولا۔

''نعمان احمد نام ہے تمہارا؟''

''جی ہاں۔'' میں نے مختصراً اثبات میں جواب دیا۔

''ولدیت احمد حسین؟''

''جی ہاں۔''

''احمد حسین، جسے کچھ ہی عرصہ پہلے قتل کے جرم میں پھانسی دی گئی تھی؟''

''میرا باپ قاتل نہیں تھا۔'' میں نے فوراً کہا۔ میری رگوں میں لہو کی گردش یک دم تیز ہو گئی تھی۔ انسپکٹر اپنا ایک ہاتھ جھٹکنے کے انداز میں یہ ظاہر بے پروانہ انداز میں بولا۔

''اس بحث کو چھوڑو، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں، بس محض تمہارے تعارف کے حوالے سے ذرا تصدیق کر رہا تھا۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''جی'' میں نے ہولے مختصراً کہا تو وہ اپنے حلق سے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے اپنی بھاری بھرکم کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور ساتھ میز کی سطح پر رکھا وہ سیاہ رنگ کا رول بھی اٹھالیا، جسے اب وہ ایک ہاتھ میں تھام کر اس کی ہولے ہولے پُرسوچ انداز میں ضربیں اپنے دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر مارنے لگا اور۔ چند قدم۔ دروازے تک گیا پھر واپس لوٹ کر میری کرسی کے عقب میں قریب کھڑا ہوگیا۔

جانے کیوں ایسے میں میرا دل تیز تیز دھڑکنے لگا اور ایسے ہی وقت میں، میرے دل و دماغ میں کالیا کی باتیں گونجنا شروع ہوگئیں۔

کئی پل اسی تھکی ہوئی سی خاموشی میں بیت گئے، اس کے بعد مجھے اپنے کاندھے پر اسی رول کی ہلکی ہلکی تھپکی کی طرح کی ضربیں لگتی محسوس ہوئیں اور انسپکٹر راجا دلاور کی آواز ابھری۔

''تم پرسی آرنمبر پہ ایف آئی آر کٹی ہوئی ہے۔ اور یہ معمولی بات نہیں، کچا میڈیکل سرٹیفکیٹ ایم ایل او کی طرف سے آچکا ہے، مگر تمہارا چالان عدالت میں چلا جائے تو تمہیں جرمانے کے ساتھ سزا بھی لگ سکتی ہے۔ بعد جیل کے اندر تمہارے ساتھ اور بھی بہت کچھ ہوسکتا ہے۔ مگر میں نے ابھی تک عدالت میں تمہارا چالان جانے سے روکے رکھا ہے۔'' وہ اتنا کہہ کر رکا۔ مجھے اس کی یہ بات بڑی ہولناک محسوس ہوئی تھی کہ ''بعد میں جیل کے اندر تمہارے ساتھ اور بھی بہت کچھ ہوسکتا ہے۔''

میرے خیال میں یہ ایک واضح دھمکی تھی کہ جیل کے اندر ایک قیدی کی حیثیت سے میرے ساتھ کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ گویا میرے دشمنوں کے ہاتھ اس قدر لمبے تھے۔ یا یہ محض ایک ڈراوا تھا۔ اس ضمن میں مجھ سے یہ تو ندیل پولیس افسر کیا کام لینا چاہتا تھا؟ میں وہ سننے کے لیے بے چین تھا۔ لہٰذا کسی بحث اور سوالات میں پڑے بغیر مختصراً بولا۔

''جی جناب! اسے میں آپ کی مہربانی ہی کہہ سکتا ہوں۔''

''گڈ'' وہ بولا۔ یہ میرے عین توقع کے مطابق تھا۔

وہ دوبارہ گھوم کر اپنی بھاری بھرکم چیئر پر براجمان ہوگیا۔ میری نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور اس کی بھی، مگر پھر اس نے اپنی میز کی دراز سے ایک کاغذ نکال کر میرے سامنے کردیا۔ یہ ایک ٹائپ شدہ اسٹیمپ پیپر تھا۔

''اسے ایک نظر دیکھ لو۔ تمہیں اس پر اپنے دستخط کرنا ہیں، یہ ایک عام سا معافی نامہ ہے۔ یا، یوں کہہ لو کہ یہ ایک مخالف کے ساتھ صلح نامہ۔''

میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ یہ اسٹیمپ پیپر اٹھا کر ایک نگاہ اس پر ڈالی اور پڑھنے لگا۔ اور پھر جیسے جیسے اسے پڑھتا گیا، میری آنکھیں پھٹی پھٹی رہ گئیں۔

انسپکٹر راجا دلاور جس کاغذ کو محض ایک عام معافی نامہ یا صلح نامہ (تھوڑی رعایت کے ساتھ) میرا ''نجات نامہ'' کہنے پر تلا ہوا تھا وہ درحقیقت مجھے صرف اور صرف اپنے گلے کا پھندا اور اپنی تھانے یا جیل سے باہر کی ساری زندگی دشمنوں کے سامنے سر جھکاتے رہنے پر مجبور کرنے کا گویا ''وسیع بنیادوں'' پر ایک طویل المیعاد منصوبے کے سوا کچھ نہ تھا۔ میرا جیسا سیدھا سادہ عام سا پڑھا لکھا نوجوان، ممکن تھا کہ کچھ گھنٹے حوالات کی ''ہوا'' کھانے کے بعد اس پر دستخط بھی کردیتا، اگر کالیا کی پیشگی مجھے نصیحت نہ ہوتی تو۔ وہ تھا تو میری ہی عمر کا، مگر زندگی کے بعض تلخ حقائق سے وہ شاید بہت چھوٹی سی ہی عمر سے گزر کر اتنا کندن تو ہو ہی چکا تھا، جس کا میں عشر عشیر بھی نہ تھا، نیز اس راہ پُرخار میں اس کا تجربہ بھی مجھ سے بہت آگے کا تھا۔

یہی سبب تھا کہ میرے ساتھ حوالات میں چند گھنٹے گزارنے کے اور اس تو ندیل انسپکٹر کو دیکھنے کے بعد بہت کچھ اندر ہی اندر بھانپ گیا تھا اور جاتے وقت جہاں مجھے میری جلد رہائی کی بھی نوید سنا گیا تھا وہاں، مجھے یہ کارآمد نصیحت بھی کرچکا تھا کہ میں یہاں کسی ایسے جھانسے میں نہ آؤں۔

تاہم کالیا نے مجھے ایک تسلی تو جاتے وقت ضرور دی تھی کہ کچھ بھی ہوجائے یہ انسپکٹر مجھ پر اب تشدد سے کام نہیں لے سکتا، ہاں! ڈرا دھمکا ضرور کرسکتا ہے۔ میرے لیے اس کی یہی تشفی بہت تھی۔

لیکن میں سمجھ رہا تھا کہ مجھے کچھ اپنی عقل سے بھی کام لینا چاہیے تھا، اس وقت میں بہرحال، تھانے میں تھا، میرا معمولی جرم ''سنگین'' کیا جانے والا تھا، یا پھر یہ محض ایک ڈراما تھا یا جو کچھ بھی تھا، میں غلط قسم کے چکر میں گھن چکر بنا ہوا تھا، جس کی باگ اس پولیس افسر کے ہاتھ میں اس وقت تھی۔

چنانچہ میں نے محتاط اور متعدل رویہ (جو میری طبیعت کا خاصا بھی تھا) اپناتے ہوئے، پہلے تو اس اسٹیمپ پیپر کو واپس میز پر اسی طرح رکھ دیا، اس کے بعد اپنے اس جعلی نجات دہندہ سے بولا۔ ''جناب! مجھے تو یہ معافی نامے سے زیادہ اقرار نامہ دکھائی دیتا ہے، وہ بھی ایسا اقرار نامہ جس کی رو سے میں نجانے کتنے بڑے سنگین جرائم کا مرتکب ہوا ہوں کہ مجھے تو اپنے آپ سے ہی

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

خوف محسوس ہونے لگا ہے، کیوں کہ اس میں تو کئی ایسی باتیں بھی درج ہیں، جن سے سرے سے میرا کوئی تعلق ہی نہیں بنتا ہے۔''

میری نپی تلی بات سن کر، انسپکٹر راجا دلاور نے بڑی خرانٹ نظروں سے مجھے گھور کر دیکھا یوں کہ جیسے اشارہ کناہ ہو۔ ''میری بات مان لو شریف آدمی! ورنہ اچھا نہ ہوگا'' مگر مجھے اس کی چنداں پروا نہ تھی، کیوں کہ جانتا تھا میں کہ یہ ابھی مجھ پر بہ زور تشدد کرنے کی پوزیشن میں نہیں رہا ہے۔

''رہائی کے صلح میں اب اتنا تو تمہیں بھی کمپرومائز کرنا پڑے گا ہمارے ساتھ۔'' بالآخر وہ مجھ سے گمبھیر لہجے میں بولا۔

''ہمارے ساتھ'' اس کی مراد اگر میرے دشمن بہ شمول قانون تھا، تو یہ میرے حق میں اچھا نہیں ہونے جا رہا تھا۔

''تم اپنا حال دیکھ ہی رہے ہو۔ ابھی تک تمہاری کوئی ضمانت بھی نہیں کروا سکا ہے۔ ضمانت کروانے والے ایسے ہوتے ہیں جیسے اس کالیا کے آدمی تھے۔ تمہارے بعد وہ یہاں آیا، پانی پیا اور چلا بھی گیا۔''

اس نے اپنا جملہ مکمل کیا۔ جیسے مجھے میری اوقات یاد دلانے کی کوشش کی تھی اس نے۔ تاکہ میں اپنے کم مائیگی کے احساس تلے مایوس ہو کر اس کی وہ بات مان لوں جو ساری عمر کے لیے میرے گلے کا پھندا بن سکتی تھی۔ میں نے باوجود اس کے اپنا پہلے والا انداز اور لہجہ اپناتے ہوئے اس سے کہا۔ ''جناب! آپ کی بات شاید ٹھیک ہو، لیکن میرے لیے اس خود ساختہ بیان پر دستخط کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں ایسا نہیں کر سکتا۔''

''افسوس کا بچہ! بند کر اپنی بکواس۔'' وہ یک دم پھٹ پڑا۔ اور ساتھ ہی سیاہ رول کو طیش تلے میز کی سطح پر زور سے بجا بھی دیا، جس سے میں لمحے بھر کو اچھل پڑا تھا۔ مجھے لگا کہ یہ اپنی اصلی فرعونی صفت پر اتر آیا تھا۔ جس میں جلاد صفت روایتی پولیس انسپکٹر ایک بے گناہ اور مجبور و بے بس قیدی کو ''جور و زبردستی'' دھونس دھمکی سے زیر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

میں خود بھی اس کے یوں ایک دم بھر جانے پر حیران ہو گیا تھا، اور اندر سے ذرا خائف بھی کہ کہیں کالیا کا وہ اندازہ غلط ہی ثابت نہ ہو کہ مجھے یہ راشی پولیس افسر ڈرا دھمکا تو سکتا ہے مگر تشدد نہیں کر سکتا۔ جبکہ اس کا یہ جارحانہ انداز۔ کیا مجھ پر دوسرے طریقے سے دباؤ ڈالنے کا تھا؟

میں ابھی تک آنکھیں پھاڑے اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ ایک دم لال بھبوکا ہو گیا تھا۔ میرے چہرے پہ طاری اتھاہ خاموشی دیکھ کر وہ ٹھنڈا سا ہونے لگا اور بتدریج اس کا غصے سے سوجھا ہوا چہرہ معمول پہ آنے لگا، اور پھر جیسے اس نے ایک گہری سانس خارج کر کے اپنے اندر کے غصیلے پن کو اگل دیا، پھر اپنا لہجہ معتدل رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ ''دیکھو، میں نہیں چاہتا کہ تمہارے ساتھ کسی قسم کی سختی کروں۔ میں نے سنا ہے تم ایک پڑھے لکھے انسان ہو اور ایسے آدمی کو اس قسم کی باتیں سمجھانا آسان ہوتا ہے۔ مگر تم۔'' وہ رک گیا۔ پھر اس بار کرسی پر بیٹھے بیٹھے خود ہی ذرا آگے جھک کر میز سے وہ اسٹیمپ پیپر اٹھا کے میری طرف کیا۔ اور سناٹے دار لہجے میں بولا۔ ''لو، شرافت سے اس پر اپنے دستخط کر دو۔''

مجھے اس کا یہ انداز بالکل ایسا ہی لگا جیسے اس کا بس نہیں چل رہا ہو کہ وہ زبردستی میرا ہاتھ پکڑ کے اس میں قلم تھما کے کاغذ پر میرے دستخط لے ڈالے۔ مجھے اس کے انداز میں ایک ایسی عجلت کا احساس بھی ہوا جیسے، دیر ہو گئی تو اس کے پاس مجھ سے یہ سب کروانے کا شاید وقت نہیں رہے گا۔

میں نے ایک عام سے ردعمل پر مجبور ہو کر اس کے ہاتھ سے وہ اسٹیمپ پیپر تھام تو لیا مگر اس بار مجھے اپنے لہجے میں ڈر اور خوف کی جھجک لائے بغیر اٹل اور سنجیدہ لہجے میں کہنا پڑا۔ یہ ضروری تھا، ورنہ یہ خرانٹ آدمی مجھے بالکل ہی تھڑدلا سمجھنے لگتا۔

''سوری انسپکٹر صاحب! میں اس پر دستخط نہیں کر سکتا۔''

میرے لہجے کے حتمی پن نے اسے بھی شاید باور کرا دیا کہ میں اتنا بے وقوف اور بزدل نہ تھا جتنا وہ مجھے سمجھ رہا تھا۔

''اس میں تمہارا فائدہ ہے۔ دستخط کر دو۔'' وہ عجیب سے تحمل سے بولا۔ میرے اندر خود اعتمادی پیدا ہونے لگی تھی، بعض حالات میں میرے جیسے کیا ہر اس انسان میں یہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت آ جانی چاہیے کہ موجودہ حالات میں کسی بڑی مصیبت سے بچنے کے لیے چھوٹی مصیبت کو گلے لگانا دانش مندی ہوتی ہے۔ میں یہی کر رہا تھا۔ لہٰذا میں بھی اسی تحمل سے بولا۔

''نہیں سر! میں یہ نہیں کر سکتا اور برائے مہربانی مجھے اس غلط کام پر مجبور نہ کریں۔ میں واپس حوالات میں جانا پسند کروں گا۔''

میری بات پر اس کا چہرہ ایک بار پھر ابلنے کے قریب ہو گیا۔ اب میں بھی آبزرو کر رہا تھا کہ وہ خود بھی اس معاملے میں بے بس نظر آ رہا تھا اور اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ مجھ پر غیر انسانی تشدد سے کام لے کر مجبور کرنے کی کوشش کرے۔

کالیا کے یہاں سے جاتے وقت جو تنبیہہ الفاظ اس نے مجھ سے کہے تھے، تھوڑی دیر پہلے وہ مجھے بے معنی سے ا

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

معلوم ہو رہے تھے مگر اب راجا دلاور کے چہرے سے غیظ آلودہ اور بے بسی کے ''مشترکہ'' آثار دیکھ کر مجھے ان کی افادیت کا اندازہ ہونے لگا۔

وہ تھوڑی دیر تک مجھے بھناتی نظروں سے گھورتا رہا اس کے بعد وہ اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور ساتھ ہی قدرے جھک کر وہ اسٹیمپ پیپر بھی میز سے اٹھالیا اور اسے پھاڑنے کے انداز میں اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر جیسے آخری بار بولا۔

''یہی ایک موقع تھا تمہاری یہاں سے نجات کا جو تم نے ضائع کر دیا لیکن پھر بھی میں تمہیں ایک آخری موقع دیتا ہوں۔ کر رہے ہو اس پر دستخط یا ساری عمر جیل میں چکی پیسنے کا فیصلہ کر چکے ہو۔''

''میرا جواب اب بھی وہی ہے اور وہی رہے گا، جتنی بار آپ پوچھو گے۔'' میں نے بھی اسی لہجے میں جواب دے ڈالا۔

اس نے اپنے ہاتھ میں پھاڑنے کے انداز میں تھاما ہوا وہ اسٹیمپ پیپر، خاموشی سے اپنی میز کی دراز میں رکھ لیا اور کرسی میں بیٹھ کر میز پر رکھی گھنٹی پر ہاتھ مارا اور اسی دوران میری طرف گھور کر بولا۔ ''لگتا ہے، تمہیں کسی نے رہائی کے سلسلے میں سبز باغ دکھا رکھا ہے، میں اسے بھی جانتا ہوں دیکھ لیتا ہوں میں اسے بھی۔'' اس کا انداز تہدیدی تھا۔

اسی وقت ایک سنتری وہاں نمودار ہوا اور اسے سیلوٹ جھاڑ دیا۔ انسپکٹر راجا دلاور نے اس سے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ''لے جاؤ اسے۔''

چند لمحوں بعد میں دوبارہ اسی تنگ و تاریک حوالاتی کوٹھڑی میں مقید تھا۔ اور خاصا پُر امید اور مسرور تھا کہ زمانہ چشیدہ اور گھاگ کالیا کے الفاظ درست ثابت ہوئے تھے۔ یہ جلاد صفت نظر آنے والا انسپکٹر دلاور میرا کچھ نہیں بگاڑ سکا تھا۔ رہی اس کی تہدید تو ظاہر ہے، شکست خوردہ انسان کب اپنی ہار تسلیم کرتا ہے، وہ اسی طرح گیدڑ بھبکیوں سے کام لیتا ہے۔

تھوڑی دیر گزری۔ رات نصف پہر پہ تھی، ہر سو سناٹے کا راج تھا۔ سامنے مختصر سے کوریڈور پر مدھم روشنی تھی، میں ننگی اینٹوں والی دیوار سے اپنی پشت ٹکائے سیلن زدہ فرش پر بیٹھا تھا۔ نظریں میری سامنے ٹکی ہوئی تھیں مگر خود میں کہیں اور کھویا ہوا تھا۔ دفعتاً ہی ایک ہلکی سی آہٹ پر میں چونکا۔ نظروں پہ توجہ مختص ہوئی تو میں چونک پڑا۔ کسی کا سایہ متحرک پایا، انداز اس کا چوروں جیسا ہی تھا۔ وہ کوئی سنتری نہیں لگا، بلکہ یہاں سے فرار ہوتا کوئی قیدی مگر اس کا رخ بیرونی راستے کی بجائے، میری کوٹھڑی کی طرف تھا۔ اسی بات نے مجھے ٹھٹکنے پر مجبور کر دیا۔ اور میں اس پُراسرار سائے پر، جو اب ایک مکمل انسانی ہیولے کی صورت اختیار کر چکا تھا، اپنی نظریں جمائے اٹھ کھڑا ہوا۔

''شش۔ کوئی آواز مت نکالنا۔'' میرے قریب آنے تک اس نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا اور اپنی جیب سے چابیوں کا ایک بڑا سا گچھا نکالا اور سلاخ دار دروازے کے ایک طرف بنے مختصر سے سنگی طاقچے میں ڈال کر قفل کھول دیا۔

''باہر آجاؤ۔ جلدی۔'' وہ بولا۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کا چہرہ تکنے لگا، پھر الجھ کر اس سے مستفسر ہوا۔

''لل۔ لیکن تم کون ہو؟ اور اس طرح مجھے یہاں سے کیوں نکالنا چاہتے ہو؟''

''مجھے اپنے شیراز کالیا نے بھیجا ہے۔'' اس نے دھیمی سرگوشی میں کہا۔ اور میں کالیا کے ذکر پر چونک سا گیا۔ وہ آگے بولا۔ ''یہ سالا انسپکٹر دلاور تجھے آج صبح ہونے سے پہلے غائب کرنا چاہتا ہے تاکہ تجھے بعد میں مفرور ملزم قرار دے کر کسی جعلی پولیس مقابلے میں مروا سکے، وہ تیرے سر پر سنگین جرم بھی تھوپ سکتا ہے۔ شاید تم نے اس کی کوئی بات ماننے سے انکار کیا ہو۔

بہرحال جو بھی کیا تم نے اچھا ہی کیا اور کالیا کے مشورے سے ہی کیا ہوگا مگر اب بدطینت انسپکٹر کا یہ منصوبہ کھل چکا ہے۔ چلو اب، بڑی مشکلوں سے ہم نے یہاں کے عملے کو بھاری رشوت دے کر راضی کیا ہے، ویسے بھی اپنے کالیا کے لیے یہ بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ وقت کم ہے دیر مت کر۔''

میں اس کی زبانی اس رذیل صفت انسپکٹر راجا دلاور کے اس بھیانک منصوبے پر اندر سے لرز گیا۔ اس کی بات بھی مجھے ٹھیک ہی لگی تھی کہ وہ ناکامی پر تلملا کے اب اس اقدام پر اتر آیا تھا اور مجھے آخری تہدید بھی اس کی یاد تھی کہ وہ مجھ سے نمٹ لے گا۔

یہ بھی ممکن تھا کہ اپنی ناکامی کے بعد وہ کوئی ایسا داؤ کھیلنے کا ناپاک ارادہ رکھتا ہو، جیسا کہ کالیا کا یہ ساتھی، مجھے بتا رہا تھا مگر مجھے الجھن یہ ہو رہی تھی کہ کالیا مجھے جانتا تھا کہ میں کس قبیل کا آدمی تھا اور وہ میرے سلسلے میں ہمیشہ سیدھے راستے کا قائل تھا، پھر اس نے میرے لیے فرار کا یہ غیر قانونی راستہ کیوں اختیار کرنے کا سوچا تھا؟

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

مجھے اس کی یہ بات بھی یاد تھی، جو اس نے یہاں سے جاتے وقت ایک عزم مصمم کے طور پر مجھ سے کہی تھی کہ وہ مجھے صبح ہونے تک یہاں کسی بھی صورت میں نہیں رہنے دے گا، کیا خراب انسپکٹر دلاور کے اس ناپاک منصوبے کا اسے بھی کسی طرح علم ہو گیا ہو؟

''کیا سوچنے لگے بھائی؟ باہر کالیا ہمارا انتظار کر رہا ہے۔ جلدی کرو۔ خطرہ ہمارے سر پہ منڈلا رہا ہے۔'' مجھے سوچتا پا کر اس نے کہا اور کالیا کی باہر موجودگی کا سن کر پھر میں نہ ٹھہر سکا اور اس کے ہمراہ چل دیا۔

وہ مجھے تھانے کی عمارت کے مختلف چور گوشوں سے چھپتا چھپاتا ہوا لے کر باہر آ گیا۔

یہاں ہر طرف سناٹے کے سوا کچھ نہ تھا۔ ہم ایک بے رونق سی سڑک کے کنارے کھڑے تھے۔ مجھے یہاں اپنے اور اس ساتھی لڑکے کے سوا کوئی اور دکھائی نہ دیا۔

میں نے پیش گرد پر ایک نگاہ ڈالنے کے بعد اس سے کچھ پوچھنا چاہا تھا کہ اچانک وہ بھی جیسے متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے خود کلامیہ انداز میں بڑبڑایا۔

''یہ کالیا کدھر مر گیا۔ عین وقت پر؟ ٹھہرو میں ذرا اس سے بات کر لوں۔ ہو سکتا ہے وہ کوئی خطرہ بھانپ کر اِدھر اُدھر نہ ہو گیا ہو۔''

یہ بڑبڑاتے ہوئے اس نے اپنی جیب سے سیل فون نکالا اور رابطہ کرنے پر دھیمی آواز میں بولا۔

''ابے او۔ کالیا! تو کدھر مر گیا؟ ہم یہاں کھڑے ہیں جہاں تو نے ہمیں آنے کو کہا تھا۔ کیا؟ اچھا۔ او۔ چلو ٹھیک ہے۔ کدھر کھڑی ہے بائیک؟ او۔ یہ جگہ تو قریب ہی ہے۔ بس ٹھیک ہے۔ ہم اس میں آ جاتے ہیں۔ او کے بائی۔''

وہ کالیا سے خود ہی خود بات کرنے کے بعد۔ مجھے ایک طرف چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے آگے بڑھا اور میں حیران پریشان اس کے پیچھے چلتا چلا گیا۔ تھانے کے اطراف کا علاقہ ویران پڑا تھا۔ ہم اس کی عقبی دیوار کی باؤنڈری وال کے ایک آدم گذار سوراخ سے یہاں تک پہنچے تھے۔

ایک جگہ پر چند کھجوروں کا ایک خشک جھنڈ تھا وہاں ایک بائیک سائیڈ پر کچی ٹیکری پر پڑی تھی، اس نے فوراً بائیک سنبھالی اور مجھے پیچھے بیٹھنے کو کہا، جب تک میں اس کے پیچھے سوار ہوا، اس نے کک مار کے بائیک اسٹارٹ کر دی اور میرے سوار ہوتے ہی اس نے ایک طوفانی جھٹکے سے بائیک آگے بڑھا دی۔

وہ ویران اور سنسان سڑک پر بائیک طوفانی رفتار سے دوڑا رہا تھا اور میرا ذہن اس سے زیادہ تیز رفتاری کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

سچی بات یہ تھی کہ یہ سارا چکر ہی میری سمجھ سے بالاتر تھا اور بار بار نجانے کیوں مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میں کسی جھانسے میں تو نہیں آ رہا؟ کالیا پر مجھے پورا بھروسا تھا، وہ کوئی ایسی غلط حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ خود اپنے لیے شاید اس کا ہر راستہ ہمیشہ کھلا ہی رہتا تھا لیکن میرے سلسلے میں وہ ہمیشہ محتاط روی سے قدم اٹھاتا تھا۔ تو پھر۔ اس نے یہ قدم کیوں اٹھایا تھا؟ یہی بات مجھے ہضم نہیں ہو پا رہی تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ میرا معاملہ اتنا گمبھیر اور خطرناک صورت اختیار کر گیا ہو اور اس راستے کے سوا اس کے پاس اور کوئی چارہ بھی نہ بچا ہو، مجبوراً اس نے یہ سب کیا ہو۔

اس کا یہ ساتھی بھی اسی کی عمر کا تھا اور اسی کے ''قبیل'' کا ہی نظر آیا تھا مجھے۔

مگر اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ وہ خود کہاں تھا؟

''تم نے کہا تھا کالیا باہر ہمارا انتظار کر رہا ہے۔ مگر، وہ کہاں غائب ہو گیا؟''

میں نے بالآخر اس سے پوچھ لیا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا، شاید اس کا سارا دھیان بائیک چلانے پر مرکوز تھا اور پھر شاید اس لیے بھی کہ بائیک ایک اوپن سواری ہوتی ہے، کانوں میں تیز ہوائیں شائیں شائیں کر رہی تھیں۔ وہ نہ سن سکا تھا میری بات۔

میں بھی خاموش رہا مگر جانے کیا بات تھی میرا دل مطمئن نہیں ہو رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ کہیں کوئی گڑبڑ ضرور تھی مگر اب کیا کیا جا سکتا تھا۔ پیش آمدہ حالات ہی ایسے رہے تھے کہ یہ سب کچھ میری توقع کے ایک دم برخلاف ہوا تھا اور میں نے بھی گویا خود کو اس بہتے حالات کے دھارے پہ چھوڑ دیا تھا۔

اب مجھے ہر لمحے یہی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ ابھی عقب سے پولیس کی تیز سیٹیاں سنائی دیں گی اور بہت سی گاڑیاں ہمارے تعاقب میں دوڑی چلی آئیں گی۔ لیکن شکر ہی رہا کہ ابھی تک ایسا کچھ نہیں ہوا۔

بائیک کا سفر نصف گھنٹے بعد تمام ہوا۔ یہ ایک فرار تھا۔ تھانے سے فرار۔ اور قانون سے فرار۔ لہٰذا میں ابھی اپنے گھر نہیں جا سکتا تھا۔ کالیا سے ملنا اور اس کے اس سارے کھڑاگ کے بعد اس کا مشورہ ضروری تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

سفر ایک ایسی جگہ تمام ہوا، جو انڈسٹریل علاقہ کہلاتا تھا، یہاں ایک چھوٹے سے مکان میں ہم داخل ہوئے تھے، اس نے اپنی بائیک بھی اندر کرلی تھی۔

چھوٹے سے صحن اور دو تنگ و تاریک کوٹھڑی نما اس گھر کی خاموش فضا ہی مجھے آسیبی معلوم ہورہی تھی۔ ایک کمرے میں موجود جھلنگا سی کھری چارپائی اور ایک کرسی پڑی تھی۔

اس نے بتی جلادی۔ میں نے پہلی بار بہ غور اس کا جائزہ لیا، درمیانی قامت کا یہ شخص مجھے اگرچہ کالیا کے قبیل کا ہی نظر آتا تھا مگر اس کے انداز و اطوار میں کوئی ایسی بات تھی ضرور جو مجھے بے چین سا کررہی تھی۔ یا پھر یہ میری چھٹی حس تھی جو اس کی طرف سے مجھے "کھٹکا" رہی تھی۔

میں نے اس سے وہی سوال دہرایا۔ جو بائیک پر کیا تھا۔ وہ جواباً بلا تامل بولا۔

"صرف کالیا ہی نہیں، میرے ساتھ ایک اور بھی ساتھی تھا، وہ باہر ہمارے منتظر تھے۔ ان کے پاس دو بائیکیں تھیں مگر اچانک کسی وجہ سے ان دونوں کو جانا پڑ گیا اور وہ ایک بائیک ہمارے لیے چھوڑ گئے دوسری پر روانہ ہوگئے مجھے کالیا نے تمہیں ادھر لانے کا کہا تھا کل صبح تک وہ بھی آجائے گا۔"

"میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ کالیا نے تو مجھ سے یہ وعدہ کیا تھا وہ مجھے صبح ہونے سے پہلے ہی میری ضمانت کروادے گا۔ مگر۔" میرا جملہ ادھورا رہ گیا، جواباً وہ بول پڑا۔

"پہلے اس کا یہی منصوبہ تھا مگر اس میں تاخیر ہورہی تھی اور کالیا نہیں چاہتا تھا کہ تم زیادہ دیر اس بدطینت انسپکٹر کے زیر دام رہو کیوں کہ وہ اس کی بدخصلتی سے واقف تھا۔ وہ اپنے غلط مقصد کی خاطر تمہیں کسی بھی لمبے قانونی چکر میں پھنسا سکتا ہے یہی وہ کرتا آیا ہے۔ اسی لیے آخری راستہ ہمارے پاس یہی بچا تھا۔"

مجھے اس کی بات میں کچھ کچھ وزن محسوس ہوا تھا۔ تاہم پھر بھی اس کی بات پر غور کرنے کے انداز میں بولا۔

"لیکن اب وہ مزید کیا کرنے کا ارادہ رکھتا ہے؟ اس طرح بھی تو راجا دلاور مجھے ایک فراری مجرم گردان سکتا ہے؟"

میری بات پر وہ بغیر کسی جھجک کے بولا۔ "ابھی تو فوری طور پر کالیا کا مقصد یہی تھا کہ تمہیں کسی طرح انسپکٹر راجا دلاور کے چنگل سے چھڑا لیا جائے۔ اس کے بعد تمہاری ضمانت کا بھی دیر بہ دیر اور خاطر خواہ بندوبست کیا جاسکے۔"

میرے سوالوں کے جواب میں وہ یوں فرفر اور بغیر جھجک کے بول رہا تھا کہ اس پر رٹے رٹائے سبق کا گمان ہوا، جیسے اسے مجھ سے پہلے ہی ایسے سوالات کی توقع ہو اور اس کے جوابات بھی اس نے سوچ رکھے ہوں۔ گویا اب "سحر شب گزیدہ" کے بعد ہی کچھ مزید آگے سوچا جاسکتا تھا۔ مگر ادھر ہی ایک کھٹک مجھے پریشان بھی کررہی تھی کہ کہیں صبح ہونے تک میرے ساتھ کچھ اور ہی ہونے کی نامنصوبہ بندی ہوچکی ہو۔ اچانک ایک خیال میرے ذہن میں چمکا۔

ادھر مجھے کچھ سوچتا پا کر وہ یکدم مجھ سے بولا۔

"تم ادھر بالکل محفوظ ہو۔ لہٰذا صبح تک کالیا کے آنے کا انتظار کرو۔ میں اب چلوں گا اور ہاں! باہر بالکل مت نکلنا، جب تک کالیا یہاں نہ آجائے۔ چلتا ہوں۔"

"ٹھہرو۔" میں نے کہا۔ وہ میری طرف سوالیہ نظروں سے تکنے لگا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"خاور۔"

"تمہارے پاس سیل فون تو ہوگا۔ میں ذرا کالیا سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

میری بات پر وہ گومگو سا ہوگیا، میری بھانپتی ہوئی نظریں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں، تب ہی اس نے اپنی جیب سے سیل نکالا اور اپنے ہاتھ میں لے کر اس کے ساتھ شاید کوئی چھیڑ چھاڑ کی، پھر جھلاتے ہوئے بڑبڑایا۔

"او۔ اس کم بخت نے بھی ابھی آف ہونا تھا۔ لگتا ہے شاید بیٹری آف ہوگئی ہے۔"

پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔ "تم فکر نہ کرو۔ صبح ہو لینے دو۔ کالیا تو آہی جائے گا یہاں، پھر کیوں پروا کرتے ہو۔ چلتا ہوں میں....."

میں چپ رہا۔ اور دروازے تک اس کے ساتھ آیا، باہر نکلتے وقت وہ آخر میں مجھ سے بولا۔

"میں باہر سے تالا لگادوں گا، گھبرانے کی ضرورت نہیں، یہ احتیاط کے پیش نظر کروں گا۔"

یہ کہہ کر وہ اپنی بائیک لے، چلا گیا اور باہر سے مجھے ہلکی کھڑبڑ کی آواز سنائی دی۔ پھر خاموشی چھا گئی۔

"لے نومی بھیا! لگتا ہے تو اس عیار انسپکٹر دلاور کی چال میں آگیا۔ یہی تو وہ کرنا چاہ رہا تھا تیرے ساتھ تاکہ تجھے بعد میں فراری مجرم قرار دلوا کر، تیرے ساتھ کچھ بھی کرے..... بھاگ جا یہاں سے۔ صبح سے پہلے۔"

میری چھٹی حس نے مجھے بری طرح کھدیڑا۔

میں نے اسی لیے پہلے خاموشی سے خاور کو جانے دیا

WWW.PAKSOCIETY.COM

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف

ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ

کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ

ایڈ فری لنکس

ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر

ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety

پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بُک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بُک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

http://paksociety.com

Downloaded From Paksociety.com

تھا۔ تاکہ بعد تنہائی میں کچھ سوچ سکوں۔

مگر پہلے میں نے دروازے کی جھری سے اپنی ایک آنکھ چپکا کر باہر دیکھنے کی کوشش چاہی، باہر اندھیرا تو تھا لیکن، قریب کہیں سے تھوڑی بہت روشنی آرہی تھی۔

باہر کی تاریکیوں کو چیرتی اسی قلیل روشنی میں مجھے خاور بائیک پر جاتا نظر آیا اور پھر ایک طرف کو مڑ کر نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ میں ایک گہری سانس لے کر سیدھا کھڑا ہوگیا۔

☆☆☆

رات کا آخری پہر، سر پہ تاروں بھرا آسماں اور ایک اجنبی تنگ و تاریک ویران مکان کے مختصر صحن میں تنہا کھڑا مجھے ایک لمحے کے لیے ہول سا آگیا تھا۔ یوں بھی میرے ایک اندازے کے مطابق یہ مکان آبادی سے الگ تھلگ واقع تھا، ممکن تھا چند ایک اور بھی اطراف میں ایسے گھر ہوں، لیکن بہرحال، کم از کم اس کے گرد و جوار میں دور نزدیک کسی آبادی کے آثار نہ ہونے کے برابر تھے۔ زیادہ تر فیکٹریاں اور کارخانے ہی تھے۔ یا پھر ان سے متصل سالخوردہ سے رہائشی کوارٹرز۔

میں نے صحن میں ہی کھڑے کھڑے مکان کا جائزہ لینا شروع کردیا۔ یہ مکان مجھے بہ مشکل اسی گز کے پلاٹ پر بنا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ مختصر سے صحن کے ایک کونے پر ہی ایک ''تین دیواری'' کی آڑ دے کر بیک وقت غسل خانے اور حوائج ضروریہ کا بندوبست کیا گیا تھا۔ جدھر سامنے کے رخ پر دو تنگ و تاریک کوٹھریاں تھیں، اسی ایک کوٹھری کے دروازے کے ذرا ہی قریب چھوٹا باورچی خانہ تھا۔ صحن اوپر سے کھلا تھا جبکہ سامنے کے رخ پر بنی دونوں کوٹھریوں پر چھت سی بنی ہوئی تھی، جس پر جانے کے لیے کوئی سیڑھی نہ تھی۔ ہاں البتہ باورچی خانے کی بناوٹ اس طرح تھی کہ ''جگاڑی'' طریقے سے چھت تک پہنچا جاسکتا تھا۔

اچانک میں ٹھٹکا..... کوئی ایسی بات میرے ذہن میں آئی تھی جس نے مجھے بے اختیار چونکنے پر مجبور کردیا تھا اور وہ تھی۔ دوسری کوٹھری..... یعنی جس کوٹھری میں تھوڑی دیر پہلے میں اور خاور، موجود تھے اس کے ساتھ بنی ہوئی اس دوسری کوٹھری کا خیال اچانک ہی میرے ذہن میں ابھرا تھا۔ اس کا دروازہ بند تھا مگر باہر سے کنڈی نہیں لگی ہوئی تھی۔ بتی صرف پہلی والی کوٹھری کی روشن تھی، جبکہ دوسری کے اندر اندھیرا تھا۔ گھپ اندھیرا..... نجانے کیوں اس دوسری کوٹھری کو دیکھ کر مجھے اپنے بدن میں لمحے بھر کو جھرجھری کا احساس ہوا تھا۔

''کیا یہ کوٹھری خیالی تھی؟''

ایک عجیب سوال، معاً ہی میرے ٹھٹکے ہوئے ذہن میں ابھرا تھا۔ کیوں؟ ایسا میں نے آخر کیا محسوس کیا تھا؟ ظاہر ہے اس مکان کی طرح یہ بھی کوٹھری خالی ہی ہوگی۔ جب میں اور خاور اس مکان میں داخل ہوئے تھے۔ وہ خالی تھا اور بہ قول خاور کے بھی یہ خالی تھا۔ پھر وہ مجھے پہلی والی کوٹھری میں لے آیا تھا۔

اچانک خاموش رات کے اس آخری پہر تلے ہوا کا ایک تیز جھونکا، صحن میں چکرایا اور اس دوسری کوٹھری کا دروازہ ہلکی چرچراہٹ کی اسرار بھری آواز سے اندر کی طرف کھلتا چلا گیا۔ اور تب ہی اچانک ایک ہولناک خیال نے مجھے سرتاپا لرزا کر رکھ دیا۔ میرے اندر جیسے کوئی زور زور سے چیخنے لگا۔

''نعمان میاں! کوٹھری خالی نہیں ہے۔ اس کے اندر کوئی موجود ہے۔''

میں پھٹی پھٹی نظروں سے مذکورہ کوٹھری کے تاریک خلا میں گھورے جارہا تھا، مجھے یوں لگا، جیسے ابھی اندر کوئی بھیانک عفریت یکدم چنگھاڑتا ہوا باہر آمد ہوگا اور مجھے پھاڑ کھائے گا۔

مجھے اپنے آپ پر ایسا کوئی دعویٰ نہ تھا کہ میں کوئی آہنی اعصاب کا ایک تیس مار خاں قسم کا آدمی تھا لیکن بہرحال اب تک کے حالات نے مجھے جتنا بھی حوصلہ دیا تھا، وہ بھی کم نہ تھا۔ مجھے ایسا لگا تھا۔ اس ویران اور تنگ و تاریک مکان کے اندر میں اکیلا نہیں تھا۔ کوئی اور بھی موجود تھا۔ کیا یہ کسی کی آسیبی موجودگی کا احساس تھا یا پھر کچھ اور؟

میں نے ایسے کڑے اور ہولناک لمحات میں اللہ کا نام لیا اور آہستہ آہستہ اس کوٹھری کی طرف قدم بڑھانے شروع کردیے۔ مگر میرا دل تیزی کے ساتھ دھک۔ دھک۔ دھک۔ کررہا تھا۔

میں ادھ کھلے دروازے تک پہنچ کر رکا۔ دھڑکتی ہوئی نظریں میری، ہنوز اندر جمی ہوئی تھیں، مگر ابھی تک اندر کی کالی بھٹ تاریکی کی ایک رمق کو بھی چیر نہ سکی تھی۔ ناچار میں نے اندر قدم رکھ دیا۔ اور تب ہی اچانک ایک عجیب سی بو کا بھبکا میرے نتھنوں سے ٹکرایا۔ یہ بو کسی ''کیچ زدہ'' مٹی کی تھی۔ سیلی سیلی مٹی کی۔ میں نے اس کی بھی پروا نہ کی۔ واہمہ، بے بسی پھر ڈر اور خوف سمجھا ہو کر اپنے منتہا کو پہنچ جائیں تو آپوں آپ ایک جرات پر انسان کو مائل کر ڈالتے ہیں کہ اس اسراریت سے جلد از جلد پردہ اٹھا کے خوف و دہشت کی ان عذاب ناک گھڑیوں کی طوالت کو ختم کردیا جائے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اندر قدم رکھتے ہی میں نے اندازے سے سوئچ ٹٹول کر بٹن آن کر دیا۔

کمرے میں پیلی زرد روشنی پھیل گئی اور۔ ایک ہولناک منظر میری آنکھوں کے سامنے تھا، جسے دیکھ کر میری روح تک کانپ گئی۔

☆☆☆

مجھے پورا مکان گھومتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ کنپٹیوں میں سائیں سائیں ہونے لگی۔ جی متلانے لگا۔ یوں جیسے ابکائی سی آنے والی ہو۔ ساعتوں میں نامعلوم سی گونج ہونے لگی جیسے سیٹیاں بج رہی ہوں۔

میرا واہمہ غلط نہیں تھا کہ میرے علاوہ بھی اس مکان میں کوئی تھا۔ میری چھٹی حس ایسے ہی نہیں مجھے رہ رہ کر بیدار کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ کچھ تھا اس مکان میں اور جو تھا وہ میری پھیلی ہوئی خوف زدہ سی آنکھوں کے سامنے ایک لاش کی صورت کھری چارپائی پر پڑا تھا۔ اس طرح کہ اس کا سارا بدن خون سے تربتر تھا۔ لیکن بات صرف اتنی ہی نہیں تھی، وہاں مجھے ایک اور شاک پہنچانے کا ساماں بھی کیا گیا تھا۔ کوٹھڑی کے بالکل وسط میں ایک گڑھا بھی کھدا ہوا تھا اور ایک طرف مٹی کا ڈھیر پڑا چیخ چیخ کر اعلان کر رہا تھا کہ اس بدنصیب انسان کی قبر بھی ادھر ہی کھودی گئی ہے۔ گویا اسے کسی نے قتل کر ڈالا تھا اور اسی مکان میں اس کی قبر کھود کر گاڑا بھی جانے والا تھا، مگر کسی وجہ کے باعث وہ خونی قاتل اپنی اس پوری ظالمانہ کارروائی کو۔ عملی جامہ نہیں پہنا سکا ہوگا اور راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

میں نے اپنے مختل پڑتے اعصاب پر قابو پانے کی کوشش چاہتے ہوئے، حلق میں ابھرنے والے گولے کو نگلنا چاہا تو پتا چلا میرا حلق بھی سوکھ کر کانٹا ہو رہا تھا۔

ایک اجنبی سے ویران مکان میں، جہاں میرے علاوہ اور کوئی بھی موجود نہ تھا، وہاں ایک لاش کا پایا جانا اور پاس ہی اس کی قبر بھی کھودی گئی ہو۔

یہ دہشت ناک منظر کسی بھی آدمی کے ہوش اڑانے کے لیے کافی تھا اور میں تو پھر بھی پولیس کے چنگل سے بھاگا ہوا انسان تھا۔

میں نے اپنی ہمت کو مجتمع کیا اور آگے بڑھا۔ میری ٹانگوں میں ہلکی لرزش تھی۔ لاش، پشت کے بل کھری چارپائی پر پڑی تھی اور یہ کسی مرد کی ہی لاش معلوم ہوتی تھی۔ جس نے عام سی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ میں قریب پہنچا تو ایک تیسرا ''شاک'' میرا منتظر تھا اور میرا سر گھومنے لگا۔

یہ لاش بڑے منشی دادن خان کی تھی۔

''بھاگ جاؤ۔ نعمان میاں! یہ قبر درحقیقت تمہارے لیے ہی کھودی گئی ہے۔''

میرے اندر کوئی چیخا اور۔ پھر جیسے مجھ پر ایک جنون سا طاری ہو گیا۔

میں واپس پلٹا۔ اور صحن میں آ گیا۔ بے اختیار مجھے ابکائی آ گئی۔ میں نے صحن میں ہی قے کر دی۔ خود کو سنبھالا۔ میرا سر گھوم رہا تھا۔ کنپٹیوں پہ سائیں سائیں ہونے لگی، صحن کے در و دیوار جیسے پُرشور آوازوں میں بجنے لگے۔ ایک آسیبی شور سا میرے چہار اطراف مچ گیا..... یہ گویا چیختے ہوئے سناٹے تھے۔

فضا میں گھلنے والی خنکی سے اندازہ ہوتا تھا کہ سپیدۂ سحر نمودار ہونے کو تھا۔ میں نے اوپر آسمان کی طرف سر اٹھا کے دیکھا تو آسمان پر سپیدی نمودار ہونے لگی تھی۔

میں نے بہ مشکل خود کو سنبھالا اور ہر قیمت پر اس منحوس مکان سے نکل جانے کا پکا تہیہ کیا۔ اس وقت میرے پاس لمبے چوڑے اندازے اور اس بھیانک سازش کے تار عنکبوت تلاشنے کا وقت تھا نہ موقع۔

تاہم ایک بات یقینی تھی کہ میرے خلاف سوچی سمجھی سازش کھیلی گئی تھی لیکن مجھے یقین تھا کہ اس مکروہ سازش میں کم از کم شیراز عرف کالیا کا ہاتھ نہیں ہو سکتا تھا اور نہ ہی خاور اس کا ساتھی تھا۔ تو پھر وہ کس کا ساتھی تھا؟ اور کس کے کہنے پر اس نے مجھے یہاں پہلے سے بچھے ہوئے جال میں پھنسا کر خود چلا گیا تھا؟ یہ سب بعد میں سوچنے کی باتیں تھیں۔ جبکہ اس وقت سب سے اہم مسئلہ یہاں سے بہر صورت نکل بھاگنے کا تھا۔

دادن خان کا قتل، اس کی لاش کے پاس ہی قبر کا کھدا ہونا اور میری وہاں موجودگی، اس گھناؤنی اور خوف ناک سازش کو صاف ظاہر کرتی تھی کہ مجھے اس کے قتل کے جرم میں پھنسایا جانے والا تھا جبکہ دادن خان کو اس کے اپنے ہی ساتھیوں نے یا پھر انہوں نے جن کے لیے وہ دولت کے لالچ میں کام کر رہا تھا، انہوں نے ہی اسے قربانی کا جانور بنا دیا تھا۔ گویا وہ لوگ اتنے بے حس اور مفاد پرست تھے کہ اپنے مکروہ مقاصد کے حصول کے لیے جب چاہتے، اپنوں کو بھی ''پیارا'' کر ڈالتے تھے۔

خاور باہر سے دروازہ بند کر گیا تھا۔ صحن کی دیواریں کچھ زیادہ اونچی تو نہیں تھیں لیکن اتنی چھوٹی بھی نہیں تھیں کہ میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اچھل کر با آسانی انہیں پھلانگ سکتا۔ میں نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں اور تب میری نگاہ باورچی خانے پر پڑی۔ میں بہ سرعت اس کی طرف بڑھا۔ اس کا دروازہ جگاڑی سیڑھیوں جیسا کام دے سکتا تھا۔۔۔۔ میں اس کے بعض چوبی ابھاروں پہ اپنے ہاتھ پیر جما کر چھت پر چڑھ گیا۔

اب میں اوپر ایک کھلی چھت پر تھا۔

میں نے بلی کے بل چہار اطراف کا جائزہ لیا۔ چھت مجھے بغیر کسی دیوار یا منڈیر کے نظر آئی۔ میں سرے پر پہنچا اور نیچے جھانکا۔ کافی بلندی تھی۔ میں اندازہ کرنے لگا، اگر چھلانگ لگادوں تو۔ میرے جسم کا کون سا حصہ زیادہ متاثر ہونے کا امکان تھا؟ سر کے بل تو چھلانگ لگانے سے رہا، البتہ ٹانگیں ہی ایسا عضو تھیں جو سب سے پہلے اور زیادہ متاثر ہوتیں۔ اس کی بھی قربانی دی جاتی تو کم از کم کہنیوں کے بل فرار کا اگلا طویل مرحلہ طے کرنا جان گسل ہی نہیں، وقت طلب بھی ہوتا۔

ابھی میں اسی تانے بانے میں الجھا ہوا تھا کہ اچانک میرے کانوں میں ایک سمع خراش آواز ابھری اور پھر جیسے میرا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا۔

یہ آواز مجھے اس وقت دنیا کی کریہہ ترین آواز محسوس ہوئی تھی، جو کسی پولیس سائرن کی تھی اور میں نے اسی آواز کی سمت نظر اٹھا کر دیکھا۔ سامنے وہی سڑک تھی، جس پر رات کے پچھلے پہر میں اور خاور اس منحوس مکان تک پہنچے تھے۔ وہاں پولیس کی دو گاڑیاں تیزی سے دوڑی چلی آرہی تھیں اور ان کا رخ اسی مکان کی طرف تھا۔ بغیر کچھ سوچے میرے ذہن میں اس سازش کی ساری کڑیاں ملتی چلی گئیں اور مجھے اپنی رگوں میں خون جمتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

میں تو کالیا کی اس یقین دہانی پر کہ وہ مجھے سحر ہونے سے پہلے حوالات سے نکلنے کا بندوبست کردے گا تاکہ تب تک یہ بدطینت انسپکٹر راجا دلاور میرے خلاف اپنی کسی سازش کو عملی جامہ نہ پہنا سکے، خود ہی اس کی سازش میں پھنس گیا تھا۔

بڑی زرخیز ذہن کا مالک تھا یہ پولیس افسر۔ اور جس کی اس فطرت اور ''طریقہ کار'' سے شاید کالیا اچھی طرح واقف بھی تھا۔ مگر اب کیا کیا جاسکتا تھا؟

اس وقت اس فرعون صفت راجا دلاور کے ہتھے چڑھنے کا مطلب۔ جیل ہی میں میری قبر کھودنے کے مترادف تھا۔

میں پلٹا اور۔ تیزی سے چھت کے باقی تینوں سروں کا جائزہ لیا تو ایک اُمید جگنو بن کر اس تیرہ و تار۔ حالات کے دامن میں چمکی۔

چھت کے تیسرے سرے پر، بالکل اس کی دیوار کے قریب ہی پیپل کے ایک پرانے درخت کی شاخیں چھو رہی تھیں۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ انہی شاخوں کی رسی کی مدد سے تھاما اور پھر تھوڑی سی مزید کوشش سے، چند مضبوط شاخیں اور ٹہنیاں میری مٹھی میں آگئیں۔ میں انہیں تھامتا اور رسی کا کام لیتا ہوا نیچے بہ حفاظت کود گیا۔ اسی وقت مجھے مکان کے دروازے پر پولیس کی گاڑیوں کے رکنے اور ان کے ٹائر گھسنے کی آوازوں کے ساتھ ہی کدکڑے مار کر اترتے بھاری قدموں کی آوازیں بھی سنائی دیں۔ سائرن اب بھی کریہہ آوازوں میں ہنکار رہے تھے۔ ان میں ایک تحکمانہ چیخ بھی شامل تھی۔

یہ انسپکٹر راجا دلاور کی آواز تھی۔ ''دروازہ توڑ ڈالو۔ وہ اندر ہی موجود ہے۔''

اس بدخصلت کے ان الفاظ نے جیسے سازش کے اس تارِ عنکبوت پر اپنی مہر ثبت کردی تھی۔ ظاہر ہے اس کا صاف مطلب میری سمجھ میں یہی آنا چاہیے تھا کہ اسے پکا پکا پتا تھا کہ میں اسی مکان میں آرام سے بیٹھا، اپنے نجات دہندہ کالیا کا انتظار کر رہا ہوں گا۔

میرے پاس کچھ وقت تھا۔ درخت سے اترنے میں، میں نے مطلق دیر نہیں لگائی تھی اور اس سے زیادہ بجلی کی سی تیزی کا مظاہرہ میں نے اس منحوس مکان اور اس محسن درخت سے دور نکل جانے میں کیا تھا۔

میری کوشش یہی تھی کہ میں فرار ہوتے ہوئے ''کھلے'' کی جگہ اختیار کرنے کی بجائے۔ نسبتاً تنگ راستوں کا انتخاب کروں اور یہی میں نے کیا۔

عقبی سمت میں کچھ تنگ سی سنسان گلیاں تھیں، میں اس میں داخل ہوگیا اور سرپٹ دوڑنے لگا۔ لیکن یہ بھی کافی نہ تھا۔ مجھے اس حقیقت کا بھی ادراک تھا کہ جب میں۔ انسپکٹر راجا دلاور کی ''توقع'' کے خلاف اس مکان میں نہیں ملوں گا تو۔ وہ پاگلوں کی طرح اس پورے اطراف کے علاقے میں میری ڈھنڈیاں ڈال دے گا۔ اسی لیے میری کوشش تھی کہ کسی طرح یہاں اریب قریب میں مجھے چھپنے کی کوئی خاطر خواہ جگہ مل جاتی تاکہ میں آرام سے وہاں چھپ کر پولیس کے جانے کا انتظار کرنے کے بعد نکل سکتا۔ لیکن اس طرح کی محفوظ پناہ کی تلاش میں، دوڑتے دوڑتے میں بری طرح ہلکان ہوگیا، مگر مجھے ایسی

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کوئی جگہ نہ ملی۔ تب ہی اچانک۔ مجھے تیز سیٹیوں کی آوازیں سنائی دیں۔

اطراف کے علاقے میں میری ڈھنڈیاں ڈالنے کا پولیس نے پرانا اور کارآمد طریقہ اپنایا تھا تاکہ دیگر لوگ بھی متوجہ ہوکر پولیس سے تعاون پر آمادہ ہوجاتے۔

میں نے بھی ہمت نہیں ہاری تھی۔ دوڑتے دوڑتے میں ایک وسیع وعریض فیکٹری کی باؤنڈری وال کے ایک ٹوٹے ہوئے حصے سے اندر داخل ہوگیا۔

یہاں دور نزدیک کچھ لوگ دکھائی دیئے تھے مگر میں فیکٹری کے اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے، ریختنے، کی آڑ لیتا ہوا۔ ایک ایسی جگہ پر جا پہنچا جو میری توقع کے عین مطابق قدرے محفوظ تھی اور جہاں سے بعد میں، جب چاہتا، میں حالات کے سازگار ہوتے ہی بہ آسانی کسی کی نظروں میں آئے بغیر نکل بھی سکتا تھا۔

یہ کوئی پرانا گودام سا تھا۔ جہاں کاٹھ کباڑ اور جانے کیا کیا الابلا بکھرا ہوا تھا، جن میں زنگ آلودہ مشینوں کے ڈھانچے اور ان کے کل پرزے، ریختنے کی صورت بکھرے ہوئے تھے۔

میں انہی کے بیچ میں دبک کر بیٹھ گیا۔ اس گودام کا دروازہ کھلا ہوا، بلکہ ٹوٹا ہوا کہنا زیادہ مناسب تھا، ایک پٹ اس کا ٹوٹ کر زمین میں دھنسا ہوا تھا۔ اندر مکڑیوں کے تنے ہوئے جالوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں عرصے سے کوئی نہیں آیا ہوگا اور آتا بھی کیوں؟

بہرطور۔ میں ادھر ہی دبک کر بیٹھ رہا۔ اندر اندھیرا تھا۔ میں جائزہ بھی لینے لگا۔ اس کی چھت خاصی بلند تھی اور یہ مستطیل نما گودام تھا اور خاصا بڑا تھا۔ چھتوں پر روشندان نصب تھے۔ ایک دو پر اگزاسٹ فین، مردار سی رفتار سے چل رہے تھے۔

میں اللہ کا نام لے کر وہیں دبکا بیٹھا رہا اور دل ہی دل میں خدا سے خیریت کے ساتھ یہ مشکل گھڑی گزرنے کی دعائیں بھی مانگتا رہا۔

اب میرے پاس سوچنے کے لیے کافی وقت تھا، لیکن اب سوچنا کیا؟ جبکہ پولیس کی آمد اور انسپکٹر راجا دلاور کی آواز نے سب آشکارا کردیا تھا۔

تاہم حالات کا بہ نظر غائر تجزیہ کرتے ہوئے۔ مجھے اس بات کا خوش کن اندازہ ہورہا تھا کہ میں فوری طور پر سردست ہی سہی۔ ایک بڑی مصیبت میں پھنسنے سے بچ گیا تھا۔ سمجھ میں آنے والی بات تھی کہ اگر میں اس طرح پکڑا جاتا تو قانون کی زبان میں اسے ”رنگے ہاتھوں“ پکڑے جانا کہلاتا جو انسپکٹر دلاور چاہتا بھی تھا۔

اس طرح اب اس کی اس مکروہ سازش کا ایک اہم تار میں کاٹنے میں کامیاب ہوچکا تھا۔

تاہم فراری مجرم کا لیبل میری پیشانی پہ لگانے کا ابھی ایک موقع اس کے پاس تھا اور میں اس کا ہی توڑ نکالنے کا بیٹھا سوچ رہا تھا۔

میری نظروں کے سامنے بار بار بڑے منشی دادن خان کی لاش کا منظر گھوم رہا تھا، جہاں مجھے اس کے عبرت ناک انجام پر افسوس ہورہا تھا وہاں اس بات کا قلق بھی ہورہا تھا کہ میرے چشم پوشیدہ دشمنوں نے اسے موت کے گھاٹ اتار کے کس طرح مجھے قانونی شکنجے میں پھنسانے کی ایک لرزہ خیز کوشش کی تھی۔ کاش! میری منشی دادن خان کے ساتھ ہاتھا پائی نہ ہوئی ہوتی اور نہ ہی وہ اس طرح دو ہاتھیوں کے بیچ پستا۔ مگر اب کف افسوس ملنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا لیکن یہ بات اپنی جگہ میرے دل و دماغ میں ایک چمگادڑ کی طرح سوالیہ نشان بن کر گمبھیریاں بھر رہی تھی کہ آخر دادن خان کے قاتلوں کا تعلق کس گروپ سے ہوسکتا تھا؟

کہیں اس کے اپنے لوگوں نے تو نہیں اسے قربانی کا بکرا بنایا تھا؟ یا پھر میرے پوشیدہ دشمنوں نے؟

میں اب تک اپنے دشمنوں کو دو گروپوں میں تقسیم کرچکا تھا۔ ایک تو لینڈ مافیا گروپ تھا اور دوسرا۔ وہ گروپ ہوسکتا تھا، جس نے میرے شریف اور سادہ لوح، محنت کش باپ کو اپنی کسی پراسرار اور گہری سازش کو نشانہ بنایا تھا اور اب انہیں شاید کسی طرح میرے عزائم کا علم ہوچکا تھا، تو وہ بھی میرے خلاف میدان میں اتر آئے تھے۔ ایسا یقیناً۔ میری۔ رانا بشیر سے تفصیلی ملاقات کے بعد ہی ہوا تھا تو کیا اس کی بیوی کے قتل میں کہیں رانا بشیر کے اپنے ہی خاندان کے کسی فرد کا ہاتھ تھا یا پھر۔ کوئی اور چکر تھا؟

جبکہ ڈائری کی کہانی بھی ابھی ادھوری تھی۔ اور ”پارٹ ٹو“ ڈائری کی تلاش جاری تھی، اس پر مستزاد مگر مچھ کے جبڑے والی وہ ٹائی پن کے مالک کو بھی تلاشنا باقی تھا۔

میں جتنا سوچتا، اتنا ہی میرا ذہن گنجلک ہوا جاتا تھا۔ کبھی تو ساری کڑیاں ملتی محسوس ہونے لگتی تھیں تو کبھی ایک دم بکھر جاتیں۔ میں نے سردست ان خیالات کو ذہن سے جھٹک دیا اور ابھی کی سوچ و بچار کرنے لگا۔

ایک دو گھنٹے خیریت سے گزر چکنے کے بعد تک میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اپنے آیندہ کے ایک حتمی فیصلے پر پہنچ چکا تھا کہ یہاں سے بہ خیر و عافیت کے نکل جانے کے بعد مجھے سب سے پہلے کہاں کا رخ کرنا چاہیے تھا۔

اور وہ راستہ تھا ایڈووکیٹ زنیرہ..... کیوں کہ فی الوقت وہی ایک ایسی ہستی تھی جو اس سارے معاملے کو ایک قانون دان کی نگاہ سے دیکھنے، اور اسے سوچنے سمجھنے اور کسی لائق اچھا مشورہ دینے کے قابل تھی۔

ابھی اپنے گھر جانے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا کہ وہاں جانے کا مطلب خود اپنے گلے میں ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگانے کے مترادف تھا۔ ایک خیال یہ بھی آیا تھا کہ چاچا انور شاہ کے گھر کا رخ کرتا۔ مگر وہ بھی کیا کر سکتے تھے۔ پولیس اس وقت عین انہی جگہوں پر میری تلاش میں جگہ جگہ چھاپے مار رہی ہوگی۔ جہاں انہیں اندازہ ہو سکتا تھا کہ میں اس ڈی فرار کے بعد پناہ کی تلاش میں کہاں کہاں کا رخ کر سکتا تھا؟

تیسرا خیال۔ میرا کالیا کی طرف بھی گیا تھا۔ اگرچہ میرے ایک محتاط اندازے کے مطابق انسپکٹر راجا دلاور کی چالوں اور فریب کاریوں سے یہی اچھی طرح واقف تھا اور اس سلسلے میں مجھے وہ بھی کوئی مفید مشورہ دے سکتا تھا۔ کالیا سے ملنا یوں بھی از بس ضروری تھا کہ میں اسے یہ ساری باتیں اور خاور نامی اس نوجوان کے متعلق بھی آگاہ کرتا۔

میں کالیا کے ٹھکانے سے واقف تو نہ تھا، البتہ میں نے اس سے فون پہ ہی رابطہ کرنا تھا۔

پھر میں نے یہی سوچا کہ ایڈووکیٹ زنیرہ سے ملنے کے بعد ہی کالیا سے اسی کے ہاں سے بات کرنے کی کوشش کروں گا اور ساتھ ہی زنیرہ کو بھی کالیا کے بارے میں تفصیلی آگاہ کر دوں گا۔

بلاشبہ میرے اس منحوس مکان سے کامیاب فرار پر انسپکٹر راجا دلاور بری طرح جھلاہٹ کا شکار ہوگا اور اپنی اس جامع اور بے داغ منصوبہ بندی کی غیر متوقع ناکامی پر تلملا رہا ہوگا لیکن اسے اب بہت سی مشکلات کا بھی سامنا کرنا پڑے گا۔

مزید کافی دیر بیت گئی۔ میرے کانوں میں اب مختلف مشینوں کے چلنے کی گھرر۔ گھرر کرتی آوازیں بھی سنائی دینے لگی تھیں۔ شاید فیکٹری ''چالو'' کر دی گئی تھی۔ وقت جیسے چیونٹی کی رفتار سے گزرنے لگا۔

اب مشکل یہ تھی کہ مجھ سے یہ فیصلہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ مجھے اسی وقت نکلنا چاہیے یا رات کا انتظار کروں۔ جو ایک کار محال ہی تھا۔ کیوں کہ رات ہونے میں ابھی پندرہ بیس گھنٹے تھے۔ بھوک پیاس بھی میں برداشت کر لیتا۔ لیکن میں اس گمبھیر معاملے کو زیادہ طول نہیں دینا چاہتا تھا۔ کیوں کہ اس طوالت کا سارا فائدہ انسپکٹر دلاور کے حصے میں جانے کا احتمال تھا۔ پھر میرے اپنے بھی بالخصوص عاصمہ بہنا اور بھائی فہیم میرے لیے پریشان ہو رہے ہوں گے۔ باپ کے بعد اب ان کے لیے ''بڑا'' میں ہی تھا۔

زنیرہ، کالیا اور انور چاچا بھی تھے جو یقیناً میری طرف سے شدید تشویش میں مبتلا ہوں گے۔

لہٰذا میں نے اب یہاں سے نکلنے کا حتمی فیصلہ کر لیا۔

مجھے اندازہ تھا کہ میں نے یہاں بیٹھ کر کم از کم پانچ چھ گھنٹے بتا لیے تھے۔ باہر نکلنے اور زنیرہ کی رہائش گاہ تک پہنچنے میں خطرہ اپنی جگہ تھا۔

میں دوبارہ گرفتار بھی کیا جا سکتا تھا۔ اگرچہ یہ گرفتاری رنگے ہاتھوں نہ ہوتی، یعنی مقتول دادن خان کی جائے وقوعہ والی سے دور سہی، مگر انسپکٹر راجا دلاور جیسے آدمی سے کوئی بعید نہ تھا کہ وہ کچھ بھی گل کھلا سکتا تھا اور اس کے حتھے تو فی الوقت مجھے چڑھنا ہی نہیں تھا۔

میں نے ذرا باہر نکل کر اطراف کا جائزہ لیا تو مجھے باہر فیکٹری کے وسیع و عریض میدان نما احاطے میں لوگوں اور ورکروں کی خاصی چہل پہل دکھائی دی اب اس پرانے گودام نما جگہ سے باہر نکلنے کی صورت میں ایک غیر متعلقہ شخص کو دیکھ کر ان سب کا چونک جانا لازمی امر تھا۔

تاہم۔ مجھے کچھ آڑ بھی میسر تھی۔ میں ان کا سہارا لیتا ہوا۔ دوسری جانب سے، چھپتا چھپاتا ہوا، فیکٹری کے ایک ایسے حصے میں آ گیا۔ جہاں سے مین گیٹ صاف نظر آتا تھا۔ وہاں دو تین نیلی وردیوں میں گن مین کھڑے دکھائی دیے۔

فیکٹری کا پلاٹ وسیع تھا اور یہاں کام کرنے والے کثیر تعداد میں تھے۔ بہت سے مخصوص لباس پہنے ہوئے تھے، کافی سارے عام کپڑوں میں۔

اب تھوڑی جرات کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا میرے پاس۔ میں انہی عام کپڑوں میں ملبوس لوگوں کے درمیان رل مل کر۔ بالآخر نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ ایک سنگل پٹ کا چھوٹا دروازہ تھا۔ جو شاید ''ایمرجنسی ایگزٹ'' کی صورت میں ہی مستعمل ہوتا تھا۔

میں کسی طرح یہاں سے نکل کر باہر آ گیا اور فوراً ایک رکشا میں سوار ہو گیا اور اسے ایڈووکیٹ زنیرہ کی رہائش گاہ کا پتا

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

بتادیا۔

شکر تھا کہ پولیس کا کوئی آدمی کہیں نظر نہیں آیا تھا۔ شاید انسپکٹر میری تلاش سے مایوس ہوگیا تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں تھا کہ وہ چپکا بیٹھ رہا ہوگا۔ اس نے یقیناً اپنے سادہ وردی پوش پولیس والے میری نگرانی کے لیے۔ میرے گھر اور چاچا انور شاہ کے گرد و پیش میں چھوڑ رکھے ہوں گے۔ تاہم یہ خطرہ زنیرہ کی رہائش گاہ میں کم ہی تھا۔

میرا رکشے میں سفر جاری تھا اور لحہ مجھے دھر لیے جانے کا بھی خطرہ ستا رہا تھا۔ میں ذرا اندر ہو کر بیٹھا تھا۔ میرے پاس تو رکشے والے کو کرایہ دینے کے لیے بھی پیسے نہ تھے لیکن یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہ تھا۔ زنیرہ کے ہاں پہنچ کر کرایہ ادا کیا جاسکتا تھا۔

رکشا اب انڈسٹریل ایریا سے نکل کر آبادی میں داخل ہوگیا تھا اور میں مزید محتاط ہوگیا تھا۔ یہاں مجھے ایک دو جگہوں پر پولیس کی موبائلیں بھی کھڑی نظر آئی تھیں اور دھڑکا ہوا تھا کہ کہیں یہ رکشا نہ روک لے۔ مگر شکر تھا کہ ایسا کچھ نہیں ہوا۔

یوں بھی میں رکشے والے کو اسی راستوں پر ہی چلتے رہنے کا کہہ رہا تھا جو نسبتاً طویل مگر زیادہ محفوظ تھے۔ یعنی اس طرف پولیس کی موجودگی کا خطرہ کم کم ہی تھا۔ البتہ رکشے والے کو اعتراض ہو رہا تھا بار بار۔ کیوں کہ وہ اپنا فیول بچانے کے لیے یہی کوشش کرتے ہیں کہ شارٹ کٹ راستہ اپنایا جائے تاہم میں نے اسے کرایے کے ساتھ ہی ''اجرت خالص'' کی پیش کش کر ڈالی تھی، تب جا کے وہ مطمئن ہوا تھا۔

اگرچہ مجھے پوری طرح اندازہ تھا کہ زنیرہ اس وقت گھر کی بجائے اپنے آفس میں ہی ہوگی یا پھر۔ آج وہ گئی ہی نہ ہو۔ اس کا امکان کم ہی تھا۔ تو میں نے سوچ رکھا تھا کہ مجھے ایسی صورت میں کیا کرنا چاہیے تھا۔

زنیرہ کا گھر کم و بیش آدھ پون گھنٹے کی مسافت پر تھا لیکن میں احتیاط کے پیش نظر جن راستوں سے گھما پھرا کر رکشے والے کو لایا تھا اس میں تقریباً سوا گھنٹا صرف ہوگیا۔

زنیرہ کی رہائش گاہ پر کوئی چوکیدار نہ تھا۔ ایک سو بیس گز کے اس مکان میں وہ خالہ نجو (خالہ نجمہ) کے ساتھ رہتی تھی۔ ابو والے کیس کے دوران میں ان سے بھی ملا تھا۔

وہ ایک پچاس پچپن سالہ نفیس خاتون تھیں۔ انہوں نے ہی زنیرہ کو پالا تھا۔ ان کے شوہر کا حال ہی میں انتقال ہوا تھا۔ میاں حامد ریلوے میں ملازم تھے۔

میں اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا رکشے سے اترا اور دروازے کی طرف بڑھا۔

''او۔ بھیا! کرایہ تو دیتے جاؤ۔ پھر اندر چلے جانا۔'' رکشے والے نے پیچھے سے ہانک لگائی، شاید اس سلسلے میں اسے کوئی تلخ تجربہ ہو چکا تھا۔ میں نے پلٹ کر کہا۔

''ابھی اندر جا کے بھیجتا ہوں کرایہ۔ ذرا صبر کرو۔''

وہ منہ بنا کر خاموش ہو رہا۔ میں نے دروازے پر لگی کال بیل بجائی۔ خالہ نے دروازہ کھولا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ چونک پڑی۔ شاید اس کے علم میں بھی اب تک بہت کچھ آچکا تھا۔ وہ میری طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بہ مشکل بولیں۔

''تت۔ تم۔''

''خالہ! پہلے اس رکشے والے کو کرایہ دے کر فارغ کریں۔ میں اندر آنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا اور وہ جلدی سے مجھے اندر آنے کا راستہ دیتے ہوئے بولیں۔

''آجاؤ۔ آجاؤ۔''

میں اندر داخل ہوگیا۔ خالہ نجو نے رکشے والے کو فارغ کر دیا۔ اس کے بعد۔ وہ دروازہ بند کر کے مجھ سے بولیں۔

''کک۔ کہیں تمہارے پیچھے۔ پپ۔ پولیس تو نہیں ہے؟'' ان کی آنکھوں اور لہجے سے بھی، گہری تشویش نمایاں تھی۔ میں نے اثبات میں سر ہلا کے جواباً کہا۔

''پولیس تو ہے میرے پیچھے۔ لیکن اس وقت نہیں، آپ بتائیں خالہ! زنیرہ صاحبہ گھر پہ ہیں یا.....'' میں نے استفساریہ انداز میں دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ جواباً بولیں۔

''تمہیں تو معلوم ہی ہے، وہ اس وقت کہاں گھر ہوتی ہے؟''

''ٹھیک ہے میں اندر ڈرائنگ روم میں بیٹھ جاتا ہوں۔ آپ ایسا کریں، انہیں جلدی سے ایک فون کھڑکا دیں، زیادہ طویل بات نہ کیجئے گا۔ میرا بتا دیں، اور بس ذرا جلدی، آپ کی مہربانی ہوگی۔ اس وقت وہی مجھے کوئی اچھا مشورہ دے سکتی ہے۔''

''ہاں۔ ہاں۔ نومی بیٹا! فکر کیوں کرتے ہو۔ میں ابھی زنیرہ بٹی کو فون کر دیتی ہوں، مہربانی کی کیا بات ہے۔ تم کوئی غیر تھوڑی ہو۔''

وہ یہ کہہ کر چلی گئیں۔ میں اندر نشست گاہ میں آکر بیٹھ رہا۔

اس میں کوئی شک نہ تھا کہ ابو والے کیس کے دوران ہی میری زنیرہ اور بعد میں اس کی خالہ نجمہ (نجو) سے شناسائی ہو گئی تھی۔ یوں کیس وغیرہ کے سلسلے میں ہی میرا اکثر یہاں بھی

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

آنا ہو جایا کرتا تھا..... پھر زنیرہ کی طبیعت بھی میرے ساتھ کچھ ایسی مماثل رہی کہ موکل اور وکیل کا یہ "لنک" مزاج آشنائی کے باعث ایک دوستانہ تعلق میں بدلتا چلا گیا۔

خالہ نجو کو خود میں نے زنیرہ سے اپنی تعریف کرتے ہوئے بھی سنا تھا، ان کی نگاہ میں، میں ایک شریف اور سادہ نوجوان تھا۔ ممکن تھا کہ وہ روایتی سرپرستوں کی طرح اپنی چہیتی بھانجی کے لیے، میرے سلسلے میں کچھ اور بھی آگے جانے کا مستقبل میں ارادہ رکھے ہوئے تھی، کم از کم ان کے میرے ساتھ خلیقانہ برتاؤ سے تو یہی لگا تھا، ورنہ مجھے کسی قسم کی کوئی خوش فہمی نہ تھی۔ نہ ہی اس کی ضرورت بھی۔ تاہم زنیرہ کا میرے ساتھ میلان، خالص دوستانہ ہی رہا تھا اب تک۔ اور میرے ساتھ اس کی اچھی خاصی انڈراسٹینڈنگ ہو گئی تھی۔

تھوڑی دیر گزری تو خالہ نجو نے آکر بتایا کہ زنیرہ کچھ ہی دیر میں پہنچنے والی تھی۔

میں بے چینی سے اس کا انتظار کرنے لگا۔ یہ انتظار زیادہ طویل نہ تھا مگر اس وقت ایک پل بھی ایک گھنٹے کا ہی معلوم ہوتا تھا۔

زنیرہ جب آئی تو اس کے انداز سے ہی ظاہر ہوتا تھا کہ خالہ نجو کی زبانی میرا سنتے ہی، بھاگم بھاگ یہاں پہنچی تھی۔

"او۔ مائی گاڈ! تت۔ تم۔ نومی! خیریت سے تو ہو نا؟" اس نے آتے ہی مجھ سے پہلے خیریت دریافت کی تھی۔ اور میں نے بہ ظاہر مسکرا کر جواب دیا۔

"اب تک تو خیریت ہی ہے۔ آگے کی خیریت آپ سے نیک مطلوب چاہوں گا۔"

میری بات پر بے اختیار اس کے نرم لبوں پہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔ "بہت زندہ دل ہو۔ مصیبت کی اس گھڑی میں بھی تمہیں بذلہ سنجی سوجھ رہی ہے۔"

"میرے لیے سب سے بڑی مصیبت کی گھڑی، صرف اس وقت تھی جب میں اپنے بے گناہ باپ کو پھانسی لگنے سے بچانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا تھا۔ مگر قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ وہ پھانسی سے نہ بچ سکے۔ اس کے بعد میرا اندر بجھ کر رہ گیا۔ جس کو آپ میری بذلہ سنجی پر محمول کر رہی ہیں وہ درحقیقت ایک بے حسی اور سپاٹ پن ہی ہے میرا کہ مجھے اب کوئی مصیبت، مصیبت نہیں لگتی، بس ایک امتحان لگتا ہے۔"

میرے لہجے کی گہری متانت نے زنیرہ کو باور کرا دیا کہ میں اندر سے کس قدر تلخ ہو گیا ہوں۔ لہٰذا اس نے جب چند ثانیے کے لیے ایک متاسفانہ خاموشی اختیار کی تو میں نے اسی دوران ہی اسے اب تک کے پیش آمدہ حالات کے بارے میں آگاہ کر دیا۔

ساری میری "رام کتھا" سننے کے بعد اس نے پہلی فرصت میں مجھ سے کھانے پینے کا پوچھا۔ جس پر میں نے صرف ایک عدد چائے اور ایک گلاس پانی کا کہہ ڈالا۔ جبکہ وہ ناشتے پر مصر تھی۔ میں نے انکار کر دیا۔

"اب آپ کیا کہتی ہیں..... اس مسئلے کے بیچ؟ مجھے کالیا سے رابطہ کرنا چاہیے؟ یا پھر آپ خود ہی۔"

"نہیں، میرا خیال ہے ابھی کالیا کو خود سے دور ہی رکھو۔ وہ بہرحال قانون اور معاشرے کی نگاہ میں ایک مجرم ہی کی حیثیت رکھتا ہے، تمہاری اس سے تعلق داری تمہارے لیے نقصان کا باعث بن سکتی ہے۔" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی تو میں نے ایک تلخ سی مسکراہٹ سے کہا۔

"کم از کم ہمارے آج کے سماج میں کالیا جیسے مجرم لوگ ہی شریفوں کے کالے کرتوتوں سے نہ صرف اچھی طرح واقف ہیں بلکہ ان کی کمزوریوں سے فائدہ بھی اٹھانا خوب اچھی طرح جانتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ کالیا جیسے لوگ پلک جھپکتے میں ہی بڑے آرام سے اپنی ضمانت کروا لیتے ہیں اور مجھ جیسے بے گناہ کی ضمانت فضول قسم کی قانونی موشگافیوں کی نظر ہو جاتی ہے اور اس دوران میں اسے قربانی کا بکرا بنا دیا جاتا ہے۔" میں ایک ثانیے کے لیے رکا پھر بولا۔

"زنیرہ صاحبہ! بے شک میرے اور آپ کے بیچ ایک دوستی کا جذبہ بھی پنپ چکا ہے اور مجھے اس پر فخر رہے گا۔ لیکن بعض حساس معاملات میں مجھے آپ سے صرف ایک کلائنٹ کی حیثیت سے ہی مشورہ کرنا پڑتا ہے۔ ابو کی بے گناہ پھانسی اور اب تک کے حالات کے بعد سے میں بھی اب اس زمانے کے چلن کو سمجھ چکا ہوں اور جانتا ہوں کہ کب کون سا لوہا کس لوہے کو کاٹنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ میں آپ کی پوری فیس ادا کروں گا۔ بس آپ مجھے ابھی کسی طرح کوئی قانونی پوائنٹ کھیل کر میری پیشانی سے فراری مجرم کا داغ دھو ڈالیں۔ کالیا سے میں خود بات کر لوں گا۔"

میری باتیں زنیرہ نے غور سے سنی، اور خاصے سنجیدہ اور پُرسوچ انداز میں اپنے لبوں پر زبان پھیر کر بولی۔ "کافی حد تک تو تمہاری باتیں درست بھی ہیں۔ لیکن نومی! غلط بہرحال غلط ہی گردانا جاتا ہے۔ اس پر کسی تاویل و توجیہ کا اطلاق نہیں ہوتا۔ باقی کالی بھیڑیں کہاں نہیں ہوتیں؟ ہمیں ان کا شرافت

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کے ہتھیار سے ہی مقابلہ کرنا چاہیے۔''

''اسی لیے تو میں آپ کے پاس آیا ہوں۔ رہا کالیا تو میرا اس سے بھی ملنا ضروری ہے، وہ بہت سی اندر کی باتوں سے نہ صرف واقف ہے بلکہ وہ ان کالی بھیڑوں کی کنی کترنا بھی جانتا ہے۔ کبھی کبھار ایسے گمبھیر معاملات میں اس طرح کی مصلحت کوشی بھی بھگتنا پڑتی ہے۔ ورنہ آپ خود ذرا سوچیں۔ قانون کے اس رکھوالے انسپکٹر راجا دلاور نے میری قبر کھودنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ مجھے لگتا یہی ہے کہ یہ وہی مافیا ہے۔ جس نے میرے بے گناہ باپ کو پھانسی لگوائی تھی۔ اور اب مجھے بھی۔''

''اللہ نہ کرے۔ نوی! یہ تم کیا اول فول بکنے لگتے ہو۔'' وہ بے اختیار بولی۔ ایسے میں وہ دوستانہ انداز کی بے تکلفی اور اپنائیت کا مظاہرہ کرنے لگتی تھی۔ آگے بولی۔

''ٹھیک ہے، میرا خیال ہے ہمیں کالیا کے ذرائع کا بھی فائدہ اٹھانا چاہیے لیکن میں بھی تب تک اپنے کولیگ بینچ سے مشورہ کر لیتی ہوں۔ ویسے میرا خیال ہے تمہیں اس سلسلے میں رضا کارانہ گرفتاری پیش کرنا ہوگی۔ پولیس کو یا عدالت کو اور تمہارے تحفظ کو یقینی بنانے کے لیے مجھے میڈیا کا بھی سہارا لینا پڑے گا۔''

زنیرہ سے میری ذہنی ہم آہنگی اور مزاج آشنائی کی یہی ایک وجہ تھی کہ وہ وقت اور حالات کے تقاضوں کو پہچاننے میں اور اس کے مطابق آئندہ کا لائحہ عمل تیار کرنے میں میرا ہم قدم بننے میں دیر نہیں لگاتی تھی۔

میں نے کہا۔ ''تم ایک اور کام تو کر دو۔ عاصمہ اور فہیم سے میری بات کرا دو۔ پتا نہیں ان بے چاروں کا کیا حال ہو رہا ہوگا؟''

''آف کورس۔ ویسے میں انہیں تمہارے بارے میں بتا چکی تھی۔'' زنیرہ نے کہا۔ میرا اندازہ صحیح ثابت ہوا تھا۔

''وہ دونوں بے چارے پریشان ہو گئے تھے۔ یہ اطلاع میں نے دیر سے ہی انہیں دی تھی اس لیے کہ میں پہلے انہیں پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن جب مجھے حوالات میں تمہاری ضمانت کرانے میں ناکامی ہوئی تو تب مجھے بتانا پڑا تھا۔ میرا خیال ہے پہلے تم عاصمہ اور فہیم سے بات کر لو تاکہ انہیں کچھ تسلی ہو جائے لیکن خبردار انہیں یہاں کا مت بتانا۔ نہ ہی یہاں انہیں آنے کا مشورہ دینا ملنے کے لیے۔ اس بدطینت پولیس افسر راجا دلاور نے اپنے سادہ وردی میں اہلکار چھوڑ رکھے ہوں گے۔ وہ ان کی ریکی کرتے ہوئے یہاں تک پہنچ سکتے ہیں۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' میں نے کہا۔

تھوڑی دیر بعد میں زنیرہ کے سیل فون پر عاصمہ اور فہیم سے بات کر چکا تھا اور انہیں تشفی بھی دینی چاہی تھی۔ وہ دونوں مجھ سے ملنے کے لیے بے چین اور پریشان ہو رہے تھے۔ مگر انہیں صورتِ حال کی نزاکت کا بھی احساس تھا۔ اسی لیے زیادہ اصرار نہ کیا۔

اس کے بعد میں نے کالیا سے بات کی اور جیسے میں نے اس کی سماعتوں میں دھماکا کر دیا۔ گویا چھوٹتے ہی اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔

''ابے لے۔ جگری! تو کدھر ہے؟ میں تو تجھے ڈھونڈ ڈھونڈ مر گیا۔ یار! جلدی بتا۔ تو خیریت سے تو ہے ناں؟ اس وقت ہے کہاں؟ جلدی بول؟''

وہ جیسے میری آواز سنتے ہی پھٹ پڑا تھا۔ میرے لیے پریشان ہو رہا تھا بلکہ یوں کہا جائے کہ مرا جا رہا تھا تو کچھ ایسا غلط بھی نہ تھا۔ اس کا میرے لیے اس قدر متوحش اور تشویش زدہ ہونا اپنی جگہ ایک معنی رکھتا تھا۔ کون تھا کالیا میرا؟ کیا لگتا تھا وہ میرا؟ محض ایک دوست۔ اور دوستی بھی بھلا کتنی پرانی تھی۔ بہ قول کسی خوش فکرے کے۔ جمعہ، جمعہ آٹھ دن..... مگر اس قلیل عرصے میں وہ مجھے اپنا سمجھنے لگا تھا۔

اپاہج سماج اور بے حس زمانے کے رائندہ درگاہ لوگوں کی یہی ادا نرالی ہوتی ہے۔ پل بھر میں اپنا بنا لیتے ہیں۔ اور خود بھی اپنا بن جاتے ہیں۔ کالیا بھی یہی تھا۔ لیکن اس کی ایک اور ادا بھی نرالی تھی۔ اور یہی وہ ادا تھی جو مجھے سب سے زیادہ بھائی تھی۔ وہ مجھے اپنے جیسا نہیں دیکھنا چاہتا تھا اور جو میں تھا۔ وہ مجھے ایسا ہی رہنے دینا چاہتا تھا۔ وہ خود بھی ایک شریف زادہ ہوگا۔ لیکن حالات و گرگوں کے بھنور نے اس کی نہج بدل ڈالی تھی اور وہ بے چارہ، نہ چاہتے ہوئے بھی شیراز سے، جرائم کی دنیا کا ''کالیا'' بن گیا تھا..... لیکن اس نے شاید میری صورت میں اپنا چہرہ دیکھا تھا اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ ایک اور ''شیراز'' کالیا بن جائے۔ یہ ایک جرائم پیشہ شخص کی بہت بڑے ظرف کی بات تھی، بلکہ میں اسے نیکی کہوں گا کہ وہ بہرحال مجھے ایسے کسی روپ میں دیکھنے کا خواہ نہیں تھا۔ وہ مجھے ''کالیا'' بننے سے بچانا چاہتا تھا۔

میں نے خود کو قدرے پُرسکون کرتے ہوئے کہا، ہولے سے کہا۔

''چھری کے نیچے دم تو لے لے میرے یار! میں ابھی تو

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

بالکل ٹھیک ہوں۔اور جہاں ہوں خیریت سے ہوں۔ لیکن..... یار! میرے ساتھ اس بدخصلت انسپکٹر راجا دلاور نے کچھ اچھا نہیں کیا۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے اسے اب تک کی ساری پیش بیتی بمعہ جگ بیتی، کے پوری صراحت کے ساتھ بتا ڈالی۔

''مجھے تو پہلے ہی اس پر یہی شبہ ہو چکا تھا۔اسی لیے تو میں تیرے بغیر حوالات سے باہر نہیں آنا چاہتا تھا کہ وہ کہیں تیرے ساتھ ہاتھ کے ہاتھ کوئی تر پا چلتر نہ کر جائے، کیوں کہ میں اس کے سب پینتروں سے اچھی طرح واقف ہوں۔'' کالیا میری رام کتھا سنتے ہی فوراً بول پڑا تھا۔

''یہ تو نے اچھا کیا کہ عین وقت پر تو مکان سے فرار ہو گیا۔میں اس خاور سے بھی اچھی طرح نمٹ لوں گا۔جو تو نے مجھے اس رزیل کا ناک نقشہ بتایا ہے ناں۔میں شاید اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہوں۔خیر۔اب یہ بتا کہ تو اس وقت ہے کدھر؟''

میں نے اسے مختصراً ایڈووکیٹ زنیرہ کے بارے میں بتا دیا۔

''واہ میرے یار! یہ بھی تو نے ایک اچھا ہی قدم اٹھایا ہے۔یہ وکیل صاحبہ اگر تیرے ساتھ واقعی مخلص ہے تو اس کا مشورہ ماننے میں دیر مت لگانا۔یہی تجھے۔قانونی طریقے سے تیرے شریفانہ کردار کو داغ لگانے سے بھی بچائے گی۔جو نہ صرف تیرے لیے بلکہ تیرے گھر والوں کے لیے بھی بہتر ہو گا۔باقی میں دیکھ لیتا ہوں۔تو اس کی فکر نہ کر اور بے غم ہو جا۔اس انسپکٹر کی پینترے بازیوں کو بریک لگانے کا ذمہ میرے سپرد ہے۔بے غم ہو جا۔پر خبردار۔جگری! کوئی غیر قانونی راستہ مت اختیار کرنا۔خدا حافظ''

میں نے ایک گہری سانس خارج کر کے زنیرہ کا سیل اسے تھما دیا۔

میرا سیل تھانے میں چھین لیا گیا تھا۔اس لیے میں نے احتیاط کے پیش نظر۔اپنی سم بلاک کروا دی تھی۔اور سیٹ بھی مخصوص کوڈ ملا کر ڈل کر دیا تھا۔یہ زنیرہ نے اپنے سیل فون اور میرے شناختی کارڈ نمبر کی مدد سے موبائل ٹیلی کام فرنچائز سے رابطہ کر کے کیا تھا۔

☆☆☆

کالیا نے اب جو کام انجام دینا تھا وہ بہ خوبی جانتا تھا۔اب دیکھنا یہ تھا کہ زنیرہ میرے سلسلے میں کیا کرنے والی تھی؟ اس نے پہلے دو تین فون کھڑکائے۔مختلف لوگوں سے ''سیر حاصل'' گفتگو کی کچھ مشورے لیے اس کے بعد وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں گئی، چند ہی سیکنڈوں میں اس کی واپسی ہوئی تو اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا آفس بریف کیس جھول رہا تھا، وہ اس نے اپنے سامنے دھری شیشے کی ٹاپ والی میز پر رکھ کر کھولا، شفاف عدسوں والی سیاہ نفیس فریم کی عینک نکالی، اور اندر سے چند کاغذات نکال کر کچھ منٹوں تک اس کی ''کمپائلنگ'' کرتی رہی، اور ایک فائل بنا ڈالی۔مزید نصف گھنٹا اسے اس فائل کے اندر کچھ اندراج کرنے میں لگا۔

اس دوران وہ مجھ سے کچھ ضروری سوالات بھی کرنے لگی، جس میں مذکورہ مکان، خاور اور منشی دادن خان کی لاش سمیت انسپکٹر راجا دلاور کے خود ساختہ بیان کا بھی ذکر تھا، بمعہ نام پتے کے اس کے بعد اپنے چہرے سے عینک اتار کے ایک گہری ہمکاری لی اور بریف کیس بند کر دیا۔

میری مستفسرانہ نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔وہ کچھ پل مجھے پُرسوچ نگاہوں سے تکتی رہی اس کے بعد گہری متانت سے بولی۔

''تمہارا کیس میں نے تیار کر لیا ہے۔ان پہ تمہارے دستخط کے بعد میں یہاں سے روانہ ہو جاؤں گی، تم ابھی ادھر ہی رہو گے۔البتہ میرے فون کا انتظار کرنا، اور باہر بالکل مت نکلنا۔ہو سکتا ہے میں تمہیں خود ہی لینے کے لیے دوبارہ آؤں۔

میری پہلی کوشش یہ ہو گی کہ تمہاری بذریعہ عدالت رضا کارانہ گرفتاری کے بعد، ذاتی مچلکے پر تمہاری ضمانت کروا لوں۔ممکن ہے اس میں ایک دو پیشیاں بھی بھگتانی پڑ جائیں۔لیکن تب تک میری استدعا کے مطابق تمہیں کسی پولیس یا تھانے کی بجائے۔ایف سی ایم (فرسٹ کلاس مجسٹریٹ) کی کسٹڈی میں رکھا جائے گا۔کلیئر؟''

زنیرہ پر مجھے پورا بھروسا تھا۔لہٰذا میں نے اسے اثبات میں جواب دے دیا۔تاہم پوچھا۔

''کیا مجھ سے کسی ملاقات پر پابندی تو نہیں ہو گی؟''

''نہیں'' زنیرہ نے مختصراً جواب دیا۔اس کے انداز سے اب صاف جھلکنے لگا تھا کہ وہ فوراً نکلنا چاہتی تھی۔میں خاموش ہو گیا۔اس نے مختلف کاغذات پر میرے سائن لیے اور چلی گئی۔

میں نشست گاہ میں تنہا بیٹھا رہ گیا اور اسی طرح مجھے ایک گھنٹا تو بیت ہی گیا تھا۔اس دوران خالہ نجو مجھے دو بار چائے بنا کر پلا چکی تھیں۔

تیسری بار ان کی آمد کارڈلیس فون ریسیور کے ساتھ

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ہوئی۔ ''یہ لو بیٹا تمہارا فون ہے۔'' انہوں نے کارڈلیس فون مجھے تھماتے ہوئے کہا۔ میں یہی سمجھا تھا کہ زنیرہ کا ہی فون ہو گا۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ فون لیا اور اپنے کان سے لگا کر ہیلو کہا تو دوسری طرف سے آواز سن کر میں چونکا۔ میرا اندازہ غلط ثابت ہوا تھا۔ فون زنیرہ کا نہیں تھا، کالیا کا تھا۔

مجھے حیرت ہوئی کہ بھلا اسے زنیرہ کا لینڈ لائن نمبر کیسے پتا چلا۔ بعد میں عقدہ کھلا کہ میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی زنیرہ کے سیل فون پر اس سے بات کی تھی اور اس نے جب دوبارہ مجھ سے بات کرنا چاہی تو ظاہر ہے تب تک زنیرہ اپنا سیل فون اپنے ساتھ لے جا چکی تھی اور اسی نے ہی اسے اپنے گھر کا فون نمبر دے دیا تھا کہ وہ مجھ سے بات کر لے۔

''میں نے خاور کا پتا چلا لیا ہے۔ مگر اس نے تمہیں اپنا نام غلط بتایا تھا۔''

کالیا نے کہا تو میں بولا ''ہاں! مجھے بھی اس کا اندازہ تھا۔ مگر تم آگے بتاؤ؟ کیسے تم نے اس کا پتا لگا لیا؟ اور کیا تمہیں پورا یقین ہے کہ یہ وہی ہے۔ جبکہ تم نے تو اسے دیکھا بھی نہیں؟''

''ابے لے۔ جگری! کیا تجھے نہیں معلوم پولیس اور بعض حساس قانونی ادارے محض مجرم کا خاکہ تیار کر کے بھی اسے گرفت میں لے لیتے ہیں۔ بالکل اسی طرح میں نے بھی یہی کام کیا ہے۔ تو نے خاور کا جو ناک نقشہ بتایا تھا وہ میں نے اچھی طرح ذہن نشین کر لیا تھا۔ کیوں کہ مجھے شبہ تھا کہ اس کام میں اس پولیس افسر راجا دلاور کی کون مدد کر سکتا ہے۔ یہ عارف عرف مچھندر ہے۔ ہمارے مخالف گروپ سے اس کا تعلق ہے، پہلے یہ ہمارا ہی ساتھی ہوا کرتا تھا، مگر پھر بعد میں...... چل چھوڑ، بات طویل ہو جائے گی۔ یہ مچھندر پولیس کا ٹاؤٹ بھی ہے۔ خاص کر انسپکٹر راجا دلاور کا۔ میں نے اسے دھر لیا ہے۔ پر میں چاہتا ہوں کہ تو اسے ایک نظر دیکھ لے تو مجھے یقین ہو جائے، تب میں اس کا منہ بہ آسانی کھلوا لوں گا۔''

اس کی بات سن کر میرے اندر خوش امیدی چمکی تھی۔ کیوں کہ بہ قول زنیرہ کے۔ خاور یا عارف مچھندر نہ صرف انسپکٹر راجا دلاور کے گلے کا پھندا بھی بن سکتا تھا۔ بلکہ۔ میرا کیس مضبوط کرنے کا سبب بھی...... بشرطیکہ یہ وہی ہو۔

لہٰذا میں پورے جوش سے بولا ''یار کالیا! اگر تو یہ وہی خاور ہے تو یقین کرو میری بہت سی مشکلیں آسان ہو جائیں گی اور میرا کیس بھی مضبوط ہو جائے گا لیکن اس وقت میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں یہاں سے ہل بھی نہیں سکتا۔ مجھے ایڈووکیٹ زنیرہ

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

ماہ اپریل کے موسمی تغیرات
جاسوسی کے نت نئے تصورات

اولین صفحات ماضی کی نذر ہو جانے والے ایک معما کیس کی از سر نو تحقیقات...... موت و حیات کی کشمکش کا پُرتجسس احوال...... **امجد رئیس** کے قلم کا کمال

انگارے شریف آدمی کو بدمعاش بننے پر مجبور کر دینے والے قانون شکن عناصر کی یکجائی جنم لینے والا ہولناک سلسلہ **طاہر جاوید مغل** کے قلم سے

آوارہ گرد چلچلاتی دھوپ میں بے آسرا و تنہا مسافر کی آبلہ پائی... **عبدالرب بھٹی** کی طبع آزمائی

سرورق کی کہانیاں

پہلا رنگ تجسس و سسپنس سے بھرپور سرورق کی کہانی۔ **کبیر عباسی** کے انداز تحریر کی عکاسی

دوسرا رنگ خودکشی کے رنگ میں ڈوبا فتا تلاشنہ کھیل...... **محمد فاروق انجم** کا تیکھا سرورق

آپ کے تبصرے...
مشورے محبتیں... شکایتیں...
اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کہانیاں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

نے تاکید کر رکھی ہے کہ میں اس کا یا اس کے فون کا انتظار کروں۔''

''ابے لے۔جگری! میں بھلا تجھے کب وہاں سے ہلنے کا مشورہ دے رہا ہوں۔''

وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔''تو صرف مجھے یہ بتا کہ اگر میں اس خاور کو لے کر تیرے پاس آجاؤں اور تو صرف ایک نظر اس پر ڈال کر اسے پہچان لے۔ پھر تیرا کام ختم اور میرا شروع۔ چند سیکنڈوں کی بات ہوگی۔''

اس کی بات سن کر میں نے چند ثانیوں کی پُرسوچ... خاموشی اختیار کرلی اور پھر بولا۔

''یار! تو ذرا مجھے تھوڑا وقت دے سکتا ہے۔ میں ایڈووکیٹ زنیرہ سے فون پر مشورہ کرلوں۔''

''چلے گا۔ پر، ذرا جلدی۔ حالات ایسے ہیں کہ سب کچھ جتنی جلدی اور تیزی کے ساتھ نمٹ جائے اتنا ہی اچھا ہو گا۔ بند کرتا ہوں فون۔'' اس نے یہ کہہ کر رابطہ منقطع کردیا۔

کارڈلیس پر میں نے اسی وقت زنیرہ کے سیل کا نمبر پنچ کیا۔ تھوڑی دیر میں اس کی آواز ابھرتے ہی میں نے اسے کالیا کی بات سے آگاہ کیا تو وہ بہ یک ترنت بولی۔

''اسی وقت اسے بلاؤ۔ یہ شناخت پریڈ ضروری ہے۔ اور سنو۔ نومی! اگر تو یہ وہی شخص نکلتا ہے تو پھر۔'' وہ کسی سوچ میں پڑ گئی۔ مجھے کچھ اندازہ ہوا کہ وہ کیا سوچ رہی تھی۔ اسی لیے میں بھی خاموش رہا۔ کچھ سیکنڈوں کی پرسوچ خاموشی کے بعد اس کی دوبارہ آواز ابھری۔

''چلو ٹھیک ہے۔ ابھی اسے آلینے دو اور تم اسے پہچان لو اچھی طرح۔ پھر مجھ سے فون پر بات کرو۔ بعد میں تمہیں بتاتی ہوں کہ کیا کرنا ہے۔''

میں نے کالیا سے بات کی اور اس نے اسی وقت آنے کی ہامی بھرلی۔ میں نے اسے زنیرہ کی رہائش گاہ کا پتا بھی... بتاتے ہوئے یہ تاکید بھی کردی تھی کہ وہ ذرا اس طرف محتاط ہو کر ہی آئے۔

''بے غم ہو جا۔ جگری! کالیا نے کچی گولیاں نہیں کھیلیں۔ ابھی پہنچتا ہوں۔''

میرا دل جوش کے مارے دھڑک رہا تھا۔ میں دعائیں مانگنے لگا کہ کاش یہ وہی ہو۔ کیوں کہ یہی منشی دادن کے قتل کے راز سے بھی پردہ اٹھا سکتا تھا۔

میں نے خالہ نجو سے کہہ دیا کہ ابھی تھوڑی دیر میں شیراز نام کا ایک نوجوان آئے گا، میں نے اس سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔ اس لیے دروازے پر میں ہی جاؤں گا۔

انہیں سارے معاملات کا علم ہی تھا۔ اس لیے انہوں نے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔

اب میں یہی دعا مانگ رہا تھا کہ اس سے پہلے کہ زنیرہ کا فون یا وہ خود مجھے لینے آجائے، کالیا اس سے پہلے ہی آجائے۔ شکر تھا کہ میری دعا قبول ہوئی اور تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہی کال بیل بجی۔ میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔

میں فوراً صوفے سے اٹھا اور دروازے پر پہنچا۔ ایک نگاہ جھری سے باہر جھانکا تو میری رگوں میں خون کی گردش یکلخت تیز ہوگئی۔

دروازے پر ایک پرانی سی کار کھڑی تھی اور اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر کوئی اجنبی اسٹیئرنگ تھامے بیٹھا، دروازے کی طرف ہی دیکھ رہا تھا، جبکہ خود کالیا، دروازے پر کھڑا تھا۔ میں نے فوراً دروازہ کھولا تو کالیا نے جلدی سے کہا۔

''بندہ کار کی عقبی سیٹ پر موجود ہے۔ جلدی سے ایک نظر ڈال لے اس پر۔''

یہ کہہ کر وہ کار کی جانب پلٹا۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ میں نے ایک محتاط سی نگاہ گرد و پیش پر ڈالی، پھر کچھ مطمئن ہو کے باہر قدم رکھا، اور سامنے ہی کھڑی کار کی جانب بڑھا۔ تب تک کالیا عقبی سیٹ کا دروازہ کھول چکا تھا۔ میں نے ایک دھڑکتی نظر، باہر سے ہی کھڑکی سے اندر ڈالی۔

وہ رسیوں سے جکڑا پڑا تھا۔ اس کے منہ پر پٹی باندھی گئی تھی۔ تاہم چہرہ واضح تھا۔

اسے دیکھتے ہی میں نے جوش سے سرخ پڑتے چہرے کے ساتھ کالیا سے کہا۔

''یہی ہے وہ۔''

میری تصدیق کرتے ہی۔ کالیا کی آنکھوں میں ایک تیز سی چمک ابھری۔ میں نے کہا۔''تو ذرا اندر آ۔''

اس نے اپنے ساتھی سے کچھ کہا اور پھر وہ میرے ساتھ اندر آگیا۔

میں نے اسے نشست گاہ میں بٹھا دیا۔ کارڈلیس ابھی تک وہیں پڑا تھا۔ میں نے اسی وقت زنیرہ سے رابطہ کیا اور اسے بتا ڈالا کہ میں اس مطلوبہ نوجوان کو پہچان چکا ہوں۔

میری بات سنتے ہی وہ پُرجوش سے لہجے میں بولی۔

''گڈ! اب تم ایک کام کرو..... میری ذرا کالیا سے بات کرا سکتے ہو؟''

''ہاں۔ وہ ادھر ہی ہے ابھی یہ لیں۔ کریں بات۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کہتے ہوئے میں نے فون کالیا کی طرف بڑھادیا اور بتا بھی دیا کہ ایڈووکیٹ زنیرہ اس سے بات کرنا چاہتی تھی۔

اس نے فون لیا اور نہایت شائستہ لہجے میں زنیرہ کو سلام کیا اس کے بعد کچھ سیکنڈ تک خاموشی سے اس کی بات سنتا رہا۔ پھر بولا۔

''ٹھیک ہے میڈم! آپ بے غم ہو جائیں۔ جہاں آپ کہیں گی میں اسے پہنچادوں گا۔ اچھا جی۔''

یہ کہہ کر اس نے فون میری طرف بڑھادیا۔

''نومی! میں نے کالیا کو کچھ باتیں سمجھادی ہیں۔ میں خود بھی پہنچ رہی ہوں۔ تم اسے رخصت کردو۔ ہم نے ساتھ نکلنا ہوگا۔''

میں نے اثبات میں جواب دیا اور اس کے تھوڑی دیر بعد ہی کالیا سے بولا۔

''کالیا! تم میڈم کی بات سمجھ گئے ہوناں؟ تم جاؤ ابھی وہ بھی آنے والی ہیں۔ مجھے لینے کے لیے۔ بس! دعا کرنا یار! یہ معاملہ بہ خیر وخوبی انجام کو پہنچ جائے۔''

کالیا۔ میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر دوستانہ لہجے میں بولا۔ ''بے غم ہو جا۔ جگری! قسمت تیرا ساتھ دے رہی ہے۔ اللہ کی مدد تو تیرے ساتھ شامل ہی ہے۔ چلتا ہوں۔''

وہ چلا گیا۔ اور اس کے جانے کے تھوڑی دیر بعد ہی زنیرہ آگئی۔

اس نے پہلے مجھے اپنے آئندہ کے لائحہ عمل کے سلسلے میں تھوڑا بریف کیا۔ جس کے مطابق۔ وہ مجھے اپنے ساتھ پہلے ایف سی ایم کے پاس لے جانا چاہتی تھی جہاں میں ان کی کسٹڈی میں رہوں گا۔ اور وہیں۔ عارف مچھندر کو بھی پیش کیا جائے گا۔ اس کے بعد ایک اسپیشل تحقیقی ٹیم اس سارے معاملات کی چھان بین کرنے والی تھی، اور میرا کیس انہی کے سپرد کیا جائے گا۔ وغیرہ۔

میں اللہ کا نام لے کر زنیرہ کے ساتھ روانہ ہوگیا۔

بعد میں جو کارروائی میرے سلسلے میں لائی گئی اس سے میں مطمئن رہا۔ کیوں کہ میرے ساتھ ایسا کوئی مجرموں والا سلوک نہیں کیا گیا تھا۔

ایف سی ایم کے سامنے مجھے پیش کیا گیا تھا اور میں نے اپنا وہ سارا بیان بلا کم وکاست ریکارڈ کروادیا۔ جس کی روشنی میں تفتیشی ٹیم نے اپنا لائحہ عمل ترتیب دینا تھا۔ تاہم میں نے اپنی طرف سے صرف اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ میری بڑے منشی دادن خان کے ساتھ ہاتھا پائی ضرور ہوئی تھی لیکن وہ عمومی نوعیت کی تھی، اس میں کوئی کسی ''شارپ وپین'' یعنی کند آلے کا استعمال نہیں کیا گیا تھا اور نہ ہی فریقین میں سے کسی کو بھی کوئی برا یا گہرا زخم آیا تھا، ماسوائے معمولی خراشوں کے جبکہ میرے خلاف جو ایم ایل سی کا سرٹیفکیٹ جاری کیا گیا تھا وہ جھوٹا اور پروزنل تھا، یعنی کچا۔ پرفیکٹ سرٹیفکیٹ ابھی تک نہیں بنایا گیا تھا۔

اسی نقطے کو زنیرہ نے بھی ایف سی ایم اور اسپیشل تفتیشی ٹیم کے سامنے اٹھایا تھا کہ محض کچے سرٹیفکیٹ پر CR نمبر کی ایف آئی آر نہیں کاٹی جاتی، جب تک پکا سرٹیفکیٹ تیار ہو کے نہ آجائے، البتہ کچے سرٹیفکیٹ پر صرف NC درج کی جاتی ہے۔ اور پکا سرٹیفکیٹ میڈیکل چیک اپ اور لیب انوسٹی گیشن کے چوبیس گھنٹے بعد، بعض کیسز میں یہ میعاد بہتر گھنٹے پر بھی محیط ہوتی ہے۔

چناں چہ زنیرہ کے انہی چند مزید اہم نکتوں پر کیس تیار کر کے ہائی کورٹ کو تفویض کردیا گیا اور وہاں ہونے والی دو تین پیشیوں کے بعد ہی میری باعزت ضمانت منظور کر لی گئی۔

عارف مچھندر کی طرف سے مجھے ذرا ڈر تھا کہ وہ کم بخت کہیں عین وقت پر اپنے بیان سے منحرف نہ ہو جائے۔ مگر کالیا نے بھی، پچی گولیاں نہیں کھیلی ہوئی تھیں اس نے بھی اپنا اعتراف جرم قبول لیا تھا کہ اسے یہ سب کرنے کے لیے انسپکٹر راجا دلاور نے کہا تھا البتہ اس کا منشی دادن کے قتل سے کوئی تعلق نہ تھا۔

انسپکٹر دلاور کو بھی کورٹ نے لائن حاضر کر کے اس کے خلاف محکمہ جاتی کارروائی کا حکم دے دیا اور اسے کوارٹر گھاٹ کر کے پیٹی وغیرہ سب اتروالی گئی تھی۔

وہ ابھی تفتیشی ٹیم کے نرغے میں تھا۔ اور نجانے بعد میں اس کے ساتھ کیا ہونے والا تھا یہ خدا ہی بہتر جانتا تھا۔ مگر میں بہر حال اپنی باعزت بریت پر خوش اور مطمئن تھا۔

میرے عزیز دوست، بھائی بہن، اور میرے بہی خواہ سب خوش تھے۔

یہ میری اپنے خفتہ و ناخفتہ دشمنوں کے خلاف دوسری اہم فتح تھی۔ جس نے یقیناً انہیں یہ سوچنے پر مجبور کر ہی دیا ہوگا کہ میں ان کے لیے اتنا تر نوالہ نہ تھا، جتنا کہ انہوں نے مجھے سمجھ لیا تھا۔

زنیرہ اور کالیا کا میں دل سے ممنون تھا۔ اس مشکل گھڑی میں انہوں نے بالخصوص زنیرہ نے اپنی جان تک کو

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

خطرے میں ڈال کر میری بڑی مدد کی تھی۔

اس روز سب گھر پہ ہی تھے اور چاچا انور شاہ بھی ہمارے گھر آئے ہوئے تھے۔

انہوں نے مجھ سے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

''نومی بیٹا! عطا محمد کے دیئے ہوئے تمہارے پاس کتنے روپے باقی بچے ہیں؟''

میں ان کے سوال کا مطلب سمجھ کر جواباً بولا۔''میرے اکاؤنٹ میں ان کے دیئے ہوئے ابھی ایک لاکھ موجود ہیں۔''

''ٹھیک ہے کل صبح وہ رقم نکلوا لینا۔اور مجھے دینا۔'' وہ تلخی سے بولے۔''میں کل ہی خود ان کے گھر جا کر وہ رقم بھی ان کے منہ پر ماردوں گا اور اس نوکری پر بھی لعنت بھیج دوں گا۔''

''ہاں بھیا! انکل شاہ، ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' قریب بیٹھی عاصمہ نے بھی ان کی بات کی تائید میں کہا۔فہیم بھی وہیں موجود تھا۔وہ بھی اسی تلخی سے بولا۔

''ہاں بھائی جان! کیا صلہ دیا انہوں نے آپ کی دیانت داری اور وفا داری کا؟ حقیقت کی تہہ میں پہنچے بغیر انہوں نے بھی آپ پر اتنا بڑا الزام تھوپ دیا۔''

''میرا تو دل اس بات پر زیادہ دکھ رہا ہے کہ وہ لوگ بھی اس سازش کو نہ سمجھ پائے جن کی بھلائی اور فائدے کے لیے اور ان کا روزگار بچانے کے لیے نعمان بیٹے نے اپنی جان تک خطرے میں ڈالی اور ایک بڑی لینڈ مافیا سے ٹکر بھی لے ڈالی۔تف ہے ان پر۔''

چاچا انور شاہ غصے سے بولے۔

''چچ پوچھو تو نومی بیٹا! میرا اب اس لاری اڈے کی نوکری سے بھی دل کھٹا ہو گیا ہے۔''

میں خاموش تھا۔لیکن میری نگاہوں کے سامنے وہ ہزاروں غریب ملازموں کے ستے ہوئے معصوم چہرے گھوم گئے تھے جو شاید اب بھی مجھ سے اُمید لگائے بیٹھے تھے۔ان کا کیا قصور تھا؟

اچانک کال بیل بجی۔فہیم دروازے پر گیا۔اور تھوڑی دیر بعد واپس آ کر اس نے ایک چونکا دینے والی اطلاع ہمیں دی۔

''بھائی جان۔باہر کچھ لوگ آئے ہیں آپ سے ملنے۔ان میں عطا محمد نامی آدمی بھی ہے۔کہیں یہ وہی تو نہیں۔جو۔''

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔چاچا انور شاہ یک دم بولے۔

''جاؤ ان سے کہہ دو۔گھر پہ کوئی نہیں ہے۔اب کیا لینے آیا ہے وہ یہاں۔''

فہیم دوبارہ دروازے کی طرف لوٹنے لگا تو میں نے اسے روک لیا۔

''ٹھہرو فہیم!'' وہ پلٹتے پلٹتے رک گیا۔میں نے چاچا انور شاہ کی طرف دیکھ کر بڑے رسان سے کہا۔

''چاچا! وہ خود ہمارے گھر آئے ہیں۔آئے ہوئے مہمان کو اس طرح لوٹانا ٹھیک نہیں ہے۔آپ کی اجازت ہو تو ان سے مل لینے میں کوئی حرج نہیں۔اب تو سب ٹھیک ہو چکا ہے۔ممکن ہے ان کے دل سے بھی غلط فہمی نکل گئی ہو؟''

چاچا انور شاہ نے ایک نظر میری جانب دیکھا اور ایک گہری سانس خارج کر کے بولے۔''تم بھی میرے یار جنت بخشے، احمد حسین پہ گئے ہو۔وہ بھی بڑی بڑی باتوں پر ہمیشہ معاملہ فہمی اور عفو و درگزر سے کام لیتا تھا۔''

پھر وہ قریب کھڑے فہیم سے بولے۔''ان کے ساتھ اور کتنے لوگ ہیں؟''

''میرے خیال میں پانچ، چھ ہی ہوں گے۔'' فہیم نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے انہیں بیٹھک میں بٹھا دو۔میں اور نعمان آتے ہیں۔'' چاچا انور شاہ نے کہا اور فہیم اثبات میں سر ہلاتا ہوا چلا گیا۔

تھوڑی دیر گزری، فہیم انہیں بٹھا آیا تھا۔اس کے بعد میں اور چاچا انور شاہ بیٹھک میں داخل ہوئے اور سب کو سلام کیا، وہ سب اٹھ کھڑے ہوئے اور عطا محمد سب سے پہلے خود میری طرف آگے بڑھا تھا اور مجھے بے اختیار اپنے گلے سے لگا لیا۔

ان کی آنکھوں اور انداز و اطوار سے شرمندگی اور ندامت جھلکتی تھی۔

''یار نعمان بیٹے! مجھے معاف کر دینا۔میں تمہارے جیسے ہیرے آدمی کی قدر نہ جان سکا۔'' وہ مجھ سے الگ ہو کر بولا۔تو اس کے ساتھ آئے ہوئے آدمیوں میں سے ایک نے اپنے ساتھیوں کی جیسے ترجمانی کرتے ہوئے۔نہایت شرمساری کے ساتھ کہا۔

''نعمان بھائی! ہم سب بھی آپ سے معافی مانگنے آئے ہیں۔ہم سے بس غلطی ہو گئی کہ ہم سچ اور جھوٹ کی تمیز نہیں کر سکے۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

خوب صورت مضامین سے مزین اپریل 2017ء کا سالگرہ نمبر

ماہنامہ پاکیزہ کراچی

انجم انصار کا ناول گم شدہ محبت اختتامی موڑ پر

رفعت سراج و شیریں حیدر کے ناولوں کی دلکش اقساط

سحر ساجد نے من جانبازم میں بکھیرے خوب صورت جذبوں کے موتی

سیما رضا ردا نے قلم اٹھایا نہایت حساس موضوع پر اپنے منی ناول ہم کو عبث بدنام کیا میں

ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کے پُراثر الفاظ میں اللہ اور اس کا نور کا بیان

کذب کے موضوع پر اختر شجاعت کی پُرفکر تحریر

پاکیزہ کی سالگرہ کے حوالے سے سینئر مصنفات کی خصوصی رائے شائستہ زرین کے سروے میں

پاکیزہ کی دیرینہ ساتھی، مصنفہ مہناز عرفان

سے نزہت اصغر کی دلچسپ گفتگو

ناہید سلطانہ اختر، نگہت سیما اور عالیہ حرا کی خصوصی تحریریں سالگرہ نمبر کے لیے

اس کے علاوہ

منشا محسن علی، ریحانہ زیدی، دانیہ صدیقی،

نمرہ ملک، ثنا عمران ودیگر باصلاحیت لکھاریوں کی دل نشیں تحریریں

سالگرہ نمبر کے لیے خصوصی سلسلے، دل پزیر اشعار، غزلیات، دلچسپ تراشے، پُرمزہ پکوان اور دلکش نسخے آپ کی اعلیٰ ذوقی کی نذر

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''آپ لوگ ایسا کہہ کر مجھے کیوں شرمندہ کررہے ہیں؟ پلیز۔ بیٹھ جائیں آپ لوگ، مجھے آپ سب کی آمد پر خاص طور پر عطا صاحب کی تشریف آوری پر بے حد مسرت ہوئی ہے۔'' میں نے ان سب سے بڑی محبت اور خوش اخلاقی سے کہا تو وہ سب بیٹھ گئے۔

چاچا انور شاہ سے بھی ان سب نے کم وبیش یہی الفاظ ادا کیے تھے۔

صدر عطا محمد نے مجھے اپنے ساتھ بٹھایا۔

اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اس دوران چائے بسکٹ کا بھی دور چلا، جس کا انتظام نعیم اور عاصمہ بہنا نے ہی کیا تھا۔

میرے کیس سے متعلق اور باعزت بریت، بہ شمول ایک پولیس انسپکٹر کی معطلی اور بدطینتی بھی میری سچائی کا بین ثبوت تھی۔ ایک اور انکشاف بھی انہوں نے میرے سامنے کیا تھا۔ یہ چند گنتی کے وہی لوگ تھے جو بڑے منشی دادن خان کے گروپ کے تھے، وہ بھی شرمسار تھے، چوں کہ وہ اس کے قریبی ساتھی اور اس سازش کے شریک کار تھے، انہوں نے ہی یہ تکلیف دہ انکشاف کیا تھا کہ یہ درحقیقت دادن خان کی ہی سازش تھی، اور اسی نے ہی انتظامیہ میں موجود بعض ''کالی بھیڑوں'' سے درپردہ سودے بازی کی تھی، جو اصل میں ایک لینڈ مافیا، سیٹھ ستار کی سپورٹ کررہے تھے۔

دادن خان کے قتل کی گتھی ابھی نہیں سلجھی تھی، جبکہ تفتیش جاری تھی۔ تاہم وہ اب اس دنیا میں نہیں رہا تھا تو اس طرح ان لوگوں کو بھی اس بات کا احساس ہوگیا تھا کہ اب میں ہی وہ واحد شخص تھا جو اس بگڑے ہوئے معاملے کو سدھار سکتا تھا۔

''نعمان میاں! ان لوگوں نے میرے قدموں میں گر کر معافی مانگ لی ہے۔ اب یہ تم سے بھی معافی مانگنے آئے ہیں۔'' عطا محمد نے مجھ سے کہا۔ اور آگے بولا۔

''مگر میں نے ان سے صاف کہہ دیا تھا کہ تم لوگوں کی معافی نعمان سے مشروط ہے۔ سو یہ میرے ساتھ یہاں تم سے معافی مانگنے چلے آئے۔ اب تمہاری مرضی ہے کہ تم انہیں معاف کردو یا پھر میں انہیں لاری اڈے سے بے دخل کردوں؟''

''نہیں عطا صاحب!'' میں نے فوراً کہا۔

''میں ان کا روزگار بچانے کے لیے ہی تو۔ کوشاں ہوں۔ شکر ہے کہ انہیں عقل آگئی۔ لیکن مجھے دادن خان کی موت پر بھی افسوس ہے۔ صاف دل کی بات کہوں گا کہ میری اس سے نفرت کی ایسی کوئی لڑائی نہ تھی کہ میں اس کی موت کا خواہاں ہوتا۔ بس انسان کو لالچ میں نہیں پڑنا چاہیے۔ اب تو وہ اس دنیا میں نہیں رہا۔ ہم اس کے لیے اللہ سے بخشش اور مغفرت کی ہی دعا کرسکتے ہیں۔''

میری بات پر چند منٹوں کے لیے خاموشی چھا گئی اور اس دوران چاچا انور شاہ نے سب سے بڑے منشی کے لیے دعا کی درخواست کردی۔ سب نے دعا کی اور اس کے بعد عطا محمد نے مجھ سے کہا۔

''نعمان میاں! کیا اب ہم سمجھیں کہ تمہارے اور انور شاہ کے دل میں ہمارے لیے کوئی ناراضگی نہیں رہی؟''

''نہیں نہیں۔ عطا صاحب! میں یا نعمان کبھی بھی آپ سے ناراض نہیں ہوئے۔''

اس بار چاچا انور شاہ نے ان سے کہا۔ ''بس تھوڑا افسوس ہوا تھا کہ آپ بھی نعمان جیسے نوجوان کو غلط سمجھ گئے، مگر شکر ہے اللہ کا کہ آج ہمارے دلوں سے یہ غلط فہمیاں دور ہوگئیں۔''

''تو پھر ٹھیک ہے۔ اب نئے سرے سے ان معاملات کو سنبھالو۔ میں نعمان کو ضلعی ٹرانسپورٹ کمپنی کو نائب صدر کا عہدہ تفویض کرتا ہوں اور انور شاہ تم کو میں منشی کا عہدہ دیتا ہوں۔ اب تم دونوں ہی ملیر کے غریب عوام کی اس سہولت کا خیال کرتے ہوئے اس اڈے کو شہر سے باہر منتقل کرنے کی سازش سے بچا سکتے ہو۔'' عطا نے کہا اور آگے بولا۔

''تم دونوں کے لیے، بلکہ ہم سب کے لیے بھی یقیناً یہ خوشی کی بات ہوگی کہ ہمیں اب صوبائی سطح کے ہونے والے اتحاد پر بھی اس لاری اڈے کو بچانے کے لیے مالی سپورٹ حاصل ہوگئی ہے۔''

مجھے اور چاچا انور شاہ کو اس خبر پر واقعی بے حد خوشی ہوئی تھی۔

میں نے پورے جوش سے کہا۔ ''آپ لوگ اس بات کی فکر نہ کریں کہ میں اپنے مشن سے ہٹ گیا ہوں۔ بلکہ میں تو ابھی تک اپنی سی پوری کوشش کو جاری رکھے ہوئے تھا کہ درمیان میں یہ مسئلہ کھڑا ہوگیا۔ ابھی جو آپ نے جس لینڈ مافیا سیٹھ ستار کا نام لیا ہے میں اس تک پہنچ چکا تھا۔ مگر آپ کو شاید اس بات کا علم نہیں کہ اس کی پشت پناہی میں بھی ایک بااثر شخصیت کا ہاتھ ہے اور میں بہت جلد اسے بھی بے نقاب کرنے والا ہوں۔''

''بس تو پھر ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔ نعمان میاں!

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اور جتنے پیسے تمہیں چاہیے وہ مجھ سے.....''

''عطا صاحب! بس مجھے اب آپ سب لوگوں کا اعتماد اور اتحاد چاہیے۔'' میں نے عطا محمد کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اور اس کی بات کاٹ کر کہا۔ تو سب نے بیک وقت اس عزم کا اعادہ کیا کہ وہ میرا بھرپور ساتھ دیں گے۔

آخر میں عطا محمد نے مجھ سے پوچھا۔ ''اب اس اخبار کی جھوٹی خبر اور انتظامیہ کے اگلے اور آخری راؤنڈ کے بارے میں ہمارا کیا لائحہ عمل ہونا چاہیے؟''

میں اس کی بات سن کر گہری متانت سے بولا۔

''ہمیں سب سے پہلے اسی اخبار میں اس خبر کی تردید کرنی چاہیے، نیز اس جھوٹی خبر میں جس طرح ہم سب کے دانستہ نام شامل کیے گئے تھے۔ اس کی بھی تردید کرنا ہوگی۔''

''میں تو سوچ رہا ہوں کہ اس سلسلے میں ایک بھرپور قسم کی پریس کانفرنس کرلینی چاہیے اور انتظامیہ کی ان کالی بھیڑوں کا بھی اشارتاً سہی ذکر کرنا چاہیے اور ساتھ ہی نعمان کو بھی اس پریس کانفرنس میں نائب صدر کی حیثیت کا عطا صاحب کی طرف بھی اعلانیہ ذکر کردیا جائے تاکہ آئندہ پھر کبھی مقامی انتظامیہ کی کالی بھیڑوں کو ہمارے خلاف کوئی گل کھلانے کا موقع نہ مل سکے۔'' چاچا انور شاہ نے بھی مشورہ دیا اور ہم سب نے ان کے اس کارآمد اور صائب مشورے پر صاد کرتے ہوئے اگلے دن ہی لاری اڈے کے دفتر کے باہر کھلے احاطے میں ہی یہ پریس کانفرنس کروانے کا پختہ ارادہ کرلیا۔

☆☆☆

حالات بہ ظاہر معمول پر تھے اور دیگر معاملات بھی خوش اسلوبی سے طے پا چکے تھے۔

اللہ نے میری نیک نیتی کا انعام اس صورت میں دیا کہ جو مجھے غلط سمجھے ہوئے تھے، سچ از خود ان کے سامنے ظاہر ہو چکا تھا بلکہ ان کی زبان سے ہی وہ سچ ظاہر ہوا تھا۔

اللہ تعالیٰ مجھے میرے دشمنوں کے خلاف مرحلہ وار کامیابیوں سے ہمکنار کررہا تھا۔

ارشاد مٹھن کا منہ کالا ہونا، رانا بشیر کا میرے در پر آنا اور ایس ایچ او، راجا دلاور کی معطلی سے لے کر بڑے منشی دادن خان کا اپنے ہی مفاد پرست لوگوں کے ہاتھوں انجام کے پہنچنے کے ساتھ اس کی سازش بھی بے نقاب ہوگئی تھی بلکہ اس کے ساتھ جو چند لوگ شامل تھے وہ بھی اس کا انجام دیکھ کر راہ راست پر آچکے تھے اور میرے ساتھ شامل ہوگئے تھے۔

یہی سبب تھا کہ میرے حوصلوں کے بادبان اور زیادہ بلند ہوگئے تھے۔ حالاں کہ اگر دیکھا جاتا تو اپنے طاقت ور اور بااثر دشمنوں کے سامنے میری بھلا حیثیت ہی کیا تھی؟

لیکن یہی اللہ کی حقانیت اور ہر جگہ اس کی موجودگی کی نشانی تو ہے کہ وہ حق پر چلنے والوں کے ہمیشہ ساتھ رہتا ہے اور دشمن خواہ کتنا ہی طاقت ور ہو، بالآخر فتح، باطل کے سامنے حق کی ہی ہوتی ہے۔

تاہم ان سب باتوں کے باوصف، میرے دیدہ و نادیدہ دشمنوں کے خلاف میری یہ فتح معمولی بات نہ تھی۔ لیکن مجھے بھی اس سلسلے میں کوئی خوش فہمی نہ تھی کہ وہ اب چپکے بیٹھ رہیں گے۔ بلکہ مجھے بہ خوبی اندازہ تھا کہ وہ جلد یہ دیر، اور پہلے سے زیادہ بھرپور وار کرنے کے لیے ابھی سے ہی اپنے دانت نکوس رہے ہوں۔

☆☆☆

اگلے دن لاری اڈے میں دفتری گوشے میں ہی، سامنے بڑے سے احاطے میں ہم نے ایک دھواں دھار پریس کانفرنس بھی کرڈالی تھی۔ جس میں عطا محمد خود بھی بہ نفس نفیس شامل تھے۔

ہماری اس کانفرنس کے بعد پوری دنیائے میڈیا میں کھلبلی مچ گئی۔

لاری اڈے کی منقلی کو ہم نے ہی نہیں بلکہ سنجیدہ حلقوں میں بھی اسے ایک ''غاصبانہ'' اور لینڈ مافیا کو ''نوازنے'' کا نام دے دیا گیا تھا۔ جس کے مطابق یہ لینڈ مافیا لاری اڈے کے وسیع و عریض پلاٹ پر کوئی پلازا بنوانا چاہتی تھی اور متعلقہ محکمے کی کالی بھیڑوں سے درون خانہ ساز باز کرکے یہ سرکاری زمین۔ اونے پونے داموں خریدنے کا ارادہ رکھتی تھی۔

میں نے اپنی تقریر میں اپنے اس پختہ عزم کا بھی بھرپور اعادہ کیا تھا کہ ہم بہت جلد اس لینڈ مافیا کو بے نقاب کرنے والے ہیں وغیرہ۔

اسی روز عطا محمد نے بھی مجھے نائب صدر کا عہدہ سونپنے کا اعلان بھی کرڈالا تھا۔

وہ دن ہم نے معمول سے ہٹ کر لاری اڈے میں گذارا تھا۔ واپسی میری رات گئے ہوئی تھی۔ ہم سب خوش اور مطمئن تھے۔

بیچ میں پڑنے والے اس نئے مسئلے کی وجہ سے میں رانا بشیر والے پُراسرار اور گمبھیر معاملے سے ہٹنے لگا تھا۔ تاہم اب اگلے دن زنیرہ کے مشورے سے میں نے اس پر بھی غور و خوض

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اور کسی نئے لائحہ عمل کو ترتیب دینا تھا۔ ابھی تک ہم نے ان دونوں باپ بیٹی (رانا بشیر اور فرحانہ) سے بھی کوئی رابطہ نہیں کیا تھا اور نہ ہی انہوں نے کیا۔

جب رات کو میں لاری اڈے سے گھر کے لیے روانہ ہو رہا تھا تو میرے سیل پر فرحانہ کی کال موصول ہوئی۔

یہ اس کا پہلی بار ہی مجھ سے رابطہ تھا۔ اس لیے کال ملتے ہی اس نے پہلے تصدیق کی خاطر استفسار یہ مجھ سے کہا۔

''ہیلو، آپ۔ نعمان احمد صاحب ہیں؟''

''جی میں ہی بات کر رہا ہوں۔ آپ کون؟''

''میں فرحانہ بول رہی ہوں۔ رانا بشیر کی بیٹی۔''

''جی، میں پہچان گیا آپ کو۔ خیریت؟'' میں نے مختصراً کہا۔ وہ بولی۔

''مما کی دوسری ڈائری مل گئی ہے۔ مگر۔'' ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ دوسری جانب سے رابطہ منقطع ہو گیا اور میں۔

''ہیلو۔ ہیلو'' ہی کرتا رہ گیا۔ تاہم ذرا دیر بعد میں نے خود فرحانہ کا نمبر ملانا چاہا تو اس کا سیل آف ملا۔ مجھے عجیب سی حیرت آمیز الجھن ہوئی کہ یہ کیا معاملہ تھا؟ پھر خیال آیا کہ ہو سکتا ہے اس کے سیل کی بیٹری ڈسچارج ہو گئی ہو۔ یہ سوچ کر میں آگے بڑھ گیا۔ مگر میرا ذہن فرحانہ کی اس ادھوری بات پر اٹک کر رہ گیا تھا کہ ہمیں جس ڈائری کے دوسرے حصے کی... تلاش تھی وہ مل چکی تھی۔ کیوں کہ پہلی ڈائری سے فرحانہ کی ''مما'' یعنی رانا بشیر کی مقتول بیوی رفعت خانم کے قتل کا وہ پُراسرار راز فاش ہونے کا قوی امکان تھا۔ جس کی وجہ سے میرے باپ کو بے گناہ پھانسی پر چڑھا دیا گیا تھا لیکن پھر کسی طرح رفعت خانم کی ذاتی ڈائری نے کم از کم اتنا راز تو ضرور افشاں کیا تھا کہ رانا بشیر کو یہ احساس ہو گیا کہ اس کی بیوی کا اصل قاتل کوئی اور تھا، میرا باپ نہیں اس تکلیف دہ امر کے باوجود کہ کاش! یہ ڈائری۔ میرے باپ کو بے گناہ پھانسی لگنے سے پہلے مل جاتی تو میرے باپ کی جان بچ سکتی تھی۔ مجھے اپنے باپ کے اس وعدے اور اپنے اس عزم کا بھی پاس تھا کہ اصل قاتل کو بے نقاب کرنا ہو گا تاکہ ہم تینوں بہن بھائیوں کی پیشانی سے یہ داغ ہمیشہ کے لیے ڈھل جائے کہ ہم کسی قاتل کی اولاد نہیں تھے بلکہ ایک شریف گھرانے اور نیک خصلت باپ کے چشم و چراغ تھے۔ جسے بدقسمتی سے ایک گھناؤنی سازش میں پھنسا کر تختہ دار پر لٹکا دیا گیا تھا۔

بے شک، مقتولہ رفعت خانم کی اس ذاتی ڈائری، جو ادھوری تھی، نے رانا بشیر کی کم از کم اس حد تک تو آنکھیں کھول ہی دی تھیں کہ وہ یقینی طور پر یہ حقیقت جان چکا تھا کہ اس کی بیوی کا قاتل بہرحال میرا باپ ہرگز نہیں تھا۔ مگر باوصف اس کے۔ مجھے اس ادھوری ڈائری میں کوئی ایسی خاص بات محسوس نہیں ہوئی تھی، جس سے اصل قاتل کا کوئی سراغ ملتا ہو، تاہم مذکورہ ڈائری کے آخری صفحے پر ایک سنسنی خیز انکشاف ضرور ہوا تھا کہ وہ ڈائری ہی ادھوری تھی۔ جبکہ ڈائری کے باقی ماندہ رجات دوسری ڈائری میں موجود تھے اور ہم سب کو اُمید تھی کہ اسی دوسری ڈائری کے مندرجات سے ہی آگاہ ہونے کے بعد شاید قاتل کو بے نقاب کرنے میں آسانی ہوتی۔ لہٰذا دوسری ڈائری کی تلاش بھی..... دونوں باپ بیٹی نے اپنے گھر میں بڑی شدومد کے ساتھ شروع کر دی تھی۔ اور اب تھوڑی دیر پہلے ہی فرحانہ کے آنے والے فون میں اس نے بڑے جوش سے یہ خبر مجھے سنائی تھی۔ مگر اس دوران..... اس نے جس ''مگر'' کا لفظ استعمال کیا تھا۔ وہ میرے حلق میں اٹک کر رہ گیا تھا۔ اس ''مگر'' کے بعد آگے کیا تھا؟ یہ بتاتے ہوئے کسی وجہ سے دوسری طرف سے فرحانہ کی یہ اہم بات ادھوری ہی رہ گئی تھی اور رابطہ از خود ہی منقطع ہو گیا تھا۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ اب اس نے زنیرہ کو بھی آگاہ کیا تھا یا سب سے پہلے جوش میں فرحانہ نے مجھے ہی آگاہ کرنا چاہا تھا؟ ویسے اگر زنیرہ کو اس نے بتایا ہوتا تو وہ بغیر کوئی لمحہ بھی ضائع کیے۔ مجھے ضرور فون کھڑکا دیتی۔

بہرطور۔ انہی خیالوں میں الجھا ہوا میں گھر پہنچا تو عاصمہ اور فہیم میرے ہی منتظر تھے۔ میری وجہ سے بے چارے ان دونوں نے بھی کھانا نہیں کھایا تھا، رات کا کھانا ہم تینوں بہن بھائی اکٹھے ہی کھایا کرتے تھے۔

بہرطور۔ کھانے سے فارغ ہو کر جب میں اپنے کمرے میں آیا تو اس کے تھوڑی ہی دیر بعد فہیم میرے کمرے میں داخل ہوا۔

''بھائی جان! آپ تھک تو نہیں گئے ہیں؟'' وہ بولا۔

''نہیں۔ نہیں۔ آؤ۔ بیٹھو۔ کیا بات ہے؟'' میں نے مسکرا کر کہا۔

میں اپنی چارپائی پر نیم دراز تھا۔ وہ سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا..... میری نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ کچھ سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ اسی لہجے میں بولا۔

''بھائی جان! وہ..... میں آ..... آپ سے ایک بات کرنا چاہ رہا تھا۔''

(جاری ہے)

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

(رفیق احمد ناز ڈی جی خان کا جواب)

شبیر تو قیر فیصل آباد.....فیصل آباد

ہر کسی کو کہاں راس آتی ہے راہِ الفت
ہم نے دیکھے ہیں محبت میں اجڑنے والے

کاوش محمود.....اسلام آباد

ہوتے ہی شام جیسے اڑتے ہیں سب پرندے
اڑ جائیں گے کسی دن ایسے ہی آسماں میں

عنایت حسن.....لاہور

ہوائیں اس کو بجھائیں گی کس طرح سوچو
کہ یہ چراغ تو سینے میں جلنے والا ہے

فہیم الدین فہیم.....ساہیوال

ہجر کی وحشت نے دل کو کردیا رنجور اب
بھولتی جاتی ہیں اب صورتیں دیکھی ہوئی

(یوسف حسین بخاری لاہور کا جواب)

عنبرین مشتاق.....فتح جنگ

یوں تو ہر بات کی ہوتی ہے اجازت مجھ کو
بس روایت ہی بغاوت نہیں کرنے دیتی

آفتاب احمد.....لاہور

یہ تعلق پھر کہیں مروا نہ دے میرے ندیم
جانبِ منزل ذرا سا دور ہو ہو کر چلیں

فخر عالم.....راولپنڈی

یہ کائنات تو پیچھے ہی رہ گئی تھی کہیں
ہجوم ذات سے تو راستہ نہ ملا

(قندیل بابر کا جواب)

عبدالجبار رومی.....لاہور

واسطہ دے رہے ہیں ان کی وفا کے آنسو
آنچل کی آغوش میں آؤ خوشی مناؤ

(نیلوفر شاہین اسلام آباد کا جواب)

نجمی رحمٰن.....برٹ لیٹ یو ایس اے

مٹی کی محبت میں ہم آشفتہ سروں نے
وہ قرض اتارے کہ جو واجب بھی نہیں تھے

سعید احمد چاند.....کراچی

لگا دو ہاتھ جنازے کو پھر سنور لینا
پڑا ہے دیر سے مٹی خراب ہوتی ہے

نیلوفر شاہین.....اسلام آباد

حسرتِ وصل و کلفتِ فرقت کیا کچھ اپنے پاس نہیں
آس میں ڈوبا ایک اک دن اوس میں ڈوبی ایک اک رات

(نزہت رحمٰن لاہور کا جواب)

رفیق احمد ناز.....ڈی جی خان

رخِ رخسار سے زلفوں کی ہٹا دو
آفتاب ہو رہا ہے شرمسار بہت

نزاہت افشال.....مہورہ فتح جنگ

دنیا ہمارے قتل کو کہتی ہے خودکشی
مرنے کے بعد بھی ہمیں رسوا کیا گیا

(عبدالجبار رومی لاہور کا جواب)

ذیشان احمد.....لاہور

انسان سے محبت کی سزا کتنی کڑی تھی
نفرت کے طمانچے میرے رخسار تک آئے

زاہد حیات.....ساہیوال

اس کو اپنا رقیب سمجھو تم
جو لگاتا ہے گھاؤ لہجے میں

ناظر احمد.....ملتان

اس کی آنکھوں نے مرے خواب کی حد جاری کی
مجھ کو مٹی سے علاقہ ہے اسے پانی سے

شبیر حسن ساجد.....سرگودھا

اب بھی برسات کی راتوں میں بدن ٹوٹتا ہے
جاگ اٹھتی ہیں عجب خواہش انگڑائی کی

زویا.....لاہور

ازل سے تابہ ابد ہجرتیں مقدر ہیں
مرے خدا مرا تھوڑا سفر تو کم کردے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

(عبدالحکیم ثمر کراچی کا جواب)

نازش فاطمہ.....خان پور

یوں رشتہ بھی تجھ سے نبھایا ہے میں نے
ترے غم کو اپنا بنایا ہے میں نے

ناصر احمد.....دینہ

یہ مسافر کہیں تو ٹھہریں گے
کون چلتا رہے گا رستوں پر

شاہد احمد خان.....سرگودھا

یونہی تو پلکوں پہ یاقوت نہیں آویزاں
کچھ تو ہے جو مرے سینے میں پگھلتا ہو گا

سیف اللہ.....ملک وال

اسے کہنا کہ لوٹ آئے سلگتی شام سے پہلے
کسی کی خشک آنکھوں میں صدائیں رقص کرتی ہیں

(فاریہ عزیز شیخوپورہ کا جواب)

سید محمد حسین شاہ.....حیدرآباد

اب تو خلوص دل ہے فقط مصلحت کا نام
بے لوث دوستی کے زمانے گزر گئے

(نوشین کنول جھنگ کا جواب)

محمد احسن جاوید.....ڈی جی خان

یار بن کر گلے ملتے ہیں دشمن بھی
ایک ناز ہے جس سے رسم نبھائی نہ گئی

آفتاب احمد.....لاڑکانہ

مرے لیے ہے وہ آتش فشاں پہاڑ ایسا
مری طرف ہی کھلے سب دہانے رکھتا ہے

زریں مجید.....ساہیوال

محبت زرد موسم سے لپٹ کر جب بھی روتی ہے
تو بالوں میں گلابوں کو سجا کر دیکھ لیتے ہیں

(عبدالحکیم ثمر کراچی کا جواب)

نصیر احمد ملک.....فیصل آباد

یہ شب بھر نیند جو آتی نہیں ہے
جنوں کی ابتداء ہے اور کیا ہے

جگنو.....لڈن وہاڑی

یہ احترام تمنا یہ احتیاطِ جنوں
کہ تیری بات کروں اور تیرا نام نہ لوں

کائنات شفیق.....کوئٹہ

یہ اور بات کہ خود کو بھلا دیا ہے غیاث
ہم ان کی چاہ میں کیسے بھلا کمی کرتے

ناصر خان.....مظفر گڑھ

یہ بھی اچھا ہوا کہ اسے پا نہ سکے
ہمارا ہو کے بچھڑتا تو قیامت ہوتی

تسنیم فرحت.....لاہور

یہ دہشت تو اس دور کی دین ہے
وراثت نہیں ہے یہ اجداد کی

(نوشین کنول جھنگ کا جواب)

فرخندہ مرزا.....لاہور

ان کے وعدوں پر یقین ہم کو کبھی آیا نہیں
ایک وہ ہے جس نے اپنوں کو بھی اپنایا نہیں

دین محمد بٹ.....گجرات

اس توقع پہ سہی دھوپ سفر کی افضل
ریگزاروں میں کہیں پر تو شجر بھی ہو گا

اشفاق احمد.....جہلم

اک حشر نہ اٹھ جائے کہیں اہل قلم میں
چھپ جائے جو اخبار میں مضمون ہمارا

ابریز گل.....پشاور

اک آگ کا رستہ ہے یہ شعلوں کا سفر ہے
ہوتی ہے کہانی یہ رقم خون جگر سے

محمد خالد.....ژوب

اس نے قوسین بنائے مرے دائیں بائیں
عمر بھر تاکہ نہ بکھرے مرا شیرازۂ غم

(نیلوفر شاہین اسلام آباد کا جواب)

ادریس خان.....راولپنڈی

تجھ سے ہی سارے مہر و عنایت کے سلسلے
تو دیکھتا نہیں تو کوئی دیکھتا نہیں

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر حذف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدنظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

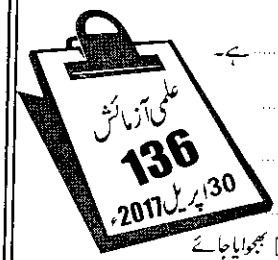

میرے خیال سے اس مرتبہ دریافت کی گئی شخصیت کا نام ..... ہے۔

نام: .....

پتا: .....

.....

انعام یافتہ ہونے کی صورت میں مجھے جاسوسی ☐ سسپنس ☐ پاکیزہ ☐ سرگزشت ☐ بھجوایا جائے

کسی ایک پر ☑ کیجیے۔

کوپن کے ہمراہ اپنے جوابات مورخہ 30 اپریل 2017ء تک علمی آزمائش 136 پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200 پر ارسال کریں۔

مقابلہ
بیت بازی

قارئین کے مسلسل اصرار پر ادبی ذوق کی تسکین کے لیے اک نیا سلسلہ ''بیت بازی'' شروع کیا گیا ہے۔ آپ اپنے پسندیدہ شعر کے آخری حرف سے شروع ہونے والا شعر ارسال کر سکتے ہیں۔

نام .....

پتا .....

.....

محترم / محترمہ ..... کے شعر کے جواب میں شعر ارسال کر رہا ہوں اسے شامل اشاعت کر لیں

(شعر الگ کاغذ پر ہے) **97**

مقابلہ بیت بازی

پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی، 74200

اگر آپ کو

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ،
ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ،
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت،

کے حصول میں دقت پیش آ رہی ہے یا آپ کو اپنے علاقے کے بک اسٹال سے کوئی شکایت ہے اور آپ کے علاقے میں بروقت پرچہ نہیں پہنچ رہا تو

شکایت فیکس کریں

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

ثمر عباس 0301-2454188

سرکولیشن مینیجر 35802552-35386783-35804200

فیکس نمبر 35802551

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 35895313 فیکس: 35802551

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

علمی آزمائش۔ 136

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوایئے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماہنامہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری ''یک سطحی سرگزشت'' کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح سپرد ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 30 اپریل 2017ء تک موصول ہوجائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

1893ء کو بنارس میں پیدا ہوئے۔ اردو کے شعراء میں ایک بڑا نام ہے۔ غزل گوئی کی وجہ سے ان کا مقام بہت بڑا مانا جاتا ہے۔ 9 ستمبر 1960ء کو گونڈہ میں انتقال ہوا۔

علمی آزمائش 134 کا جواب

2 لاکھ 15 ہزار مربع کلومیٹر پر پھیلی اور ڈیڑھ کروڑ آبادی والی ریاست ''حیدرآباد دکن'' کو پاکستان میں شامل ہونا تھا لیکن وہاں کے ریاستی حکمران کی نااہلی کے سبب ہندوستان میں شامل کہلاتا ہے۔ اس ریاست کے پہلے حکمران کا نام قمرالدین خان تھا۔

انعام یافتگان

1- مختار قاضی (ساہیوال) 2- خاقان خان (پشاور) 3- سلیم کھوکھر (حیدرآباد)
4- یوسف خان (میرپور آزاد کشمیر) 5- التماس عباس (جھنگ)

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے عظمیٰ خانم، مہر خورشید ترمذی، پروین اختر، امامہ تجمل، خادم حسین، فرید پراچہ، نعمان اشرف، زاہد خان، اشرف سائیں، راشد علی راشد، فہیم الدین گجراتی، نادر شاہ، زین بقائی، محمد الیاس، انور علی، ذکیہ فصیح احمد، فریدہ مبشر، شہلا عظیم بیگ، مرزا فرحت حسین، نوشین اکبر ضیاء الدین، فہمی، سلیم احمد، مخدوم الفضل کریم، نادر شاہ، عقیلہ عباس، نوشین اختر، آصف خان، امین مرچنٹ، سارہ اللہ بخش جوکھیو، نادر علی، فیض علی، پروفیسر حامد خان، ڈاکٹر صالح، الیاس انصاری، نادیہ زیدی، ضیاء عباس، ہما اشرف، نگہت الیاس۔ لاہور سے غفار احمد، پرویز اکرام، ہما شیخ، سعید احمد اچکزئی، ظفر زیدی،

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

رفاقت یوسف زئی، نادر خان، شوکت خان، عشرت عباس، شوکت حیات، آفاق احمد بھٹ، نرگس علی محمد، ابرار احمد، صنوبر ملک، مریم اصغر، سلیم الزماں، امینہ خان، امتیاز خان۔ اسلام آباد سے ثریا فاطمہ، ابراہیم سلطان خان، فدا حسین، غلام صابر، یونس خان، ولنواز خان، شہزادہ احمد، اظہار الحسن، ضیغم عباس، نصرت فتح، آئزہ بلال (اسٹاف کالونی) نیلوفر شاہین۔ راولپنڈی سے فصیح سرحدی، بقا اللہ خان حسن زئی، آصف خان، فصیحہ خاتون، اطہر علی، واصف خان، نوید اشرف، کاشان حسن، سعادت علی خان (عسکری الیون)۔ سکھر سے نور افضل، انصار احمد، نعیم شاہ، قطب الدین۔ حیدر آباد سے خواجہ اشرف، ناصر سلیم انصاری، کاظم علی سید، نور الٰہی خان، مرزا اشرف، قانع احمد سلیم جاری، مریم بنت کاشف، سرگودھا سے نعمان ملک، عبادت حسین زیدی۔ تلہ گنگ سے احمد الدین ملک ممتاز احمد۔ چنیوٹ سے انعام اللہ، ادیب اختر، ذیشان ملک، توفیق علی حسن۔ شجاع آباد سے اقرار الحسن کاشان علی، محمد طلحہ، افروز احمد۔ جھنگ سے التماس عباس، فخر عالم شاہ، عباس علی شاہ۔ ڈی جی خان سے نیاز احمد، یوسف شاہ، رفیق احمد ناز، محمد احسن جاوید۔ ڈی آئی خان سے ناصر حسین، کاشف اکرام، مفتی ایاز، سعید الدین، خیر محمد، نوید اشرف۔ گجرات سے ملک فیز فیصل اشرف، شادی پور سے لطیف الرحمن۔ خانیوال سے فرزانہ کاشف، شاہین خان۔ خیر پور سندھ سے امتیاز زیدی۔ نور پور آزاد کشمیر سے یوسف خان۔ میر پور خاص سے فیض مصطفی عطاری، شاور خان، شہلا انیس، طاہر الدین بیگ۔ جیکب آباد سے راحت علی ظہیر علی، گوہر فیاض، امامہ صدیق۔ اوکاڑہ سے محمد فیروز، مسرت افضال، ارم حفیظ، راحیل، رفعت گل۔ نوشہرہ سے نعمت خان، ارشد خان، نرملا خان۔ ملتان سے عنبرین چشتی، محمد ارشد ظہیر، محمد معین چشتی، سلمٰی صدیق، منہی ضیائی، نصرت علی خان۔ سیالکوٹ سے فیصل سلمان، گوہر عباس، اکبر محمود، علی عباس زیدی۔ ساہیوال سے فتح محمد، کاظم علی، نازین بٹ، عبدالستار (طارق بن زیاد کالونی)۔ ملتان سے محمد بلال اقبالی، محمد سعید چشتی، نورین افشاں، ایاز سومرو، زندان خان، کلیم اللہ چغتائی، ذیشان ملک، فرحت مغیر، قدوس بخش، سعیدہ جلال، فاضلی خان اچکزئی، لبنیٰ ظہیر، رضوانہ اختر، اللہ دتہ، محمد عتیق، فرزانہ ملک، زینب چوہان، قدوس بخش۔ جہلم سے ارباز خان، ملک سرفراز، ندیمہ امتیاز۔ فیصل آباد سے محمد زاہد، ماسٹر عبدالعزیز (سمندری)۔ جھنگ سے عطا المصطفی۔ گوجرانوالہ سے الف اے کھوکھر۔ چکوال سے رمضان وٹو، ارشاد حسین۔ واہ کینٹ سے نور افضل خان خٹک۔ منڈی بہاؤالدین سے خرم جہانزیب۔ میانوالی سے عبدالخالق (کالا باغ) ایم شفیق قدسی (مسلم بازار)۔ کوئٹہ سے حبیب احسن، ناصر چنگیزی، نعمان خان، حسن عسکری، زاہد علی، فرحت بابر، خاقان چنگیزی، راؤ رشید، ارباز خان، فیض اللہ خان، قتیل سید پوری، تقی چنگیزی، نگار ٹ، صالح بشیر، نصرت چنگیزی۔ سرگودھا سے انعام اللہ انعام، اکبر خان، اشرف ممتاز، زاہد حسن، نادر شاہ، حیات خان، فصیح الزماں، عظمی اکملی ٹوانہ، خلیق الزماں، خضر حیات۔ شجاع آباد سے حسن علی زیدی، فہیم اللہ، نصیر جتوئی۔ خانیوال سے طارق شہزاد، سید ابشام اشرف مشہدی۔ حیدر آباد سے احمد انصاری، بابر خان، طہ یاسین، دعا زہرا۔ میر پور خاص سے مجاہد علی ایس بنسی۔ کھاناں سے سلیم کامریڈ۔ پاک پتن سے علی محمد (حسن پورہ)۔ ساہیوال سے سرفراز ملک۔ چھچھ برہ زئی سے ذوالفقار فضل کریم، ملک جاوید محمد خان سرکانی۔ حاصل پور سے نعمان ادریس۔ ڈی جی خان سے موسیٰ خان۔ بہاولپور سے قاضی عدنان احمد، حمیرا کوکب واسطی، آمنہ ملک۔ گلگت سے حب علی، محمد الحسن شاہ، گل رعنا، انجم عباس، علی اکبر۔ بہاولنگر سے ضیغم علی، عرشیہ تقی، نگہت اکبر، آصف آرائیں۔ بہاولپور سے اشرف حسین، تابندہ جبیں، مومنہ کشف، سید محمد لئیق (شاہدرہ)۔ چنیوٹ سے مصطفی حسن زیدی، نیلوفر خان، صبا نور، میاں ظہور الٰہی۔ دیپال پور سے واجد علی خان، لاریب، حلیمہ سعد۔ ہارون آباد سے امتیاز الدین، فروہ بتول۔ گجرات سے حفیظ اللہ، ماہ نور، سیما الیاس۔ حویلی لکھا سے ولنواز حسن زئی۔ چونیاں سے کامل اشرف۔ ڈی جی خان سے محبوب حسین نادر۔ پاک پتن سے پروین صبا، ارشد جانی، نور علی نور، ذیشان احمد۔ جہلم سے شیر محمد، خدیجہ اشتیاق، آصف محمد۔ سرگودھا سے عارف شاہ، فردوس خان، اشفاق احمد۔ واہ کینٹ سے اسماعیل شاہ، فیض جوکھیو، ماریہ عرفان۔ گوجرانوالہ سے ذکیہ علی سید، افضال خٹک، محمد مسعود عالم۔ اٹک سے نزابت افشال (مہورہ)۔ میانوالی سے عبدالخالق (کالا باغ)، کھاناں سے سلیم کامریڈ۔

ممالک غیر سے فیروز احمد (شارجہ)، عباس توفیق پاکستانی (دبئی)، صالح ممتاز، ایاز علی سومرو (جدہ)، اکبر مصطفی (کویت)۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

راندۂ درگاہ

محترم ایڈیٹر
السلام علیکم
ایک سچ بیانی ارسالِ خدمت ہے۔ یہ روداد اسماء کی ہے جسے خوا مخواہ راندۂ درگاہ بنا دیا گیا۔ آج کل گلی گلی محلے محلے میں پیتھولوجیکل لیبارٹری کھلی ہوئی ہیں جو صرف دولت کمانے کے لیے کھولی گئی ہیں۔ ان کی غلطیاں کس طرح گھر کے گھر تباہ کردیتی ہیں اسی کی ایک جھلک دکھائی ہے۔

غلام رضا جعفری
(حیدرآباد)

ڈاکٹرنی کی بات نے میرے تن بدن میں آگ لگا دی۔ میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ اس طرح آسانی سے اتنی بڑی بات کردے گی۔ لیکن..... اس کے لیے تو یہ معمولی سی بات تھی۔ بڑی اور بہت مشکل بات تھی تو میرے لیے اور میری ماں کے لیے۔ جو حیرت سے میرا منہ تک رہی تھی۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا کہ واقعی اس نے یہی بات کہی ہے جو میں نے اور میری ماں نے سنی ہے۔ ہمارے ساتھ آئی ہوئی خالہ روشن نے تو دونوں ہاتھوں سے سر پیٹ لیا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے ڈاکٹرنی نے بھرے بازار میں میرے منہ پر کالک مل دی ہو۔ میرا سر چکرا گیا۔ دو روز پہلے بھی میں نے اسی ڈاکٹرنی سے اپنا معائنہ کرایا تھا۔ اس دن یوں ہی بیٹھے بیٹھے بائیں طرف پیٹ کی نچلی طرف درد کی شدید لہر اٹھی تھی اور میں چکرا کر گر پڑی تھی۔ جب مجھے ہوش آیا تو یہی ڈاکٹرنی میرے پاس بیٹھی تھی۔ اس نے دوا دی ٹیکا لگایا اور ضروری ٹیسٹ کرانے کی ہدایت دے کر جانے کے لیے اٹھی ہی تھی کہ اماں نے ساجت کرتے ہوئے اس سے کہا۔ ''ڈاکٹرنی صاحبہ آپ خود ہی کرادیں۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔''

''اچھا..... کل صبح کا پہلا یورین میرے کلینک میں پہنچا دینا۔ باقی ٹیسٹ میں خود کرالوں گی۔'' اس نے کہا اور چلی گئی۔

آج ڈاکٹرنی نے رپورٹ دینے کے لیے بلایا تھا۔ میں نے تو اماں کو کہہ دیا تھا کہ خود ہی جاکر رپورٹ لے آؤ لیکن اماں اور باجی نے زور دیا کہ میں ساتھ چلی جاؤں اور ایک بار پھر دوا لے لوں تاکہ طبیعت سنبھل جائے۔ ہم دونوں ماں بیٹی دروازے سے نکلی ہی تھیں کہ محلے والی خالہ روشن ٹکرا گئی جس نے ملتے ہی کہا۔ ''میں تمہارے یہاں ہی آرہی تھی۔ کہاں چل پڑی ہو تم دونوں؟ خیریت تو ہے ناں؟''

''اسماء کو ڈاکٹرنی کے پاس لے چلی ہوں۔ چار دن ہوگئے طبیعت خراب ہے۔''

''ہائے اللہ خیر کرے۔ میری بچی کو کیا ہوگیا۔''

''ہائے..... دیکھو تو ہلدی کی طرح پیلی ہورہی ہے۔'' خالہ روشن نے مجھے پیار کرتے ہوئے کہا اور وہ بھی ہمارے ساتھ ہی چل پڑی۔

میرا نمبر آیا تو ڈاکٹرنی نے میری خیریت معلوم کی اور میرا نام پوچھا۔

''اسماء اسماعیل۔'' میں نے بتایا۔ اس نے ایک ڈبے میں رکھے ہوئے بہت سارے لفافوں میں سے ایک لفافہ ڈھونڈا اور کھول کر دیکھنے کے بعد میری طرف غور سے دیکھا۔

''خیریت تو ہے ناں..... ڈاکٹرنی جی۔'' اماں نے جلدی سے پوچھا۔ میں بھی اس کا جواب سننے کے لیے بے تاب ہورہی تھی۔ ڈاکٹرنی مسکرائی اور بڑے اچھے انداز میں بولی۔

''مبارک ہو۔ آپ ماں بننے والی ہیں۔''

''ہائے میں مرگئی۔ بغیر شادی کے۔'' خالہ روشن نے اپنا سینہ پیٹ لیا اور دوڑتی ہوئی کلینک سے باہر نکل گئی۔

''یہ..... یہ..... آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ میں نے غیر یقینی انداز میں پوچھا۔ اماں حیرت سے کبھی مجھے اور کبھی ڈاکٹرنی صاحبہ کو دیکھ رہی تھی۔''

''یہ..... یہ..... کیا کہہ رہی ہیں آپ؟'' اماں نے بھی میری طرح لرزتی آواز میں پوچھا۔

''بی بی میں نے جو کچھ کہا ہے جو اس رپورٹ میں لکھا ہے۔'' ڈاکٹرنی نے کہا۔

''رپورٹ غلط ہے۔'' میں نے احتجاج کیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

''تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے بی بی؟'' ڈاکٹرنی نے مجھے جھڑک دیا اور میں کانپتی لرزتی آرام گاہ میں آ گئی اور کسی بے جان شے کی طرح کرسی پر گر گئی۔ اماں بھی میرے پیچھے ہی آ گئی۔ مجھے یوں لگا کہ جیسے آسمان ٹوٹ کر زمین پر آ گرا ہو اور زمین سرخ انگارہ ہو گئی ہو۔ جیسے ہر طرف اندھیرا چھا گیا ہو اور مجھے کچھ دکھائی نہ دے رہا ہو۔ میری آنکھوں میں آنسو ستاروں کی طرح جھلملانے لگے تھے۔ کلیجہ منہ کو آتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے میرا خون جل رہا ہو جیسے میری نس نس میں تیزاب بھر دیا گیا ہو۔ میرے ارد گرد بیٹھی ہوئی تمام عورتیں مجھے حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔ .... ان کی نظروں میں بے شمار ان گنت طرح طرح کے سوالات تھے اور ان سوالات کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ ان سب نظروں کا سامنا کرنا میرے لیے بہت مشکل ہو رہا تھا۔ میں ان نگاہوں کا سامنا نہیں کر پا رہی تھی۔

''کیا ہوا بہن؟'' یہ ایک سوال تھا جو میرے ساتھ والی ایک عورت نے میرے چہرے کی طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ میں خاموش سر جھکائے بیٹھی رہی۔ میں نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا اور جواب دیتی بھی تو کیا۔ میرے پاس کوئی جواب تھا ہی نہیں۔ میں نے اس کے سوال کو سنا ان سنا کر دیا۔ جیسے میرے منہ میں زبان ہی نہ ہو۔ میں یوں گم صم تھی کہ جیسے میں پتھر کی بن گئی ہوں۔ میں نے اپنی آنکھوں کو بند کر لیا۔ نہ ان عورتوں کو دیکھ سکوں گی اور نہ ان کی نگاہوں کے نشتر مجھ گھائل کو مزید گھائل نہ کر سکیں گی۔ میں اندر ہی اندر لہو کے آنسو پی رہی تھی۔

''یہ..... یہ تو نے کیا کر دیا بیٹی؟'' اماں کی سرگوشی میرے کان میں پڑی تو میں نے ماں کی طرف دیکھا۔ اس

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

http://paksociety.com

Downloaded From Paksociety.com

کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی تھی۔ میری پلکوں تلے رکا ہوا سمندر بھی بہنے لگا تھا۔

''اماں..... خدا کی قسم۔ مجھے تیری قسم۔ ابا کی قسم۔ تو جس کو مانتی ہے مجھے اس کی قسم میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔'' میں نے اماں کو اپنے پاک دامن ہونے کی یقین دہانی کرانے کی کوشش کی۔ اب وہاں موجود تمام عورتوں میں ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرنے اور سننے کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ ان کی کھسر پھسر میرے کانوں میں آنے لگی تھی۔ اماں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے میرے سامنے رپورٹ کا لفافہ لہرایا جو میرے مجرم ہونے کا پکا ثبوت تھا۔ جس کے سامنے میری ہر دلیل جھوٹی پڑتی تھی۔ جو میرے ہر سچ کو جھوٹا ثابت کررہا تھا۔ اماں نے کسی وکیل کی طرح کہا۔

''لیکن..... یہ رپورٹ..... تمہارے جرم کا بہت بڑا ثبوت ہے۔ اس رپورٹ میں لکھا ہے کہ تم نے گناہ کیا ہے۔ تم نے اپنا منہ اپنے ہاتھوں سے کالا کیا ہے۔'' اماں لوگوں کی موجودگی کی پرواہ کیے بغیر دکھی دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر جذبات میں آگئی اور دونوں ہاتھوں سے میرا کندھا پیٹنے لگی۔

''توبہ توبہ..... ایسا کیا گناہ کردیا۔ اتنی سی عمر میں۔''

''کوئی تو کیا ہوگا۔ گناہ تو گناہ ہوتا ہے۔''

''سنا نہیں تم نے۔ منہ کالا کرنے کی بات ہورہی ہے۔''

''منہ کالا کرنے کا مقصد تو ایک ہی ہوتا ہے۔''

''توبہ توبہ..... توبہ توبہ.....''

''اتنی سی عمر میں اتنا بڑا گناہ۔'' اماں کی باتیں سن کر اب تو ہر عورت کے لبوں پر یہ الفاظ اعلانیہ آرہے تھے۔ میں جیسے زمین میں گڑتی جارہی تھی۔

''اے ہے کیوں ماررہی ہو جوان بچی کو۔ اپنی نہیں تو اس کی عزت کا خیال کرو۔'' ایک بزرگ عورت نے میری طرف داری کی۔

''سوتیلی ہوگی۔ ورنہ ایسا نہ کرتی۔'' ایک اور عورت نے کہا۔

''سگی بیٹی ہوتی تو اس کے ہر گناہ پر پردہ ڈالتی۔''

''ہاں ہاں بہن! اس طرح بات کا بتنگڑ نہ بناتی یہاں بھری کلینک میں۔'' یہ کوئی اور عورت کہہ رہی تھی۔

غرض جتنے منہ اتنی ہزار باتیں۔ اماں بھی یہ سب کچھ سن رہی تھی اور غصے میں لال پیلی ہورہی تھی۔

''جاؤ بی بی جاؤ..... یہاں ہنگامہ نہ کرو۔'' نرس نے آکر غصے میں کہا۔

''کیا ہوا بہن؟'' ایک عورت نے اماں سے پوچھا۔ یعنی وہ اماں کے منہ سے معاملے کی وضاحت سننا چاہتی تھی۔ اماں نے اسے تو کچھ نہیں کہا لیکن میری طرف کھا جانے والی نظروں سے گھورنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں غم و غصے سے خون اترا ہوا تھا۔ میں اس کی رنجیدہ آنکھوں میں پوشیدہ غصیلی باتوں کو جان گئی تھی یہی کہ.....''

''بتا دوں۔ بتادوں ان سب کو..... تم نے کیا گل کھلائے ہیں۔ تمہیں کیا ہوا ہے یا کیا ہونے والا ہے؟ بتا دوں ان سب کو کہ تم ہمارے سر پر کیا پہاڑ گرانے والی ہو بلکہ قیامت آگئی ہے ہمارے گھر۔'' اماں نے اپنے جذبات کی بھڑکتی آگ کو سرد کرنے کے لیے بہت کچھ کہا اور میں سب کچھ سنتی رہی۔ زہر کا گھونٹ بھرتی رہی۔ ہاں یہ زہر کا گھونٹ ہی تو ہے جو میں لمحہ لمحہ بھر رہی ہوں۔ اماں نہیں جانتی کہ پہاڑ تو میرے سر پر ٹوٹا ہے۔ ریزہ ریزہ پہاڑ نہیں ہوا بلکہ میں خود ہوگئی ہوں۔ بدنامی کے ڈھیر تلے تو میں دب گئی ہوں۔ میری عزت کی دھجیاں اڑادی گئی ہیں۔ میں جیسے سرعام برہنہ ہوگئی ہوں۔ میں اماں کے سامنے صرف نفی میں سر ہلا کر رہ گئی۔ چاہنے کے باوجود میں کچھ نہیں بول پارہی تھی۔ میری زبان جو بولتے بولتے کبھی تھکتی ہی نہ تھی مگر اب کچھ بولنے سے محروم تھی۔ زبان میرا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں زور زور سے چلاؤں، شور مچاؤں اور ہر ایک کو جھنجوڑ جھنجوڑ کر اپنی بے گناہی کا یقین دلاؤں۔ ہر ایک کو اعلانیہ بتاؤں۔ میں گناہ گار نہیں ہوں بے گناہ ہوں لیکن ایسا نہ ممکن تھا اگر میں ایسا کر بھی دوں تو میری ہزار دلیلیں اس ایک لفافے کے سامنے کچھ نہیں کر سکتیں کیوں کہ اس میں میرے گناہ گار ہونے کی سند تھی۔

''چل اٹھ بدبخت۔'' اماں نے دانت پیس کر میرے بال نوچتے ہوئے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ میں چپ چاپ اٹھ کر اس کے ساتھ چل پڑی۔ ایک ایک قدم منوں بھاری لگ رہا تھا۔ قدم ڈگمگا رہے تھے۔ دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہورہی تھیں۔ گھر جانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا گھر کے باقی لوگوں کو کیا منہ دکھاؤں گی۔ یقیناً ہر کوئی منتظر ہوگا۔ گھر جاتے ہی سوال کیا جائے گا کیا ہوا اسماء۔ مگر اسماء کے پاس کسی کو بتانے کے لیے کچھ بھی نہیں۔ یہ کوئی نہیں جانتا کہ میں آسمان کی بلندیوں سے گر کر زمین کی انتہائی

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

گہری کھائی میں گر کر چور چور ہوگئی ہوں۔ میری زندگی کس قدر ریزہ ریزہ ہوگئی ہے۔ اس کا اندازہ تو کوئی بھی نہیں لگا سکتا خود میری ماں بھی نہیں۔

گھر میں داخل ہوتے ہی باجی کو اپنا منتظر پایا جو دروازے کے پاس ہی نہ جانے کب سے کھڑی تھی۔ شاید وہ بے چینی سے ہمارا انتظار کررہی تھی۔ اس کی تشویش ناک نظروں کا سامنا کرنے کی مجھ میں ہمت نہ تھی۔

''کیا بتایا ڈاکٹر نے؟'' باجی نے پوچھا۔ مجھے اسی سوال کی اُمید تھی۔ اس نے میرے چہرے کی طرف غور سے دیکھا تو میرا دل زور سے چھاتی کی دیوار سے ٹکرایا۔ جیسے سینہ چیر کر دل باہر آگرے گا۔ میں اندر ہی اندر کانپ کر رہ گئی۔ اس نے لفافہ میرے ہاتھ سے لے لیا۔ لفافے کا میرے ہاتھ سے چھن جانے سے بھی میں پوری طرح کانپ گئی، مجھے یوں لگا کہ جیسے میں سچ مچ اس مکروہ اقدام سے گزری ہوں۔''

''خوش خبری سنائی ہے ڈاکٹرنی نے۔ مٹھائی بانٹو۔ خوشیاں مناؤ۔'' اماں نے غصے میں کہا اور مجھے دھکا دے کر آگے نکل گئی۔

''خوش خبری؟'' باجی نے اس لفظ پر زور دے کر دہرایا تھا۔ مجھے ایسا لگا کہ جیسے میں چارہ کترنے والی مشین میں آگئی ہوں اور تیزی کے ساتھ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بکھرتی جارہی ہوں۔ باجی حیرت اور پریشانی میں مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے ایک نظر باجی کی طرف دیکھا اور منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ جیسے میں بہت دلیر ہوگئی ہوں۔ منہ زور اور سرکش ہوگئی ہوں مگر نہیں ایسا نہیں تھا بلکہ میں تو بہت شرمندہ تھی کسی سے نظر ملانے کی تاب نہیں تھی مجھ میں۔ باجی کی پریشانی اور بھی بڑھ گئی تھی۔ وہ اماں کی بات کو سمجھ نہیں پائی تھی۔ اماں کا طنز اس کے کانوں میں پڑا تو سہی مگر دماغ اس کا مطلب سمجھ پانے سے قاصر تھا اور پھر میں ہمت کر کے آگے بڑھی اور باجی کے گلے لگ کر زور زور سے رونے لگی۔ وہ مجھے یوں ہی اپنے ساتھ لپٹائے کمرے میں لے گئی۔ اماں کے رونے کی آواز میرے کانوں میں پڑ رہی تھی۔ اس کی سسکیاں ہچکیوں میں بدل گئی تھیں۔

''اسماء تو پیدا ہوتے ہی مرکیوں نہ گئی اگر مجھے پتا ہوتا تیرے ان لچھنوں کا تو میں خود ہی تیرا گلا گھونٹ دیتی۔ تجھے زندہ دفنا دیتی۔''

اماں کے بین سن کر باجی نے گردن گھما کر باہر کی طرف دیکھا۔ اب بھی وہ معاملے کو سمجھ نہ پائی تھی۔

''رپورٹ میں کیا لکھا ہے۔ اماں کیا کہہ رہی ہیں۔ تم سن رہی ہو ناں۔ ایسا کیا ہوگیا اسماء۔ اماں تمہیں کوس رہی ہیں۔ بددعائیں دے رہی ہیں۔'' باجی ایک ہی سانس میں کہتی چلی گئیں اور میں چپ چاپ کھڑی تھی۔ میں اس جرم کا اقبال جرم کیسے کروں۔ جو میں نے کیا ہی نہیں۔ مجھے ایسا لگا کہ جیسے میں جیل میں آگئی ہوں۔

''رپورٹ میں کیا لکھا ہے؟'' باجی نے نرم لہجے اور دھیمی آواز میں اپنا سوال ایک بار پھر دہرایا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ میں اسے کیا بتاؤں۔ میں نے نظریں اٹھا کر باجی کی آنکھوں میں دیکھا۔ میں نے بھانپ لیا تھا کہ باجی کو میرے اس نہ کردہ گناہ کا علم ہوگیا ہے۔

''جو روشن خالہ نے آپ کو بتایا ہے۔'' میں نے بھی اسی سنجیدگی سے جواب دیا اور اپنا منہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر رونے لگی۔

''مجھے روشن خالہ کی بات پر یقین نہیں ہے۔'' باجی نے کہا تو میں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ وہ میری نظروں میں چھپے سوال کو جان گئی تھی۔

''ہاں اسماء! مجھے اس کی بات پر اعتماد نہیں ہے۔'' باجی نے اثبات میں سر ہلا کر سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

میں خاموش تھی۔ میں لیبارٹری کی رپورٹ میں لکھی ہوئی بات کو اپنے منہ سے بتانے کی ہمت نہیں کر پارہی تھی۔ میں ان الفاظ کو اپنے منہ سے کس طرح دہراتی جن کی وجہ سے میری پوری زندگی ریزہ ریزہ ہوگئی ہے۔ جن کی وجہ سے میں آسمان کی بلندیوں سے گر کر پاتال کی گہرائیوں میں جا پڑی ہوں۔ جس نے میری خوشیوں کو دکھوں میں بدل دیا تھا۔ جو میرے منہ پر کلنک کا ٹیکا ثابت ہورہے تھے۔ میں باجی کے سامنے خاموش کھڑی تھی۔

''اسماء میں نے کیا پوچھا ہے تم سے؟'' باجی نے میرے کندھے کو جھنجوڑا۔

میں پھر بھی خاموش ہی رہی۔ مجھے ایسے لگ رہا تھا کہ جیسے میں کال کوٹھڑی میں ہوں اور مجھے موت کی سزا بار بار سنائی جارہی ہو۔

''اسماء!'' باجی نے ایک بار پھر میرے کندھے سے پکڑ کر ہلایا۔

''آپ کو پتا تو ہے۔'' میں نے کہا۔

''مگر..... میں تمہارے منہ سے سننا چاہتی ہوں۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

باجی نے کہا جیسے کہ کسی کو جرم کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑ لینے کے باوجود بھی مجرم سے پوچھے کہ ''یہ تم نے کیا کیا ہے۔'' وہ مجرم کے منہ سے یہ سننا چاہتا ہو کہ ''ہاں میں نے جرم کیا ہے۔'' اور پھر میں نے باجی کے بے حد اصرار پر ہمت کی اور کہہ دیا۔

''یہی کہ..... میں..... ماں بننے والی ہوں۔'' میں نے یہ جملہ بہت مشکل سے اپنے اوپر جبر کر کے کہا۔ میرا یہ کہنا تھا کہ میرے منہ پر پڑنے والے باجی کے تھپڑ نے میرے گال کو سن کر دیا۔ مجھے اسی ری ایکشن کی توقع تھی۔

''باجی! خدا کی قسم.....! میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔'' میں باجی کے سامنے گڑگڑائی۔

''پھر یہ کیسے ہو گیا؟''

''اسی سوال کا جواب تو میرے پاس نہیں ہے۔'' میں نے کہا اور اپنے دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا لیا۔ مجھے بار بار رونا آ رہا تھا۔

''اس گناہ کی سزا جانتی ہو؟'' باجی نے پورا زور لگا کر میرے منہ پر سے میرے ہاتھوں کو پکڑ کر ہٹایا۔ اس نے نظریں میرے چہرے پر گاڑ رکھی تھیں۔ شاید وہ میرے دل کی بات کا اندازہ میرے چہرے کے تاثرات سے لگانا چاہتی تھی۔ اس کے سوال کے جواب میں، میں نے صرف اثبات میں سر ہلا دیا اور منہ سے کچھ بھی نہ کہا۔ کچھ کہنے کو میری ہمت ہی نہ ہوئی۔

''اس کے باوجود بھی؟'' باجی نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ مگر میں باجی کی بات کا مقصد سمجھ گئی تھی۔ وہ یہی کہنا چاہتی تھی کہ اس گناہ کی سزا کو سمجھنے کے باوجود بھی میں نے یہ گناہ کیوں کیا مگر میں نے ایسا کوئی اندھا قدم نہیں اٹھایا جو میرا گناہ کہلائے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ تقریر سے زیادہ تحریر کا اثر ہوتا ہے اور میرے ساتھ ایسا ہی ہو رہا تھا میری نظر میں اس لیبارٹری کی رپورٹ جیسی تحریر کے سامنے بالکل بے اثر تھی۔

''یہ..... یہ الزام ہے مجھ پر۔'' میں نے کہا۔

''لیبارٹری والوں کو تم سے کیا عداوت ہے۔'' باجی نے کہا تو میں چپ ہی رہی مگر کہتی بھی تو کیا۔ مجھے اپنی ہر بات کا ایک نیا سوال سننا پڑ رہا تھا۔ جس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا۔ میں لاجواب ہو جاتی۔

''شادی کر لی ہے تم نے؟'' باجی نے میرے کچھ قریب ہو کر سرگوشی کرتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں۔'' میں نے مری ہوئی آواز میں جواب دیا۔

باجی چپ چاپ کھڑی کچھ دیر تک مجھے غصے سے گھورتی رہی اور مجھے دھکا دے کر تیزی کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گئی۔ دھکا لگنے سے میں چارپائی پر گر پڑی۔ اس نے باہر سے دروازے کی کنڈی لگا دی تھی۔ کمرے میں نیم تاریکی چھا گئی تھی۔ میں بھی یہی چاہتی تھی کہ مجھے تنہا چھوڑ دیا جائے تاکہ میں کھل کر اپنا دکھڑا رو سکوں۔

میں کمرے میں بالکل تنہا تھی۔ میں چارپائی پر گری اور بے جان ہو کر ایک طرف ڈھلک گئی۔ میری عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی۔ جو پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ اس کیفیت میں صرف دکھ ہی دکھ تھا۔ میں نے اپنا سر دیوار کے ساتھ ٹکا دیا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ زور زور سے رونا شروع کر دوں۔ چیخوں، چلاؤں اور دروازے کھڑکیاں پیٹنا شروع کر دوں۔ شیشے توڑ دوں اور پاگل بن جاؤں۔ ہر ایک کو پکار پکار کر اپنی طرف متوجہ کروں اور بتاؤں کہ میں نے ایسا کوئی گناہ نہیں کیا۔ پھر مجھے یہ ناکردہ گناہ کی سزا کیوں دی جا رہی ہے لیکن میرے ذہن میں ابھرنے والی ایک بات مجھے ایسا کرنے سے روک رہی تھی کہ میری ہزار باتیں سیکڑوں دلائل، ڈاکٹر کی دی ہوئی اس ایک رپورٹ کے سامنے جھوٹی ہو جائیں گی۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ یہ ناکردہ گناہ کیسے میرے سر آ گیا۔

''رپورٹ غلط بھی تو ہو سکتی ہے۔'' میرے دل میں اچانک ہی یہ خیال آیا۔

''ہاں اگر ٹیسٹ دوبارہ کروا لیا جائے تو ہو سکتا ہے کہ یہ مصیبت میرے سر سے ٹل جائے۔'' میں نے اپنے آپ سے کہا اور اس خیال کے آتے ہی میں دروازے کی طرف دوڑی اور زور زور سے دروازے کو پیٹنا شروع کر دیا۔

''باؤلی ہو گئی ہے بدنصیب۔'' یہ اماں کی آواز تھی جو آج سے پہلے خوش ہو کر مجھے خوش نصیب اور نصیبوں والی کہا کرتی تھیں۔ اکثر میرے ماتھے پر بوسہ دیتے ہوئے کہا کرتیں۔ ''بہت نصیبوں والی ہے میری بچی۔ اس کے نصیبوں جیسا تو کسی کا نصیب نہیں ہو گا۔''

اللہ نہ کرے کہ مجھ جیسا کسی کا نصیب ہو اور وہ کسی ناکردہ گناہ کی ذمے دار ہو جائے۔ کسی پر ایسی آفت نہ آئے کہ اس کی زندگی ریزہ ریزہ ہو جائے۔ بیٹھے بٹھائے خوامخواہ ہی ماتھے پر کلنک کا ٹیکا لگ جائے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

میں بہت دیر تک دروازے کو پیٹتی رہی مگر بے سود۔ ہاتھوں میں درد ہوا تو میں رک کر لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ جیسی کئی میلوں کی دوڑ لگائی ہو اور تھک کر ہانپنے لگی ہوں۔ میں نے تھوڑی دیر بعد پھر دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔

''کیا ہے۔ دماغ چل گیا ہے کیا تمہارا؟'' یہ باجی کی آواز تھی۔ اس نے غصے میں کہا تھا۔

''باجی اگر آپ کو میری بات پر یقین نہیں ہے تو پھر ایک اور ٹیسٹ کروا لیتے ہیں۔''

''ہزار بار بھی ٹیسٹ کروایا تو یہی نتیجہ آئے گا۔'' باجی نے جواب دیا۔

''باجی پلیز میری بات پر یقین کرو۔ میں بے گناہ ہوں۔ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔'' میں نے کہا اور ایک بار پھر رونے لگی۔

''ہر گناہ گار یہی کہتا ہے کہ میں بے گناہ ہوں۔'' اماں نے کہا۔ ''روشن نے پورے محلے کو یہ بات بتا دی ہے، ایک کے بعد ایک پڑوسی آیا جا رہا ہے میں کیسے دروازہ کھول دوں تاکہ آنے والیاں تجھے گھیر لیں۔''

میں زور زور سے رونے لگی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں ان سب کو اپنی بے گناہی کا یقین کس طرح دلاؤں۔

میں نادان تو نہیں ہوں۔ اچھا برا سب سمجھتی ہوں۔ بے شک داناؤں سے بھی نادانیاں ہو جایا کرتی ہیں۔ بڑے بڑے عقل مندوں کا دماغ ماؤف ہو جایا کرتا ہے اور کوئی نہ کوئی غلطی ضرور سرزد ہو جایا کرتی ہے لیکن ایسی بھی نہیں کہ جو میرے سر لگائی جا رہی ہو۔ میں بھلا اپنے ماں باپ اور اکلوتے بھائی کی عزت کو اس طرح کیسے اچھال سکتی ہوں۔ مانا کہ لڑکیاں ایسا کر گزرتی ہیں لیکن میں نے باخدا ایسا کچھ نہیں کیا تھا۔ باپ بھی ایسا کہ جس کی شفقت نے کوئی لمحہ خالی نہیں چھوڑا تھا۔ جان نچھاور کرنے والا دوست نما بھائی۔ ماں بھی ایسی کہ جس نے محبت اور شفقت کے ساتھ لمحہ بہ لمحہ اچھے برے کی تمیز کرنے کی تاکید کی ہو، جس نے ہر وقت محبت ہی محبت دی ہو۔ جس ماں نے اپنی زندگی کے تجربے کے پیشِ نظر گاہے بہ گاہے زندگی کے تمام نشیب و فراز سے آگاہ کیا۔ ان تمام باتوں سے قطع نظر، کیا مجھے خود اپنی عزت کا خیال نہیں؟ نہ صرف مجھے بلکہ ہر لڑکی کو اپنی عزت کا خوب احساس ہوتا ہے۔

اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ جذبات کا سرکش سیلاب کسی کو بھی اپنے ساتھ بہا کر لے جانے کی طاقت رکھتا ہے لیکن اس کے برعکس صبر کی چٹان بھی تو کوئی اہمیت رکھتی ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اکثر لڑکیاں محبت کے جال میں پھنس جاتی ہیں اور جذبات میں بہک کر ماں باپ کی عزت نیلام کر دیتی ہیں لیکن ایسی بھی تو لڑکیاں ہیں جو اپنی نیلام ہوتی ہوئی عزت کو بچا لیتی ہیں۔

خالہ روشن، ایسی عورت ہے کہ جس کا نام تو روشن ہے مگر اس کا کام لوگوں کی روشن زندگیوں کو گل کرنا ہے۔ پوری کالونی کا کوئی گھر اس عورت سے بچا ہوا نہیں ہے۔ وہ ہر گھر میں کسی نہ کسی بہانے دن میں ایک چکر ضرور لگایا کرتی تھی۔ وہ ہمارے ہاں بھی آتی رہتی تھی۔ وہ سوائے لوگوں کی

کراچی
ماہنامہ پاکیزہ

میں، قاری بہنوں کی دلچسپی کے لیے ایک نیا اور منفرد سلسلہ باتیں بہار و خزاں کی..." پیش کیا جا رہا ہے جس میں ہر قاری بہن دیے گئے سوالوں کے جوابات دے کر شمولیت اختیار کر سکتی ہے۔ آپ کے خیالات و احساسات ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

تو قارئین آج ہی
ماہنامہ پاکیزہ
اپنے ہاکر سے بک کروالیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

برائیوں کے کسی کی کوئی بات نہ کرتی تھی۔ تو کیا ہماری برائی ہماری باتیں نہ کرتی ہوگی اس بات سے اماں نے اسے کئی بار ٹوکا۔ خود میری بھی اس سے کئی بار تکرار ہوئی تھی۔ شاید اس تیزی سے جنگل کی آگ بھی نہ پھیلتی ہوگی کہ جتنی تیزی سے اس نے میری رسوائی کی یہ بات پھیلائی ہوگی۔

میں خوب جانتی ہوں کہ خالہ روشن نے جان بوجھ کر اس بات کو ہر گھر میں پھیلا دیا ہے۔ غلط فہمی کی ذرا سی چنگاری کو اس نے ہوا دے کر شعلوں میں بدل دیا ہے۔ وہ ایسا ہرگز نہ کرتی جو آج اس کی اپنی بیٹی ہوتی۔ اس کی اپنی بیٹی اگر سچ بھی کر دکھاتی تو خالہ روشن اسے ہوا نہ لگنے دیتی اور بات ایک کان سے دوسرے کان تک نہ جا سکتی لیکن پھر بھی وہ اپنی فطرت کے ہاتھوں مجبور ہو کر کوئی نہ کوئی بات ضرور کر ہی دیتی۔ کیوں کہ مکاری اس کے خون میں بسی ہوئی ہے۔ عداوت تو چھوٹ سکتی ہے مگر فطرت نہیں بدل سکتی۔ یہ حقیقت خالہ روشن پر صادق آتی ہے۔

ہمارا گھرانا بہت زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا۔ میں نے بھی صرف پانچویں جماعت تک پڑھا تھا۔ اس کے بعد ماں باپ نے گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے میرا اسکول چھڑا دیا تو میں چپ چاپ گھر بیٹھ گئی۔ پڑھائی کا شوق ہونے کے باوجود پڑھائی جاری رکھنے کی کوئی ضد نہ کی۔ بس اماں نے کہا۔ ''تجھے اور پڑھانے کی گنجائش نہیں ہے ہم میں۔'' میں نے جواب میں صرف اچھا اماں کہہ دیا تھا لیکن چھپ چھپ کر رو رو کر اپنے ارمانوں کو آنسوؤں میں بہا دیا مگر دل کی بات زبان پر نہ لائی اور چپ چاپ بیٹھ گئی۔ حالات خراب ہونے کی وجہ سے ہی ابو نے بھائی کو چھٹی جماعت سے چھڑا کر ورکشاپ میں لگا لیا تھا۔ بھائی میری طرح خاموش نہیں رہا تھا۔ اس نے بہت ضد کی تھی۔ رویا تھا۔ کم از کم میٹرک تک پڑھنا اس کی خواہش تھی مگر وہ ماں باپ کے فیصلے کے آگے مجبور تھا اور ماں باپ حالات کے ہاتھوں مجبور تھے۔ باجی بھی صرف ساتویں تک ہی پڑھ سکی تھی۔ گھر کا گزارا بمشکل ہو رہا تھا۔ خالہ روشن کا آنا جانا ہمارے گھر بہت پرانا تھا۔ یعنی جب میں بہت چھوٹی تھی تب سے اور اب پندرہ سال کی ہو رہی تھی۔ خالہ روشن کی باتوں کی گہرائی کو میں اچھی طرح سمجھتی تھی۔ وہ باتوں ہی باتوں میں اس بات کا اشارہ دے چکی تھی کہ میں اس کی بہو بنوں مگر میں ہرگز نہیں چاہتی تھی۔ میرا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ میں کسی اور کی طرف توجہ رکھتی تھی یا کسی اور کو دل دے بیٹھی تھی۔ اس بارے میں تو میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ وہ اپنی لالچ کے تحت مجھ سے محبت جتاتی تھی لیکن جس خلوص اور محبت میں خود غرضی آجائے اسے خلوص نہیں بلکہ لالچ کا نام دیا جاتا ہے اور خالہ روشن کا خلوص بھی لالچ کی بنیاد پر تھا۔ جسے گھر کا کوئی فرد نہیں صرف میں جانتی تھی۔ وہ جب بھی آتی، بطور خاص مجھے اپنے پاس بلا کر بٹھاتی اور جب چائے وغیرہ کی بات چلتی تو وہ اونچی آواز میں اعلان کرتی۔

''میں تو اسماء کے ہاتھ کی چائے پیوں گی۔'' اور مجھے نہ چاہتے ہوئے بھی خالہ روشن کی فرمائش پر چائے بنانا پڑتی۔

''کیوں خالہ..... ہمارے ہاتھ کی چائے میں کیا ہے؟'' باجی نائلہ بول پڑتی اور سب ہنس پڑتے، اس موقع سے لطف اٹھایا جاتا۔ وہ ہر روز میرے لیے کھانے پینے کی کوئی نہ کوئی چیز ضرور لاتی۔ گھر والوں کے سامنے بھی روک ٹوک کرتی تو امی ابو کہتے۔ ''کیا ہوا بیٹی، خالہ اتنی چاہت سے لے آئی ہے تو لے لو۔''

''ارے تمہارے بہانے ہم بھی کھا لیں گے۔'' باجی خوش ہو کر کہتیں۔ لیکن اندر کے راز کو کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ کوئی بھی خالہ روشن کے اندر کی کالی میل اور بری نیت کو نہیں جانتا تھا اور میں نے بھی کسی کو کچھ نہ بتایا۔ اس کی اصل وجہ یہ بھی تھی کہ ظاہری طور پر کوئی ایسی بات نہیں ہوئی تھی کہ جس کا میں بتنگڑ بنا کر خالہ روشن کے دل میں چھپی ہوئی لالچ کو سر عام کرتی اور خالہ روشن بھی محتاط تھی وہ بھی ایک منصوبے کے تحت کھل کر کوئی بات نہیں کر رہی تھی یا پھر شاید وہ کسی موقع کی تلاش میں تھی۔ جو ابھی اسے مل گیا تھا اور اس نے ایک چنگاری کو ہوا دے کر بلند و بالا شعلے میں بدل دیا تھا۔

ایک دن خالہ روشن کو موقع مل ہی گیا۔ اس وقت ہم سب امجد، ابو، بہن بھائی اور میں چائے پی رہے تھے۔ اس وقت اس نے باتوں باتوں میں کہا۔ ''اے بہن! مجھ بیوہ کی زندگی کا کیا بھروسا میں چاہتی ہوں اپنے جیتے جی نورے کا گھر بسا دوں۔ ساری جایداد کا اکیلا مالک ہے۔ آنے والی بھی خوش رہے گی۔ آنے والی آزاد رہے گی۔ دیور، نندوں اور جیٹھ کا کوئی جھگڑا نہ ہوگا۔ میرا کیا ہے۔ آج مری تو کل دوسرا دن اگلے دن تیجا۔''

اس کی اس تقریر کا مقصد ہر کوئی جانتا تھا کہ آگے یہ کیا بات کرنے والی ہے۔ سب نے اس کی بات کو سنی ان سنی کر دی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''کام کیا کرتا ہے نورا؟'' بھائی نے ایک دم پوچھ لیا تو وہ کچھ جھینپ سی گئی۔

''دکانوں اور مکان کا کرایہ ماشاءاللہ اتنا آرہا ہے کہ میرے نورے کو کام کرنے اور کسی کی غلامی کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ ہم ماں بیٹا دو ہی تو ہیں۔ جب اس کی بیوی آجائے گی تو کون سی بھاری پڑ جائے گی۔ سکون کی زندگی گزارے گی میری بہو۔ میں تو چاندسی بہو لاؤں گی چاندسی۔'' خالہ روشن کی زبان تھی کہ رکنے کو نہیں آرہی تھی۔ اس دوران وہ بار بار میری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ وہ یقیناً مجھے ہی سنا رہی تھی۔ وہ اپنی ان چکنی چپڑی باتوں سے مجھے راغب کرنے کی کوشش کررہی تھی مگر میں اپنے کام میں مصروف رہی اور ہر بات کو سن کر بھی ان سنی کردی۔ ہر بات کا مطلب سمجھ کر بھی نظرانداز کردیا۔

''تمہاری بچیاں بھی جوان ہیں بہن۔ ان کا بھی کچھ سوچو۔'' اس نے اپنے دل کی بات تو کی مگر گھما پھرا کر۔ اس نے عمل کر بات نہیں کی کہ وہ چاہتی کیا ہے۔

''یہی تو فکر کھائے جاتی ہے۔'' اماں نے طویل آہ بھر کر کہا۔

''کہیں بات وات چلائی تم نے؟'' وہ اماں کے کچھ قریب ہوگئی۔

''ہاں! اسماء کی بات چل تو رہی ہے۔ بس تم دعا کرو۔ اللہ اس کے نصیب اچھے کرے۔'' اماں کی بات سن کر ایک دم اس کے تیور ہی بدل گئے اس نے بددلی سے کہا۔

''اللہ بہتری کرے۔'' صاف ظاہر تھا کہ اس کے دل کو دھچکا لگا تھا۔ وہ یہ بھی نہ کہہ سکتی تھی کہ اسماء پر تو میری نظر ہے۔ اس نے مجھے تھورا اور جوتیاں گھسیٹتی ہوئی چلتی بنی۔ میں دل ہی دل میں خوش ہوگئی کہ ہوا چلی اور بدلی ٹلی۔ درحقیقت اسے میرے رشتے کی چلنے والی بات بری لگی تھی۔ اسی کا اس نے اس طرح بدلا لیا تھا کہ پورے محلے کو رپورٹ کی خبر دے آئی تھی۔

میں روشن خالہ کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ دروازے کی چرچراہٹ سنائی دی۔ اس آواز پر میں نے گردن گھما کر دیکھا۔ دروازہ کھلا اور باجی کچھ دیر دروازے میں ہی کھڑی مجھے گھورتی رہی۔ اس کے چہرے پر غصہ عیاں تھا۔ میں اس کی طرف ایک نظر دیکھ کر شرمندگی سے زمین کو گھورنے لگی۔ ایک وقت ایسا بھی تھا کہ ہم دونوں بہنیں نظروں میں نظریں ڈالے ہنسی مذاق کرتی تھیں۔ گپیں لگایا کرتی تھیں مگر آج میں بہن سے نظر بھی نہیں ملا پارہی تھی۔ شرمندگی کے مارے دل یوں چاہتا تھا کہ زمین..... شق ہو جائے اور میں اس میں کود جاؤں۔ دل ہی دل میں اپنی موت کی دعا کررہی تھی لیکن یہ بھی سچ ہے کہ منہ مانگے موت نہیں آتی۔ میں اس وقت ایک ایک پل جی رہی تھی۔ مررہی تھی۔

باجی کمرے میں داخل ہوئی تو میرا دل ایک دم کانپ گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں کال کوٹھڑی میں ہوں اور وہ مجھے تختہ دار تک لے جانے کے لیے آئی ہو۔ وہ آکر میرے پاس چارپائی پر بیٹھ گئی۔ اس کا انداز کسی تفتیشی افسر کا سا تھا۔ میں نے ایک بار پھر باجی کو دیکھا اور پھر اپنی نظریں سامنے والی کلاک پر مرکوز کردیں۔ گھڑی رات کے دس بجا رہی تھی۔ مجھے کمرے میں بند ہوئے پورے چار گھنٹے گزر گئے تھے۔

''کھانا کھاؤ گی؟'' باجی نے پوچھا۔

میں نے بے چارگی کے عالم میں باجی کی طرف دیکھا اور بے اختیار میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ میں نے نفی میں سر ہلا کر کھانا کھانے سے انکار کردیا۔ میری بھوک تو کیا نیند بھی اڑ گئی تھی۔ سکون برباد ہوگیا تھا۔ دل میں ابھرنے والی خواہشات اور معمولی سی خوشیاں بھی غم میں بدل گئی تھیں۔ مجھے تو رہ رہ کر رونا آرہا تھا۔ باجی تشکی باندھے مجھے گھورے جارہی تھی۔ اب نہ جانے کیا ہونے والا تھا۔ یہ سب لوگ میری زندگی کا کوئی نہ کوئی فیصلہ کردیں گے۔ گھر والوں کی اب میرے بارے میں کیا رائے تھی۔ اس بارے میں مجھے کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ یقیناً ان کی رائے پہلے بہت مختلف تھی۔ اب اس گھر میں میری حیثیت آنکھ میں پڑنے والے اس تنکے کی طرح تھی جسے نکال پھینکنا بہت ضروری ہوتا ہے۔

''اپنی بھی عزت نیلام کی اور ہم سب کو بھی بدنام کیا تم نے۔'' باجی نے بڑے نرم لہجے میں کہا تھا۔

میں نے باجی کی بات کا جواب نہیں دیا۔

اس وقت خاموش رہنا ہی میرے لیے بہتر تھا اور پھر میں جواب بھی کیا دیتی۔ اسے کس طرح مطمئن کرتی۔ میری پلکوں تلے چھپا ہوا آنسوؤں کا سمندر مسلسل بہہ رہا تھا۔

''لوگوں کی باتیں سنیں تم نے؟ لوگ کیا کچھ کہہ رہے ہیں؟'' اب باجی کی آواز قدرے بلند ہوگئی تھی۔ میں چپ چاپ ان کی باتیں سن رہی تھی اور سسک رہی تھی۔ میں خاموش رہی جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''اسی کو مگرمچھ کے آنسو کہتے ہیں جو تم بہا رہی ہو۔'' اس نے کہا۔

''حقیقت تو میرا خدا جانتا ہے۔'' میں روتے ہوئے بولی۔

''اگر تمہاری کسی سے بات تھی تو مجھے بتا دیا ہوتا۔ ہم تمہاری شادی.....''

''باجی پلیز۔'' میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا اور وہ چپ ہوگئی۔

''میرا کسی سے کوئی جذباتی لگاؤ تھا نہ ہے۔'' میں نے کہا۔ آواز بھرائی ہوئی اور ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں مگر پھر بھی باجی میرے اس رونے کو بھی مگرمچھ کے آنسو کہہ رہی تھی۔

''اور پھر یہ جو ہوگیا ہے؟'' باجی نے میرے چہرے پر نظریں گاڑھ دیں۔ جواب میں مجھے خاموش ہی رہنا پڑا اور اس کے جواب میں کہتی بھی تو کیا؟

''اگر تمہارے ساتھ کوئی حادثہ..... میرا مطلب ہے کہ زیادتی ہوئی ہے تو بھی بتا دو۔ ہم ہر مسئلے کو فیس کرلیں گے۔'' باجی نے رازداری کے انداز میں کہا۔

''نہیں..... ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔''

''تو پھر آخر ہوا کیا ہے۔ تم حقیقت کیوں نہیں بتاتی ہو؟'' باجی نے زور دے کر پوچھا۔ وہ بار بار دروازے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ جیسے کسی کے آجانے کا ڈر ہو۔

''حقیقت یہ ہے کہ یہ سب جھوٹ ہے۔ مجھ پر الزام ہے۔'' میں نے باجی کی نظروں میں نظریں ڈال کر کہہ دیا۔

''دیکھو اسماء..... جو ہونا تھا ہوگیا۔ اب تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔'' باجی نے کہا۔ ان کا انداز سمجھانے والا اور لہجہ نرم تھا۔

''جو..... کر گزرتی ہیں..... وہ کسی بات سے نہیں ڈرتیں۔'' میں نے کہا۔

''اس کا مطلب ہے تم نے جان بوجھ کر.....''

''نہیں نہیں.....'' میں ایک دم بول پڑی۔ ''خدا کی قسم باجی..... میں نے ایسا کچھ نہیں کیا..... آپ کو یقین کیوں نہیں آتا۔'' میں نے کہا اور اپنا منہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا اور بے اختیار میری ہچکیاں بندھ گئیں۔

باجی اپنے ہاتھوں سے میرے بکھرے بالوں کو سنوارنے لگی تھی۔ اس نے پیار سے مجھے پکارا اور میرے چہرے کو اوپر اٹھا کر بغور میری صورت کو دیکھنے لگی۔ میں جانتی تھی کہ وہ کیا دیکھ رہی تھی۔ اصل میں وہ میرے چہرے کو دیکھ کر میرے دل کی اصلیت کو جاننا چاہتی تھی۔ اب بھی وہ سمجھ رہی تھی کہ شاید میں رونے دھونے کی ایکٹنگ کر رہی ہوں۔

''میں چاہتی ہوں کہ بات کسی طرح سمٹ جائے۔ تمہارے سسرال والوں کو پتا نہ چلے۔ ایک لیڈی ڈاکٹر میری اچھی دوست ہے۔ اس سے مل کر معاملہ ختم.....''

''اوہو۔ کوئی معاملہ ہے ہی نہیں تو..... ختم کیا کروائیں گی؟'' میں جل کر بولی۔

''لیکن یہ رپورٹ؟'' باجی نے کہا۔

''وہ رپورٹ غلط ہے باجی رپورٹ بالکل غلط ہے۔'' اگر آپ کو میری بات پر یقین نہیں ہے تو دوبارہ ٹیسٹ کروا لیتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

باجی مسلسل میری صورت کو دیکھے جا رہی تھی۔

''کتنا ٹائم ہوا ہے اس بات کو؟'' باجی نے پھر پوچھا۔ میں باجی کی بات کا گہرا مقصد سمجھ گئی۔

''کچھ ہوا ہی نہیں تو ٹائم نوٹ کرنے کی کیا بات ہے؟'' میں نے جواب دیا۔

باجی نے بیزاری کے ساتھ طویل سانس لی اور تنک آکر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں چارپائی پر لیٹ گئی۔ بیٹھے بیٹھے میری کمر شل ہوگئی تھی اور مجھے اپنی کمر کی ہڈیوں کی کٹ کٹ کی آواز سنائی دینے لگی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے میری کمر چیخ گئی ہو۔ میں نے درد کی شدت سے آنکھیں بھینچ لیں اور خود بخود آہ نکل گئی جسے میں نے حلق میں ہی دبا لیا۔ اس طرح کہ جیسے میں نے اپنی جان پر بہت جبر کیا ہو۔ ٹانگوں کو پھیلایا تو گھٹنوں کے کڑکڑانے کی آواز گونجی۔ میں سیدھی چت ہوگئی۔ میری آنکھوں کے کناروں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ میں باقاعدہ رونے لگی تھی۔

''یا اللہ رحم کر۔ تو بہت رحیم و کریم ہے۔'' میں نے دبی دبی آواز میں دعا کی۔ دل کی کیفیت کو لفظوں میں بیان کرنا میرے بس کی بات نہیں۔

سو جانے کی غرض سے آنکھیں موندھے چند لمحے ہی ہوئے ہوں گے کہ اپنے گھر کا دروازہ زور سے بند ہونے کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

میں ایک دم سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ دل کی دھڑکن بہت تیز ہوگئی تھی۔ درد کی شدت سے سر میں ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا گھبرا کر اٹھی تو میرا سر کھڑکی کے پٹ سے ٹکرا گیا تھا۔ میں نے کھڑکی کے پٹ کو

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ذرا سا بھیڑ دیا۔

''یہ میں کیا سن رہا ہوں۔'' ابو کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ وہ بہت غصے میں تھے۔

میں نے کھڑکی کے ذرا سے کھلے ہوئے پٹ سے باہر کی طرف جھانکا۔ امی اور ابو چارپائی پر پریشان بیٹھے تھے۔ باجی چارپائی کے ساتھ ہی زمین پر بیٹھی تھیں۔ ان کے بھی آنسو بہہ رہے تھے۔

''ہم تو برباد ہو گئے۔ ہماری تو ناک کاٹ دی اس بے غیرت لڑکی نے۔ موت آجائے اس کم بخت کو۔'' امی نے روتے ہوئے جھولی پھیلا کر بددعا کی۔

''اب ہے کہاں؟'' ابو نے چلا کر پوچھا۔

''بند ہو گئی ہے کمرے میں۔ پوچھو تو سہی اس سے۔'' امی نے ابو کو مشورہ دیا۔

''یہ کوئی میرے پوچھنے کی بات ہے۔ میں تو منہ بھی نہیں دیکھنا چاہتا اس بے غیرت کا۔'' ابو نے غصے میں کہا۔

امی اور ابو کی حالت دیکھ کر میرا دل پھٹ گیا۔ مگر میں کیا کر سکتی تھی۔ سوائے آنسو بہانے کے۔ میں نے کھڑکی بند کر دی اور پھر سے لیٹ گئی۔ میں ان کو کس طرح یقین دلاؤں کہ میں بالکل بے قصور ہوں۔ میں نے ایسا کوئی جذباتی عمل نہیں کیا جس سے میری یہ حالت ہو لیکن..... ڈاکٹر کی رپورٹ نے ان سب کو میرے منہ کالا کرنے کا یقین دلا دیا ہے۔ میرے پاس کوئی ثبوت نہیں کہ میں اس رپورٹ کو جھوٹا ثابت کر سکوں اور ان سب کے سامنے سرخرو ہو جاؤں۔

میں ہڑبڑا کر اٹھی تو میرا جسم کانپنے لگا۔ کمرے کا دروازہ دھڑام سے کھلا تھا اور سائے تیزی کے ساتھ کمرے میں گھس آئے۔ کمرے میں تاریکی تھی اور میں ان کے چہروں کو ٹھیک طرح سے نہ دیکھ سکی تھی۔ میرے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ پھر جب کچھ لمحوں بعد ان کے چہرے دیکھے تو حیران رہ گئی۔ میں نے جلدی سے لرزتے ہاتھوں کے ساتھ اپنا دوپٹا درست کیا۔ وہ دونوں سائے میرے ابو اور بھائی تھے۔ میں ان کو دیکھ کر بری طرح کانپ گئی۔

''آ..... پ..... آپ؟'' میں نے پوچھا۔

میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ابو اور بھائی اس طریقے سے کمرے میں گھس آئیں گے۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی اور لفظ منہ سے نکالتی۔ بھائی نے آتے ہی تین چار تھپڑ میرے منہ پر مار دیئے۔ میرا چہرہ سن ہو گیا۔ ان دونوں کے پیچھے امی اور باجی بھی دوڑتی ہوئی آ گئیں۔

''تجھے شرم نہ آئی۔ بے غیرت بے حیا۔'' بھائی نے کہا۔ میں چپ رہی۔

''ناک کٹوا دی اس ذلیل لڑکی نے ہماری۔'' ابو نے نفرت سے بھرپور لہجے میں کہا۔

''کوئی جگہ نہیں ہے اس لڑکی کی اس گھر میں۔'' امی بولیں۔

''یہ وہ گندی مچھلی ہے جس نے سارے گھر کو گندا کر دیا ہے۔'' باجی نے کہا۔

''اس گندی مچھلی کو گندے نالے میں ہی پھینک دوں گا۔'' بھائی نے کہا۔

''میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں بے قصور ہوں۔ خدا کی قسم!'' میں ان سب کے سامنے ہاتھ جوڑ کر رونے لگی۔ میں نے اپنا دوپٹا ابو اور بھائی کے قدموں میں رکھ دیا۔ بھائی کے پاؤں پکڑ لیے۔

''دوبارہ ٹیسٹ۔ بکواس بند کرو بے غیرت لڑکی۔'' امی نے چیخ کر کہا۔

''رہنے دو یہ مکاری..... ایسا ہی ناٹک کرتی ہیں تم جیسی مکار۔'' بھائی نے کہا اور میرے ہاتھ سے پکڑ کر مجھے باہر کی طرف کھینچنے لگا۔

''کہاں لے جا رہے ہیں مجھے۔ کہیں مت لے جاؤ میں کہیں نہیں جاؤں گی۔'' میں نے کہا۔

''ابو..... ابو.....'' میں نے ابو کا ہاتھ پکڑنا چاہا تو انہوں نے میرے منہ پر تھپڑ مار دیا۔ ان کی انگلی میری آنکھ میں لگی اور میری آنکھوں میں ہونے والی چبھن سے شدید تکلیف ہونے لگی تھی۔

''غرق ہو جاؤ اس گھر سے بے حیا۔'' بھائی مجھے کمرے سے باہر کی طرف کھینچ رہا تھا اور میں پوری قوت سے اپنے آپ کو روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں زمین پر بیٹھ گئی تھی لیکن بھائی نے پوری قوت سے جھٹکا دیا تو میں گھسٹتی چلی گئی۔

''باجی پلیز..... آپ بھی.....'' میں نے روتے ہوئے باجی کا ہاتھ پکڑا تو وہ بھی اپنی جگہ سے لڑکھڑا گئی۔ امی نے اس کا بازو میرے ہاتھ سے چھڑا لیا۔ میں چلا رہی تھی۔ گڑگڑا رہی تھی لیکن وہ سب کے سب میری ایک نہیں سن رہے تھے۔ میری قسموں پر یقین نہیں کر رہے تھے۔ میں نے امی کو پکڑنا چاہا تو ان کا صرف دوپٹا ہی میرے ہاتھ آیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''لے جایہ بھی اپنے ساتھ کم بخت۔'' امی نے کہا اور دوپٹا اتار کر پھینک دیا۔ میں بھائی کے پیروں سے لپٹ گئی۔ اس نے اپنی ٹانگیں میری گرفت سے چھڑانے کی بہت کوشش کی مگر میں رو رہی تھی۔ اللہ اور رسولؐ کے واسطے دے رہی تھی۔ خدا اور رسولؐ کی قسمیں کھا کر اپنے بے قصور ہونے کا یقین دلا رہی تھی۔ بھائی میرے ہاتھوں سے اپنے پاؤں چھڑانے کے لیے کافی دیر تک زور آزمائی کرتا رہا۔ میں بھی بری طرح لپٹی ہوئی تھی۔ وہ تھک کر کھڑا ہو گیا اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ اس کا سانس بری طرح پھول گیا تھا۔ اسے اس حال میں دیکھ کر میری گرفت نرم ہو گئی تھی۔ میری گرفت کے نرم ہوتے ہی وہ میری کمر میں لاتیں مارنے لگا۔ لگاتار اس نے کئی لاتیں ماری تھیں۔ میں زور زور سے رونے لگی تھی۔ اپنی کمر کو میں سہلانے لگی تھی۔ ابو، امی اور باجی کھڑے میری مظلومی کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ میں بری طرح تشدد کا شکار ہو رہی تھی اور پھر بھائی اول فول بکتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

کمرے میں قید ہوئے مجھے کئی گھنٹے ہو چکے تھے۔ اس دوران نہ تو ابو کی صورت دیکھی تھی اور نہ بھائی کی۔ میں جانتی تھی وہ مجھ سے بہت ناراض تھے۔ وہ میری صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے ایک دن ابو نے مجھ سے کہا تھا۔ ''اسماء بیٹی! جس دن میں تمہاری صورت نہ دیکھوں تو میرے دل کو بے سکونی رہتی ہے۔'' لیکن..... اب..... ابا کے دل کو کیسے سکون آیا ہوگا۔ یقیناً اب بھی وہ بے سکون ہی ہوں گے۔ میں جانتی ہوں کہ کوئی باپ اپنی بیٹی سے منہ نہیں موڑ سکتا لیکن انہوں نے مجھ سے منہ موڑ لیا۔ ایک غلط فہمی کی بنیاد پر۔ وہ مجھے بے غیرت سمجھتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ واقعی میں نے یہ اندھا قدم اٹھایا ہے۔ لیکن میں نے کوئی ایسا اندھا قدم نہیں اٹھایا جس سے میری عزت جائے۔ میں بے آبرو ہو جاؤں اور ان کے سر شرم سے جھک جائیں۔ وہ نہیں جانتے کہ اس ایک الزام نے میری حیا، میری غیرت اور میری آبرو کو ریزہ ریزہ کر دیا ہے بلکہ میری تو پوری زندگی ہی ریزہ ریزہ ہو گئی ہے۔ میرا اپنا سر شرم سے جھک گیا ہے۔ میں کسی سے نظر ملانے کے قابل نہیں رہی ہوں لیکن لیبارٹری کی رپورٹ اس الزام کو الزام نہیں بلکہ مجھ بے قصور کو قصوروار اور مجرم قرار دے رہی ہے۔ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اسی وقت دروازے کے دونوں پٹ ایک جھٹکے سے کھلے اور ابو تیزی کے ساتھ گھر کے اندر داخل ہوئے۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ ابو کے چہرے کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ وہ کچھ نیا کرنے والے ہیں۔ وہ جو نہیں ہونا چاہیے۔ میں ابو کی طرف دوڑی۔

''ابو خدا کی قسم میں.....'' ابو نے میری بات نہیں سنی اور مجھے دھکا دے دیا۔ میں لڑکھڑاتی ہوئی امی کی طرف گری۔ امی نے اپنے اوپر گرنے سے مجھے روکا تو میں چارپائی پر جا گری۔ میں رو رہی تھی۔ گڑگڑا رہی تھی۔

ابو کے ساتھ ایک بوڑھا شخص بھی آ چکا تھا۔ وہ شخص ابو سے بھی بڑی عمر کا تھا۔ میں دوڑ کر کمرے میں چلی گئی۔ اس سے پہلے کہ میں کمرے کا دروازہ بند کرتی۔ وہ دونوں بھی کمرے میں آ گئے۔ میں کمرے کے ایک کونے میں فرش پر بیٹھ گئی۔ میرے پاس ہی اماں اور باجی بھی آ کر بیٹھ گئیں۔ ابو اور وہ بوڑھا آدمی چارپائی پر بیٹھ گئے۔

''یہ بھائی صاحب؟'' اماں نے ابو کی طرف دیکھ کر جھجکتے ہوئے پوچھا۔

''یہ.....'' ابو نے کہا اور کچھ دیر سوچنے کے بعد مردہ سی آواز میں مزید کہا۔

''یہ..... اسماء کا ہونے والا شوہر.....'' ابو نے کہا تو میری چیخ نکل گئی۔ خود امی اور باجی بھی حیرت زدہ تھیں۔

''مگر یہ جوڑ.....''

''خاموش رہو تم.....'' ابو نے امی کو جھڑک دیا۔ امی وہیں دم سادھ گئیں۔

''مگر ابو.....'' باجی نے کہا تو ابو بپھر گئے۔

''میں جو کر رہا ہوں ٹھیک کر رہا ہوں ایسی بے غیرت لڑکی کا یہی انجام ہے۔'' ابو نے غصے سے کہا۔ میں نے دوڑ کر ابو کے پاؤں پکڑ لیے۔

''ابو خدا کے لیے مجھ پر رحم کریں۔ میں بے گناہ ہوں۔ اگر آپ کو یقین نہیں تو کسی اور جگہ سے ٹیسٹ.....''

''چپ رہو۔'' ابو نے کہا اور پیر کے ساتھ مجھے ٹھوکر ماری۔

''اندھا قدم اٹھانے والی کو اندھی کھائی میں... پھینکنا ہی بہتر ہے۔'' ابو نے غصے میں کہا اور میں دم سادھ گئی۔ ابو یہ نہیں سمجھ رہے تھے کہ وہ غصے میں اندھا قدم اٹھا رہے ہیں۔ سب کی نظر میں اس کی ذمے دار میں ہی تھی لیکن کوئی میری بات پر غور نہیں کر رہا تھا کہ میں کیا کہہ رہی ہوں۔ میں بار بار یہ کہہ رہی تھی کہ تصدیق کے لیے دوبارہ ٹیسٹ کروا لیے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

جائیں۔ مگر میری بات کو کوئی بھی ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ سب کے سب اس جھوٹی رپورٹ کو حقیقت مان چکے تھے اور مجھے جان بوجھ کر اندھی کھائی میں پھینک رہے تھے۔ وہ سب کے سب صرف سنی سنائی بات پر عمل کر رہے تھے۔

''ابو مجھے گولی مار دیں۔ جلا دیں، زندہ درگور کر دیں مگر خدا کے لیے ایسا نہ کریں۔'' میں نے ابو کی منت کر لی۔

''یہ تم..... زندہ درگور ہی تو ہو رہی ہو۔ ورنہ گولی مار کر جان سے مار دینا کوئی مشکل کام نہیں۔ ہمارے لیے تم مر چکی ہو۔'' ابو نے کہا۔ دکھ سے ان کی آنکھوں سے ایک آنسو بھی نہ بہا کہ وہ اپنی چہیتی بیٹی کو اپنے ہاتھوں سے زندہ درگور کر رہے ہیں۔ میں خاموش ہو گئی۔ اب مجھے یقین ہو گیا تھا کہ ان کے سامنے میری کوئی منت اور کوئی واسطہ کارآمد نہیں ہوگا۔

''تم خوش رہو گی۔ میری پہلی بیوی بھی تم جیسی ہی ہے۔ میرے پاس تمہیں کوئی دکھ نہیں ہوگا۔'' اس بڈھے کی کھڑکھڑاتی آواز نے میرے دل میں ایک نیا درد بھر دیا۔

بھائی قاضی صاحب کو لیے کمرے میں داخل ہوئے۔ میں ان سب کے سامنے رو رہی تھی گڑگڑا رہی تھی۔ منت سماجت کر رہی تھی مگر میری سننے والا کوئی نہیں تھا۔ قاضی صاحب بھی مجھ روتی کو دلاسہ دینے لگے۔ ضرور ان کے سامنے بھی میری رسوائی کی داستان پیش کر دی گئی تھی۔ میں کسی جال میں پھنسے ہوئے پرندے کی طرح تھک ہار کر ہانپنے لگی۔ میں خاموش ہو گئی اور اپنے آنسو صاف کر دیئے۔ میں نے اپنے آپ کو سمندر کی ان تیز لہروں کے سپرد کر دیا جو جہاں چاہیں میری زندگی کی کشتی کو لے جائیں۔ کسی کنارے لگا دیں یا پھر یونہی بیچ سمندر کے ڈوب کر غرق آب ہو جائے۔ میں ان سب کے اس غلط فیصلے سے متفق ہو گئی۔ قاضی صاحب نے ہمارا نکاح پڑھا دیا اور میں نے چپ چاپ اپنی بیس سالہ زندگی، اپنی خواہشات کی امنگوں کا متلاشی وجود، اس پچاس سالہ بوڑھے کو قبول کر کے اس کے حوالے کر دیا۔ اب میری زندگی کے کٹھن مراحل کا آغاز ہو گیا تھا۔ میرا پل صراط کا سفر شروع ہو گیا تھا۔ میں اپنے کمزور بوڑھے اور نحیف ہم سفر کے ساتھ پرخار راستوں پر چل پڑی تھی۔

''چلو اسماء۔'' اس نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ میں بھی چپ چاپ سر جھکائے اس کے ساتھ ہو گئی۔ میں اب کر بھی کیا سکتی تھی۔ میری زندگی کا انتہائی غلط فیصلہ میرے ماں باپ نے کر دیا تھا۔ اس نے میرا ہاتھ اس طرح اپنی گرفت میں لے لیا کہ جیسے اسے میرے بھاگ جانے کا ڈر ہو۔ ہم دونوں جیون ساتھی کمرے سے باہر جانے کے لیے مڑے ہی تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی اور ڈاکٹرنی گھر میں داخل ہوئی۔

''میں اس لیے آئی ہوں کہ اسماء کی رپورٹ بدل گئی ہے۔ جو رپورٹ آپ کے پاس آئی ہے میری دوسری مریضہ اسماء اسماعیل کی ہے۔ دونوں کے نام ایک ہونے کی وجہ سے یہ غلطی ہو گئی ہے۔ دراصل میری دوسری مریضہ تین سال سے اولاد نہ ہونے کی وجہ سے مجھ سے علاج کروا رہی ہے۔ اس کے حمل کا ٹیسٹ تھا اور آپ کے پیشاب کا جنرل ٹیسٹ تھا۔ میں اپنی اس غلطی کی معذرت چاہتی ہوں۔'' سب حیران اس ڈاکٹرنی کو دیکھنے لگے۔

''آپ نے تو بڑی آسانی سے معذرت کر لی۔ آپ کی اس ذرا سی غلطی سے مجھ پر کیا گزری یہ آپ نہیں جانتیں۔'' میں نے کہا اور رونے لگی۔

''مجھے سب آپ کی محلے دار روشن نے سب کچھ بتا دیا ہے۔ میں پریشان تھی کہ دوسری رپورٹ میں نے کس کو دے دی اتفاق سے روشن اپنی دوا لینے آئی ہوئی تھی۔ اس نے سب کچھ مجھے بتایا اور آپ کے گھر کا پتا بھی اسی نے بتایا ہے۔'' ڈاکٹرنی نے کہا۔

''لیکن میری زندگی تو برباد ہو گئی ناں۔ میں تو زندہ درگور ہو گئی ہوں۔'' میں نے روتے ہوئے کہا۔

''مجھے زیادہ افسوس تو تمہارے ماں باپ پر ہے۔ جنہوں نے اس غلط اور سنی سنائی بات پر بغیر کسی تصدیق کے اتنا بڑا اندھا قدم اٹھا لیا اگر تمہارا دوبارہ سے ٹیسٹ کروا لیتے تو سچ سامنے آ ہی جاتا۔ اس میں میرا اتنا بڑا قصور تو نہیں ہے۔'' ڈاکٹرنی نے کہا اور رپورٹ لے کر چلی گئی۔

''چلو اسماء۔'' میرے مجازی خدا نے میرے ہاتھ کو دبائے ہوئے کہا اور دروازے کی طرف چل پڑا۔ میں بھی اس کے پیچھے اس طرح چل پڑی کہ جیسے پالتو جانور اپنے مالک کے ساتھ چل پڑتا ہے۔

ایک نئی نویلی مجبور دلہن کو اپنی سوکن اور اپنے چھ سات سوتیلے بچوں کے ساتھ کن مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ یہ مت پوچھیے۔ بس..... بلکہ بے بس..... جیسے تیسے زندگی گزار رہی ہوں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

سزا

محترم مدیر
السلام علیکم
میں عرصہ دراز سے سرگزشت پڑھ رہی ہوں۔ کبھی لکھنے لکھانے سے دلچسپی نہیں رہی لیکن کئی ماہ پہلے ایک سچ بیانی پڑھی۔ جس میں ایسے واقعات تھے جو بالکل میرے جیسے تھے۔ اسے پڑھ کر سوچا کہ مجھے بھی اپنی حالات زندگی لکھنا چاہئیں۔ بس میں نے تمام واقعات کو بلا کم و کاست لکھنا شروع کردیا۔ مجھ پر جو گزری ہے وہ لکھتی چلی گئی ہوں۔ اب پتا نہیں آپ کو پسند آتی ہے یا نہیں۔
نجمہ نعیم
(سیالکوٹ)

منصور میرا اکلوتا بیٹا ہے۔ وہ ایک سال کا تھا جب میرے شوہر ایک معمولی سی بات پر ناراض ہوکر گھر سے چلے گئے تھے۔ اس کے بعد وہ کبھی پلٹ کر نہیں آئے اور نہ ہی ان کے بارے میں کچھ معلوم ہوسکا۔ ان کے جانے کے بعد مجھ پر جو گزری اسے الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ ایک جوان اور تنہا عورت کا اس معاشرے میں زندگی گزارنا پل صراط پر چلنے کے مترادف ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔ ہر کوئی میری بوٹیاں نوچنے کے درپے تھا اور مجھے اپنی عزت بچانا

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

Downloaded From Paksociety.com

مشکل ہو گیا تھا۔ میرے سامنے دو بڑے مسئلے تھے۔ ایک اپنی عزت کی حفاظت اور دوسرا غم روزگار۔ جب کافی دن گزر گئے اور میرے شوہر نعیم احمد واپس نہیں آئے تو میں اپنے بھائی کے گھر چلی گئی کیونکہ میکے میں وہی ایک واحد سہارا تھا۔ ماں باپ مر چکے تھے۔ اس کے علاوہ کوئی اور بہن بھائی نہیں تھا۔ بھائی نے نعیم احمد کو تلاش کرنے کی بہت کوشش کی۔ لاہور میں ان کے بھائی اور کچھ دوسرے رشتے دار رہتے تھے لیکن انہیں بھی ان کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ مایوس ہو کر میں نے کرائے کا مکان خالی کر دیا اور اپنا مختصر سامان لے کر بھائی کے گھر آ گئی۔

بات بہت معمولی تھی اور مجھے بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ معاملہ اتنا آگے بڑھ جائے گا۔ ویسے تو میں آئے دن ہی ان سے الجھتی رہتی تھی لیکن اس روز کچھ زیادہ ہی بول گئی۔ دراصل میرے ملنے والوں میں ایک شادی تھی لیکن میرے پاس اس تقریب میں شرکت کرنے کے لیے ڈھنگ کے کپڑے نہیں تھے۔ میری شادی تین سال پہلے ہوئی تھی۔ اس کے بعد سے اب تک میں نے اپنے لیے کوئی جوڑا نہیں بنایا تھا۔ جہیز اور بری میں جو کپڑے ملے تھے، انہی سے کام چلا رہی تھی لیکن انہیں اتنی بار پہن چکی تھی کہ میرے تمام رشتے داروں اور ملنے جلنے والوں کو ان کا ڈیزائن اور رنگ بھی یاد ہو گیا ہو گا۔ اسی لیے میں نے سوچا تھا کہ اس شادی میں شرکت کرنے کے لیے کوئی اچھا سا سوٹ یا ساڑی خریدوں گی۔

کچھ خواہشیں ایسی ہوتی ہیں جو چاہنے اور کوشش کرنے کے باوجود پوری نہیں ہوتیں۔ میری یہ خواہش بھی ایسی ہی تھی اور اس کے پورا ہونے کا کوئی امکان نظر نہیں آ رہا تھا کیونکہ میرے پاس تو کچھ تھا نہیں جو اپنے لیے کوئی کپڑا خرید سکتی۔ نعیم مجھے جو پیسے دیتے، ان سے گھر کا خرچ ہی مشکل سے پورا ہوتا بلکہ بعض اوقات تو مہینے کے آخر میں بہت تنگی ہو جاتی۔ کئی بار ایسا بھی ہوا کہ گھر میں کوئی چیز ختم ہو گئی اور میرے پاس اسے منگوانے کے لیے پیسے نہ ہوتے۔ نعیم ادھار کرنے کے بہت خلاف تھے اور انہوں نے سختی سے تاکید کر رکھی تھی کہ کسی بھی حال میں محلے کی دکان سے کوئی چیز ادھار نہ خریدوں۔ چاہے ہمیں ایک وقت فاقہ ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ اس لیے کچھ بچانے یا کوئی کمیٹی ڈالنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

میں نے نعیم سے کئی بار پیسے بڑھانے کا مطالبہ کیا لیکن ہمیشہ ان کا ایک ہی جواب ہوتا کہ اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں۔ انہیں جو تنخواہ ملتی ہے۔ ۱۲ میں سے وہ صرف بس کا کرایہ اپنے پاس رکھ کر سارے پیسے مجھے دے دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کا کوئی اور خرچ نہیں تھا۔ وہ پان کھاتے نہ سگریٹ پیتے اور نہ ہی انہیں فلم دیکھنے یا ہوٹلوں میں جانے کا شوق تھا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے کپڑے بھی چھٹی والے دن خود ہی گھر پر دھو لیتے۔ دیکھا جائے تو ان کی حالت مجھ سے بھی زیادہ قابل رحم تھی۔ میں جانتی تھی کہ وہ چاہنے کے باوجود میرے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔ اس کے باوجود ان سے الجھتی رہتی تھی۔

وہ حالات کے گرداب میں پھنس گئے تھے۔ جس میں سے نکلنا ان کے بس میں نہیں تھا۔ انہوں نے غربت کی گود میں آنکھ کھولی۔ باپ کپڑے کی مل میں سپروائزر تھے لیکن وہ چاہتے تھے کہ اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائیں تاکہ ان کا مستقبل سنور سکے۔ نعیم احمد کا ایک چھوٹا بھائی شمیم بھی تھا۔ باپ نے دونوں کو اسکول میں داخل کروا دیا اور جیسے تیسے ان کی تعلیم کے اخراجات پورے کرتے رہے لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ابھی نعیم آٹھویں اور شمیم چھٹی جماعت میں تھے کہ ان کے باپ کا ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا۔ ان کے سر سے گویا چھت ہٹ گئی اور وہ کھلے آسمان تلے آ گئے۔ عزیزوں رشتے داروں نے کچھ عرصہ تو ساتھ دیا لیکن ایک ایک کر کے سب پیچھے ہٹ گئے۔ اب نعیم کی ماں کو پیٹ کا دوزخ بھرنے کے ساتھ ساتھ مکان کے کرائے اور بچوں کے تعلیمی اخراجات کی فکر ستانے لگی۔ وہ خود تو کچھ کرنے کے قابل نہیں تھیں۔ ان کے پاس تعلیم تھی اور نہ ہی انہیں کوئی ہنر آتا تھا۔ بچے بہت چھوٹے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ زندگی کی گاڑی کو کس طرح آگے بڑھائیں۔

محلے کے ایک خدا ترس شخص نے نعیم کو اپنی دکان پر جز وقتی ملازم رکھ لیا۔ وہ اسکول سے واپس آنے کے بعد کھانا کھا کر دکان پر چلے جاتے اور شام تک وہیں رہتے۔ اس طرح انہوں نے چودہ سال کی عمر میں ہی کمانا شروع کر دیا اور یوں گھر کی گاڑی گھسٹ گھسٹ کر چلنے لگی۔ ان کی ماں چاہتی تھیں کہ شمیم بھی کوئی چھوٹا موٹا کام کرے تاکہ گھر کی آمدنی میں اضافہ ہو لیکن نعیم نے منع کر دیا۔ بارہ سال کے لڑکے کو کسی مکینک کی دکان پر چھوٹے کا کام ہی مل سکتا تھا جس میں پیسے کم اور جھاڑ زیادہ کھانا پڑتی ہے۔ انہوں نے شمیم کو دل لگا کر پڑھنے کی ہدایت کی اور خود مشقت میں جت

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

گئے۔

نعیم نے میٹرک پاس کرنے کے بعد کالج میں داخلہ لینے کی بجائے دکان پر کل وقتی ملازمت کر لی۔ اس طرح ان کی تنخواہ میں اضافہ ہو گیا۔ وہ کسی دفتر میں کام کرنا چاہ رہے تھے لیکن اٹھارہ سال کی عمر کو پہنچنے سے پہلے کسی سرکاری ادارہ یا پرائیویٹ کمپنی میں ملازمت نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے پرائیویٹ انٹر کے امتحان کی تیاری شروع کر دی اور دو سال بعد ایک سرکاری ادارہ میں کلرک کی جاب مل گئی۔ لیکن انہوں نے اپنا تعلیمی سلسلہ جاری رکھا اور دیکھتے ہی دیکھتے پہلے بی کام اور پھر ایم اے اکنامکس کر لیا لیکن تعلیمی قابلیت بڑھانے کے باوجود ان کی ترقی نہیں ہوئی کیونکہ سرکاری محکموں میں سنیارٹی کو دیکھا جاتا ہے چنانچہ وہ بھی دس سال گزر جانے کے باوجود اسسٹنٹ کے عہدے تک ہی پہنچ سکے جب کہ چھوٹے بھائی شمیم نے ایم بی اے کر لیا اور اسے ایک اچھی کمپنی میں ملازمت مل گئی۔ چند دنوں بعد ہی اس کا تبادلہ لاہور ہو گیا اور اس نے وہیں پر مستقل سکونت اختیار کر لی۔

میں نے میٹرک کے بعد پڑھائی ختم کر دی تھی کیونکہ ہمارے خاندان میں لڑکیوں کی تعلیم کا رواج نہیں تھا اور نہ ہی مجھے آگے پڑھنے سے زیادہ دلچسپی تھی۔ اس لیے میں نے کالج میں داخلہ نہیں لیا اور گھر کے کاموں میں لگ گئی کیونکہ پرانے زمانے کی عورتوں کی طرح اماں کا بھی یہی خیال تھا کہ لڑکیوں کو پڑھائی کے ساتھ امور خانہ داری میں بھی طاق ہونا چاہیے یہ ہنر آئندہ زندگی میں بھی ان کے کام آتا ہے۔ مجھے کھانا پکانے سے زیادہ سلائی سے دلچسپی تھی چنانچہ اماں نے مجھے ایک قریبی سلائی اسکول میں داخل کروا دیا، جہاں میں نے چھ مہینے میں ہی ہر طرح کے زنانہ سوٹ سینا سیکھ لیے۔ مجھے کیا پتا تھا کہ آگے چل کر یہ ہنر میرے لیے کتنا کار آمد ثابت ہوگا۔

نعیم کی ماں نے نہ جانے مجھے کہاں دیکھ لیا کہ ایک دن وہ سوالی بن کر ہمارے گھر آ گئیں کیونکہ وہ اجنبی لوگ تھے۔ اس لیے ابو نے چھان بین کے لیے کچھ وقت مانگا اور میرے اکلوتے بڑے بھائی کی ڈیوٹی لگائی کہ وہ نعیم کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔ ایک ہفتہ بعد بھائی نے جو رپورٹ دی وہ کافی حوصلہ افزا تھی۔ ان میں وہ ساری خوبیاں موجود تھیں جو کسی شریف اور اچھے انسان میں ہونا چاہئیں۔ البتہ ان کی مالی حیثیت کچھ کم تھی۔ امی یہ سن کر سوچ میں پڑ گئیں کہ اتنی کم تنخواہ میں ہماری بیٹی کا کیسے گزارہ ہوگا۔ ہر ماں کی طرح انہوں نے بھی میرے لیے ایک خوش حال گھرانے کا خواب دیکھا تھا۔ شاید وہ انکار کر دیتیں لیکن بھائی نے نہ جانے ابو کو کیا پٹی پڑھائی کہ وہ اس رشتے پر تیار ہو گئے۔ وہ بھی دوسرے قدامت پسند مردوں کی طرح اس سوچ کے حامل تھے کہ لڑکیوں کو جوان ہوتے ہی رخصت کر دینا چاہیے۔ ورنہ وہ بگڑ جاتی ہیں۔ میں خود بھی ایک کم حیثیت شخص سے شادی کرنا نہیں چاہ رہی تھی لیکن ہم ماں بیٹی کی کسی نے نہیں سنی اور میں نعیم کی دلہن بن کر ان کے گھر آ گئی۔

چند روز شادی کی گہما گہمی میں مجھے کچھ اندازہ نہیں ہوا۔ نعیم کی ماں چند روز بعد ہی چھوٹے بیٹے شمیم کے پاس لاہور چلی گئیں جو نعیم کے مقابلے میں قدرے خوش حال زندگی گزار رہا تھا۔ چھ ماہ بعد انہیں دل کا دورہ پڑا اور وہ جانبر نہ ہو سکیں۔ ادھر میرے والدین بھی ایک سال کے عرصے میں آگے پیچھے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ تب مجھے احساس ہوا کہ خدا کے کاموں میں کوئی نہ کوئی بہتری ہوتی ہے۔ اچھا ہوا کہ ان کی زندگی میں ہی میری شادی ہو گئی اور میں اپنے شوہر کے گھر میں پُرسکون زندگی گزار رہی تھی ورنہ بھائی اور بھاوج کے ٹکڑوں پر پڑی رہتی۔

نعیم مجھ سے بہت محبت کرتے تھے۔ میرا بہت خیال رکھتے اور حتی المقدور ہر ضرورت پوری کرتے۔ انہوں نے مجھ سے کبھی اونچی آواز میں بات نہیں کی۔ وہ اپنے سارے کام خود کرتے۔ میں انہیں دو وقت کی روٹی اور ناشتا دینے کی روادار تھی لیکن جواب میں انہیں وہ توجہ اور محبت نہ دے سکی جس کے وہ حق دار تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ دن بہ دن میرا احساس محرومی بڑھتا جا رہا تھا۔ نعیم کی تنخواہ اتنی کم تھی کہ میں اپنی کوئی خواہش پوری نہیں کر سکتی تھی۔ مجھے بچپن سے ہی اچھے کپڑے پہننے اور گھر کے لیے چیزیں خریدنے کا شوق تھا لیکن اس تنخواہ میں تو کچن کا خرچ ہی بمشکل پورا ہوتا۔ میں کوئی اور چیز کیسے خریدتی۔

منصور کی پیدائش کے بعد اخراجات میں مزید اضافہ ہو گیا۔ ہم دونوں میاں بیوی سر جوڑ کر بیٹھے اور سوچنے لگے کہ ماہانہ بجٹ میں کہاں کہاں کٹوتی ہو سکتی ہے۔ میں نے ماسی کو جواب دے دیا اور خود ماسی بن گئی۔ اخبار بند کر دیا۔ پہلے ہمارے یہاں ہفتہ میں دو بار گوشت پکتا تھا۔ اب ایک بار پکانے لگے۔ سبزیاں اور دالیں کون سی سستی تھیں۔ میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

بچت بازاروں کی خاک چھانتی اور کم قیمت اشیاء خرید کر لاتی۔ ان تمام تدبیروں کے باوجود گزارہ مشکل ہوتا جارہا تھا۔ پھر میں نے ایک دن نعیم کو آڑے ہاتھوں لیا اور بولی۔ ''آپ کوئی دوسری ملازمت کیوں نہیں ڈھونڈتے۔ ان چند روپوں کی خاطر کیوں اپنی اور میری زندگی کو جہنم بنا رکھا ہے۔ مہنگائی دن بہ دن بڑھتی جارہی ہے۔ اب تو دو وقت کی روٹی کھانا مشکل ہوگیا ہے۔ کل کو منصور بھی بڑا ہو گا۔ اس کی تعلیم اور دیگر اخراجات کے لیے بھی پیسوں کی ضرورت ہوگی۔''

''اللہ پر بھروسا رکھو۔ کچھ نہ کچھ ہو ہی جائے گا۔'' وہ بڑے اطمینان سے بولے۔

''اگر آپ اسی طرح ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے تو کچھ نہیں ہوگا۔'' میں نے جھلاتے ہوئے کہا۔ ''انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جس کے لیے وہ کوشش کرتا ہے۔''

''تمہارا کیا خیال ہے۔ میں نے کوشش نہیں کی۔ کئی جگہ درخواستیں دے چکا ہوں۔ انٹرویوز بھی ہوتے رہتے ہیں لیکن قسمت ساتھ نہیں دے رہی۔ دراصل مسئلہ یہ ہے کہ آج کل ملٹی نیشنل کمپنی میں معمولی جاب کے لیے بھی ایم بی اے مانگتے ہیں۔ پرائیویٹ فرم میں کام زیادہ اور تنخواہ کم ہے پھر کوئی مراعات بھی نہیں ملتی۔ ایک دن چھٹی کرلو تو اس کے بھی پیسے کٹ جاتے ہیں۔ سرکاری ملازمت میں یہ سب نہیں ہوتا۔ تنخواہ وقت پر ملتی ہے اور نوکری بھی محفوظ ہے پھر پنشن کا آسرا بھی ہے۔ کم از کم بڑھاپا تو سکون سے گزر جائے گا۔''

''یہ بھی خوب کہی آپ نے۔'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''لوگ آج کی فکر کرتے ہیں۔ آپ بیس سال بعد کا سوچ رہے ہیں۔''

''تم پریشان مت ہو۔ میں نے گریڈ سولہ کی انٹرنل پوسٹ کے لیے امتحان دیا ہے اگر کامیاب ہوگیا تو تنخواہ میں معقول اضافہ ہوجائے گا اور دیگر مراعات بھی ملیں گی۔''

مجھے ان کی سادگی پر ہنسی آگئی۔ وہ اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ اس طرح کی آسامیوں پر اندر ہی اندر سلیکشن ہو جاتا ہے۔ یہ امتحان اور انٹرویو تو محض دکھاوا ہے۔ میرا خدشہ درست ثابت ہوا۔ امتحان میں کامیاب ہوجانے کے باوجود انہیں انٹرویو کے لیے نہیں بلایا گیا اور وہ انتظار کرتے رہ گئے۔

اس دن کے بعد ہمارے درمیان جھگڑے بڑھتے گئے۔ یہ یک طرفہ تکرار تھی جس میں صرف میں بولتی اور وہ سنتے مگر جب میں تھک جاتی تو وہ آہستہ سے کہتے۔ ''صبر کرو۔ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔''

میں صبر ہی کررہی تھی ورنہ اب تک اس گھر کو چھوڑ کر کہیں جا چکی ہوتی لیکن جاتی بھی کہاں۔ لے دے کر ایک بھائی کا گھر تھا۔ وہ بھی مجھے کتنے دن اپنے پاس رکھتا۔ تھک ہار کر مجھے پھر اسی گھر میں آنا پڑتا۔ میں سب سے زیادہ اپنے بچے کی طرف سے پریشان تھی۔ ہم اتنے تنگ دست تھے کہ اس کی چھوٹی چھوٹی ضرورتیں بھی پوری نہیں کرسکتے تھے۔ کئی بار سوچا کہ میں ہی کوئی ملازمت کرلوں لیکن میٹرک پاس کو کون پوچھتا۔ زیادہ سے زیادہ مجھے کسی اسپتال یا اسکول میں آیا کی نوکری مل جاتی۔ اس میں کیا ملتا؟ بہت سوچنے کے بعد میرے دماغ میں ایک خیال آیا۔ میں نے سلائی کا کورس کر رکھا تھا، کیوں نہ فارغ وقت میں محلے والوں کے کپڑے سینا شروع کردوں۔ اس سے کچھ نہ کچھ آمدنی تو ہو ہی جائے گی۔

میں نے یہ تجویز نعیم کے سامنے رکھی تو انہوں نے اس کی شدید مخالفت کی اور بولے۔ ''آج کل درزی کے یہاں سلوانے کا رواج ہے۔ تم پروفیشنل نہیں ہو، اس لیے تمہارے پاس کوئی نہیں آئے گا اور اگر کسی نے ایک آدھ سوٹ سلنے کے لیے دے دیا تو تمہارے کام میں اتنے کیڑے نکالے جائیں گے کہ تم پریشان ہو جاؤ گی۔ بلاوجہ لوگوں سے تعلقات بھی خراب ہوں گے۔ بہتر ہے کہ اس خیال کو دل سے نکال دو۔''

میں نے ان کی ایک نہ مانی اور اپنے جہیز کی مشین نکال کر بیٹھ گئی۔ اس کھٹارا مشین کو دیکھ کر خیال آیا کہ امی نے جو ہار دیا ہے اسے کسی سنار کے پاس جا کر بیچ دوں مگر فوراً دماغ نے صلاح دی کہ یہ غلط ہے۔ کل چار پانچ زیور ہیں انہیں بھی بیچ دیا تو تہی دست ہو جاؤں گی۔ اس لیے اسی مشین پر کام کرنے کی ٹھان لی۔ اس کے بعد میں نے گھر گھر جا کر عورتوں کو اپنے کام کے بارے میں بتایا لیکن مجھے کہیں سے بھی حوصلہ افزا جواب نہیں ملا۔ ان کے انداز میں بے اعتباری جھلک رہی تھی جیسے ڈر رہی ہوں کہ میں اپنی ناتجربہ کاری کے باعث ان کے کپڑوں کا ستیاناس مار دوں گی۔ نعیم کا کہا درست نکلا۔ پورے مہینے میں صرف دو سوٹ آئے اور جب میں نے انہیں سینا شروع کیا تو پتا چلا کہ یہ ایک کل وقتی کام ہے اور میں اپنی گھریلو مصروفیت کے ساتھ اسے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

جاری نہیں رکھ سکتی۔ گھر کے کام نمٹاتے نمٹاتے دو بج جاتے۔ اس کے بعد میں منصور کو سلا کر سلائی کرنے بیٹھتی۔ اگر وہ ڈیڑھ دو گھنٹے کی نیند لے لیتا تو میں تھوڑا سا کام کر لیتی۔ اس کی نیند بڑی کچی تھی اور ذرا سے کھٹکے پر اس کی آنکھ کھل جاتی تھی۔ ایسی صورت میں میرے لیے آدھ گھنٹے کام کرنا بھی مشکل ہو جاتا۔ پانچ بجے نعیم آجاتے تھے۔ اس کے بعد تو کچھ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

بڑی مشکل سے وہ دو سوٹ مکمل کیے اور سلائی کا کام بند کر دیا۔ وہ تو شکر ہوا کہ کسی نے ان میں کوئی مین میخ نہیں نکالی ورنہ میرے لیے بڑی مشکل ہو جاتی۔ بہرحال یہ تجربہ ناکام رہا اور زندگی واپس اپنی ڈگر پر لوٹ آئی۔ میں نے کسی حد تک حالات سے سمجھوتا کر لیا تھا اور جان گئی تھی کہ ساری زندگی اسی طرح محرومیوں کی آگ میں جلتے ہوئے گزارنی ہے۔ نعیم کی سرشت میں ہی نہیں تھا کہ وہ اپنے حالات بہتر بنانے کے لیے جدوجہد کرتے۔ وہ بنیادی طور پر قناعت پسند تھے اور روکھی سوکھی کھا کر بھی خوش رہتے تھے۔ میں نے ان سے اس موضوع پر بات کرنا چھوڑ دی تھی لیکن بعض اوقات ایسی صورتِ حال پیدا ہو جاتی کہ میرے لیے اپنے آپ پر قابو رکھنا مشکل ہو جاتا جیسا کہ اس روز ہوا۔

مجھے شادی میں شرکت کرنے کے لیے نئے کپڑے بنوانا تھے لیکن میرے پاس پیسے نہیں تھے لہٰذا میں نے شادی کے بعد پہلی بار نعیم سے کوئی فرمائش کی۔ میں جانتی تھی کہ ان کی جیب بھی خالی ہوگی اور وہ یہ فرمائش پوری نہیں کر سکتے پھر بھی میں نے اس اُمید پر دل کی بات کہہ دی کہ شاید وہ کوئی انتظام کر سکیں لیکن مجھے اس وقت شدید مایوسی کا سامنا کرنا پڑا جب انہوں نے اپنی عادت کے مطابق سر جھکا کر کہا۔ ''تم جانتی ہو کہ میرے لیے یہ فرمائش پوری کرنا ممکن نہیں۔ میرے پاس بچتا ہی کیا ہے۔ ساری تنخواہ تو تمہارے ہاتھ پر رکھ دیتا ہوں۔''

''اس طرح تو ساری عمر کچھ نہیں ہوگا۔ میں کب تک پرانے کپڑے پہن کر تقریبات میں جاتی رہوں گی۔''

''تم ہی بتاؤ، میں کیا کروں؟'' وہ بے بسی سے بولے۔

''کسی دوست سے قرض لے لیں۔ تنخواہ ملنے پر واپس کر دیں گے۔''

''اس کے بعد سارا مہینا فاقے کرنا، قرض لینا آسان ہے لیکن اس کی ادائیگی بہت مشکل ہوتی ہے۔ اس

بنوں کے پٹھان قبائل

تیرہویں صدی 40 کے اواخر میں کودائی کرلانڑی کے ایک قبیلے مینگل اور سید ماخد کے ایک الحاق شدہ قبیلے ہنی نے برمل میں اپنا کرلانڑی دیس چھوڑا، کوہ سلیمان عبور کیا اور ضلع بنوں میں آکر کرم و گمبیلا دریاؤں کی وادیوں میں بس گئے۔ کوئی ایک سو سال بعد شیک کی اولادیں، بنوچی، شیک کی بیوی مسماۃ بنو (Bannu) سے اولادیں ایک لگی کرلانڑی بنوچی (جو اپنے داؤد رشتہ داروں کے ساتھ اس وقت کوہاٹ اور ضلع بنوں کے درمیانی زاویے میں سلسلہ خوست کے مشرقی پہاڑیوں پر متمکن تھے اور ان کا مرکزی مقام شوال تھا) کو وزیری نے بے گھر کیا اور وادی کرم پر غلبہ حاصل کرتے ہوئے مینگل اور ہنی کو ان کے موجودہ علاقہ واپس کوہاٹ اور کرم کے کوہستانوں میں دھکیل دیا اور دریائے کرم و ٹوچی کے درمیانی علاقے پر قبضہ کر لیا جس پر اب وہ ضلع کے شمال مغربی کنارے میں آباد ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ہر لحاظ سے بدخصلت داؤر نے بارڈر سے پرے دریائے ٹوچی کے کناروں پر قبضہ کر لیا جہاں وہ ابھی تک آباد ہیں۔ کوئی 400 سال قبل بگی خیل نے ضلع کا کالا باغ سے اوپر سندھ پار کے حصے اور اس مقام پر کوہ نمک سے نکلی ہوئی پہاڑیوں کی ایک چھوٹی سی شاخ پر قبضہ کر لیا۔ برمل میں اپنے آبائی گھروں سے نکل کر آتے ہوئے درویش خیل وزیری نے جب بنوچی کو شوال کی پہاڑیوں سے بے دخل کیا اور خالی ہونے والے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ 350 سال تک پہاڑیوں تک ہی محدود رہے لیکن گزشتہ اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں انہوں نے ٹوچی کے دائیں کنارے پر مروت کے میدانی علاقے اور کرم کے بائیں کنارے پر بنوچی کے علاقے میں تجاوز ہونا شروع کیا۔ شروع شروع میں ان کی آمد صرف موسم سرما ہی میں ہوتی تھی لیکن رواں صدی کے اوائل یعنی طوائف الملوکی کے دور میں (جس کے ساتھ ساتھ بنوں میں سکھ اقتدار قائم ہوا) انہوں نے انجام کار اپنی حاصل کردہ زمینوں میں پاؤں مضبوط کیے اور اب بھی وہیں رہتے ہیں۔ سب سے آخر میں بیطنی آئے جو پچھلے ساٹھ سال کے دوران مروت کی شمال مشرقی حدود پر پہاڑیوں کے دامن میں ایک چھوٹے سے خطے پر آباد رہے ہیں۔ لہٰذا سارے سندھ پار کے بنوں اور ضلع کے دریا کے اس طرف والے حصے کے شمال میں کرم اور سندھ کو سیکسر کے ساتھ ملانے والے خط الحاق تک پٹھان آباد ہیں۔ سیکسر وہ چوٹی ہے جس سے سلسلہ کوہ نمک ضلع میں داخل ہوتا ہوا شمال کی طرف کو مڑتا ہے۔ سندھ پار کے پٹھان، نیازی کی جزوی استثنیٰ کے ساتھ، نرم اور مغربی لہجے کی پشتو بولتے ہیں۔ نیازی ہندکو بولتے ہیں خصوصاً دریائے سندھ کے شمال میں۔

مرسلہ: آغا ناصر، کوئٹہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

سے تو بہتر ہے کہ تم شادی میں ہی نہ جاؤ۔ کوئی بہانہ بنا دینا۔''

''کل کو آپ کہیں گے کھانا مت کھاؤ، کپڑے مت پہنو، بچے کو دودھ مت پلاؤ۔ ہم کس کس چیز کو چھوڑیں گے۔ اس سے تو بہتر ہے کہ آپ میرا گلا گھونٹ دیں۔ روز روز زہر کا گھونٹ پینے سے بہتر ہے کہ ایک ہی دفعہ موت آجائے۔''

''تم پاگل تو نہیں ہوگئیں۔ کیسی باتیں کررہی ہو؟''

''ابھی تو نہیں ہوئی لیکن بہت جلد ہو جاؤں گی۔''

میں نے ہذیانی انداز میں کہا۔ ''آپ نے مجھے تین سال میں تسلی اور دلاسوں کے سوا دیا ہی کیا ہے۔ میری زندگی تو برباد ہوگئی۔ کم از کم اپنے معصوم بیٹے کا ہی خیال کرلیں۔ کیا وہ بھی میری طرح ہمیشہ محرومیوں کی آگ میں جلتا رہے گا۔''

وہ اپنی عادت کے مطابق خاموشی سے میری جلی کٹی باتیں سنتے رہے۔ اس کے بعد اٹھ کر باہر چلے گئے۔ ایک گھنٹے بعد ان کی واپسی ہوئی۔ انہوں نے خود ہی کھانا کھایا اور مجھ سے کوئی بات کیے بغیر بستر پر جا کر لیٹ گئے۔ میں برتن دھونے اور کچن کی صفائی کرنے کے بعد کمرے میں آئی تو وہ سو چکے تھے۔ تب مجھے احساس ہوا کہ وہ ناراض ہو گئے ہیں۔ اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ میں کچھ بھی کہتی۔ وہ خاموشی سے سنتے رہتے اور تھوڑی دیر بعد نارمل ہو کر مجھ سے باتیں کرلیتے۔ واقعی مجھ سے غلطی ہوئی۔ مجھے ان سے اس لہجے میں بات نہیں کرنا چاہیے تھی۔ جب مجھے علم تھا کہ وہ میری فرمائش پوری نہیں کر سکتے تو اس پر اصرار نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں نے سوچا کہ صبح اٹھ کر ان سے اپنے رویے کی معافی مانگ لوں گی۔

اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ صبح اٹھ کر دیکھا تو ان کا بستر خالی تھا۔ میں سمجھی کہ شاید باتھ روم میں ہوں گے۔ تبھی میری نظر تکیے کے نیچے سے جھانکتے ہوئے کاغذ پر گئی۔ میں نے لپک کر اسے اٹھایا۔ اس میں لکھا تھا۔

پیاری نجمہ!

بہت شرمندہ ہوں کہ تمام تر کوشش کے باوجود تمہاری ضرورتیں اور خواہشیں پوری نہ کر سکا۔ اب مجھ میں تمہارا سامنا کرنے کی تاب نہیں۔ اس لیے گھر چھوڑ کر جارہا ہوں۔ اب ہی وقت واپس آؤں گا جب تمہیں ایک اچھی زندگی دینے کے قابل ہو جاؤں۔ اپنے بھائی کے گھر چلی جاؤ۔ تم سے جلد رابطہ کرنے کی کوشش کروں گا۔

تمہارا نعیم

یہ خط پڑھ کر میں سناٹے میں آگئی۔ میں نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ وہ مجھے اس طرح چھوڑ کر جا سکتے ہیں۔ تب مجھے احساس ہوا کہ عورت کو ہمیشہ اپنی حدود میں رہ کر بات کرنا چاہیے۔ مرد کو غصہ آجائے تو وہ اشتعال میں آکر کچھ بھی کر سکتا ہے۔ یہ بھی غنیمت ہوا کہ انہوں نے مجھے طلاق نہیں دی اور گھر سے جانے پر ہی اکتفا کیا۔ کم از کم یہ اُمید تو تھی کہ وہ جلد یا بدیر واپس آجائیں گے۔ میں نے چند روز ان کا انتظار کیا اور بھائی کے گھر چلی آئی۔

جب میں نے بھائی کو سارا قصہ سنایا تو وہ بھی الٹا مجھ پر ہی ناراض ہوئے۔ انہوں نے مجھے بے بھاؤ کی سنائیں اور بولے کہ میں نے نعیم احمد جیسے شریف النفس انسان کی قدر نہیں کی۔ بھابی ان سے دو ہاتھ آگے تھیں۔ ان کی زبان قینچی کی طرح چلنے لگی۔ ان کی تقریر کا لب لباب یہ تھا کہ ہمارا اپنا گزارہ مشکل سے ہوتا ہے، تمہارا خرچا کیسے اٹھائیں گے۔

بھائی نے اپنے طور پر نعیم احمد کو تلاش کرنے کی بہت کوشش کی لیکن کامیابی نہیں ہوئی۔ پہلے وہ ان کے دفتر گئے۔ وہاں سے معلوم ہوا کہ نعیم نے چھٹی لے لی ہے۔ لاہور میں ان کے بھائی سے رابطہ کیا لیکن وہ وہاں بھی نہیں پہنچے تھے۔ جب نعیم احمد کی فوری واپسی کی اُمید دم توڑ گئی تو میں نے کرایہ کا مکان خالی کردیا اور اپنے مختصر سامان کے ساتھ بھائی کے گھر مستقل ٹھکانا بنالیا۔

اب میری زندگی کا بدترین دور شروع ہوا۔ بھابی نے چند ہی روز میں میری زندگی اجیرن بنادی۔ انہوں نے گھر کا سارا کام میرے اوپر ڈال دیا اور یوں میں مالکن سے نوکرانی بن گئی۔ صبح سے لے کر رات گئے تک میں کاموں میں لگی رہتی اور مجھے اتنی فرصت بھی نہیں ملتی کہ اپنے بیٹے کے کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے کا خیال رکھ سکوں۔ اپنے گھر میں تھی تو میرے پرس میں تھوڑے بہت پیسے ہمیشہ ہوتے تھے لیکن اب میں بالکل قلاش ہو چکی تھی۔ میرے پاس اپنے بچے کے لیے دودھ کے پیسے بھی نہیں ہوتے تھے۔ گھر کے لیے جو دودھ آتا تھا اگر اس میں سے ایک پیالی منصور کو دے دیتی تو بھابی آسمان سر پر اٹھا لیتی تھیں۔ بھائی کو تو اتنی توفیق نہیں ہوتی کہ کبھی میرے ہاتھ پر سو روپے ہی رکھ دیتے۔ ان کا یہ احسان کیا کم تھا کہ انہوں نے ہمیں اپنے گھر میں رکھا ہوا تھا اور دو وقت کی روٹی کھلا رہے تھے۔

بھابی کی زیادتیاں بڑھتی جارہی تھیں اور ان کی دلی

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

خواہش تھی کہ کسی طرح میں ان کے گھر سے چلی جاؤں۔ بھائی کی آنکھوں پر بھی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ انہیں اپنی بیوی کی کوئی زیادتی نظر نہیں آرہی تھی۔ ان کی شہ پا کر بھابی نے منصور کو بھی ڈانٹنا ڈپٹنا شروع کردیا۔ وہ دو سال کا معصوم بچہ تھا۔ اسے کسی بات کی سمجھ نہیں تھی۔ ایک دن میں کھانا پکا رہی تھی کہ اچانک ہی منصور سوتے سے اٹھ گیا اور اس نے رونا شروع کردیا۔ وہ صرف اس وقت روتا تھا جب اسے بھوک لگ رہی ہوتی۔ ہنڈیا چولہے پر رکھی ہوئی تھی۔ اس لیے فوری طور پر میں کچن سے باہر نہ آسکی۔ مجھ سے پہلے بھابی کمرے سے نکل آئیں اور انہوں نے منصور کے گال پر دو تھپڑ رسید کردیے۔

یہ دیکھ کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں نے بھابی کو آڑے ہاتھوں لیا اور بولی۔ ''آپ کو شرم نہیں آتی اس معصوم بچے پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے۔''

انہیں اس ردعمل کی توقع نہیں تھی۔ وہ چلاتے ہوئے بولیں۔ ''شرم تو تمہیں آنی چاہیے۔ میرے گھر میں رہ کر مجھ پر ہی آنکھیں نکال رہی ہو۔''

''یہ میرے بھائی کا گھر ہے اور اس پر میرا بھی کچھ حق ہے۔'' میں نے تڑ کی بہ تڑ کی جواب دیا۔

''ہونہہ، بڑی آئی حق جتانے والی۔'' بھابی نے ہاتھ نچاتے ہوئے کہا۔ ''جو اپنے شوہر کی نہ ہوسکی۔ وہ کسی اور کی کیا ہوگی۔''

''دیکھیں بھابی میرے شوہر کو بیچ میں مت لائیں۔ یہ ہمارا آپس کا معاملہ ہے۔ وہ ہمیشہ کے لیے مجھے چھوڑ کر نہیں گئے۔ اللہ نے چاہا تو جلد ہی واپس آجائیں گے۔''

''ہونہہ! اسے آنا ہوتا تو جاتا ہی کیوں؟'' وہ طنزیہ انداز میں بولی۔ ''تم جیسی عورتیں ہی شوہروں کو گھر چھوڑنے پر مجبور کردیتی ہیں۔ ضرور اس نے کچھ دیکھا ہوگا جسے اس کی غیرت برداشت نہ کرسکی ورنہ اتنی سی بات پر کوئی گھر چھوڑ کر نہیں جاتا۔''

یہ سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ انہوں نے واضح طور پر میرے کردار پر حملہ کیا تھا جسے میں کسی قیمت پر برداشت نہیں کرسکتی تھی۔ اگر کچھ بولتی تو بات بڑھ سکتی تھی۔ اس لیے منصور کو لے کر اپنے کمرے میں آگئی اور دروازہ بند کر کے رونے لگی۔ جب دل کا غبار ہلکا ہوگیا تو میں نے اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنا شروع کردیا۔ اب اس گھر میں ایک منٹ رہنا بھی میرے لیے دشوار تھا۔ آج بھابی نے میرے کردار پر حملہ کیا تھا۔ کل وہ مجھ پر چوری یا اسی نوعیت کا کوئی الزام لگا سکتی تھیں۔ میں نے اسی وقت بھائی کا گھر چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا۔

دوسرے دن میں منصور کو لے کر صرافہ بازار گئی۔ میرے پاس جہیز اور بری میں ملنے والا کچھ زیور تھا۔ میں نے وہ زیور ایک سنار کو دکھایا اور اس نے مارکیٹ کے حساب سے جو قیمت لگائی وہ میرے اندازہ سے بہت زیادہ تھی۔ میں نے وہ پیسے بینک میں جمع کرادیے اور گھر آگئی۔ دو تین دن تک گھر میں خاموشی رہی۔ پھر میں ایک روز بس میں بیٹھ کر ایک مضافاتی بستی میں گئی جو ابھی آباد ہورہی تھی۔ کچھ مکان بن رہے تھے اور کچھ زیر تعمیر تھے۔ میں نے اسٹیٹ ایجنٹ کے توسط سے ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر لیا اور کسی کو بتائے بغیر وہاں شفٹ ہوگئی۔

میرا خیال تھا کہ بھائی مجھے ڈھونڈنے کی کوشش کریں گے لیکن انہوں نے مکمل خاموشی اختیار کرلی۔ شاید وہ اسی دن کا انتظار کررہے تھے۔ البتہ جب میرا مختصر سا سامان سوزوکی میں رکھا جارہا تھا تو بھابی کی پریشانی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ انہوں نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا۔ ''یہ سب کیا ہورہا ہے۔ تم کہاں جارہی ہو۔ میں تمہارے بھائی کو کیا جواب دوں گی؟''

''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ کو تو خوش ہونا چاہیے کہ ایک کانٹا نکل گیا۔ بھائی اگر پوچھیں تو بتا دیجیے کہ تمہاری بہن بدچلن تھی۔ اپنے کسی آشنا کے پاس چلی گئی۔''

''ارے تم ابھی تک اس بات کو دل میں لیے بیٹھی ہو۔ وہ تو یونہی میرے منہ سے نکل گئی تھی۔''

''آپ جانتی ہیں نا کہ کمان سے نکلا ہوا تیر اور زبان سے نکلا ہوا لفظ واپس نہیں آتا اور ویسے بھی آدمی وہی کچھ کہتا ہے جو اس کے دل میں ہوتا ہے۔ میں کیسے مان لوں کہ اتنی بڑی بات آپ نے یونہی کہہ دی ہوگی۔''

''اچھا اب غصہ تھوک دو اور آرام سے اس گھر میں رہو۔ دنیا کیا کہے گی کہ چار دن بھی بہن کو نہ رکھ سکے۔''

میں جانتی تھی کہ انہیں دنیا سے زیادہ اپنے آرام کی فکر تھی۔ ایک مفت کی نوکرانی جو ہاتھ سے نکلی جارہی تھی۔ میں نے خشک لہجے میں کہا۔ ''میں کسی پر بوجھ نہیں بننا چاہتی۔ میرا یہاں سے جانا ہی بہتر ہے۔ اسی میں ہم سب کی بھلائی ہے۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

"لیکن جاؤ گی کہاں؟" وہ بے چین ہوتے ہوئے بولیں۔ "اپنا اتا پتا تو بتا دو۔ تمہارے بھائی پوچھیں گے تو کیا جواب دوں گی؟"

"فی الحال میں نے ایک عارضی انتظام کیا ہے جب مستقل ٹھکانا ہوگا تو پتا بھی بتا دوں گی۔"

اس کے بعد میں نے بھابی کو کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا۔ سامان سوزوکی میں رکھا جا چکا تھا۔ میں نے منصور کو گود میں اٹھایا۔ ایک ٹیکسی روکی اور سوزوکی والے کو اس کے پیچھے آنے کا کہہ کر اپنی نئی منزل کی جانب روانہ ہوگئی۔ دیکھا جائے تو میں نے ایک بہت بڑا اور جرأت مندانہ قدم اٹھایا تھا۔ ایک دو سالہ بچے کے ساتھ اجنبی ماحول میں رہنا انتہائی خطرناک تھا لیکن میں نے ممکنہ خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے حکمت عملی تیار کرلی تھی۔

دوسرے روز میں نے ایک پینٹر سے چھوٹا سا بورڈ بنوایا جس پر لکھا تھا۔ "دینی درسگاہ و سلائی مرکز" بازار سے سودا سلف لانے کے لیے ایک دس بارہ سال کے لڑکے کو جز وقتی ملازم رکھ لیا۔ وہ جب بھی سودا لے کر آتا۔ میں اس کے ہاتھ پر کچھ روپے رکھ دیتی۔ پہلے پردہ نہیں کرتی تھی لیکن اب میں نے عبایا اور حجاب لینا شروع کر دیا تھا۔ میں بہت کم گھر سے باہر نکلتی تھی۔ دو تین دن بعد ہی محلے کی بچیوں نے میرے پاس آنا شروع کر دیا اور میں انہیں بلا معاوضہ قرآن ناظرہ پڑھانے لگی۔ محلے کی عورتوں کو میں نے یہی بتایا کہ میرے شوہر بسلسلہ ملازمت ملک سے باہر گئے ہوئے ہیں۔

مجھے بھائی اور بھاوج سے زیادہ غصہ نعیم احمد پر تھا جو ایک معمولی سی بات پر مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ انہوں نے اتنا بڑا قدم اٹھانے سے پہلے یہ بھی نہیں سوچا کہ ان کے بغیر میں اور بچہ کس طرح زندگی گزاریں گے۔ میرے بھائی کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید اس کا رویہ بھی مختلف نہ ہوتا۔ آخر کوئی کب تک کسی کو اپنے گھر میں رکھ سکتا اور اس کی ضرورتیں پوری کر سکتا ہے۔ یہ ذمے داری شوہر کی ہے اور اس کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔ میں جتنا اس بارے میں سوچتی۔ اتنی ہی میرے دل میں نعیم احمد کے لیے نفرت بڑھتی جاتی۔ رفتہ رفتہ میں انہیں اپنا مجرم سمجھنے لگی اور میں نے تہیہ کرلیا کہ اب کبھی ان کی شکل نہیں دیکھوں گی۔ اسی لیے میں نے بھائی سے بھی رابطہ نہیں کیا کیونکہ اگر انہیں میرا پتا معلوم ہو جاتا تو وہ نعیم احمد کو میرے گھر کا راستہ دکھا سکتے تھے۔

میں نے ایک بار پھر اپنی سلائی کی مشین نکالی اور محلے والوں کے کپڑے سینے لگی۔ اس بار مجھے کامیابی ہوئی۔ یہ غریبوں کا محلہ تھا اور ان کی اکثریت درزی کی سلائی افورڈ نہیں کرسکتی تھی جب کہ میں درزی کے مقابلے میں نصف اُجرت لے رہی تھی۔ اس لیے میرا کام چل نکلا اور دو تین مہینے میں ہی مجھے اتنی آمدنی ہونے لگی کہ آرام سے گھر کا خرچ اور مکان کا کرایہ نکالنے لگی۔ اس علاقے میں اچھے اور بڑے مکان بھی بن رہے تھے۔ جن میں کھاتے پیتے لوگ آباد ہونا شروع ہو گئے تھے۔ اس کی وجہ سے جائیداد کی قیمتیں اور کرائے بھی بڑھنے لگے۔ میں نے کئی بار سوچا کہ کیوں نہ ذاتی مکان خرید لیا جائے۔ اس طرح ہر ماہ کرایہ دینے سے بچ جاؤں گی۔ لیکن یہ ایک ناممکن سی بات تھی۔

میں جس مکان میں رہتی تھی اس کے برابر ایک خالی پلاٹ تھا پتا لگا تھا کہ وہ پلاٹ کسی بیوہ کا ہے لیکن کس بیوہ کا ہے نہ تھا۔ ایک دن جب میں بچوں میں گھری بیٹھی تھی تو ایک بڑی بی آگئیں۔ میں یہی سمجھی کہ وہ کسی بچے کی نانی یا دادی ہیں۔ انہوں نے پہلے تو میرے گھر کا تفصیلی معائنہ کیا پھر بولیں۔ "بیٹا، یہ برابر والا پلاٹ میرا ہے۔ میرے شوہر نے خریدا تھا۔ اب وہ بھی نہیں رہے۔ میرے تین بیٹے ہیں اور وہ تینوں کینیڈا میں ہیں۔ ایک بیٹی گلشن میں تھی۔ اسی کا سہارا تھا اب وہ بھی شوہر کے ساتھ بھائیوں کے کہنے پر کینیڈا منتقل ہو گئی ہے۔ بچوں کی کوشش ہے کہ میں بھی ان کے پاس رہوں۔ مجبوری میں مجھے جانا پڑ رہا ہے۔ یہاں میرے شوہر کی قبر ہے اسے چھوڑ کر جانا پڑ رہا ہے اس لیے میں نے سوچا ہے کہ وہ پلاٹ تم جیسی دیندار کو دے جاؤں۔ اس پلاٹ کی قیمت یہ ہوگی کہ تم ہر جمعرات کو نجی حسن کسی کو بھیج کر قبر پر چراغ جلوا دینا۔"

یہ نعمت غیر متردقہ تھی۔ میں تو سکتے میں رہ گئی۔

اگلے دن وہ اپنے داماد کے ساتھ آئیں اور تمام قانونی کارروائی مکمل کرا کر وہ پلاٹ میرے نام کر گئیں۔ زیورات بیچ کر جو رقم ہاتھ آئی تھی اسے بینک سے نکلوایا کچھ پیسے اِدھر اُدھر سے جمع کیے اور ایک کمرا تعمیر کر کے اس میں منتقل ہوگئی۔

اب میں ذاتی مکان کی مالک بن گئی تھی اور سلائی کی آمدنی سے گزارہ کرنے لگی۔ سیپارہ پڑھنے والی بچیوں کی تعداد بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کی وجہ سے محلے والے میری عزت کرنے لگے اور میں استانی جی کے نام سے مشہور ہو گئی۔ میں گھر سے باپردہ ہو کر باہر نکلتی۔ اسی لیے محلے کے کسی

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

مرد نے میری شکل نہیں دیکھی تھی اور وہ میرا بہت احترام کرتے تھے۔

نعیم احمد کو گئے ہوئے ایک سال سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا تھا لیکن انہوں نے پلٹ کر خبر نہ لی۔ اگر وہ آئے بھی ہوں گے تو مجھ تک کس طرح پہنچتے۔ بھائی کو خود میرا پتا معلوم نہیں تھا۔ جب کبھی نعیم کی یاد ستانے لگتی تو میں سوچتی کہ ایک دفعہ بھائی سے مل کر انہیں اپنا پتا بتا دوں تاکہ وہ نعیم احمد کو میرے ٹھکانے کے بارے میں بتا سکیں لیکن اسی لمحے ایک اور سوچ مجھ پر غالب آجاتی کہ وہ میرے مجرم ہیں۔ میں انہیں معاف نہیں کر سکتی اور نہ ہی کبھی ان کی شکل دیکھوں گی۔

اسی کشمکش میں دن گزرتے گئے اور منصور پانچ سال کا ہو گیا۔ میں نے اسے قریبی اسکول میں داخل کروا دیا۔ وہ جب بھی مجھ سے باپ کے بارے میں پوچھتا تو میں یہ کہہ کر اسے بہلا دیتی کہ تمہارے ابو بہت دور گئے ہوئے ہیں۔ جب انہیں چھٹی ملے گی تو وہ آجائیں گے۔ معصوم بچے کو تو بہلانا آسان تھا لیکن محلے والوں کو مطمئن کرنا بہت مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ میرے بارے میں چہ میگوئیاں شروع ہوتیں میں نے خود ہی انہیں اصل حقیقت بتا دی۔

ہوا یوں کہ ایک دن محلے کی عورت اپنے کپڑے سلوانے آئی تو اس نے ڈرتے ڈرتے یہ موضوع چھیڑ دیا اور بولی۔ ''بہن برا نہ مناؤ تو ایک بات پوچھوں؟''

میرے کان کھڑے ہو گئے اور سوچنے لگی کہ ایسی کیا بات ہو سکتی ہے جس کے لیے یہ تمہید باندھی جا رہی ہے۔ میں نے سنبھلتے ہوئے کہا۔ ''ضرور پوچھیں۔ مجھے کوئی بات بری نہیں لگتی۔''

''تمہیں اس محلے میں آئے ہوئے تین سال ہو گئے ہیں لیکن اس دوران تمہارے شوہر ایک بار بھی تم سے ملنے نہیں آئے جب کہ باہر کام کرنے والے بھی سال میں ایک مرتبہ چھٹی پر آتے ہیں۔ کیا کوئی ناراضی ہے؟''

''یونہی سمجھ لیں۔ وہ ایک معمولی سی بات پر مجھ سے ناراض ہو کر چلے گئے اور پھر کوئی رابطہ نہیں کیا جب ان کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا تو خود ہی آجائیں گے اور اگر نہ بھی آئیں تو مجھے کوئی پروا نہیں۔ میں نے اپنی دنیا الگ بسا لی ہے اور اب میری ساری امیدیں اپنے بیٹے سے وابستہ ہیں۔ دعا کریں کہ اس کی تعلیم و تربیت کا حق پوری طرح ادا کر سکوں۔''

وہ خاتون تاسف سے اپنا سر ہلاتی رہیں لیکن انہوں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ میرا خیال تھا کہ بہت جلد پورے محلے کو یہ بات معلوم ہو جائے گی اور لوگ طرح طرح کی باتیں بنائیں گے لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ پہلے وہ صرف عزت کیا کرتے تھے۔ اب ہمدردی بھی کرنے لگے۔ میں بچیوں کو پڑھانے کا معاوضہ نہیں لیتی تھی۔ اس کے عوض وہ میرے چھوٹے موٹے کام کر دیا کرتی تھیں۔ اگر ان کے گھر میں کوئی اچھی چیز پکتی تو میرے لیے ضرور لاتیں۔ عید بقر عید پر مجھے اور منصور کو ڈھیروں تحائف ملتے۔ غرض میری زندگی میں سکون ہی سکون تھا۔ اب مجھے نعیم احمد بہت کم یاد آتے تھے۔ میں نے ان کا نام اپنے ذہن کی سلیٹ سے حرف غلط کی طرح مٹا دیا تھا۔

میں نے پوری توجہ اپنے بیٹے منصور پر مرکوز کر دی۔ میری تمام امیدیں اسی سے وابستہ تھیں۔ میں نے اس کی تعلیم و تربیت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ وہ بچپن سے ہی بلا کا ذہین واقع ہوا تھا۔ ہمیشہ ہر کلاس میں اس کی پہلی پوزیشن آتی۔ اس کے ساتھ ساتھ میں نے اس کی دینی تعلیم کا بھی بندوبست کیا۔ وہ باقاعدگی سے مسجد میں سپارہ پڑھنے جاتا۔ میں نے سات سال کی عمر میں ہی اسے نماز پڑھنے کا عادی بنا دیا اور جب دس سال کا ہوا تو اسے باجماعت نماز کی ادائیگی کے لیے مسجد بھیجنے لگی۔ میں نے اس کی نقل و حرکت پر کڑی نظر رکھی تاکہ وہ برے لڑکوں کی صحبت سے دور رہے۔ وہ اسکول سے سیدھا گھر آتا اور شام کو ایک گھنٹے کے لیے کھیلنے جاتا۔ میں نے اس کے ہوم ورک کرنے اور پڑھائی کے اوقات بھی مقرر کر رکھے تھے اور اس پر سختی سے عمل ہوتا تھا۔ اس طرح میں نے اسے بچپن سے ہی نظم و ضبط کا پابند بنا دیا تھا۔

اس تمام کوشش اور محنت کا نتیجہ یہ نکلا کہ منصور نے میٹرک اے ون گریڈ سے پاس کیا اور اسے شہر کے ایک بڑے کالج میں داخلہ مل گیا۔ اب وہ بچہ نہیں بلکہ سولہ سال کا نوعمر لڑکا تھا۔ اب تک میں اس سے یہی کہتی آئی تھی کہ تمہارے ابو ملک سے باہر ہیں لیکن اب میرے لیے اس جھوٹ پر قائم رہنا مشکل ہو گیا تھا اور میں سوچ رہی تھی کہ کوئی مناسب موقع دیکھ کر اسے حقیقت بتا دوں۔ جب اس کا رزلٹ آیا تب بھی اس نے مجھ سے یہی سوال کیا اور تلخ لہجے میں بولا۔ ''اب آپ کو بتانا ہوگا کہ حقیقت کیا ہے۔ میں نے جب ابو کے بارے میں پوچھا تو آپ نے یہی کہا کہ وہ ملک سے باہر ہیں۔ آخر کیا وجہ ہے کہ وہ اتنے طویل عرصے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

میں ایک مرتبہ بھی گھر نہیں آئے۔ انہوں نے نہ تو کبھی پیسے بھیجے اور نہ ہی ان کا کوئی خط آیا۔ کیا آپ کی ان سے علیحدگی ہوگئی ہے یا کوئی اور مسئلہ ہے جو بات بھی ہے مجھے بتا دیں۔ میں سب کچھ سننے کے لیے تیار ہوں۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ بچپن سے لے کر اب تک میں تمہیں بہلانے کے لیے جھوٹ بولتی رہی کہ تمہارے ابو ملک سے باہر ہیں جب کہ مجھے خود بھی معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہیں۔ جب سے وہ ہمیں چھوڑ کر گئے ہیں ان سے میرا کوئی رابطہ نہیں ہوا۔ یہ جھوٹ میں نے اس لیے بولا کہ تمہارا ننھا سا ذہن اس تلخ حقیقت کو برداشت نہیں کرتا۔ اب تم بڑے ہو گئے ہو اور معاملات کو سمجھ سکتے ہو۔ اس لیے تمہیں سچ بتانے میں کوئی حرج نہیں۔''

''لیکن مما وہ ہمیں چھوڑ کر کیوں چلے گئے تھے؟''

''وہی بتا رہی ہوں۔'' یہ کہہ کر میں نے منصور کو الف سے لے کر یے تک پوری کہانی سنا دی۔ اس سے کچھ نہیں چھپایا اور سب سچ سچ بتا دیا۔ وہ سر جھکائے سنتا رہا۔ جب میں نے اپنی بات ختم کی تو اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور آہستہ سے بولا۔

''آپ کو ماموں سے رابطہ ختم نہیں کرنا چاہیے تھا۔ کیا پتا ابو وہاں آئے ہوں اگر ماموں کے پاس آپ کا پتا ہوتا تو وہ ہم تک پہنچ سکتے تھے۔''

''لیکن میں ایسا نہیں چاہتی تھی۔ اسی لیے بھائی کو اپنے ٹھکانے سے لاعلم رکھا تمہارے ابو نے ایک معمولی سی بات کی اتنی بڑی سزا دی کہ گھر چھوڑ کر چلے گئے۔ انہوں نے یہ بھی نہیں سوچا کہ ان کے جانے کے بعد ہم کس کے سہارے جئیں گے۔ بھائی کا گھر میرے لیے جہنم سے کم نہیں تھا۔ میں صبح سے رات تک نوکرانی کی طرح کام کرتی اور مجھے اتنا حق بھی نہیں تھا کہ تمہیں ایک پیالی دودھ بھی دے سکوں۔ جب تم بھوک سے بلک بلک کر روتے تو میرا کلیجہ کٹ کر رہ جاتا۔ اس لمحے مجھے تمہارے ابو سے شدید نفرت ہونے لگتی اور میں نے تہیہ کرلیا کہ اب زندگی بھر ان کی شکل نہیں دیکھوں گی۔ اب بھی اگر کسی موڑ پر ان سے سامنا ہوگیا تو اپنا راستہ بدل دوں گی لیکن انہیں اپنی زندگی میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دے سکتی۔''

منصور خاموشی سے سب کچھ سنتا رہا۔ اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا لیکن میں اس کی آنکھوں میں لکھی تحریر پڑھ سکتی تھی۔ جیسے کہہ رہا ہو۔ ''مما آپ نے مجھے کس جرم کی سزا دی۔ مجھے باپ کی شفقت سے کیوں محروم کیا؟''

اس دن کے بعد میں نے منصور کے رویے میں نمایاں تبدیلی محسوس کی۔ پہلے وہ فرصت کا بیشتر وقت میرے ساتھ گزارتا، گھر کے سارے کام کیا کرتا اور میرے پاس بیٹھ کر گھنٹوں باتیں کرتا لیکن اب اس نے کتابوں سے دل لگا لیا تھا۔ کالج سے آنے کے بعد وہ پڑھنے بیٹھ جاتا اور رات گئے تک پڑھتا رہتا۔ پھر اس نے مجھے بتائے بغیر دو ٹیوشنز کرلیں۔ جب میں نے اس سے پوچھا تو وہ بولا۔ ''مما آپ سارا دن مشین چلاتی ہیں تب کہیں جا کر گھر کا خرچ پورا ہوتا ہے۔ میں آپ پر مزید بوجھ ڈالنا نہیں چاہتا۔ اس لیے فیصلہ کیا ہے کہ اپنے تعلیمی اخراجات خود برداشت کروں گا۔''

''لیکن اس طرح تمہاری تعلیم کا حرج ہوگا۔''

''اس کی آپ فکر نہ کریں۔ جو بھی نقصان ہوگا۔ اسے میں کور کرلوں گا۔''

وقت کا پہیا دھیرے دھیرے آگے بڑھتا رہا۔ منصور نے انٹر سائنس میں اچھے نمبر حاصل کیے۔ میں چاہتی تھی کہ وہ ڈاکٹر بنے لیکن اس نے ایم بی اے کو ترجیح دی اور بی بی اے کرنے کے بعد ایم بی اے بھی کرلیا۔ اس دوران اس نے مجھ سے تعلیمی اخراجات کے لیے ایک پیسا بھی نہیں لیا اور خود ہی ٹیوشن یا پارٹ ٹائم ملازمت کرکے اپنے اخراجات پورے کرتا رہا۔

ایم بی اے کرنے کے بعد اسے ایک اچھی کمپنی میں ملازمت مل گئی اگرچہ تنخواہ زیادہ نہیں تھی لیکن اسے اُمید تھی کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی ترقی بھی ہوتی جائے گی۔ اس کا اصرار تھا کہ میں سلائی کا کام چھوڑ کر آرام کروں۔ اسے سیپارہ پڑھنے کے لیے آنے والی بچیوں پر بھی اعتراض ہونے لگا۔ اس کا کہنا تھا کہ ان بچیوں کی وجہ سے گھر میں جمگھٹا لگا رہتا ہے جس سے ہماری پرائیویسی متاثر ہوتی ہے۔ مجھے اس کی بات سن کر ہنسی آگئی۔ یہ لڑکیاں برسوں سے میرے پاس سیپارہ پڑھنے آرہی تھیں۔ پہلے تو کبھی منصور نے ایسی بات نہیں کہی تھی۔ اب اسے یکا یک پرائیویسی متاثر ہونے کا خیال کیسے آگیا۔ بہرحال میں نے اس کی دونوں باتیں رد کردیں اور صاف کہہ دیا کہ میں سلائی کا کام چھوڑ سکتی ہوں اور نہ ہی بچیوں کو آنے سے منع کرسکتی ہوں۔ یہ لوگ میرے دکھ سکھ کے ساتھی ہیں اور میں انہیں اپنا خاندان سمجھتی ہوں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

چند ماہ بعد منصور نے موٹر سائیکل خرید لی۔ میں اس کے خلاف تھی کیونکہ آئے دن موٹر سائیکل کے ذریعے ہونے والے حادثات کی خبریں کانوں میں پڑتی رہتی تھیں۔ میں نے منصور سے کہا کہ وہ موٹر سائیکل کی بجائے کوئی سستی سی کار خریدے لیکن اس نے کہا کہ فی الحال اس کی اتنی گنجائش نہیں کہ وہ کار خریدنے کے بارے میں سوچ سکے۔ البتہ موٹر سائیکل اس کی رینج میں آتی ہے۔ ویسے بھی اسے دفتر آنے جانے کی بہت تکلیف ہے۔ اس لیے فوری طور پر موٹر سائیکل خریدنا بہت ضروری ہوگیا ہے۔

اسے موٹر سائیکل خریدے چند روز ہی ہوئے ہوں گے کہ سیپارہ پڑھنے کے لیے آنے والی ایک بچی نے مجھے بتایا کہ منصور بھائی مائرہ باجی کو اپنی بائیک پر چکر دے رہے تھے۔ وہ شاید شاپنگ کر کے آئی تھیں کیونکہ ان کے ہاتھ میں بڑے بڑے تھیلے تھے۔ وہ کچھ دیر دروازے پر کھڑی منصور بھائی سے باتیں کرتی رہیں پھر ہاتھ ہلاتی ہوئی گھر کے اندر چلی گئیں۔

یہ خبر سن کر میرا دل بیٹھنے لگا۔ مائرہ کی شہرت اچھی نہیں تھی گو کہ وہ ایک پڑھے لکھے معزز اور شریف خاندان سے تعلق رکھتی تھی لیکن اس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ لڑکوں سے دوستی کر کے ان سے پیسے اور تحائف بٹورتی ہے۔ اسے پہلے بھی محلے کے ایک دو لڑکوں کے ساتھ بائیک پر گھومتے ہوئے دیکھا گیا تھا لیکن یہ سلسلہ زیادہ دن نہیں چلا۔ شاید وہ لڑکے اس کی فرمائشیں پوری کرنے سے قاصر تھے۔ اسی لیے ان کی جلدی چھٹی ہوگئی اور اب اس نے منصور کو اپنے جال میں پھانس لیا تھا۔ یہ میرے لیے انتہائی وحشت ناک خبر تھی۔ منصور میری پوری زندگی کی کمائی تھا۔ میں اسے کسی دوسرے کے ہاتھوں برباد ہوتا کیسے دیکھ سکتی تھی۔ اسے اس لڑکی کے چنگل سے نکالنا میرا فرض تھا چنانچہ میں نے پہلی فرصت میں منصور سے بات کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

اس روز جب وہ گھر واپس آیا تو کھانا کھانے کے بعد حسبِ عادت اس نے چائے کی فرمائش کی جب وہ چائے پی کر اپنے کمرے میں جانے لگا تو میں نے اسے روک لیا اور بولی۔ ''یہاں بیٹھو میرے پاس، مجھے تم سے کچھ باتیں کرنا ہیں۔''

اس نے حیرانی سے مجھے دیکھا اور تخت کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''جی فرمائیے۔''

''کب سے چل رہا ہے یہ چکر؟'' میں نے کسی تمہید کے بغیر ہی سوال داغ دیا۔

وہ حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ''کیسا چکر؟''

''میں مائرہ کی بات کر رہی ہوں۔'' میں نے اپنا لہجہ سخت کرتے ہوئے کہا۔

''اوہ تو آپ کو معلوم ہو ہی گیا۔''

''دیکھو منصور۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔ ''کسی غیر لڑکی کے ساتھ اس طرح گھومنا پھرنا ٹھیک نہیں۔ محلے کے لوگ ہماری عزت کرتے ہیں اگر بات پھیل گئی تو ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔''

''مجھے کسی کی پروا نہیں۔'' وہ بے دھڑک انداز میں بولا۔ ''وہ لڑکی مجھے پسند ہے اور میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ میرے سامنے اس طرح سر اٹھا کر بات کرے گا۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو یقین دلایا کہ اب وہ جوان ہوگیا ہے اور اس نے اپنے فیصلے خود کرنا شروع کردیے ہیں، اگر میں مخالفت کرتی تو وہ ضد پر اتر آتا اور بات بگڑ جاتی لہٰذا میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی اور کہا۔ ''دیکھو بیٹا! وہ اچھی لڑکی نہیں ہے۔ لڑکوں سے دوستی کرنا اور ان سے تحفے بٹورنا اس کا مشغلہ ہے جب اس کا دل بھر جائے گا تو وہ تمہیں بھی چھوڑ دے گی۔''

''وہ ایسی لڑکی نہیں ہے۔ یہ باتیں ان لڑکوں نے پھیلائی ہیں جو اس کے آگے پیچھے پھرا کرتے تھے لیکن اس نے انہیں منہ نہیں لگایا۔ وہ کھاتے پیتے گھر کی لڑکی ہے۔ اسے تحفے بٹورنے کی کیا ضرورت ہے۔''

''اس وقت تم اس کی حمایت میں اس لیے بول رہے ہو کہ وہ تمہارے دل و دماغ پر سوار ہے۔ ورنہ محلے کی کسی اور لڑکی کے بارے میں تو ایسی کوئی بات نہیں سننے میں آئی۔''

''دراصل وہ تھوڑی سی شوخ اور آزاد خیال ہے۔ کسی سے ہنس کر بات کرلے تو وہ لڑکا غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ اس پر مرمٹی ہے۔''

''اس وقت تمہیں سمجھانا بے کار ہے۔'' میں نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔ ''کسی وقت ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچنا تو تم پر اس کی حقیقت واضح ہو جائے گی۔''

''مجھے کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں۔'' اس نے دو ٹوک الفاظ میں کہا۔ ''میں اس سے شادی کرنے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ اس سے پوچھ کر بتا دوں گا کہ آپ کو رشتہ مانگنے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کب جانا ہے۔''

میرا دماغ گھوم کر رہ گیا۔ گویا سب کچھ پہلے ہی طے ہو چکا تھا اور اب صرف رسمی کارروائی باقی رہ گئی ہے۔ میں نے منصور کے لیے کیا کچھ سوچ رکھا تھا لیکن مجھے اپنے سارے خواب بکھرتے نظر آئے لیکن میں اتنی آسانی سے ہار ماننے والی نہیں تھی۔ منصور کی تو آنکھوں پر پٹی بندھ گئی تھی لیکن اسے اس گڑھے میں گرنے سے بچانے کی ذمے داری مجھ پر عائد ہوتی تھی چنانچہ میں نے ایک اور حربہ استعمال کرتے ہوئے کہا۔

''ہماری اور ان کی حیثیت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ کیا اس کے گھر والے مان جائیں گے؟ کیا وہ خود اس دو کمرے کے مکان میں رہنے پر تیار ہو جائے گی؟''

''انہیں اس شادی پر کوئی اعتراض نہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ مجھ میں آگے بڑھنے کی صلاحیت ہے، مجھے کوئی دوسری ملازمت مل گئی تو ہم کسی اچھے گھر میں شفٹ ہو جائیں گے۔''

اس کے بعد کچھ کہنا سننا بے کار تھا۔ جوان اولاد اگر ضد پر آجائے تو اس کی بات ماننا ہی پڑتی ہے ورنہ وہ باغی ہو سکتی ہے اور میں اپنے اکلوتے بیٹے کو کسی قیمت پر کھونا نہیں چاہتی تھی۔ چنانچہ میں نے منصور کے آگے ہتھیار ڈال دیے اور بولی۔ ''ٹھیک ہے بیٹا، مجھے تمہاری خوشی عزیز ہے۔ جب کہو گے ان کے گھر رشتہ مانگنے چلی جاؤں گی۔''

ایک ہفتے بعد ہی منصور نے مجھے بتا دیا کہ آنے والی اتوار کو ہمیں وہاں جانا ہے۔ انہوں نے منصور کو بھی بلایا تھا۔ میں انگوٹھی اور مٹھائی بھی ساتھ لے گئی کہ اگر انہوں نے رشتہ قبول کر لیا تو لگے ہاتھوں رسم بھی ادا کر دوں گی کیونکہ میں منگنی وغیرہ کی قائل نہیں تھی۔ میری نہ تو گنجائش تھی اور نہ ہی کوئی قریبی عزیز یا رشتے دار جسے اس تقریب میں بلایا جاتا۔ لہٰذا میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر انہوں نے منگنی کے لیے کہا تو صاف انکار کر دوں گی۔

جیسا کہ میں نے پہلے بتایا کہ تمام باتیں پہلے ہی طے ہو چکی تھیں صرف رسمی کارروائی ہونا باقی تھی سو وہ بھی اس روز ہو گئی۔ مائرہ کے گھر والوں نے ہمارا گرم جوشی سے استقبال کیا۔ انہوں نے اپنے قریبی رشتے داروں کو بلا لیا تھا تاکہ وہ بھی منصور کو دیکھ لیں۔ میں نے حرف مدعا بیان کرتے ہوئے یہ بھی کہہ دیا کہ وہ کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے ہماری حیثیت اور پس منظر کو ذہن میں رکھیں اور اپنی تسلی کے لیے کوئی سوال کرنا چاہیں تو اس میں تکلف نہ کریں۔

مائرہ کے والد بولے۔ ''ہمارے لیے اس سے اچھی بات کیا ہو سکتی ہے کہ آپ اپنے ہونہار بیٹے کا رشتہ لے کر آئی ہیں۔ ہمیں آپ کی حیثیت اور پس منظر سے کوئی غرض نہیں بلکہ ہماری نظر میں منصور کا حال اور مستقبل ہے۔ ہم آپ کو برس ہا برس سے جانتے ہیں اور منصور بھی ہمارے سامنے ہی پلا بڑھا ہے۔ اس لیے میں اس رشتے سے پوری طرح مطمئن ہوں۔ ہماری طرف سے ہاں سمجھیں۔''

''تو پھر مجھے اجازت ہے۔'' میں نے پرس کھول کر انگوٹھی نکالتے ہوئے کہا۔

''ضرور ضرور۔'' مائرہ کی ماں بولیں اور انہوں نے بھی منصور کو پہنانے کے لیے اپنے پرس سے انگوٹھی نکال لی۔

''انگوٹھی پہنانے اور منہ میٹھا کروانے کے بعد انہوں نے سب مہمانوں کو بہت زبردست قسم کا ناشتا کروایا اور یہ طے پایا کہ شادی چھ ماہ بعد ہو گی۔ میں نے موقع غنیمت جان کر یہ بھی کہہ دیا کہ وہ اپنی بیٹی کو بھاری بھرکم جہیز نہ دیں کیونکہ ہمارے گھر میں رکھنے کے لیے بالکل بھی جگہ نہیں ہے۔''

''آپ کے پاس چھ مہینے کا وقت ہے۔ اس دوران کوئی بڑا مکان دیکھ لیں۔''

میں نے فوراً ہی اس خیال کو مسترد کرتے ہوئے کہا۔ ''منصور کی ملازمت کو ابھی چند ماہ ہی ہوئے ہیں۔ فی الحال وہ اس پوزیشن میں نہیں کہ کرائے کا مکان لے سکے۔ مائرہ کو کچھ عرصہ اسی گھر میں رہنا ہو گا۔ جب تک منصور کو کوئی دوسری ملازمت نہیں مل جاتی۔''

''ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی۔'' انہوں نے آہستہ سے کہا لیکن صاف لگ رہا تھا کہ انہیں میرا جواب پسند نہیں آیا۔

گھر آ کر منصور بھی مجھ سے الجھنے لگا کہ مجھے اس موقع پر جہیز اور مکان کا ذکر چھیڑنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ خود ہی مناسب موقع دیکھ کر مائرہ سے بات کر لیتا۔ یہ سن کر مجھے غصہ آ گیا۔ اب وہ اتنا بڑا ہو گیا تھا کہ مجھے بھی روک ٹوک کرنے لگا۔ میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ''انہیں حقیقت سے آگاہ کرنا میرا فرض تھا۔ اسی لیے ان کے کان میں یہ بات ڈال دی کہ کل کو کوئی بدمزگی نہ ہو۔ اگر تم اپنی ہونے والی ساس کے کہنے پر بڑا مکان لینا چاہتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ بشرطیکہ اس تنخواہ میں سے تم اس کا کرایہ ادا کر سکو۔ یہ بات ذہن میں رکھنا کہ چھ ماہ بعد تمہاری شادی ہے۔ اس کا

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

خرچا بھی تم ہی کو اٹھانا ہوگا۔''

یہ سن کر منصور کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس نے پھر اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی اور خاموشی سے باہر چلا گیا۔ میں جانتی تھی کہ اگر وہ اپنی پوری تنخواہ بھی بچائے تو چھ مہینے میں اتنے پیسے جمع نہیں کرسکتا کہ اس سے شادی کے اخراجات پورے ہوسکیں۔ میں نے اس سے کہہ دیا کہ وہ مجھے ہر مہینے تھوڑے تھوڑے پیسے دیتا رہے تاکہ میں اس کی بری بنانا شروع کردوں۔ زیور اور ولیمے کے بارے میں بعد میں سوچا جائے گا۔ میں جانتی تھی کہ اس کے لیے مجھے اپنی جمع پونجی میں سے کچھ نکالنا ہوگا۔

چھ ماہ بعد مائرہ دلہن بن کر ہمارے گھر آگئی۔ شروع کے چند ماہ تو سکون سے گزر گئے۔ پھر اس نے اپنا رنگ دکھانا شروع کیا۔ وہ بڑی منہ پھٹ لڑکی تھی۔ اس نے ایک ہفتے بعد ہی مجھ سے کہہ دیا کہ اسے گھر کا کام کرنے کی عادت نہیں ہے اور یہ بھی اچھا نہیں لگتا کہ اس کے ہوتے ہوئے میں سارے کام کروں۔ اس لیے وہ اوپر کے کاموں کے لیے ماسی رکھ رہی ہے۔

میرا جی چاہا کہہ دوں کہ صرف ماسی ہی کیوں۔ ایک کھانا پکانے والی بھی رکھ لو۔ آخر میں کب تک تم لوگوں کو پکا پکا کر کھلاتی رہوں گی لیکن میں نے نئی نویلی دلہن سے اس طرح کی بات کہنا مناسب نہ سمجھا۔ چند روز بعد ہی میری طبیعت خراب ہوگئی اور میں تین دن تک بستر سے نہ اٹھ سکی۔ چنانچہ کھانا بازار سے آیا منصور کو اس کی عادت نہیں تھی۔ اس نے خود ہی مائرہ سے کہہ دیا کہ اگر تم سے کام نہیں ہوتا تو کوئی کھانا پکانے والی رکھ لو۔ مجھ سے بازار کے کھانے نہیں کھائے جاتے۔

میں نے جس گھر میں پچیس سال تک بیک وقت مالکن اور نوکرانی کا کردار ادا کیا۔ اب وہاں ایک نہیں بلکہ دو ملازمائیں کام کررہی تھیں۔ اس کے باوجود منصور کو ناشتا دینے کی ذمے داری میری تھی کیونکہ مائرہ کو دیر سے اٹھنے کی عادت تھی۔ اس کی صبح گیارہ بجے ہوتی تھی۔ وہ ہلکا سا ناشتا کرتی۔ اس کے بعد وہ اخبار لے کر بیٹھ جاتی اور بقیہ دن لیٹ کر ٹی وی دیکھ کر گزار دیتی۔ ملازمائیں بھی اسی وقت ڈھنگ سے کام کرتی ہیں جب ان کی نگرانی کی جائے۔ مائرہ تو کمرے سے باہر ہی نہیں آتی تھی۔ اس لیے یہ فریضہ بھی مجھے ہی انجام دینا پڑتا۔ شام کو وہ منصور کو لے کر گھومنے نکل جاتی اور ان کی واپسی گیارہ بارہ سے پہلے نہیں ہوتی تھی۔ اس طرح میں بہو اور بیٹے کے ہوتے ہوئے بھی اکیلی تھی۔

شادی کے ایک ماہ بعد میں نے دیکھا کہ مائرہ خلاف معمول صبح سویرے اٹھ کر تیار ہورہی ہے۔ میں سمجھی کہ شاید وہ منصور کے ساتھ اپنے میکے یا بازار جارہی ہوگی۔ جب وہ اپنا پرس جھلاتی ہوئی ناشتا کرنے آئی تو میں نے پوچھ ہی لیا۔ ''بیٹی کہاں کی تیاری ہے؟''

وہ منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''جاب پر جارہی ہوں۔ ایک مہینے کی چھٹی لی تھی۔ وہ ختم ہوگئی۔''

''تم جاب کرتی ہو؟'' میں نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

''کیوں؟ اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے۔'' وہ تنک کر بولی۔ ''منصور نے نہیں بتایا اگر جاب نہیں کروں گی تو گزارہ کیسے ہوگا۔ مجھے یہ بالکل اچھا نہیں لگتا کہ چھوٹی موٹی ضرورتوں کے لیے شوہر کے آگے ہاتھ پھیلاؤں۔ عورت کو معاشی طور پر خود مختار ہونا چاہیے تاکہ وہ کسی کی محتاج

عزم بہزاد

اچھا مصرعہ کہنے کی جستجو دل میں لیے ایک شاعر تمام زندگی بھی گزار سکتا ہے اور ان کا خیال ہے کہ آج کے دور میں شعرا شق کو تخلیق کا درجہ دے دیتے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار عزم بہزاد نے ایک خصوصی نشست میں کیا۔

ان کا شعری مجموعہ 1997ء میں ''تعبیر سے پہلے'' شائع ہوا۔ اس کے علاوہ وہ ایک اشتہاری کمپنی میں بحیثیت ''کونسپٹ رائٹر'' وابستہ رہے۔ مختلف اشتہارات کے لیے بے شمار گیت اور لازوال معرعے تخلیق کر چکے ہیں، عزم بہزاد کے خیال میں شاعری کے علاوہ تمام اصناف میں اظہار، صرف کسبِ معاش کی سبیل ہے، اس کو ہم تخلیق نہیں کہہ سکتے تخلیق ہمارے اندر کو دریافت کرتی ہے جب کہ کمرشل ازم میں ہم ''ماسٹر'' کو دریافت کرتے ہیں۔ دل سے جنم لینے والی خواہش تخلیق کہلاتی ہے اور تقاضے کے تحت کچھ لکھا جائے تو وہ کمرشل ازم کہلاتا ہے۔ آپ کی ادبی محفلوں میں دکھائی نہ دینے کی وجہ وہی اچھا مصرعہ لکھنے کی جستجو ہے جو کسی محفل میں جانے نہیں دیتی۔

مرسلہ: رعنا فیصل، کراچی

WWW.PAKSOCIETY.COM

http://paksociety.com

پاک سوسائٹی پر مُوجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

Downloaded From Paksociety.com

نہ رہے۔''

اس کی بات سن کر مجھے پچیس سال پہلے کا وہ بھیانک منظر یاد آ گیا۔ جب میں نے شادی میں جانے کے لیے نعیم احمد سے نئے کپڑوں کی فرمائش کی تھی جسے وہ پورا نہ کر سکے۔ اسی بات پر ہمارا جھگڑا ہوا تھا۔ میں نے انہیں نہ جانے کیا کچھ کہہ دیا کہ وہ گھر چھوڑ کر چلے گئے اور میں اب تک تنہائی کی آگ میں جل رہی ہوں۔ کاش میں بھی پڑھ لکھ کر کوئی ملازمت کر لیتی تو مجھے نعیم احمد کے آگے ہاتھ نہ پھیلانا پڑتے اور میرا گھر برباد نہ ہوتا۔ مائرہ کی بات سو فی صد درست تھی۔ واقعی عورت کو معاشی طور پر خود مختار ہونا چاہیے۔

منصور اور مائرہ کام پر چلے جاتے اور میں سارا دن بور ہوتی رہتی۔ اس بوریت سے نمٹنے کے لیے میں نے ایک بار پھر سلائی مشین سنبھال لی گو کہ منصور کو اس پر شدید اعتراض تھا لیکن میں نے اس کی ایک نہ سنی اور صاف کہہ دیا کہ وہ میرے معاملے میں مداخلت نہ کرے۔ میں نے بچیوں کو بھی دوبارہ سیپارہ پڑھانا شروع کر دیا۔ اس طرح گھر میں رونق لگی رہتی اور میرا دل بھی بہل جاتا۔ شام پانچ بجے بچیاں چلی جاتیں اور میں بہو بیٹے کے استقبال کی تیاری میں لگ جاتی۔

اب مائرہ دبے لفظوں میں مکان بدلنے کی بات کرنے لگی۔ لیکن منصور ٹال رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ کوئی اچھی ملازمت مل جائے تب ہی وہ گھر بدلنے کے بارے میں سوچ سکتا ہے۔ میں مائرہ کے جذبات کو سمجھتی تھی۔ وہ بڑے گھر میں رہنے کی عادی تھی اور ہر لڑکی کی طرح اس کی بھی خواہش ہوگی کہ اس کا ایک بڑا سا گھر ہو جسے وہ اپنی مرضی کے مطابق سجائے۔

ایک دن منصور مٹھائی کا ڈبہ لیے گھر میں داخل ہوا۔ اس کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ وہ آتے ہی مجھ سے لپٹ گیا اور چہکتے ہوئے بولا۔ ''مما! مجھے بہت اچھی جاب ملی ہے، تنخواہ یہاں سے دوگنی اور اس کے علاوہ کئی مراعات ملیں گی۔ چھ ماہ کا آزمائشی پریڈ گزر جانے کے بعد اگر جاب کنفرم ہوگئی تو کمپنی کی طرف سے کار، بنگلا اور طبی سہولیات بھی ملیں گی۔''

میں نے اس کا ماتھا چوم لیا اور ڈھیروں دعائیں دیں۔ مائرہ کے تو قدم زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ اس نے ابھی سے نئے گھر کو سجانے کے خواب دیکھنا شروع کر دیے۔ البتہ مجھے اپنا گھر چھوڑنے کے خیال سے وحشت ہو رہی تھی۔ یہ گھر میرے لیے ایک محفوظ پناہ گاہ ثابت ہوا تھا۔ جہاں میں نے زندگی کے پچیس سال بڑے سکون و اطمینان سے گزار دیے۔ اب اسے چھوڑنے کا تصور ہی سوہان روح تھا لیکن اولاد کی خوشی اور آرام کی خاطر میں یہ قربانی دینے پر تیار ہوگئی۔

منصور کو نئی ملازمت پر جاتے ہوئے ایک مہینا ہوا ہوگا کہ ایک دن دروازے پر دستک ہوئی۔ اس وقت میں گھر پر اکیلی تھی۔ صفائی کرنے والی کام ختم کر کے جا چکی تھی اور کھانا پکانے والی ملازمہ نے اس روز چھٹی کی تھی۔ سیپارہ پڑھنے والی بچیاں بھی ابھی تک نہیں آئی تھیں۔ لہٰذا دستک کی آواز سن کر مجھے ہی دروازہ پر جانا پڑا۔ میں نے آدھا پٹ کھول کر پوچھا۔ ''کون ہے؟''

''منصور احمد کا گھر یہی ہے؟'' اس اجنبی نے پوچھا۔

''جی ہاں۔'' میں نے جواب دیا۔

''آپ ان کی والدہ ہیں؟''

''جی مگر آپ کون ہیں؟''

اس اجنبی نے ایک قدم آگے بڑھایا اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا۔ میری خوف کے مارے گھگی بندھ گئی۔ اس سے پہلے کہ میں شور مچا کر لوگوں کو اکٹھا کرتی۔ اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور بولا۔ ''ڈرو نہیں۔ نجمہ میں کوئی غیر نہیں۔ تمہارا شوہر نعیم احمد ہوں۔''

''نعیم احمد۔'' میں نے بے یقینی سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ کافی بدل گئے تھے۔ اس لیے میں پہلی نظر میں انہیں نہ پہچان سکی۔ سرخ و سفید چہرہ، صحت مند جسم، آنکھوں پر سنہرے فریم کا چشمہ۔ انہوں نے قیمتی سیاہ رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا اور دیکھنے میں ہی وہ کوئی امیر آدمی لگ رہے تھے۔

''اب کیا لینے آئے ہیں؟'' میں نے کرخت لہجے میں کہا۔ ''آپ کو یہاں کا پتا کیسے معلوم ہوا؟''

''ڈھونڈنے سے خدا بھی مل جاتا ہے۔ تم تو اس کی مخلوق ہو۔'' انہوں نے خوش مزاجی سے کہا۔

''بیٹھنے کے لیے نہیں کہو گی۔ بہت لمبی داستان ہے۔ اس طرح کھڑے کھڑے نہیں سنا سکتا۔''

''نہیں آپ الٹے قدموں واپس چلے جائیں۔ اب میرا آپ سے کوئی تعلق نہیں رہا اور نہ ہی مجھے آپ کی داستان سننے سے کوئی دلچسپی ہے۔''

''تمہارے کہہ دینے سے یہ تعلق ختم نہیں ہو سکتا۔'' وہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اطمینان سے چلتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گئے۔ ''تم اب بھی میری بیوی ہو اور مجھے تمہارے پاس آنے کا پورا حق ہے۔''

''یہ حق اس وقت کیوں یاد نہ آیا جب آپ مجھے اور دو سال کے معصوم بچے کو رات کی تاریکی میں چھوڑ کر چلے گئے اور اس کے بعد آپ نے پلٹ کر ہماری خبر نہ لی۔ اب پچیس سال بعد آپ کو یہ حق یاد آیا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں نے جذبات اور فوری اشتعال کے تحت گھر سے جانے کی غلطی کی لیکن اس سے بڑا جرم تم نے کیا اور بھائی کو اپنا پتا بتائے بغیر غائب ہو گئیں۔ پھر تم ہی بتاؤ کہ میں تم تک کس طرح پہنچتا۔ میری نیت ٹھیک تھی اور میں ایک مقصد کے تحت گھر چھوڑ کر گیا تھا۔ البتہ شدید غصے کی حالت میں میرا دماغ کام نہیں کر رہا تھا۔ اس لیے میں نے غلط طریقہ اختیار کیا جس کی سزا آج تک بھگت رہا ہوں۔ میں روز روز کی بک بک جھک جھک سے تنگ آچکا تھا۔ کوشش کے باوجود کوئی ڈھنگ کی ملازمت نہیں مل رہی تھی۔ اس لیے میں نے ملک سے باہر جانے کا فیصلہ کیا۔ میں نے کمپنی سے قرض لیا۔ اِدھر اُدھر سے کچھ پیسے جمع کیے اور ایجنٹ کو دے کر دبئی چلا گیا۔ جانے سے پہلے میں تم سے ملنے گیا تو بھائی نے بتایا کہ تم ناراض ہو کر اسے بغیر بتائے کہیں چلی گئی ہو اور وہ انتظار کر رہا ہے کہ شاید غصہ ٹھنڈا ہونے پر تم اس سے رابطہ کرو۔ میرے پاس وقت نہیں تھا۔ لہٰذا میں نے اس سے کہا کہ جیسے ہی تمہارا پتا معلوم ہو وہ مجھے فوراً اطلاع کر دے۔

میں ہر سال چھٹیوں میں وطن آتا تو اس سے ملنے ضرور جاتا۔ اس نے بھی تمہیں بہت تلاش کیا لیکن اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ میں نے تمہیں ڈھونڈنے کے لیے کیا کیا جتن نہیں کیے۔ یہاں تک کہ اخبار میں تلاش گم شدہ کے اشتہار بھی شائع کروائے لیکن شاید تم اخبار بھی نہیں پڑھتیں۔ میں نے دس سال دبئی میں کام کیا۔ اس کے بعد پاکستان واپس آکر اپنا کاروبار شروع کر دیا۔ یہاں آنے کا مقصد ہی یہ تھا کہ تمہیں پوری دلجمعی سے تلاش کر سکوں۔ اب میرا روزانہ کا یہی معمول تھا کہ کام سے فارغ ہو کر شہر کے مختلف علاقوں کی خاک چھانتا رہتا لیکن اتنے بڑے شہر میں کسی کو پتے کے بغیر تلاش کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ میں تقریباً مایوس ہو گیا تھا لیکن قدرت نے میری مدد کی اور میں تم تک پہنچ گیا۔''

''میں یہی تو جاننا چاہ رہی ہوں کہ آپ کو میرا پتا کیسے معلوم ہوا؟''

''یہی تو اس کہانی کا دلچسپ موڑ ہے جسے سن کر تم حیران رہ جاؤ گی۔ دراصل منصور میری ہی فرم میں کام کرتا ہے۔ اس نے ملازمت کی درخواست دیتے وقت جو فارم بھرا۔ اس میں والدین کے نام کے ساتھ گھر کا پتا بھی درج تھا۔ اسے دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ یقیناً یہی میرا بیٹا منصور ہے۔ انٹرویو کے دوران جب میں نے اس سے فیملی کے بارے میں پوچھا تو اس نے صاف صاف بتا دیا کہ والد کسی بات پر ناراض ہو کر گھر سے چلے گئے تھے اور والدہ نے ہی اس کی پرورش کی ہے۔ اب شک کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔ میں نے اس پر ظاہر تو نہیں کیا کہ میں ہی اس کا بدنصیب باپ ہوں لیکن دگنی تنخواہ اور بہتر شرائط پر اسے ملازمت دے دی۔ اب دفتر میں میرے بعد اس کی دوسری پوزیشن ہے۔ پھر میں نے اپنے آدمیوں کو اس محلے میں بھیج کر معلومات کروائیں تو منصور کی کہی ہوئی باتوں کی تصدیق ہو گئی۔ اس کے بعد میں نے تم سے ملنے کا فیصلہ کر لیا۔''

''اب کیا چاہتے ہیں؟'' میں نے رکھائی سے کہا۔

''سب کچھ جاننے اور سننے کے بعد بھی پوچھ رہی ہو کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ اب سب باتیں کلیئر ہو گئی ہیں۔ تم میرے گھر چلنے کی تیاری کرو میں کل صبح گاڑی بھیج دوں گا۔''

''یہ ممکن نہیں ہے نعیم احمد۔ بہت سا پانی پلوں کے نیچے سے بہہ چکا ہو۔ آپ کے جانے کے بعد مجھے جس کرب، اذیت، دکھ اور آزمائش سے گزرنا پڑا اس کے بعد آپ کو اپنا مجرم سمجھنے لگی ہوں اور اس کی کم سے کم سزا یہ ہے کہ مجھ سے ملنے کے بعد بھی بقیہ زندگی میرے بغیر ہی گزاریں۔ میں نے عہد کیا تھا کہ زندگی کے کسی موڑ پر آپ سے سامنا ہوا تو منہ پھیر کر راستہ بدل دوں گی اور کبھی آپ کی شکل نہیں دیکھوں گی پھر میں آپ کے ساتھ کس طرح رہ سکتی ہوں۔''

''دیکھا جائے تو تمہارا جرم اس سے زیادہ سنگین ہے۔ میں تمہیں چھوڑ کر نہیں گیا تھا بلکہ میں نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ جب کسی قابل ہوا تو تم سے ملنے ضرور آؤں گا۔ اس وقت تک تم اپنے بھائی کے پاس رہنا لیکن تم نے میرا انتظار نہیں کیا اور لاپتا ہو کر رسائی کے تمام دروازے بند کر دیے۔ خود ہی بتاؤ کہ میں تم تک کس طرح پہنچتا۔''

نعیم احمد نے مجھے آئینہ دکھا دیا تھا۔ واقعی میں نے روپوش ہو کر ایک بھیانک غلطی کا ارتکاب کیا اگر ایسا نہ کرتی تو دبئی جانے سے پہلے ہی ان سے میرا رابطہ ہو جاتا لیکن

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

میری حماقت کی وجہ سے دونوں ہی تنہائی کی آگ میں سلگتے رہے اب جب کہ ہم اپنے حصے کی سزا پوری کر چکے تھے۔ مجھے ان کی بات مان لینی چاہیے تھی لیکن اس وقت بھی میری انا آڑے آگئی اور میں نے انہیں ٹالنے کے لیے کہا۔

''ٹھیک ہے میں نے آپ کی بات سن لی اور میں جن حالات سے گزری ہوں۔ وہ بھی آپ کے علم میں آگئے لیکن میں منصور کو بتائے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی۔ وہ جہاں رہنا چاہے گا میں وہیں رہوں گی۔''

''اسے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔'' وہ حیران ہوتے ہوئے بولے۔ ''اب تو وہی میری تمام دولت جایداد اور کاروبار کا وارث ہے۔''

''یہ تو اس سے بات کرنے کے بعد ہی معلوم ہوگا کہ اس کے دل میں آپ کے لیے کتنی محبت ہے اور وہ آپ کے ساتھ رہنے پر تیار ہوتا ہے یا نہیں۔ اب آپ تشریف لے جائیں اگر منصور نے کل صبح آپ کی میز پر استعفیٰ نہ رکھا تو ہمیں لینے کے لیے گاڑی بھیج دیجیے۔''

وہ مزید کچھ کہے بغیر چلے گئے۔ میرا خیال تھا کہ جب میں منصور کو نعیم احمد کی آمد اور ان سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتاؤں گی تو وہ غصے سے بھڑک اٹھے گا اور ہو سکتا ہے کہ مجھ پر ناراض بھی ہو کہ میں نے نعیم احمد کو گھر میں کیوں آنے دیا کیونکہ وہ مجھ سے بھی زیادہ خوددار اور انا پرست تھا۔ نعیم احمد نے ہمارے ساتھ جو کچھ کیا اور جس کے نتیجے میں ہمیں بے شمار مشکلات و مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کی وجہ سے وہ بھی یقیناً ان سے شدید نفرت کرتا ہوگا اور کسی قیمت پر بھی ان کے ساتھ رہنے پر تیار نہیں ہوگا لیکن اس کا ردعمل میری توقع کے برعکس تھا۔

رات کو کھانا کھانے کے بعد میں نے منصور اور مائرہ کو اپنے پاس بٹھا کر نعیم احمد کے بارے میں بتایا۔ وہ خاموش بیٹھا رہا۔ اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ البتہ مائرہ بہت خوش نظر آرہی تھی۔ وہ بے اختیار بول پڑی۔ ''منصور ہماری تو لاٹری نکل آئی۔ کتنا مزہ آئے گا۔ ہم اتنے بڑے گھر میں رہیں گے اور تم کمپنی کے ملازم نہیں بلکہ مالک بن جاؤ گے۔''

میرا خیال تھا کہ منصور اسے جھڑک دے گا لیکن اس نے اسے کچھ کہنے کی بجائے مجھے مخاطب کیا اور بولا۔

''میرا خیال ہے کہ آپ کو ان کی بات مان لینا چاہیے۔ یہ پوری کہانی سننے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر انہوں نے ایک غلطی کی تو اس سے بڑی غلطی آپ نے کی۔ انہوں نے تو آپ کو ڈھونڈنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی اگر آپ ماموں کو اپنے ٹھکانے کے بارے میں بتا دیتیں تو ابو سے آپ کا رابطہ ہو جاتا اور ہمیں یہ دن نہ دیکھنا پڑتے۔''

میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ سارا ملبا مجھ پر ڈال دے گا۔ میں نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ ''تم بھی مجھ کو ہی الزام دینے لگے۔ اب تمہیں اپنے باپ کی غلطی چھوٹی نظر آرہی ہے۔''

''میں الزام نہیں دے رہا بلکہ حقیقت بیان کر رہا ہوں۔ ہم ماضی کو تو واپس نہیں لا سکتے لیکن اپنا حال اور مستقبل تو بہتر بنا سکتے ہیں۔ میں تو یہی کہوں گا کہ جو کچھ ہوا۔ اسے بھول جائیں اور ان کی بات مان لیں۔''

''میں نے عہد کیا تھا کہ ساری عمر ان کی شکل نہیں دیکھوں گی پھر میں ان کے ساتھ کیسے رہ سکتی ہوں۔ البتہ اگر تم اپنا مستقبل بہتر بنانے کی خاطر ان کے پاس جانا چاہتے ہو تو ضرور جاؤ۔ میں تمہیں نہیں روکوں گی۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔''

''مما، ضد چھوڑ دیں۔'' مائرہ بولی۔ ''آپ کی ایک ضد نے منصور کو باپ کی شفقت سے محروم کر دیا۔ اب آپ کیا چاہتی ہیں کہ وہ مالک ہوتے ہوئے بھی اپنی کمپنی میں ملازم کی حیثیت سے کام کریں اور ساری زندگی اس دو کمرے کے مکان میں گزار دیں۔ اگر آپ اور منصور وہاں نہ گئے تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سرجی دل برداشتہ ہو کر اپنا سب کچھ کسی خیراتی ادارے کو دے دیں۔''

اس کی بات میرے دل کو لگی۔ میں اتنی خودغرض نہیں ہو سکتی کہ اپنی انا کی خاطر منصور کو اس کے حق سے محروم کر دیتی۔ ابھی تو وہ میری محبت میں باپ کے پاس جانے سے انکار کر رہا تھا لیکن وہ زیادہ عرصہ اس پر قائم نہیں رہ سکتا تھا۔ ایک طرف دولت و جایداد کی کشش اسے ڈانواں ڈول کرتی تو دوسری جانب مائرہ اسے ورغلاتی۔ وہ کسی وقت بھی مجھ سے دور ہو سکتا تھا۔ ایک غلطی کی وجہ سے میں شوہر کی رفاقت سے محروم ہوئی اور دوسری غلطی کے نتیجے میں بیٹے سے جدائی کا صدمہ برداشت کرنا پڑتا۔ میں ایک بار پھر تنہا نہیں ہونا چاہتی تھی۔ اس لیے میں نے شوہر اور بیٹے کی خواہش کے آگے سر جھکا دیا۔ مجھے اپنی انا کی قربانی دینا پڑی یہی میری سزا تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

موت کا کنواں

جناب ایڈیٹر سرگزشت
السلام علیکم
انسان کی زندگی میں ایسے بے حساب لمحے آتے ہیں جو زندگی کو بدل دیتے ہیں۔ میری زندگی میں بھی ایک ایسا موڑ آیا تھا جس نے میری زندگی پر گہرے نقوش چھوڑے۔ آج میں جتنا دکھی ہوں اس کی ایک وجہ میں کہانی کے انداز میں بھیج رہا ہوں لیکن یہ بتا دوں کہ میں نے اپنا نام غلط لکھا ہے۔ اس کی وجہ آپ کو اس سچ بیانی میں مل جائے گی۔

ناصر حسن
(سرگودھا)

میں اس وقت کھانا کھا رہا تھا کہ باہر سے اصغر کی آواز آئی۔ میں نے جلدی جلدی کھانا ختم کیا اور باہر آ گیا۔

''کیسے آنا ہوا یار؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ ریکارڈنگ کی آواز سن رہے ہو؟'' اصغر نے الٹا مجھ سے سوال کیا۔

''ہاں سن رہا ہوں۔'' میں نے آواز پر توجہ دیتے ہوئے کہا جو کبھی ہوا کے جھونکے کے ساتھ تیز ہو جاتی تھی اور کبھی بالکل مدھم۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

Downloaded From Paksociety.com

''یہ ریکارڈنگ میلے میں ہورہی ہے۔ وہاں موت کا کنواں بھی لگا ہے۔'' اصغر نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

''چھوڑ یار! ابھی میلہ لگنے میں کئی دن باقی ہیں اور یہ موت کا کنواں کہاں سے آگیا؟'' میں نے بے زاری سے جواب دیا۔

''یار میں خود دیکھ کر آیا ہوں۔ دوسرکس اور ایک موت کا کنواں لگ چکا ہے۔''

''اچھا میں ابھی آیا۔'' میں نے اصغر سے کہا اور اندر کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ اندر پہنچتے ہی میں نے امی جان سے کہا۔ ''میں میلہ دیکھنے جارہا ہوں۔'' پھر میں نے ان کے جواب کا انتظار بھی نہ کیا اور باہر کی طرف دوڑ لگادی۔

فلمی گانوں کی آوازیں آہستہ آہستہ اونچی ہوگئیں۔ ہم میلے میں پہنچ گئے۔ آوازیں اتنی بلند تھیں کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

شاید ابھی شو شروع ہونے میں کچھ وقت تھا۔ ہم نے ٹکٹ خریدے اور موت کے کنویں کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپر آگئے جہاں سے موت کے کنویں کے اندر باآسانی دیکھا جاسکتا تھا۔ موت کے کنویں میں ایک پرانی موٹر سائیکل کھڑی تھی اور چند خوب صورت لڑکیاں فلمی گانوں پر رقص کررہی تھیں۔ ہم بڑے شوق سے انہیں دیکھنے لگے۔ تماشائیوں کی تعداد میں آہستہ آہستہ اضافہ ہوتا جارہا تھا۔

''یار ناصر، کیسی ہے؟'' اصغر نے مجھ سے سرگوشی کی۔

''بھئی کون کیسی ہے؟'' میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

''یار وہی نیلے سوٹ والی بالکل چاند کا ٹکڑا ہے۔''

میں نے غور سے اس لڑکی کی طرف دیکھا تو واقعی وہ کسی اداکارہ سے کم نہیں تھی۔ ہم دونوں کی نظریں چار ہوئیں تو اس لڑکی نے نظریں چرالیں۔ میں مسلسل اسی کو دیکھے جارہا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد اس نے میری طرف دیکھا تو میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ واقعی وہ لڑکی حسن کا پیکر تھی۔ اس کی سیاہ زلفوں نے اس کا آدھا چہرہ چھپا لیا تھا جیسے چودھویں کا چاند بادلوں کی اوٹ میں چھپ چھپ کر جھانکتا ہے۔ اس کا چہرہ انتہائی تیز لائٹس میں سونے کی طرح دمک رہا تھا۔ اس کی گہری سیاہ آنکھوں میں عجیب سا سحر تھا۔ اس کے لب گلاب کی پنکھڑیوں سے بھی زیادہ نازک اور حسین تھے۔ لوگ موت کے کنویں سے زیادہ اس لڑکی کے حسن سے متاثر تھے اور اس پر پیسے نچھاور کررہے تھے۔ میری جیب میں جتنے روپے تھے وہ سب کے سب میں نے اس حسینہ پر نچھاور کردیے۔ وہ بھی بار بار میری طرف دیکھ رہی تھی۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بھی مجھ سے متاثر ہوگئی ہے۔ اسے آپ خودنمائی نہ سمجھیں بلکہ یہ حقیقت ہے کہ میری شخصیت میں صنف مخالف کے لیے بے انتہا کشش ہے۔ میرا لمبا قد، مضبوط جسم، تیکھے نقوش اور سرخ وسفید رنگت لڑکیوں کو جلد ہی متاثر کرلیتی ہے۔ ہم ایک دوسرے کو بار بار دیکھ رہے تھے۔ پھر وہ خراماں خراماں چلتی ہوئی ایک دروازے میں داخل ہوگئی۔

شو کب کا ختم ہوگیا تھا لیکن مجھے ہوش نہیں تھا۔ میں اس وقت چونکا جب اصغر نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''کیا یہیں رات گزارنے کا ارادہ ہے؟ تمام لوگ جاچکے ہیں بس ہم دونوں رہ گئے ہیں۔''

میں نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی تو واقعی سب لوگ جاچکے تھے۔ میں اس حسینہ کے خیالوں میں اتنا گم ہوگیا تھا کہ مجھے یہ بھی معلوم نہ ہوسکا کہ شو ختم ہوگیا ہے۔

میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا، سیڑھیاں اترنے لگا لیکن میرے ذہن میں اب تک اس رقاصہ کا سراپا تھا۔ ہم کچھ دیر اِدھر اُدھر گھومتے رہے۔ میری خاموشی سے اصغر نے تنگ آکر کہا۔ ''یار ناصر کیا بات ہے؟ چپ چپ کیوں ہو؟''

میں نے اسے ساری بات بتادی۔

''یار واقعی وہ لڑکی بہت حسین ہے کل پھر آئیں گے۔'' اصغر نے مجھے دلاسا دیا۔

''یار تمہاری بات تو ٹھیک ہے مگر میرے پاس مہینے بھر کا جو خرچ تھا وہ تو ختم ہوگیا۔'' میں نے افسردگی سے کہا۔

''کوئی بات نہیں میں جو موجود ہوں، یہ دیکھ میرے پاس پچاس روپے ہیں اور کل میں ان سے پانچ ہزار بنالوں گا۔'' اصغر نے میرے شانے پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔

مجھے معلوم تھا کہ اصغر جوا کھیلتا ہے۔ وہ بہت ماہر شارپ تھا اور اس کے لیے یہ بات معمولی تھی۔ اسی وجہ سے تو ابو جان نے مجھے اس کے ساتھ گھومنے پھرنے سے منع کیا تھا۔

دوسرے دن واقعی اصغر کے پاس پانچ پانچ سو کے کئی نوٹ تھے۔ اس دن میں نے بھی ابو جان کی جیب سے سو روپے کا ایک نوٹ نکال لیا تھا۔ زندگی میں پہلی بار ایسا کیا تھا اس لیے مجھ پر خوف طاری تھا اور دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ میں نے جلدی سے سو کا نوٹ جیب میں ڈالا اور اصغر کے ساتھ میلہ دیکھنے چلا گیا۔ ہم سیدھے موت کے کنویں کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اوپر بنی ریلنگ میں آ گئے۔ میری نظریں اس لڑکی کو ڈھونڈ رہی تھیں پھر جلد ہی میں نے اسے ڈھونڈ لیا۔ میں نے جیب سے روپے نکالے اور اس لڑکی کی طرف اچھال دیئے۔ جوں ہی اس لڑکی نے اوپر دیکھا تو ہماری نظریں چار ہوگئیں۔ میں نے محسوس کیا کہ میری طرف دیکھنے کے بعد اس کی رنگت سرخ ہوگئی۔ اس کی نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور میں کسی بگڑے ہوئے نواب کی طرح روپے پھینک رہا تھا۔ پھر میری جیب کے تمام روپے ختم ہو گئے۔ میں نے اصغر کی طرف دیکھا تو اس نے مسکراتے ہوئے سو سو روپے کے کئی نوٹ میرے ہاتھ میں تھما دیے۔ میں دوبارہ نوٹ اس کی طرف پھینکنے لگا۔ تمام لوگ میری طرف یوں دیکھنے لگے جیسے دنیا کا آٹھواں عجوبہ دیکھ رہے ہوں۔

پھر شو ختم ہوگیا۔ سب لوگ آہستہ آہستہ جا رہے تھے مگر میری آنکھیں اس حسین ساحرہ پر جمی ہوئی تھیں جس نے میری راتوں کی نیندیں چھین لی تھیں جس نے میرے دن کا آرام غارت کر دیا تھا۔ جس نے میری سوچ اور میرے ذہن پر پہرے بٹھا دیے تھے تاکہ میں کچھ اور نہ سوچ سکوں۔ یہی وجہ تھی کہ میں اس کے سوا کچھ اور سوچنے سے قاصر تھا۔

ہم جانے لگے تو اس حسینہ نے ہاتھ ہلا کر الوداع کہا۔ میرا دل اتنی زور زور سے دھڑکنے لگا جیسے پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ مجھے ایسا لگنے لگا جیسے اس نے خاص طور پر مجھے الوداع کہا ہے اسی لیے غیر ارادی طور پر میں بھی ہاتھ ہلانے لگا۔ میں وہ سب کچھ ایک عالم بے خودی میں کر رہا تھا۔ اب میلے میں کافی رونق تھی۔ مختلف جھولے، جادو کے کمالات اور سرکس وغیرہ آ گئے تھے۔

میں روزانہ اصغر کے ہمراہ میلے میں چلا جاتا اور موت کے کنویں کے جتنے بھی شو ہوتے تمام دیکھتا اور پیسے لٹاتا۔

رقم کا انتظام اصغر کرتا۔ ایک دن میں نے حساب کیا تو پتا چلا کہ میں اصغر کا چار ہزار کا مقروض ہو چکا ہوں۔

جس حسینہ کی خاطر میں مقروض ہوا تھا مجھے اس کا نام بھی معلوم نہ تھا۔ البتہ آنکھوں ہی آنکھوں میں ہم نے ایک دوسرے سے بہت کچھ کہہ لیا تھا۔

وہ میلے کا آخری دن تھا۔ اس دن میلے میں بہت رش تھا اور ٹکٹوں کے نرخ بھی بڑھا دیئے گئے تھے۔ ابھی موت کے کنویں کا شو شروع ہونے میں کافی دیر تھی۔ اس لیے اصغر مجھے موت کے کنویں کے ساتھ ہی بنے ہوئے کیبن میں لے گیا جہاں بڑی بڑی مونچھوں والا ایک آدمی چارپائی پر بیٹھا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ اصغر نے اس آدمی سے اپنا اور میرا تعارف کرایا تو اس آدمی نے بھی اپنا تعارف کرایا۔ اس کا نام تو سراج تھا مگر لوگ اسے بھا سراج کہتے تھے۔ وہی اس موت کے کنویں کا مالک تھا۔

''میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟'' بھا سراج نے چارپائی پر پہلو بدلتے ہوئے پوچھا۔

''ہم آپ کے پاس ایک خاص کام سے آئے تھے، وہ لڑکی ہے نا گوری سی، بڑی بڑی سیاہ آنکھوں اور لمبے لمبے بالوں والی۔''

اصغر نے لڑکی کا حلیہ بتایا تو بھا سراج فوراً بولا۔ ''اچھا اچھا آپ ساحرہ کی بات کر رہے ہو۔''

مجھے حیرت ہوئی کہ ابھی تک وہ میرے حواس پر کسی ساحرہ ہی کی طرح چھائی تھی اور اس کا نام بھی ساحرہ تھا۔

''جی ہاں وہی۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

''مجھے افسوس ہے کہ وہ لڑکی صرف رقاصہ ہے۔'' بھا سراج نے ہمیں بھی عام گاہک سمجھتے ہوئے روایتی انداز میں کہا۔

''بھا سراج! آپ غلط سمجھے ہم اس سے صرف چند باتیں کرنا چاہتے ہیں۔'' اصغر نے رئیس زادوں کی طرح بے پروائی سے کہا۔

''اس بات پر مجھے کوئی اعتراض نہیں مگر اس سے کوئی غلط بات مت کیجیے گا وہ مانے گی نہیں۔ سو روپے مجھے میری فیس دے دیں کیوں کہ کسی بھی لڑکی سے ملنے کی فیس سو روپے ہے۔''

میں نے بھا سراج کو سو روپے ادا کیے تو وہ ہمیں وہیں بٹھا کر چلا گیا۔

کچھ دیر بعد وہی لڑکی خیمے میں داخل ہوئی جس کا سراپا ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے رہتا تھا اور جسے بھا سراج نے ساحرہ کا نام دیا تھا۔ اسے دیکھ کر میرا جسم وفور جذبات سے کانپنے لگا اور میرا دل اتنی زور زور سے دھڑکنے لگا کہ مجھے خدشہ پیدا ہوگیا کہ کہیں میرے دل کی آواز ساحرہ نہ سن لے۔

وہ ہمارے سامنے بچھی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گئی اور لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں۔''

میں نے محسوس کیا کہ اس نے بھی یہ الفاظ بمشکل ادا کیے تھے کیوں کہ اس کی حالت بھی مجھ سے کچھ زیادہ مختلف نہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

تھی۔

''اچھا آپ باتیں کریں میں ابھی آتا ہوں۔'' اصغر یہ کہہ کر کیبن سے باہر چلا گیا۔

میں بت بنا ساحرہ کو دیکھ رہا تھا۔ مجھے گردوپیش کا ہوش نہیں تھا۔ میری آنکھیں صرف ساحرہ کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

''ساحرہ۔'' میں نے بڑی مشکل سے اپنی تمام تر توانائیوں کو یکجا کرتے ہوئے کہا۔

''جی۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔ اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔

''ساحرہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کسی تمہید کے بغیر اچانک اس سے کہا۔ ''جس دن سے تمہیں دیکھا ہے تم میرے حواس پر چھا گئی ہو، میں تمہارے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کرسکتا اگر تم مجھے نہ مل سکیں تو تمہاری قسم میں جان دے دوں گا۔ خدا کے واسطے میرا دل مت توڑنا، میری امیدوں پر اوس نہ گرانا، میرے کان صرف تمہارا اقرار سننے کے لیے ترس رہے ہیں۔'' میں اس لمحے اتنا جذباتی ہوگیا کہ مجھے یہ احساس بھی نہیں رہا تھا کہ ساحرہ سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔

ساحرہ خاموش بیٹھی خلا میں تکتی رہی۔ پھر کھوئے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''کیا تم ایک رقاصہ سے شادی کرو گے، تمہارے والدین تمہارے رشتے دار، کیا ایک گھنیار قاصہ کو تمہاری بیوی کے طور پر قبول کرلیں گے۔'' ساحرہ نے تلخ لہجے میں کہا۔

''ساحرہ! تم کیا جانو کہ محبت کیا چیز ہے۔ تمہاری خاطر میں اپنے عزیز واقارب تو کیا دنیا بھی چھوڑ سکتا ہوں۔ خدارا مجھے بتاؤ تمہارے رشتے کی بات میں کس سے کروں، تمہارے والدین تو ہوں گے؟ وہ جو شرط بھی رکھیں گے میں پوری کروں گا۔ میں تمہیں ہر حال میں حاصل کروں گا۔ تمہیں یہ رقص زیب نہیں دیتے۔ میں اس موت کے کنویں سے تمہیں زندگی کی طرف لے جاؤں گا۔'' میں نے ساحرہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ ''میری بات کا جواب دو ساحرہ! میں آج تمہارا اقرار سنے بغیر نہیں جاؤں گا۔''

ساحرہ نے کچھ کہنا چاہا مگر اس کی آواز بھرا گئی اور آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں میں چھپالیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ساحرہ کی حالت دیکھ کر میری آنکھوں میں بھی آنسو آگئے۔ اس کا آنسوؤں سے بھیگا چہرہ اس گلاب کے پھولوں کی طرح لگ رہا تھا جس پر شبنم کے قطرے موجود ہوں۔

''میرے والد تین سال ہوئے مجھے اس دنیا میں اکیلا چھوڑ کر چلے گئے۔'' ساحرہ کی آواز میں اتنا درد تھا کہ میں بے چین ہوگیا۔ وہ خود کلامی کے سے انداز میں بول رہی تھی۔

''میری والدہ مجھے جنم دیتے ہی اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ میرے والد نے مجھے ماں اور باپ دونوں کا پیار دیا تھا۔ بھا سراج ان کا بہت پرانا دوست تھا۔ میرے والد دن رات محنت کرتے تھے اور میری فرمائشیں پوری کرتے تھے۔ پھر وہ بیمار ہوگئے اور ایسے بیمار ہوئے کہ بیماری نے ان کی جان لے لی۔ اسی دوران میں ہم بھا سراج کے دس ہزار روپے کے مقروض ہوگئے تھے۔ میرا کوئی بھائی یا بہن نہیں تھی۔ میں اس دنیا میں اکیلی تھی۔ میرے چچا جان لاہور میں رہتے تھے۔ ایک ماموں بھی تھے جن سے ہمارے تعلقات ختم ہوئے برسوں بیت چکے تھے۔ اس لیے میں اپنے چچا جان کے پاس لاہور چلی آئی۔ چچا جان کا ایک ہی بیٹا تھا وہ اوباش قسم کا لڑکا تھا، شراب پینا، جوا کھیلنا اور لڑکیوں کو چھیڑنا اس کا معمول تھا۔ اس کا نام امین تھا۔ وہ کئی مرتبہ جیل بھی جاچکا تھا مگر چچا جان کے اثر ورسوخ کی وجہ سے زیادہ دن جیل میں نہیں رہا تھا۔''

''چچا جان نے اپنے اوباش بیٹے سے میری شادی کرانا چاہی تو میں نے صاف انکار کردیا۔ اس پر چچا جان غصے میں آگئے اور مجھے گھر سے نکال دیا۔ پھر میں چچا جان کے گھر کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ کر فیصل آباد اپنے ماموں شوکت کے پاس چلی گئی۔ ماموں شوکت، ان کے بیٹے اکبر، خالد اور بیٹی میمونہ مجھ سے مل کر بہت خوش ہوئے مگر ممانی عائشہ مجھے اپنے گھر میں رکھنے کو تیار نہیں تھیں۔ وہ مجھے ہر وقت کام میں لگائے رکھتیں۔ میرے خلاف ماموں کے کان بھرتی رہتیں۔ ماموں شوکت بھی جلد ہی مجھ سے بدظن ہوگئے۔

ایک روز بھا سراج، ماموں کے گھر آگیا۔ نہ جانے اسے کیسے معلوم ہوگیا کہ میں ماموں کے گھر میں ہوں۔

بھا سراج نے ماموں جان سے اپنے دس ہزار روپے کا مطالبہ کیا تو انہوں نے رقم دینے سے انکار کردیا۔ ماموں جان بھی اپنی جگہ درست ہی تھے کیوں کہ قرض تو میرے ابو نے لیا تھا پھر ماموں جان قرض کی رقم بھلا کیوں ادا کرتے۔ ویسے بھی دس ہزار روپے ان کے لیے خاصی بڑی رقم تھی۔ ماموں جان نے بھا سراج کے مطالبے پر مجھے دس ہزار روپے کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

عوض اس کے حوالے کردیا۔ مجھے گھر سے نکالنے میں ممانی عائشہ کا زیادہ ہاتھ تھا۔

اس دن میں نے اپنے ماں باپ کی کمی کو شدت سے محسوس کیا۔ کاش میرا کوئی بھائی ہوتا تو وہ اپنی بہن کو دس ہزار کی حقیر رقم کے عوض کسی کے حوالے نہ کرتا۔ میں زاروقطار رو رہی تھی۔ میں ماموں کے سامنے روئی گڑگڑائی مگر ان کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ میں نے ممانی جان کو اللہ کے واسطے دیے مگر انہیں تو اپنی بیٹی کی شادی کی فکر لگی ہوئی تھی پھر وہ مجھے اپنے گھر میں کیوں برداشت کرتیں۔

پھر وہ جو میرے باپ کا دوست کہلاتا تھا اس نے اپنے دوست کی عزت کو سرِ بازار نچانے کی کوشش کی۔ میں نے اس کی یہ بات ماننے سے انکار کردیا۔ پہلے وہ مجھے نرمی سے سمجھاتا رہا پھر میرا انکار دیکھ کر مجھ پر تشدد شروع کردیا مگر میں ہر تشدد کو سہتی رہی لیکن اپنے پاؤں میں گھنگرو نہیں باندھے۔ جب اس نے دیکھا کہ میں اس کی بات نہیں مانوں گی تو اس نے تنگ آکر مجھے ایک بدمعاش اور اوباش شخص کے ہاتھ فروخت کرنے کا ارادہ کرلیا۔ اس کے عزائم کی بھنک میرے کان میں پڑی تو میرا دم گھٹنے لگا۔ میں نے کئی بار خودکشی کی کوشش کی مگر بھاسراج نے مجھے مرنے نہیں دیا۔

آخر کار میں نے بھاسراج سے کہا کہ وہ مجھے اس درندے کے ہاتھوں فروخت نہ کرے، میں رقص کرنے پر آمادہ ہوں۔ پھر مجھے رقص سکھایا گیا۔ یوں اس موت کے کنویں کو چار چاند لگ گئے۔ وہ میرے ساتھ انتہائی شفقت سے پیش آنے لگا۔ اسی ہمدردی میں اس ظالم انسان نے میری عزت کا سودا بھی کرنا چاہا مگر میں نے اس کی یہ بات بھی ٹھکرادی۔ میں نے فیصلہ کن لہجے میں اس سے کہہ دیا کہ اگر تو نے میری عزت کا سودا کیا تو نہ صرف میں رقص کرنا چھوڑ دوں گی بلکہ اپنی جان بھی دے دوں گی۔ اس نے ایک بار پھر مجھ پر تشدد کی انتہا کردی مگر میں ٹس سے مس نہ ہوئی بلکہ میں نے کھانا پینا بھی چھوڑ دیا کہ یوں سسک سسک کر سہی مگر میں زندگی کی قید سے آزاد تو ہوجاؤں گی۔

میرا حوصلہ دیکھ کر بھاسراج کا حوصلہ پست ہوگیا اور اس نے میرے انکار کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور میرے رقص پر ہی اکتفا کرلیا۔ وہ بظاہر تو میرے ساتھ بہت مخلص ہے مگر میں جانتی ہوں کہ یہ آج بھی میری عزت کا سودا کرنے کے درپے ہے۔ وہ کسی ایسی آسامی کی تلاش میں ہے جو اسے منہ مانگی رقم دے سکے میرا حسن میرے لیے عذاب بن گیا

کرومینینی مذہب

نینڈرتھل لوگوں کے بعد منظرِ عام پر آنے والی نسل کرومینینی انسان تھے جو تقریباً پچیس ہزار سال قبل سامنے آئے۔ کرومینینی جسمانی اعتبار سے اور ذہنی صلاحیتوں کی بناء پر نینڈرتھل لوگوں سے بڑے تھے۔ یوں ظاہر ہوتا ہے کہ اکثر غاروں میں رہنے کی وجہ سے کرومینینی انسان شکاری کے طور پر زندگی بسر کررہے تھے۔ جب ہم غار میں بسنے والے انسان کا عمومی ذکر کرتے ہیں تو غالباً کرومینینی انسان کے بارے میں سوچ رہے ہوتے ہیں۔ نینڈرتھل کی مانند کرومینینی انسان نے بھی اپنی ثقافت اور مذہب کے متعلق کوئی تحریری ریکارڈ نہیں چھوڑا۔ ایک بار پھر ماہرین آثاریات کے کام کے ذریعے ہی ہم تک معلومات پہنچتی ہیں۔ نینڈرتھل لوگوں کی طرح ہی کرومینینی انسان بھی بظاہر اپنے مُردوں کو اوزاروں اور ہتھیاروں سمیت دفن کردیا کرتے تھے۔ قبروں سے زیور بھی برآمد ہوئے ہیں جن کے ساتھ مُردوں کو دفن کیا گیا۔ مزید برآں کچھ کرومینینی قبروں سے ایسی ہڈیاں بھی ملی ہیں جن پر سرخ رنگ کیا گیا تھا۔ ماہرین آثاریات نے ان عناصر کو حیات بعد الموت سے متعلق بیان کیا ہے۔

مرسلہ: احمد حق، پشاور

نوحجری مذہب

جب سے نینڈرتھل اور کرومینینی معاشروں نے ابتدائی طور پر پتھر کے اوزاروں اور ہتھیاروں کا استعمال شروع کیا، انہیں آثار قدیمہ کے اعتبار سے پتھروں کے زمانہ کی ثقافتیں قرار دیا گیا۔ کرومینینی عرصے کے بعد آنے والے دور میں بھی پتھر کے ہتھیاروں کو استعمال کیا گیا مگر وہ دور دیگر لحاظ سے بہت زیادہ ترقی یافتہ تھا۔ نو حجری یا پتھر کا آخری زمانہ تقریباً سات تا تین ہزار قبل مسیح سے شروع ہوا اور تہذیب میں کئی اضافوں سے عبارت ہے۔ ایک بہت نمایاں پیش رفت جس نے مذہبی ترقی کو بہت زیادہ متاثر کیا وہ زراعت کی بطور زندگی ترقی تھی۔ جب ابتدائی لوگوں نے جان لیا کہ وہ بیج بونے اپنی فصلوں کو کاشت کرنے اور مستقبل کی بھوک کے لیے اناج ذخیرہ کرنے سے زندگی گزار سکتے ہیں تو ان کی زندگیاں یکسر بدل گئیں۔ ابتداء میں لوگ جنگلی شکار کی تلاش میں مسلسل نقل مکانی نہیں کرسکتے تھے، وہ زمین کی بارودی تک ایک ہی جگہ پر رہ سکتے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اب انہیں زیادہ مستقل رہائش کی ضرورت تھی اور وہ نسبتاً بڑے گروہوں میں رہ سکتے تھے۔ یہ ضرورت شہروں کی ترقی کا باعث بنی جو زرعی علاقوں کے قریب واقع تھے۔

مرسلہ: احمد حق، پشاور

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ہے۔'' پھر وہ دبی دبی آواز میں رونے لگی۔ ہم خاموش تھے کہ اس نے سلسلہ کلام جوڑا۔ ناصر صاحب! مجھے بچالیں۔ خدا کے لیے مجھے اس ذلت کی زندگی سے بچالیں۔ مجھے یہاں سے لے جائیں۔ میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں میں نے زندگی میں پہلی بار کسی کو اپنا سمجھا ہے۔ میں نے آپ کی نظروں میں پیار کی چمک پائی ہے کیوں کہ میں گزشتہ تین سال سے لوگوں کے چہرے ہی تو پڑھتی آرہی ہوں۔ ان کی آنکھوں میں ہوس اور چہروں پر مکروہ مسکراہٹ ہوتی ہے۔ لوگوں کی آنکھوں میں چھپی ہوئی خباثت کو میں اچھی طرح سمجھ سکتی ہوں۔ میں نے آپ کی نظروں میں سچے پیار کی جھلک محسوس کی ہے۔ اسی لیے آپ پر اعتبار کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ناصر صاحب! مجھے یہاں سے دور کسی ایسی جگہ لے جائیں جہاں یہ درندہ صفت انسان نہ پہنچ سکیں۔ اس کی سسکیاں کسی طرح تھمنے میں نہ آتی تھیں۔''

میں بت بنا یہ سب سن رہا تھا۔ میرا خون کھول رہا تھا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ اس بڑی بڑی مونچھوں والے شخص کو اتنا ماروں کہ وہ دنیا کے لیے عبرت کا نشان بن جائے۔

''میں تم کو عنقریب یہاں سے لے جاؤں گا ساحرہ، ضرور لے جاؤں گا۔ اب تمہاری خوشیوں کے دن آگئے ہیں۔ میں تمہیں کسی قیمت پر یہاں نہیں چھوڑوں گا۔'' میں یہ کہتا ہوا وہاں سے باہر آگیا۔

اصغر میرا منتظر تھا۔ ''بڑی دیر کردی یار کیا کہہ رہی تھی وہ پری۔'' اصغر نے مجھ سے سوال کیا۔

میں خاموش رہا۔

''انکار کردیا ہوگا اس چھوکری نے، ایسی خوب صورت چھوکریاں بڑی نخرے والی ہوتی ہیں۔ کوئی بات نہیں میرے یار، میں اسے اٹھوالوں گا۔ ہم دونوں تیری بے عزتی کا بدلہ اس سے ضرور لیں گے۔ یہ بھلا کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک فاحشہ میرے دوست کی توہین کرے۔ میں ایسی آوارہ لڑکیوں سے نمٹنا خوب جانتا ہوں۔''

''اصغر!'' میں پوری قوت سے چیخا۔

اس نے میری طرف خونخوار نظروں سے گھورا اور کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ ''معاف کرنا یار میں شاید غلط سمجھا تھا۔''

پھر میں نے ساری تفصیل اصغر کو بتادی۔

''کوئی بات نہیں چلو ابھی اس بھاسراج سے بات کرتے ہیں۔''

پھر ہم دونوں بھاسراج کے پاس چلے گئے جو بکنگ آفس کے پاس ہی کھڑا تھا۔

''بھاسراج! میں نے سنا ہے کہ تم ساحرہ کا سودا کرنے والے ہو۔ بتاؤ کیا دام لگائے ہیں اس کے؟ جو تم مانگو گے ملے گا مگر میں نہ سننے کا عادی نہیں ہوں۔'' اصغر نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

''جوان! بڑا گرم خون ہے تیرا۔'' بھاسراج نے اصغر کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''ادھر آ اور آرام سے بات کر۔ کیا تمہیں یہ لڑکی مستقل چاہیے یا چند گھنٹوں کے لیے۔'' بھاسراج نے اپنے روایتی انداز کو برقرار رکھتے ہوئے کہا۔

''ہمیں یہ لڑکی مستقل چاہیے۔'' اصغر کی بجائے میں نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے اس لڑکی کے میں پچاس ہزار روپے لوں گا۔ اگر سودا منظور ہے تو بتاؤ ہم صرف یہاں کل کے دن ٹھہریں گے کیوں کہ سامان وغیرہ اکٹھا کرنا ہے، میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اب ہم کہاں جائیں گے۔'' بھاسراج نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور کیبن سے باہر چلا گیا۔

''پچاس ہزار روپے، یار اصغر یہ تو بہت بڑی رقم ہے۔'' میں نے پریشانی سے کہا۔

''اس ہیرے کے پچاس ہزار تو کیا پچاس لاکھ بھی کم ہیں اگر تو پچاس ہزار کا بندوبست نہیں کرسکتا تو ٹھیک ہے یہ رقم ادا کرکے میں.....''

''تو تم کیا کرو گے۔'' میں نے کہا۔

''میرا مطلب ہے کہ میں تمہیں پچاس ہزار روپے کمانے کا گر بتادوں گا۔'' اصغر نے میری کلائی اپنے گریبان سے علیحدہ کرتے ہوئے کہا۔

''تو ٹھیک ہے بتاؤ، میں ساحرہ کے لیے سب کچھ کرسکتا ہوں۔'' میں نے اضطراب کے عالم میں اصغر سے کہا۔

''صبر کر میرے یار، صبر کر میرے پاس ایک کام ہے میں تمہاری بات اپنے استاد سے کرادوں گا۔ تم آج رات مجھے ٹھیک بارہ بجے چراغ پہلوان کے اکھاڑے پر ملنا۔ باقی باتیں وہیں پر ہوں گی۔'' اصغر نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

اصغر کا رویہ کچھ مشکوک سا تھا لیکن اس کے بغیر میں کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ دل ڈوبا جارہا تھا اگر میں پچاس ہزار روپے کا بندوبست نہ کرسکا تو ساحرہ کو نہیں پاسکوں گا۔ نہیں نہیں ایسا

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

وقت

چاہتوں کے دل فریب گداز میں پل پل رنگ بدلتی فسوں خیز کہانی...... ماں پر ہونے والے اندوہناک ظلم کا انتقام لینے پر تلا ہوا نوجوان اندر کی شرربار آگ میں جل رہا تھا۔ اسے حالات نے قہربار اور صف شکن بنا دیا تھا۔ ظلم کی چنگاریاں اس کے وجود میں ہولناک شعلوں کا روپ دھار چکی تھیں۔ وہ دشمنوں کو خاک وخون میں نہلا کر ساری رکاوٹوں کو روندتا جا رہا تھا۔ پھر اس کی شناسائی ایک سیمیں بدن، غنچہ دہن، شیریں سخن دوشیزہ سے ہوئی اور کیوپڈ کا تیر چل گیا۔ عزت سے رسوائی اور پھر سرخ روئی کے اس روح فرسا سفر میں وقت اس کے ساتھ تھا۔

سنسنی اور تحیر میں لپٹی دل گداز داستان

شمارہ اپریل 2017ء سے

ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

کے صفحات پر ملاحظہ کریں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

نہیں ہوسکتا۔ ساحرہ میری ہے اور میری ہی رہے گی۔ میں اپنے آپ سے کہہ رہا تھا۔

انہی سوچوں میں گم میں میلے سے باہر نکل آیا اور سیدھا مسجد پہنچا، وہاں پہنچ کر میں نے دو رکعت نماز پڑھی اور اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر دعا مانگی۔ ''یا اللہ! میری خواہش ناجائز نہیں ہے۔ مجھ پر کرم فرما۔ میرے پاس کسی طرح رقم کا بندوبست ہوجائے تاکہ میں ساحرہ کو اپنا سکوں۔''

میں دیر تک دعا مانگتا رہا۔ دعا سے مجھے خاصا سکون ملا۔ میں گھر چلا گیا اور بستر پر لیٹ گیا۔ پھر نہ جانے کب مجھے نیند آگئی۔

دروازے پر کھٹکا ہوا تو میری آنکھ کھل گئی۔ بھابی کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔ انہوں نے پیار بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''ناصر کھانا لاؤں؟''

میں ان کی بات سننے کی بجائے ان کی کلائیوں میں کھنکتے کنگنوں اور کانوں کے جھمکوں کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں یہ گھٹیا خیال آیا کہ اگر یہ زیور میرے ہاتھ لگ جائے تو.....! نہیں میں ایسا نہیں کروں گا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا۔ اگر اصغر سے ملنے کے بعد رقم کا بندوبست نہ ہوسکا تو دیکھا جائے گا۔

''کہاں گم ہو ناصر؟'' بھابی کی آواز پر میں چونک اٹھا۔ ''میں نے تم سے پوچھا ہے کہ کھانا لاؤں؟''

''سوری بھابی! مجھے بھوک نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

میرے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں، سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں زائل ہوچکی تھیں اور سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔

طویل انتظار کے بعد وال کلاک نے گیارہ بجے کا اعلان کیا تو میں اٹھا اور چپکے سے باہر نکل گیا۔ گھر والے سو رہے تھے۔ میں تقریباً ساڑھے گیارہ بجے چراغ پہلوان کے اکھاڑے پر موجود تھا۔

مجھے وہاں بیٹھے ہوئے آدھا گھنٹا گزرا تھا کہ ایک سایہ درخت کی اوٹ سے نکلا اور آہستہ آہستہ میرے نزدیک آگیا۔ یہ اصغر تھا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ چنگی والی سڑک پر لے گیا۔ ہم کچھ دیر وہاں کھڑے رہے۔ اصغر نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ وہاں عجیب پُراسرار سی خاموشی تھی۔ سوائے جھینگروں کی آواز کے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد سیاہ رنگ کی ایک چمچماتی ہوئی گاڑی ہمارے نزدیک آکر رک گئی۔ اصغر آگے بڑھ کے گاڑی کے نزدیک گیا اور اس کے اگلے دروازے پر جھک گیا۔ کچھ دیر وہ اسی حالت میں رہا پھر مجھے بھی آگے آنے کا اشارہ کیا۔ وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر سوار ہوگیا۔ اس نے مجھے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں بھی اصغر کے ساتھ عقبی نشست پر بیٹھ گیا۔ گاڑی میں پہلے ہی بھاری بھرکم جسم کا ایک شخص بیٹھا تھا۔ اس کی شکل مجھے دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بھی مشکوک شکل کا ایک آدمی بیٹھا تھا۔ گاڑی میں مکمل تاریکی تھی۔ ہمارے بیٹھتے ہی گاڑی جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ گاڑی کے شیشے اس قسم کے تھے کہ میں باہر بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ گاڑی کبھی دائیں اور کبھی بائیں مڑتی رہی۔

پھر ایک گھنٹے بعد گاڑی اچانک رک گئی۔ سب سے پہلے ڈرائیور گاڑی سے باہر نکلا۔ اس کے بعد میں نے گاڑی سے قدم باہر نکالا اور بعد میں وہ بھاری بھرکم آدمی بھی باہر آگیا جو پسنجر سیٹ پر بیٹھا تھا۔

وہ ایک بڑی سی عمارت تھی جو روشنیوں سے جگمگا رہی تھی۔ پھر مجھے ایک طویل کوریڈور سے گزار کے ایک کمرے میں لے جایا گیا جہاں بڑی سی ایک میز کے پیچھے ایک آدمی بیٹھا تھا۔

اس نے اصغر کو دیکھتے ہی کہا۔ ''ہیلو اصغر! تو یہ ہے وہ لڑکا جسے پچاس ہزار روپے کی ضرورت ہے؟'' اس کا اشارہ میری طرف تھا۔

''یس باس، یہی وہ لڑکا ہے جسے پچاس ہزار روپے کی ضرورت ہے۔'' اصغر نے جواب دیا۔ جواب دیتے ہوئے اس کا لہجہ بہت مؤدب تھا۔ ''اس کا نام ناصر ہے باس۔''

''مسٹر ناصر!'' غیر ملکی نے کہا۔ ''پچاس ہزار روپے تمہیں کام شروع ہونے سے پہلے دیئے جائیں گے اور کام کے بعد مزید پچاس ہزار روپے دیئے جائیں گے لیکن اگر کام نہ ہوا تو پیسے تمہیں واپس کرنا ہی پڑیں گے۔ تمہیں سزا بھی دی جائے گی۔'' غیر ملکی کا لہجہ انتہائی سرد اور تحکمانہ تھا۔

میں باس کی بات سن کر خوف زدہ ہوگیا کہ وہ کون سا کام ہے جس کا معاوضہ ایک لاکھ روپے دیا جارہا ہے؟ ان دنوں ایک لاکھ خاصی بڑی رقم ہوتی تھی۔

''غور سے سنو! مون لائٹ ہوٹل کے کمرا نمبر بارہ میں ایک شخص مقیم ہے۔ اس کا نام اسٹیفن ہے۔ وہ غیر ملکی ہے اور موجودہ حکومت کو ہمارے خلاف چند انتہائی ضروری معلومات فراہم کرنا چاہتا ہے۔ کل اس کے پاس ٹھیک ساڑھے بارہ بجے حکومت کا ایک انتہائی اہم آدمی آئے گا۔ اس کا نام محی الدین ہے۔ محی الدین کے آنے سے پہلے ہی تم ہوٹل پہنچ کر

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اسٹیفن کا خاتمہ کردو گے۔ ایک بات اور اسٹیفن ہوٹل میں فرضی نام سے ٹھہرا ہوا ہے۔'' غیر ملکی نے یوں کہا جیسے مجھ سے سگریٹ لانے کو کہہ رہا ہو۔

''م.....م.....مگر میں نے پہلے تو کبھی.....قت.....قتل نہیں کیا۔'' میں نے کانپتے ہوئے لہجے میں باس کو جواب دیا۔

''اصغر تم اسے سمجھاؤ۔'' باس نے کہا۔ ''ورنہ تم تو سمجھتے ہو کہ جو ایک مرتبہ ہمارے اس ٹھکانے پر آجائے وہ واپس نہیں جاسکتا۔'' باس کا لہجہ انتہائی درشت تھا۔

''ٹھیک ہے باس کام ہو جائے گا۔ کل رات ٹھیک گیارہ بجے اسٹیفن اس دنیا میں نہیں ہوگا۔ ورنہ میں اپنے ہاتھوں سے ناصر کو ٹھکانے لگادوں گا۔'' اصغر نے جواب دیا۔

''جون! ناصر کو پچاس ہزار روپے اور ایک ریوالور دے دو۔'' باس نے اپنے ایک آدمی سے کہا۔

جون نے مجھے ایک بریف کیس اور پوائنٹ تھری ٹو کا ایک ریوالور میرے حوالے کردیا۔

''اب تم جاسکتے ہو۔'' باس نے کہا۔ ''کام ختم ہونے کے بعد تمہیں اصغر کے ذریعے مزید پچاس ہزار روپے مل جائیں گے۔ جون اسے جہاں سے اٹھایا تھا وہیں چھوڑ آؤ۔'' باس نے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

مجھے اسی گاڑی میں چنگی والی سڑک پر پہنچا دیا گیا۔ میں سیدھا گھر پہنچا۔ سب لوگ سو رہے تھے۔ میں نے بریف کیس کھولا اور رقم گننے لگا۔ وہ پورے پچاس ہزار تھے۔ اتنی بڑی رقم میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھی تھی۔ مجھے ساری رات نیند نہیں آئی۔

صبح ہی صبح میں اصغر کو لے کر بھاسراج کے پاس پہنچا اور اسے پچاس ہزار دے کر ساحرہ کو ساتھ لے لیا۔ اس وقت میں اتنا خوش تھا کہ اس خوشی میں یہ بھی بھول گیا کہ مجھے ابھی ایک قتل بھی کرنا ہے۔

میں نے ساحرہ کو تو حاصل کرلیا تھا لیکن ابھی بہت سے کام باقی تھے۔ میں اصغر کی لائی ہوئی گاڑی میں ساحرہ کو لے کر فیصل آباد روانہ ہوگیا۔ پھر پہلے سے طے شدہ پلان کے مطابق ہم ساحرہ کو اصغر کے ایک دوست کے گھر لے گئے۔ اصغر کے اس دوست کو دیکھ کے مجھے انجانا سا خوف محسوس ہوا۔ وہ شخص اپنے حلیے ہی سے خطرناک اور جرائم پیشہ لگ رہا تھا۔ وہاں ٹھہرنا میری مجبوری تھی۔ اس کے علاوہ کوئی ایسا ٹھکانا نہیں تھا جہاں میں ساحرہ کے ساتھ ٹھہر سکتا۔ پھر میں نے خود کو یہ کہہ کر سمجھالیا کہ چند ہی گھنٹوں کی تو بات ہے۔

پھر اصغر کے اس دوست ناظم کی موجودگی میں مولوی صاحب نے میرا اور ساحرہ کا نکاح پڑھا دیا۔ اس وقت میں بہت خوش تھا۔ میں نے ساحرہ کو پالیا تھا۔ اس لمحے مجھے کائنات اتنی خوش رنگ و دل فریب لگ رہی تھی جسے الفاظ میں بیان نہیں کرسکتا۔ اب اصغر اور ناظم کی طرف سے میرا خوف بھی ختم ہوگیا تھا کیوں کہ اب تو ساحرہ میری بیوی بن چکی تھی۔

میں رات کے دس بجے اصغر کے ہمراہ واپس اپنے شہر آ گیا اور ٹھیک گیارہ بجے میں ہوٹل مون لائٹ کے استقبالیہ پر موجود تھا۔

میں نے کاؤنٹر کلرک سے کہا۔ ''مجھے اسٹفن صاحب سے ملنا ہے۔ میرا نام محی الدین ہے۔''

استقبالیہ کلرک نے کہا۔ ''سر! ایک منٹ انتظار فرمائیں۔'' پھر اس نے ٹیلی فون پر کوئی نمبر ڈائل کیا اور بولا۔ ''سر کوئی محی الدین صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ او کے سر۔'' اس نے ریسیور رکھ کے مجھ سے کہا۔ ''آپ جاسکتے ہیں سر۔''

کمرا نمبر بارہ کے دروازے پر میں نے دستک دی تو اندر سے آواز آئی۔ ''آجائیں محی الدین صاحب میں آپ ہی کا انتظار کررہا تھا۔''

میں نے آہستہ سے دروازے کو دھکیلا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ سامنے ہی صوفے پر باوقار سا شخص بیٹھا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر حیرت سے کھڑا ہوگیا۔ میں نے بغیر کچھ کہے ریوالور نکالا اور اس شخص پر ایک فائر کردیا۔ گولی اس کی گردن میں لگی۔ میں نے دوسرا فائر کرنے کی کوشش کی لیکن لاکھ کوشش کے باوجود بھی فائر نہ کرسکا۔ میں خون دیکھ کر دہشت زدہ ہو گیا تھا۔ وہ فرش پر گرا تڑپ رہا تھا۔

اچانک کسی مضبوط ہاتھ نے میرا ہاتھ سختی سے جکڑ لیا۔ میں نے چونک کے دیکھا۔ وہ کوئی پولیس افسر تھا۔ اس کے ساتھ دو سپاہی بھی تھے۔ مجھے ہتھکڑیاں پہنا دی گئیں۔ دو سپاہیوں نے بڑھ کر زخمی کو اٹھایا اور وہاں سے لے گئے۔ یہ سب اتنی جلدی ہوگیا تھا کہ مجھے یہ سوچنے کا موقع نہیں ملا کہ پولیس کو اتنی جلد کیسے خبر ہوگئی؟

مجھے پہلے حوالات پھر وہاں سے جیل منتقل کردیا گیا۔

کئی روز بعد میرے بڑے بھائی جیل میں مجھ سے ملنے آئے۔ گھر والوں کو میری گرفتاری کی خبر کافی دیر میں ملی

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

تھی۔

بھائی جان نے مجھے بتایا کہ اسٹفن صاحب کی جان بچ گئی ہے اگر انہیں بروقت طبی امداد نہ ملتی تو ان کی موت یقینی تھی۔ ان کی حالت اب خطرے سے باہر ہے۔ بھائی جان نے مجھ سے قتل کے بارے میں پوچھا لیکن میں نے صاف انکار کردیا اور کہا کہ مجھے غلطی سے گرفتار کیا گیا۔ پھر پتا نہیں پولیس والوں نے کمزور کیس کیوں بنایا کہ عدالت نے مجھے سات سال قید کی سزا سنائی۔ میں نے ساحرہ اور اصغر کے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتایا تھا۔

چند روز بعد بھا سراج مجھ سے ملنے آیا اور مجھے ایک لفافہ دیتے ہوئے بولا کہ تمہارا یہ خط میرے پتے پر آیا تھا۔ خط کے ایک کونے پر ''ناصر کے لیے'' لکھا تھا۔ بھا سراج نے مجھے لفافہ دینے کے بعد رسمی طور پر ہمدردی کے چند جملے کہے اور آئندہ آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ میں نے لفافہ کھولا اور خط پڑھنے لگا تھا۔

''میرے پیارے ناصر! یہ خط میں ناظم کے خون سے لکھ رہی ہوں کیوں کہ میں نے ناظم کو قتل کردیا ہے۔ کل کی رات مجھ پر بہت بھاری تھی جب آپ مجھے ان درندوں کے حوالے کر کے چلے گئے۔ میں آپ کا انتظار کر رہی تھی کہ تقریباً ایک بجے کے قریب دروازے پر دستک ہوئی۔ مجھے یقین تھا کہ آپ آئے ہوں گے لیکن آپ کی بجائے اصغر اندر داخل ہوا۔ اس کے پیچھے ناظم بھی تھا۔ میں نے اصغر سے آپ کے بارے میں پوچھا تو اس نے نہایت گھٹیا انداز میں جواب دیا کہ اب ناصر کبھی نہیں آئے گا کیوں کہ وہ جیل کی اپنی سلاخوں کے پیچھے بیٹھا تمہارے خیالات میں گم ہو گا۔ اصغر کے اس انکشاف نے مجھے لرزا دیا۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ میں نے روتے ہوئے پوچھا کہ ناصر جیل کیوں چلے گئے؟ اس نے بتایا میں نے یہ سازش صرف تمہیں حاصل کرنے کے لیے رچی تھی۔ اسے رقم اور پستول دینے والا میرا اپنا آدمی تھا جس نے جھوٹی کہانی سنا کر ناصر کو قتل پر آمادہ کیا تھا۔ اصغر کے مکروہ خیالات کو میں بھانپ چکی تھی۔ پھر میں نے ناظم کے ہاتھ میں لمبا سا ایک خنجر بھی دیکھ لیا تھا۔ اصغر نے خوف ناک لہجے میں کہا دیکھو ساحرہ! اگر تم نے کوئی مزاحمت کی یا ذرا سی بھی آواز نکالی تو یہ چاقو تمہارے سینے میں گھونپ دیا جائے گا۔'' اس نے ناظم کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے چاقو کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے اپنے آپ کو بچانے کی بہت کوشش کی لیکن اس کمینے اصغر نے مجھے بے عزت کر کے ہی دم لیا۔ اس کے بعد ناظم میری طرف بڑھا۔ میں غصے سے پاگل ہو رہی تھی۔ میں نے اچانک کونے میں پڑا ہوا ناظم کا چاقو دیکھا تو جھپٹ کر وہ اٹھا لیا اور پوری قوت سے چاقو ناظم کے سینے میں اتار دیا۔ اس کے سینے سے خون کا فوارہ سا ابل پڑا اور وہ فرش پر گر کے تڑپنے لگا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر اصغر وہاں سے فرار ہو گیا۔ میں نے اس کو بھی مارنا چاہا تھا لیکن وہ اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ خط میں بھا سراج کے پتے پر لکھ رہی ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ وہ یہ خط آپ کو پہنچا دے گا۔ یہ خط میں لیٹر بکس میں ڈال دوں گی اس کے بعد آپ کے سامنے آنے کی بجائے میں خود کو بھی ختم کرلوں گی۔ مجھ بے گناہ کو معاف کردینا۔ آپ کی چند گھنٹوں کی دلہن ساحرہ۔

خط پڑھنے کے بعد میں غصے اور صدمے سے لرزنے لگا۔ میرا پورا جسم پسینے میں شرابور ہو گیا اور میں جنونی انداز میں چیخا۔ ''گھٹیا انسان تو نے مجھے دوستی کے نام پر اتنا بڑا دھوکا دیا ہے۔ میں تیرا خون پی جاؤں گا۔ تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

پھر میں عالمِ جنون میں نہ جانے کیا کیا بکتا رہا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ ابھی جاؤں اور اس ننگ انسانیت اصغر کا جسم چھلنی کردوں لیکن جیل کی آہنی سلاخیں میرے راستے میں حائل تھیں۔

میں رات بھر روتا رہا، جیل کی دیواروں سے سر ٹکراتا رہا۔ اب تو بس میری ایک ہی خواہش تھی کہ یہاں سے رہائی ملتے ہی میں اصغر کو تڑپا تڑپا کر ماروں گا۔ میں نے ہر ملاقاتی سے ملنا چھوڑ دیا سوائے بھا سراج کے۔ میں نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ کر منت کی کہ کسی کو بھی میرے، ساحرہ اور اصغر کے بارے میں مت بتانا کیوں کہ ساحرہ مر چکی ہے۔

ساحرہ کی موت کی خبر سن کر بھا سراج بھی آبدیدہ ہو گیا۔ میرے دکھ کا احساس کرتے ہوئے اس نے مجھ سے ساحرہ کی موت کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا۔ پھر میں نے بھا سراج سے بھی کہہ دیا کہ تم بھی یہاں نہ آیا کرو میں کسی سے ملنا نہیں چاہتا۔

پھر بے شمار دن اور بے شمار راتیں گزر گئیں۔ کبھی کبھی ابا جان اور امی ملنے آجاتی تھیں۔ انہی کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ باجی رخسانہ اور باجی ریحانہ کی شادیاں ہو گئی ہیں۔

اسی طرح وقت گزرتا رہا اور گویا سات صدیوں پر محیط سات سال بھی گزر ہی گئے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

وہ پیر کا دن تھا جب مجھے رہا کیا گیا اور میں نے ایک طویل عرصے کے بعد آزاد فضا میں سانس لی۔ میں نے نیلے آسمان کی طرف دیکھا جہاں کونجوں کی ایک ڈار اڑتی ہوئی اپنی منزل کی طرف جارہی تھی لیکن مجھے تو زیادہ دن آزاد فضا میں سانس نہیں لینا تھی کیوں کہ میری منزل تو ایک مرتبہ پھر جیل ہی تھی کیوں کہ میں اس اصغر کو خون میں نہلانے کے بعد ایک مرتبہ پھر جیل آنا چاہتا تھا۔ میرا مقصد تو اب صرف اور صرف اصغر کی موت تھا۔ اس کی روح کو اس کے جسم سے آزاد کرانا تھا۔

میں یہی سوچتا ہوا جیل کے دروازے سے باہر نکلا تو باہر میرے پیاروں کا ایک ہجوم میرا منتظر تھا۔ ابا جان، امی جان، باجی رخسانہ اور ان کے دو بچے آسیہ اور آصف، باجی ریحانہ اور ان کے شوہر محمد علی اپنے بچوں نرگس اور کاشف کو لیے میرے منتظر تھے لیکن مجھے باجی رخسانہ کے شوہر نظر نہیں آئے۔ ابا اور امی مجھے گلے لگا کر رونے لگے۔ میری دونوں بہنیں بھی آنسو بہانے لگیں لیکن یہ خوشی کے آنسو تھے۔ میری دونوں بھانجیاں آسیہ اور نرگس ''ماموں جان..... ماموں جان'' کہتی ہوئی میرے پیروں سے لپٹ گئیں۔ میں نے ان دونوں کو گود میں اٹھا کر خوب پیار کیا۔

''آسیہ بیٹا! تمہارے ابو نہیں آئے؟'' میں نے آسیہ سے پوچھا۔

''کراچی گئے ہوئے ہیں۔ ایک دو روز میں آجائیں گے۔'' باجی رخسانہ نے جواب دیا۔

گھر پہنچا تو گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا اس لیے مجھے وہ دن گھر ہی میں گزارنا پڑا۔

اگلے ہی دن میں اپنے مشن پر نکل کھڑا ہوا۔ میرے پاس گولیوں سے بھرا ہوا ریوالور تھا۔ میں نے بازار سے لمبے پھل کا ایک تیز دھار چاقو بھی خرید لیا تھا تاکہ ضرورت کے وقت کام آسکے۔

میں نے اصغر کو بہت ڈھونڈا، اس کے ہر ٹھکانے پر گیا لیکن مجھے ناکامی ہوئی۔ وہ مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ میں نے اس کے جاننے والوں سے اس کے بارے میں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ کاروبار کے سلسلے میں اکثر شہر سے باہر جاتا رہتا ہے۔ ان دنوں بھی وہ شہر سے باہر تھا۔ آخر تھک ہار کے میں گھر واپس آگیا۔

باجی نے مجھ سے کہا کہ تم ایک دو روز میرے گھر سو جاؤ۔ جب آسیہ کے ابو آئیں گے تو میں گھر چلی آؤں گی تم اس وقت تک سکون سے میرے گھر میں رہو۔ میں نے باجی کی یہ تجویز مان لی کیوں کہ میں تو خود تنہائی چاہتا تھا۔

میں باجی کے گھر چلا گیا اور تمام لائٹیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا۔ بھرا ہوا ریوالور اب بھی میرے پاس تھا۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ باجی نے مجھے گھر کی حفاظت کے لیے بھیجا ہے اور میں نے گھر کا دروازہ ہی کھلا چھوڑ دیا ہے۔ میں دروازہ بند کرنے کی نیت سے اٹھ کر دروازے تک گیا تو ٹھٹک کر رک گیا۔

کوئی سرگوشی میں کہہ رہا تھا۔ ''آجاؤ گھر کا دروازہ کھلا ہے۔''

میں نے ریوالور ہاتھ میں پکڑ لیا اور دروازے کی اوٹ سے باہر جھانکا۔ مجھے دو سائے نظر آئے جو کمرے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ان میں سے ایک سایہ کسی مرد کا تھا اور دوسرا عورت کا۔ میں آہستگی سے واپس آیا اور ڈرائنگ روم میں چھپ کر بیٹھ گیا۔

''آجاؤ شمیم! اسی کمرے میں آجاؤ۔'' ایک مردانہ آواز سنائی دی۔

آواز کچھ جانی پہچانی سی لگ رہی تھی۔ اچانک میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا یہ مکروہ آواز تو اصغر کی تھی۔

''کمال ہے، سارا گھر کھلا چھوڑ کر اپنے ماں باپ کے گھر جا مری ہے؟ آنے دو اسے گھر کو یوں کھلا چھوڑ رکھا ہے جیسے اس کے باپ کا مال ہو۔'' وہ غصے میں بڑبڑا رہا تھا۔

میرے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ دماغ کو جھٹکے سے لگنے لگے۔ میرا پورا جسم پسینے میں نہا گیا اور دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ کیا اصغر میرا بہنوئی ہے؟ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اصغر خود کو مجھ سے بچانے کے لیے اتنی بڑی چال بھی چل سکتا ہے۔

اگر میں اصغر کی جان لیتا تو اپنے ہی ہاتھوں سے اپنی بہن کو بیوہ اور بھانجی اور بھانجے کو یتیم کر دیتا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔

میں اسی کشمکش میں مبتلا تھا کہ میرے کانوں میں اصغر کی آواز آئی۔ ''ادھر میرے پاس آؤ میری جان! ہم دنیا کے سارے غموں کو بھلا کر ایک دوسرے میں گم ہو جائیں۔'' اصغر نے جیب سے ریوالور نکال کر تکیے کے نیچے رکھتے ہوئے کہا۔

اس نے ٹیبل لیمپ روشن کر دیا۔ کمرے میں روشنی پھیل گئی اور مجھے اصغر کا چہرہ بالکل واضح طور پر نظر آنے لگا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اس کے نزدیک ہی خوب صورت سی ایک لڑکی کھڑی تھی۔

''یہ رخسانہ کون ہے؟'' لڑکی نے پوچھا۔

''میری بیوی ہے لیکن میں اسے بہت جلد طلاق دے دوں گا اور تم سے شادی کرلوں گا پھر ہم لوگ یہاں سے دور بہت دور چلے جائیں گے، اتنی دور کہ کوئی ہم تک پہنچ ہی نہ سکے گا۔'' اصغر نے شمیم کو سبز باغ دکھاتے ہوئے کہا۔

''کک..... کیا تم شادی شدہ ہو؟'' لڑکی بھڑک کر بولی۔ ''دھوکے باز، تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ تم شادی شدہ ہو؟'' لڑکی بری طرح چیخ رہی تھی۔ ''کمینے! میں نے تیری خاطر اپنا گھر بار، اپنے ماں باپ چھوڑے اور تو نے مجھے اتنا بڑا دھوکا دیا، برباد کردیا مجھے، میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔'' شمیم نے اچانک آگے بڑھ کے اصغر کا ریوالور تکیے کے نیچے سے نکال لیا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے آنکھیں بند کرکے اصغر پر گولی چلادی جو اس کے بازو میں لگی۔

اصغر نے جھپٹ کر شمیم سے ریوالور چھین لیا اور دہاڑ کے بولا۔ ''ایک عورت ہو کر اتنا تنتنا؟ تو نے مجھ پر فائر کیا، اصغر پر؟ تیرا زندہ رہنا یوں بھی میرے لیے خطرے سے خالی نہیں ہے۔'' پھر اس نے ریوالور کا ٹریگر دبادیا۔ گولی شمیم کے سینے میں پیوست ہوگئی اور وہ چیخ مار کے فرش پر گر گئی۔

اصغر کا غصہ کم نہیں ہوا تھا۔ وہ شمیم پر دوبارہ گولی چلانا چاہتا تھا کہ میں نے اسے موقع نہیں دیا اور اپنے ریوالور سے اس پر فائر کردیا۔ گولی اس کے سینے میں پیوست ہوگئی۔ اس کے حلق سے اذیت ناک چیخ بلند ہوئی اور وہ بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کے خون سے پورا بستر رنگین ہوگیا۔

میں بھاگتا ہوا شمیم کے پاس گیا، وہ آخری سانسیں لے رہی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ''آپ کا بہت بہت شکریہ..... بھائی..... اب یہ ریوالور مجھے..... دے دیں..... جج..... جلدی کریں۔''

میں نے ریوالور اسے دے دیا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے اصغر پر ایک فائر کردیا۔ گولی اصغر کے پیٹ میں لگی۔

اسی وقت بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز آئی اور کوئی چیخ کر بولا۔ ''خبردار! کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے۔'' پھر پولیس کا ایک انسپکٹر کمرے میں داخل ہوا۔ اسے دیکھ کر شمیم نے اصغر پر دوسری گولی بھی چلادی۔ اصغر کے جسم کو جھٹکا سا لگا اور اس کی گردن ڈھلک گئی۔ آنے والا پولیس افسر اور اس کے ماتحت شاید گشت پر تھے جو فائرنگ کی آواز سن کر گھر میں آگئے تھے۔

ایک سپاہی نے آگے بڑھ کر شمیم کے ہاتھ سے ریوالور چھین لیا۔ وہ رک رک کر بولی۔ ''میں..... نے اصغر کو..... قتل کیا ہے۔ کک..... کیوں کہ اس نے مجھے مارنا چاہا تھا..... میں نے اسے..... مار..... دیا۔ میں نے اسے مار.....'' یہ کہتے کہتے شمیم کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

میں نے اصغر سے اپنا انتقام لے لیا تھا لیکن شمیم نے میرا راستہ ہموار کردیا تھا اور قتل کا الزام اپنے سر لے لیا تھا اس کے باوجود پولیس نے مجھے گرفتار کرلیا لیکن ابتدائی پوچھ گچھ کے بعد چھوڑ دیا۔

میں تھانے سے گھر پہنچا تو گھر میں صفِ ماتم بچھی ہوئی تھی۔ سب رو رہے تھے۔

''ہائے میرے بیٹے نے تیرا کیا بگاڑا تھا منحوس لڑکی! تو نے اسے کیوں قتل کردیا۔'' اصغر کی ماں نے بین کرتے ہوئے کہا۔ اس بے چاری کو کیا معلوم تھا کہ اس کے بیٹے کو قتل کرنے والا اس کے سامنے کھڑا ہے۔

میں اپنے کمرے میں جاکر لیٹ گیا۔

''ماموں جان!'' میرے بھانجے نے مجھے پکارا۔

''جی بیٹا۔'' میں نے پیار بھرے لہجے میں پوچھا ''کیا بات ہے؟''

''ماموں جان! مجھے میلے میں لے چلیں۔'' اس نے خوشامد بھرے لہجے میں کہا۔ اس کے ہاتھ میں دس روپے کا نوٹ تھا۔ اس معصوم کو یہ احساس بھی نہیں تھا کہ اس کا باپ قتل ہوچکا ہے۔

میں نے اسے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''تم میلے میں جاکر کیا کرو گے بیٹا؟''

''میں موت کا کنواں دیکھوں گا ماموں جان۔'' آصف نے کہا۔

''نہیں بیٹے!'' میں نے آصف کو پیار سے چمکارا اور میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ''موت کا کنواں نہیں دیکھتے۔''

''کیوں ماموں جان! موت کا کنواں کیوں نہیں دیکھتے؟'' آصف نے معصومیت سے پوچھا۔

''اس لیے بیٹا کہ موت کا کنواں موت کا ہی کنواں ہوتا ہے۔'' یہ کہہ کر میں بلک بلک کر رونے لگا کیونکہ مجھے بے اختیار ساحرہ یاد آگئی تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

انصاف

محترم مدیر اعلیٰ
السلام علیکم
یہ دنیا امتحان گاہ ہے۔ جیسا کرو گے ویسا بھرو گے یہ ہم بچپن سے سنتے آئے ہیں۔ یہ واقعہ جسے میں نے کہانی کے انداز میں لکھا ہے، اسی طرح کا ہے اگر یہ سب کچھ میرے سامنے نہ ہوا ہوتا تو شاید میں بھی یقین نہ کرتا لیکن اس واقعے کا گواہ میں بھی ہوں۔

غفران انصاری
(فیصل آباد)

یہ سب کچھ میرے سامنے ہو رہا تھا اور میں حیران ہو کر دیکھے جا رہا تھا۔

یہ کہانی میری نہیں ہے۔ لیکن میں اس کہانی کا چشم دید گواہ ضرور ہوں۔ بہتر یہی ہے کہ میں یہ کہانی شروع سے سنا دوں۔

میں منور صاحب کی عالیشان فرم میں کام کرتا تھا۔ وہ ایک دولت مند انسان تھے۔ اس فرم کے علاوہ ان کی ایک گارمنٹ فیکٹری بھی تھی۔ ایک بڑی فارمیسی تھی۔ جس کی دوائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

Downloaded From Paksociety.com

پورے ملک میں فروخت ہوا کرتیں۔ ایک بڑا شاپنگ پلازہ تھا۔ مطلب یہ کہ وہ ایک ارب پتی انسان تھے اور سب سے بڑھ کران کا شاندار مکان تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ مکان دس ہزار گز سے کم پر نہیں ہوگا۔ کیا نہیں تھا اس مکان میں۔ ایک بہت بڑا گارڈن۔ سوئمنگ پول۔ ایک چھوٹا سا سفاری۔ بے شمار کمرے۔ اور بیش قیمت فرنیچر۔

میں جب پہلی بار ان کے مکان میں گیا تو دیکھ کر دنگ رہ گیا تھا۔

میں ان کی فرم کا اکاؤنٹنٹ تھا۔ اسی لیے کبھی کبھی وہ مجھے اپنے گھر بھی بلا لیتے تھے۔

منور صاحب ایک ایسے آدمی تھے جو خود کو لیے دیئے رکھتے۔ میں نے ان کو کبھی ہنستے یا مسکراتے نہیں دیکھا ہوگا۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں تھا کہ وہ سخت مزاج کے ہوں۔ ایسا بھی نہیں تھا۔ بس ان کا مزاج ہی ایسا تھا۔

وہ ایک اصول پسند انسان تھے۔ انہوں نے جو قوانین بنا رکھے تھے ان کی خلاف ورزی انہیں پسند نہیں تھی۔ ان کا صرف ایک بیٹا تھا اکبر جس کو وہ اعلیٰ تعلیم دلا رہے تھے۔ تاکہ وہ ان کی اسٹیٹ کو سنبھال سکے۔ اس کاروبار کو ان کی موت کے بعد جاری رکھ سکے۔

لیکن اکبر کی رپورٹ کوئی خاص نہیں تھی اور ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہر جگہ تو نہیں لیکن نوے فیصد ایسا ہی ہوتا ہے کہ جس بیٹے کو دولت کی فراوانی ملے وہ زندگی کے راستوں پر ڈگمگا کر چلنا شروع کر دیتا ہے۔ اس کے پیروں کو بہکنے میں دیر نہیں لگتی۔

منور صاحب ویسے تو اپنے کسی ملازم سے بات کرنا شاید اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے لیکن مجھ پر نہ جانے کیوں مہربان تھے۔ کبھی کبھی اپنے دل کی بات مجھ سے شیئر کر لیا کرتے۔ ان کی زندگی کا سب سے بڑا دکھ یہی تھا کہ اکبر ان کی سوچ کے مطابق نہیں چل رہا تھا۔

ایک دن انہوں نے اپنے کمرے میں بلا کر مجھ سے کہا۔

"غفران صاحب۔ میں آپ کو سختی سے ایک بات کی تاکید کر رہا ہوں کہ آپ کبھی اکبر کو کسی بھی کھاتے میں کوئی رقم نہیں دیں گے۔ اس کی پاکٹ منی پانچ لاکھ روپے ہے۔ جو اس کے لیے بہت ہے۔ جبکہ اس کا کوئی خرچ بھی نہیں ہے۔ اس کا پیٹرول تک ہماری فرم دیا کرتی ہے۔ اب اور کیا چاہیے؟

"یس سر! اکبر صاحب کے لیے یہ سب بہت ہے۔ میرا ایک مشورہ ہے سر۔"

"وہ کیا؟"

"آپ اکبر صاحب کی شادی کر دیں سر۔ شادی کے بعد وہ بدل جائیں گے۔ میں نے ایسے بہت کیسز دیکھے ہیں۔"

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔" منور صاحب نے کہا۔ "اتنے بڑے گھر میں میرے اور اکبر کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔ صرف ہم دونوں ہیں اور ملازمین کی پوری فوج ہے۔ اس کی شادی ہو جائے تو گھر میں ایک عورت آ جائے گی۔"

منور صاحب کی وائف کا انتقال ہو چکا تھا۔ نہ جانے کیوں اس کے بعد انہوں نے دوسری شادی نہیں کی تھی۔ حالانکہ ان کے پاس بہت کچھ تھا۔

میں یہ سوچا کرتا تھا کہ نہ جانے یہ کیسا دستور ہے کہ کچھ لوگوں کے گھر بھرے ہوتے ہیں۔ ماں۔ باپ۔ کئی کئی بچے بیوی اور کبھی کبھی تو دادا دادی نانا نانی وغیرہ بھی۔ اور بے چاروں کے پاس صرف دو یا تین کمروں کا مکان ہوتا ہے جس میں زندگی گزارتے ہیں۔ اس کے برعکس ایسے بھی گھر ہوتے ہیں جن میں ایک میاں بیوی، ملازمین اور کتوں کے علاوہ کوئی نہیں ہوتا اور لمبے چوڑے گھر ہوتے ہیں۔ زندگی کی ہر آسائش ہوتی ہے۔ اس کے باوجود گھر خالی ہوتا ہے۔ جیسے منور صاحب کا تھا۔

فرم کی عمارت میں اکبر کا بھی آفس تھا۔ لیکن وہ کم ہی وہاں بیٹھا کرتا تھا۔ اس نے اپنے کمرے کو ایسا سجا رکھا تھا جیسے کسی فائیو اسٹار ہوٹل کا کمرا ہو۔

ایک دن میں اپنی سیٹ پر تھا کہ میرے انٹر کام کی گھنٹی بج اٹھی۔ نمبر دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی تھی۔ وہ نمبر اکبر کا تھا۔ منور صاحب کی ہدایت یاد آ گئی کہ کسی بھی حال میں۔ اکبر اگر کچھ مانگے تو اسے نہیں دینا ہے لیکن جانا تو تھا۔ میں اپنی سیٹ سے اٹھ کر اکبر کے کمرے میں داخل ہو گیا۔

"بیٹھ جائیں غفران صاحب۔" اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ "آپ سے ایک ضروری کام ہے۔"

میں بیٹھ گیا۔ میرا اندیشہ درست ثابت ہونے جا رہا تھا۔ لیکن اس نے جو بات کی وہ میری توقع کے برعکس تھی۔

"غفران صاحب۔ کل شام چار بجے سے آٹھ بجے تک میں آپ کے ساتھ اسی کمرے میں مصروف رہا تھا۔ آپ مجھے دفتر کے معاملات سمجھا رہے تھے۔ کچھ فائلز دکھا رہے تھے جن پر ڈسکشن بھی ہو رہی تھی۔"

"سمجھ گئے؟"

"نہیں اکبر صاحب۔ میں کچھ نہیں سمجھا۔" میں نے کہا۔

"آپ کو یہ بیان دینا ہے۔" اس نے کہا۔ "میں کل آپ کے ساتھ تھا۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''اکبر صاحب۔ آپ ذرا کھل کر بتا دیں تو میں اچھی طرح سمجھ جاؤں۔''

''ارے صاحب۔ کل مجھ سے ایک حماقت ہوگئی ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''یہ سمجھ لیں کہ یہ ایک پولیس کیس ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایسی کوئی نوبت نہ آئے۔ پھر بھی آپ کو سمجھا رہا ہوں کہ اگر آپ سے پوچھا جائے تو آپ کو یہی کہنا ہے۔''

''کیا معاملہ اتنا سیریس ہے اکبر صاحب؟''

''یہ آپ کا ہیڈیک نہیں ہے۔'' اب اس کے لہجے میں اکھڑپن تھا۔ ''آپ سے جو میں کہہ رہا ہوں۔ اسے یاد رکھیں۔ اس کے علاوہ ایک اور بات بھی یاد رکھیں کہ آپ کسی کو بھی نہیں بتائیں گے کہ میں نے کیا کہا تھا۔ کسی کو نہیں معلوم ہونا چاہیے۔ خاص طور پر ڈیڈی کو۔ ورنہ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہوگی۔ ڈیڈی مجھے نہ جانے کیا سمجھنے لگیں گے۔''

اس کے لہجے میں چھپی ہوئی دھمکی مجھ سے پوشیدہ نہیں تھی۔ اس نے کہا تھا کہ میں نے اگر یہ راز ظاہر کیا تو وہ میرے لیے کچھ بھی کرسکتا ہے۔ میں جانتا تھا کہ اس کی صحبت کن لوگوں کے درمیان ہے۔ میں اس کی کچھ سرگرمیوں سے بھی واقف تھا۔ اگر یہ نہ بھی ہوتا تب بھی وہ ایک پیسے والا لڑکا تھا۔ کسی کے ساتھ کچھ بھی کروا سکتا تھا۔

میں اس سے وعدہ کر کے اپنے کمرے میں چلا آیا۔ بہت بری طرح الجھا ہوا تھا۔

اس نے یقیناً کوئی بڑی واردات کر دی تھی اور اس میں میری گواہی چاہتا تھا تاکہ میں پولیس کو بیان دے سکوں کہ جس وقت واردات ہوئی وہ میرے ساتھ تھا۔ میں انکار بھی نہیں کرسکتا تھا۔ دل چاہا کہ ایک بار دل کڑا کر کے منور صاحب کو بتا ہی دوں لیکن پھر یہ سوچ کر چپ ہوگیا کہ نہ جانے میری اس حرکت کا انجام کیا ہو۔ اکبر جیسا شخص کچھ بھی کرسکتا تھا۔

لیکن کوئی بات نہیں ہوئی۔ حالانکہ اس واردات کی خبر اخباروں میں آگئی تھی لیکن اکبر کا نام نہیں آیا تھا مگر میں یہ جانتا تھا کہ یہ حرکت اسی کی ہوگی۔

جس لڑکی کا مرڈر ہوا تھا میں اس کو جانتا تھا۔ وہ منور ہی کی فیکٹری کے ایک سپروائیزر کی لڑکی تھی۔ میں اس طرح جانتا تھا کہ میں دو تین بار اس لڑکی کو اپنے باپ کے ساتھ دیکھ چکا تھا۔ سپروائیزر نے اس سے میرا تعارف بھی کروایا تھا۔ پھر ایک دن میں نے اس کو اکبر کے ساتھ ایک مہنگے ہوٹل سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

وہ بہت خوش تھی۔ اکبر نے نہ جانے اس غریب کو کیسے خواب دکھائے ہوں گے۔ کیسے کیسے وعدے کیے ہوں گے اور وہ اپنے مستقبل کو شاندار ہوتا دیکھ کر اس کی باتوں میں آگئی ہو گی۔ اس نے اکبر کو اپنا سب کچھ سمجھ لیا ہوگا۔

وہ ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ اس نے تعلیم بھی حاصل کر لی تھی یہ بھی پتا چلا تھا کہ وہ جاب کی تلاش میں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اکبر نے اسی بنیاد پر اسے پھانس لیا ہو۔ وہ جاب تو دلوا ہی سکتا تھا۔

اسی لڑکی کا مرڈر ہوا تھا۔ میں نے اخبار میں اس کی تصویر دیکھ کر اسے پہچان لیا تھا۔ پھر کڑیاں ملتی چلی گئیں۔

اکبر کا مجھے بلا کر یہ سمجھانا کہ وہ اس وقت میرے ساتھ تھا۔ اور اس لڑکی کے ساتھ اکبر کا تعلق جو اتفاقاً میرے علم میں آگیا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ پولیس کو اسی کی تلاش ہو۔ اسی لیے اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اس کی گواہی دوں۔ اگر ایسی کوئی ضرورت ہو تو۔

میں اس کے بعد جب دفتر جاتا تو یہی گمان ہوتا تھا کہ بس کسی دن بھی پولیس والے دفتر میں داخل ہو جائیں گے۔ لیکن کچھ بھی نہیں ہوا۔ کسی نے کچھ بھی نہیں پوچھا۔ ایک بار میں فیکٹری کی طرف بھی گیا۔ اس سپروائزر سے ملنے کے لیے، جس کی لڑکی کے ساتھ یہ ستم ہوا تھا۔

اس سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ بہت ٹوٹ چکا تھا۔ بیٹی کی المناک موت نے اس بے چارے کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔ مجھ سے گلے مل کر وہ بہت دیر تک روتا رہا۔ وہ صرف ایک ہی بات کہہ رہا تھا۔ ''غفران صاحب۔ اگر پتا چل جائے نا کہ کس نے میری بچی کے ساتھ یہ سلوک کیا ہے تو میں اس کے ٹکڑے کر کے رکھ دوں۔''

اس کا مطلب یہ تھا کہ پولیس ابھی تک اس کے قاتل کا پتا نہیں چلا سکی تھی۔ میرا دل چاہا کہ میں اس سے کہہ دوں کہ میں اس لڑکی کے قاتل کو جانتا ہوں۔ لیکن افسوس میں کچھ نہیں کہہ سکا۔ بزدل، بے حس اور بے غیرت بنا ہوا اس کی آہ و بکا سنتا رہا۔ مجھ میں اتنی ہمت ہی نہیں تھی۔

مجبوریاں بھی انسان کو کس نہج پر لے آتی ہیں۔ وہ سچ بولنے کے بھی قابل نہیں رہتا۔ اس کے احساسات صرف اپنے پیٹ کے گرد گھومتے ہیں۔ بس، اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔

میں بہت بوجھل دل سے واپس آگیا۔ اپنے آپ کو مجرم محسوس کرتے ہوئے۔ ایسی شرمندگی کہ جس کا کوئی درماں نہیں۔

پھر ایک دن پولیس آ ہی گئی۔ دفتر کے چپراسیوں نے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

آ کر یہ خبر دی تھی کہ دفتر میں پولیس آئی ہے اور وہ اکبر صاحب کا پوچھ رہی ہے۔ اکبر اس وقت اپنے باس منور کے کمرے میں تھا۔ اس وقت میری عجیب حالت ہو رہی تھی۔ وہ لمحہ آ ہی گیا تھا جب مجھے اکبر کی بے گناہی کا جھوٹا ثبوت دینا تھا۔

تین چار پولیس والے تھے۔ ان میں سے ایک بڑا آفیسر بھی تھا۔ وہ سب سیدھے منور صاحب کے کمرے میں چلے گئے تھے۔ جبکہ میں دم سادھے بیٹھا رہا تھا۔ پولیس والے کسی بھی لمحے میرے پاس آنے ہی والے تھے لیکن کچھ بھی نہیں ہوا۔ بہت دیر بعد پولیس واپس چلی گئی۔ بغیر مجھ سے کچھ پوچھے۔ بغیر اکبر کو ساتھ لیے۔ واپس چلے گئے۔

کچھ دیر بعد اکبر اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ کوئی ہلچل نہیں مچی۔ کوئی ہنگامہ نہیں ہوا۔

دو دنوں کے بعد خود اکبر نے مجھ سے کہا۔ ”غفران صاحب۔ اس دن پولیس والے دماغ خراب کرنے آئے تھے۔ واپس چلے گئے۔ ہاں۔ آپ سے تو کچھ نہیں پوچھا تھا؟“

”نہیں وہ میرے پاس نہیں آئے تھے۔“ میں نے بتایا۔

”اب وہ آئیں گے بھی نہیں۔ آپ اپنا کام کرتے رہیں۔“

بعد میں پتا چلا کہ یہ سب دولت کے کرشمے تھے۔ دولت جو سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کی قوت رکھتی ہے۔ جو حاضر کو غائب اور غائب کو حاضر کر دیتی ہے۔

ایک دن منور صاحب نے مجھے اپنے کمرے میں بلا کر بتایا۔ ”غفران صاحب، کیا میں آپ کو اس قابل سمجھ سکتا ہوں کہ آپ پر پورا بھروسا کیا جا سکے؟“

”سر۔ میرا خیال ہے کہ میں نے ہمیشہ خود کو ایسا ہی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔“ میں نے کہا۔

”ہاں۔ اسی لیے تو آپ سے مشورہ لے رہا ہوں۔“ منور صاحب نے کہا۔ ”لیکن اس شرط کے ساتھ کہ آپ کسی کو نہیں بتائیں گے۔“

”آپ اطمینان رکھیں سر۔ کسی کو بھی پتا نہیں چلے گا۔“

”اچھا یہ بتائیں۔ آپ نے کچھ دن پہلے ایک درخواست دی تھی کہ آپ کو اپنے مکان کی چھت ڈلوانی ہے۔“ منور صاحب نے اچانک ایک دوسری کہانی چھیڑ دی تھی۔

”یس سر۔“

”تو کیا ہوا اس چھت کا؟“ انہوں نے پوچھا۔

”کچھ نہیں سر۔ ابھی تک تو کچھ نہیں ہوا ہے۔“ میں نے بتایا۔

”چلیں۔ آپ کے لیے میں نے پچیس ہزار کی رقم اپروو کر دی ہے۔“

اس زمانے میں پچیس ہزار روپے بہت ہو جاتے تھے۔ پوری چھت آرام سے پڑ سکتی تھی اور مجھے یہ بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ آخر کیوں۔ اس مہربانی کی کیا وجہ ہے۔ یقیناً کوئی ایسا کام پڑ گیا ہوگا کہ جس کے لیے مجھے رشوت دی جا رہی تھی۔ یہ مہربانی رشوت کے علاوہ اور کیا تھی۔

”بہت مہربانی سر۔“ میں سراپا انکسار بنا ہوا تھا۔

”جائیں۔ پہلے اپنے پیسے لے لیں۔ پھر آپ سے بات ہوگی۔“

اس دن منور صاحب نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ لیکن کوئی ایسی بات ضرور تھی جو سمجھ میں تو نہیں آ رہی تھی لیکن میں نے خود کو ذہنی طور پر تیار کر لیا تھا۔ دو چار دنوں کے بعد منور صاحب نے مجھے پھر اپنے کمرے میں طلب کر لیا۔ اس بار میں تیار ہو کر گیا تھا۔

”غفران صاحب، میں آپ سے جو کچھ کہنے جا رہا ہوں وہ بہت سیکرٹ ہے اور آپ سے اُمید کرتا ہوں کہ آپ نہ صرف اس کو راز رکھیں گے۔ بلکہ میرا ساتھ بھی دیں گے۔“

”فرمائیں سر۔“ میں نے کہا۔ ”میں حاضر ہوں۔“

”غفران صاحب۔ معاملہ یہ ہے کہ اکبر سے ایک غلطی ہو گئی ہے جس کی بنا پر اسے جیل جانا پڑے گا۔ کیس ایسا ہے کہ میں اس کی جان نہیں چھڑا سکتا۔“

”سر۔ بتائیں۔ میں کیا مدد کر سکتا ہوں؟“ میں نے پوچھا۔

”آپ وہ الزام اپنے سر لے لیں۔“ منور صاحب نے کہا۔

”کیا؟ میں حیران ہو کر ان کی طرف دیکھتا رہ گیا تھا۔

منور صاحب کے چہرے پر شرمندگی کے آثار تھے۔

”غفران صاحب، مسئلہ یہ ہے کہ اکبر میری اکلوتی اولاد ہے۔ نوجوان ہے۔ اس سے غلطی ہو گئی۔ آپ فکر نہ کریں۔ آپ کی غیر موجودگی میں آپ کے گھر والوں کا پورا خیال رکھا جائے گا۔ اور صرف پانچ چھ مہینوں کی تو بات ہے۔ اس کے علاوہ میری کوشش ہوگی کہ یہ بھی نہ ہو۔ میری بات سمجھ رہے ہیں نا۔“

اب میں نے زندگی میں پہلی بار منور صاحب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کی۔ میں نے کہا۔ ”منور صاحب میں تو سمجھ گیا ہوں لیکن آپ نہیں سمجھے۔ میرے پاس بھی بیوی ہے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اور میرا بھی ایک ہی بیٹا ہے۔ ہم میں سے ہر ایک اپنی اولاد سے محبت کرتا ہے۔ لیکن معاف کیجیے گا سر۔ آپ اپنی اولاد سے محبت نہیں کر رہے۔ اس کے حق میں کانٹے بو رہے ہیں۔ کب تک اسے قانون سے بچائے رکھیں گے۔ کب تک اس کی جگہ کسی اور کو قربانی کا بکرا بنائیں گے۔ اور میری بات یاد رکھیں۔ آپ اولاد کے روپ میں ایک سانپ کو پال رہے ہیں اور اسے جب بھی موقع ملے گا۔ آپ کو ڈس لے گا۔''

منور صاحب کے تیور بدل گئے۔ ''مسٹر غفران کیا تم زیادہ نہیں بول رہے ہو؟''

''بول رہا ہوں سر۔ زیادہ ہی بول رہا ہوں۔ لیکن جو کچھ بھی بول رہا ہوں وہ آپ کی بھلائی کے لیے بول رہا ہوں۔ کیوں کہ میں نے برسوں آپ کا نمک کھایا ہے۔ میں آپ کے حکم پر جیل بھی جانے کو تیار ہوں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میں ایک بار پھر کہوں گا کہ آپ اکبر صاحب کو سنبھالنے کی کوشش کریں۔ ایک دن ایسا ہوگا کہ سب کچھ ہاتھ سے نکل جائے گا۔ ہوسکتا ہے کہ انہوں نے آج جو جرم کیا ہے اس کی سزا صرف چھ مہینے ہو۔ لیکن اگر کل انہوں نے کوئی ایسی بات کردی کہ جس کی سزا پھانسی ہے تو کیا اس وقت بھی آپ کسی مجبور کو تلاش کریں گے کہ اس کی جگہ وہ پھانسی پر چڑھ جائے''

میرا دل چاہا کہ اسی وقت منور صاحب کو بتا دوں کہ صاحب زادے ایک لڑکی کا خون کر چکے ہیں۔ لیکن میں منور صاحب کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس آدمی کی زندگی میں یہ پہلا موقع ہوگا کہ کسی نے اس تیور کے ساتھ بات کی ہوگی۔ اب مزید دکھ دینے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اور یہ بھی ممکن تھا کہ یہ بات ان کے علم میں ہو۔ اس دن جو پولیس والے دفتر آئے تھے۔ انہوں نے بتا ہی دیا ہوگا۔ پتا نہیں کیسے باپ تھے جو ہر حال میں بیٹے کی طرف داری کیے جا رہے تھے۔

''اچھا جائیں۔ اپنے کمرے میں جائیں۔'' منور صاحب نے کہا۔

میرا خیال تھا کہ اس دفتر میں یہ میرا آخری دن ہوگا۔ لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ منور صاحب نے اس کے بعد پھر کوئی بات نہیں کی۔ ہوسکتا ہے کہ اس کے بعد کسی طرح انہوں نے معاملہ رفع دفع کرا دیا ہو۔

دولت کی کنجی سے ہر تالا کھل جاتا ہے۔ یہ سب میری سمجھ سے بالاتر تھا۔

میں سوچتا ہوں کہ اگر کسی غریب کا بیٹا ہوتا تو اس کا کیا حال ہو جاتا۔ اس کی زندگی عذاب ہو کر رہ جاتی۔

میں اس دفتر سے کہیں اور جانے کا سوچنے لگا تھا۔ کل کچھ اور بھی ہوسکتا تھا۔ کل کسی اور انداز سے کوئی پھندا میرے گلے میں آسکتا تھا۔

ایک دن میں دفتر پہنچا تو پتا چلا کہ منور صاحب بہت بیمار ہیں۔ رات اچانک ان کو برین ہیمرج ہو گیا تھا۔ وہ اسپتال میں ہیں۔ دفتر والے دیکھنے جا رہے تھے۔ میں بھی پہنچ گیا۔ منور صاحب اس آفت سے تو نکل آئے تھے لیکن مفلوج ہو گئے تھے۔ فالج نے انہیں معذور کر دیا تھا۔

وہ ایک مہینا تک اسپتال میں رہے۔ اس دوران دفتر کا کام کسی طرح چلتا رہا۔ منور صاحب کو گھر شفٹ کر دیا گیا۔ لیکن وہ فالج زدہ ہی رہے۔ میں ایک بار دیکھنے گیا تو وہ بستر پر حسرتوں کی تصویر بنے لیٹے ہوئے تھے۔ وہ بول تو سکتے تھے۔ لیکن زبان میں لڑکھڑاہٹ تھی۔ بہت مشکل سے ان کی بات سمجھ میں آتی تھی۔

میں ان کے سرہانے بیٹھ کر ان کی طرف دیکھتا رہ گیا تھا۔ کیا آدمی تھا اور کیا ہو گیا تھا۔

قدرت بھی کیسے کھیل دکھا دیتی ہے۔ وہ آدمی جو کل تک نہ جانے کتنوں کو اپنے اشاروں پر چلاتا تھا۔ آج وہ خود کسی اور کے سہارے کا محتاج تھا۔ وہ اپنی مرضی سے کروٹ بھی نہیں بدل سکتا تھا۔ اٹھ کر بیٹھ بھی نہیں سکتا تھا۔

اور اسی دوران میں نے وہ تماشا دیکھا جس کے لیے میں شروع میں بتا چکا ہوں۔ ایسا تماشا جو میرے لیے اتنا حیرت انگیز تھا کہ میں گنگ ہو کر رہ گیا تھا۔

میں منور صاحب کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک ان کا بیٹا اکبر کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بریف کیس تھا۔ اس نے مجھ پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ باپ کے پاس پہنچ کر اس نے اپنے بریف کیس کو کھول کر کچھ کاغذات نکالے اور منور صاحب کے سامنے رکھ دیے۔ منور صاحب حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''یہ لیں۔ ان پر سائن کر دیں۔'' اس نے کہا۔ ''میں نے وکیل سے پیپرز بنوا لیے ہیں۔''

''کیسے پیپرز ہیں؟'' منور صاحب نے لڑکھڑاتی آواز میں پوچھا۔

''پراپرٹی اور فرم کے کاغذات ہیں۔'' اس نے بتایا۔

''مجھے پتا چلا تھا کہ آپ تھوڑا حصہ اپنی بہن کو دینے جا رہے ہیں۔ اسی لیے میں نے یہ پیپرز تیار کروا لیے ہیں۔ کیوں کہ آپ کا تو کوئی بھروسا نہیں ہے۔ نہ جانے کب دنیا سے چلے جائیں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اسی لیے بہتر ہے کہ سب کچھ میرے حوالے کر جائیں۔''

منور صاحب کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ وہ غصے اور بے بسی کی ایسی کنڈیشن میں تھے کہ میں دنگ رہ گیا تھا۔ کوئی بیٹا ایسا بھی کر سکتا ہے۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ اس کے باپ کی کیا حالت ہو رہی ہے۔ اس کے باوجود اس کا یہ حال تھا۔ اس نے بریف کیس سے ایک قلم نکال کر منور صاحب کے سامنے رکھ دیا تھا۔

''چلیں سائن کریں۔'' اکبر نے کہا۔ ''میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔''

''ن۔نہیں۔ میں یہ نہیں کر سکتا۔'' منور صاحب نے کہا۔

اور اچانک، اچانک اکبر نے اپنا بریف کیس کھول کر ایک پستول نکالا۔ اور اس کی نال منور صاحب کی کنپٹی پر رکھ دی۔ ''جلدی کرو۔ جلدی۔''

اس وقت میری یہ حالت ہو رہی تھی جیسے کسی نے مجھے پتھر ٹائیز کر دیا ہو۔ سکتہ سا ہو گیا تھا۔ جو کچھ بھی ہو رہا تھا۔ وہ تو انتہائی حیرت انگیز تھا۔ ایسا تو شاید فلموں میں ہوتا ہو گا یا کہانیوں میں ہوتا ہو گا۔ یہ ایک باپ اور بیٹے کی کہانی تھی جو میرے سامنے کہی جا رہی تھی۔

اس وقت منور صاحب کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اکبر کا یہ حال تھا کہ اسے اس بات کی بھی پروا نہیں تھی کہ میں اس کے سامنے بیٹھا اس کی یہ حرکت دیکھ رہا ہوں۔ یہ انتہا درجے کی ہٹ دھرمی اور شورہ پشتی تھی جس کا مظاہرہ میرے سامنے کیا جا رہا تھا۔

منور صاحب رو رہے تھے۔ اکبر قلم اور فائل لیے سامنے کھڑا تھا۔ ''جلدی کریں پاپا۔ میں نے بتایا نا کہ میرے پاس وقت نہیں ہے اور آپ کے پاس بھی وقت نہیں ہے۔ نہ جانے کس وقت آپ اللہ کو پیارے ہو جائیں۔ اسی لیے سائن کر دیں۔''

منور صاحب کے ہاتھ بری طرح کانپ رہے تھے۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں اس نالائق اولاد کو اسی کے پستول کو چھین کر گولی مار دوں۔

منور صاحب نے کس طرح ان کاغذات پر سائن کیا ہو گا یہ ان کا دل ہی جانتا ہو گا۔ میں تو ایک بے بس سا چشم دید گواہ تھا۔ کیا حیثیت تھی میری۔ سائن کے مرحلے میں وہ اپنے باپ کی مدد بھی کر رہا تھا۔ یہاں، یہاں سائن کریں۔ ہاتھ سنبھالیں۔ کوئی بات نہیں۔ دوسرا سائن اور ایک یہ۔ اسی قسم کی باتیں کر رہا تھا۔ اس نے اپنا پستول ایک طرف رکھ دیا تھا۔ یعنی اسے اس بات پر یقین تھا کہ میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

منور صاحب کاغذات پر سائن کرنے کے بعد نڈھال سے ہو کر لیٹ گئے۔ اس سے پہلے اس نے ایک ہاتھ کا سہارا دے رکھا تھا۔ اس نے کاغذات اور پستول بریف کیس میں واپس رکھے اور فاتحانہ انداز سے کمرے سے باہر چلا گیا۔

اس نے مجھے لفٹ ہی نہیں دی تھی۔ جیسے میری کوئی حیثیت ہی نہ ہو۔ یا میں اس کمرے میں رکھا ہوا کوئی فرنیچر ہوں۔

منور صاحب اب بری طرح رو رہے تھے۔ میں نے ایک تولیا سے ان کے آنسو پونچھے۔ اور ان سے کہا۔ ''سر جو کچھ ہوا ہے۔ میرے سامنے ہوا ہے۔ میں عدالت میں گواہی دے سکتا ہوں۔''

''ن۔ن۔'' وہ اسی ٹوٹی پھوٹی آواز میں بولے۔ ''تم ایسا نہیں کرو گے۔''

''سر۔ بیٹے کی اسی محبت نے تو اسے تباہ کر دیا ہے۔'' میں تلخ ہو کر بولا۔

''نہیں۔ یہ۔ یہ بات نہیں ہے۔'' منور صاحب نے کہا۔

''تو پھر کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ'' وہ چپ ہو گئے۔

''بتائیں نا سر۔ یہ اگر بیٹے کی محبت نہیں تو اور کیا ہے؟''

''غفران میں نے بھی تو اپنے باپ کے ساتھ ایسا ہی کیا تھا۔'' منور صاحب نے کہا۔

''کیا؟''

''ہاں'' آنسو اور تیزی سے بہنے لگے تھے۔ ''میں نے بھی یہ جائیداد اپنے باپ سے اسی طرح حاصل کی تھی۔'' منور صاحب نے بتایا۔

میں گنگ ہو کر رہ گیا۔ مکافاتِ عمل کا ایسا تماشا میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔ میں پھر منور صاحب کے پاس رکا نہیں۔ واپس آ گیا۔ توبہ کرتا ہوا۔

منور صاحب کا کچھ دنوں بعد ہی انتقال ہو گیا تھا۔

ہو سکتا ہے کہ اس کہانی میں ایسی کوئی خاص بات نہ ہو۔ لیکن یہ واقعہ میرے سامنے کا ہے اور اس نے مجھے یقین دلا دیا ہے کہ قدرت کبھی بھی کسی مجرم کو روزِ حشر میں سزا کے لیے ڈھیل دے دیتی ہے اور کبھی کبھی اسی دنیا میں اس کا حساب برابر کر دیا جاتا ہے۔ خاص طور پر والدین کے ساتھ سلوک کو۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

فیصلہ

محترمہ عذرا رسول
السلام علیکم
آپ کے ڈائجسٹ میں سبق آموز سچی کہانیاں شائع ہوتی ہیں اسی خیال سے میں اپنی زندگی کے ایک اہم واقعے کو کہانی کی شکل میں لکھ کر بھیج رہا ہوں تاکہ دنیا والے سمجھ سکیں کہ ایک فیصلہ ہم کرتے ہیں اور ایک فیصلہ اللہ تعالیٰ بہتر فیصلہ کون سا ہوتا ہے۔
نسیم ریحان
(ملتان)

یہ کہانی بہت عجیب سی ہے۔
عجیب اور مختلف۔ اس کہانی کے زاویے مختلف ہیں۔
اس میں زندگی کسی اور رخ سے سامنے آئی ہے۔
اس کی ابتدا اس دن سے ہوتی ہے جب شہلا نے مجھے بتایا کہ اس کے گھر والے اس کی شادی کہیں اور کرنا چاہتے ہیں۔ شہلا میرے ساتھ میرے دفتر میں کام کرتی تھی۔
اس کے گھر والے لاہور میں رہتے تھے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

Downloaded From Paksociety.com

وہ کراچی میں اپنی خالہ کے یہاں رہ رہی تھی۔ لیکن اس کا مزاج ایسا تھا کہ وہ ہر مہینے خالہ کو اپنی رہائش اور کھانے پینے کے پیسے دے دیا کرتی تھی۔

وہ ایک خوبصورت اسمارٹ لڑکی تھی۔ اس کی شکل و صورت سے زیادہ اس کی باتیں خوب صورت تھیں جن میں ادب اور مزاح کی چاشنی ہوا کرتی۔

محبت کے سلسلے کو تو اسی قسم کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بس ایک نگاہ کی دیر ہوتی ہے اور کیمسٹری چل جاتی ہے۔ ہمارے ساتھ بھی یہی ہوا۔ ہم بہت تیزی سے ایک دوسرے کے قریب ہوتے چلے گئے تھے۔ شام کا وقت ہم ایک ساتھ گزارتے۔

میں اپنے والدین کے ساتھ رہتا تھا۔ میرے والد ایک ریٹائرسرکاری آفیسر ہیں۔ ان کے مزاج میں حاکمیت بہت زیادہ ہے جبکہ والدہ نرم مزاج کی ہیں۔

مجھ سے چھوٹی ایک بہن ہے جو کالج میں پڑھتی ہے۔ ہم کل چار افراد ہیں۔ اس لیے والدہ کو اب ایک بہو کی فکر ہونے لگی تھی۔

''بس، اب بہت دن آزاد رہ لیے۔ اب تمہاری شادی ہو جانی چاہیے۔''

''لیکن امی یہ تو سوچیں کہ ابھی میں نے زندگی میں دیکھا ہی کیا ہے؟''

''بس بہت کچھ دیکھ چکے ہو۔ اب اپنی بیوی کا چہرہ دیکھنا۔''

اس قسم کی باتیں ہوا کرتی تھیں اور میری بہن سدرا امی کو بھڑکاتی رہتی تھی۔ پاپا سے تو بات کرنے کی ہمت نہیں تھی اس میں۔ اور نہ ہی مجھ میں تھی۔ بس امی رہ جاتی تھیں اور وہ ان ہی کے کان بھرتی رہتی۔

دفتر سے فارغ ہونے کے بعد میں اور شہلا باہر نکلتے۔ کسی ریستوران میں جا کر بیٹھ جاتے یا کسی پارک میں سیر کرتے رہتے۔

محبت کے ابتدائی دنوں کی باتیں کتنی خوب صورت ہوتی ہیں اور خواب کتنے سہانے ہوتے ہیں۔ زندگی کتنی مدھم ہو کر چلتی رہتی ہے۔

ہم بہت دیر تک باتیں کرتے رہتے۔ اسے بھی اس بات کا کوئی خوف نہیں ہوتا تھا کہ وہ دیر سے گھر پہنچی تو گھر والے برا بھلا کہیں گے اور نہ ہی اسے اس بات کی پروا ہوتی تھی، ہم دونوں ایک دوسرے کی محبت میں سرشار رہتے تھے۔

سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا کہ ایک دن اچانک شہلا نے ایک خبر سنا دی۔

''میں اگلے ہفتے لاہور جا رہی ہوں۔'' اس نے بتایا۔

''لاہور؟ وہ کیوں؟'' میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''میں نہیں جانتی، ابو نے بلایا ہے۔ وہ تو کہہ رہے تھے کہ دفتر سے چھٹی لے کر کل پرسوں ہی آجاؤ۔ شاید کسی قسم کی ایمرجنسی ہو گئی ہے۔''

''کیسی ایمرجنسی؟''

''یہ تو ابھی نہیں معلوم۔ یہ تو وہاں جا کر ہی پتا چلے گا۔ ویسے میں نے دس پندرہ دنوں کی چھٹی کی بات کر لی ہے۔'' شہلا نے بتایا۔

''یار، تم چلی جاؤ گی تو میں کیا کروں گا؟''

''میرا انتظار۔'' وہ مسکرا کر بولی۔

''ہاں، وہ تو کرنا ہی ہوگا۔''

شہلا چلی گئی۔ شہلا کے جانے کے دو دن بعد والد صاحب نے ایک نادر شاہی فیصلہ سنا دیا۔ ''سنو میاں تمہیں اسی مہینے شادی کرنی ہے۔''

''اسی مہینے شادی۔'' میں سٹپٹا گیا تھا۔

''ہاں اسی مہینے۔ میں نے اپنے دوست جواد کو زبان دے دی ہے تمہیں اس کی بیٹی سے شادی کرنی ہے۔''

''لیکن پاپا، میں تو.....''

''میں کچھ نہیں سننا چاہتا۔ اور میں یہ بھی نہیں سنوں گا کہ تم فلاں لڑکی سے محبت کرتے ہو اور اس سے شادی کرنے کا احمقانہ منصوبہ بنا رہے ہو۔ تمہیں جواد کی بیٹی سے شادی کرنی ہے اور اسی مہینے تمہیں لاہور جانا ہے۔''

''لاہور۔ وہ کیوں؟''

''تاکہ تم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ سکو۔ ایک دوسرے کے پاس آسکو۔ بس اس سے زیادہ میں کچھ نہیں سنوں گا۔ تم اپنے آفس والوں سے کہہ دو کہ تم دس بارہ دنوں کے لیے باہر جا رہے ہو۔''

پاپا کے سامنے کچھ کہنے کی ہمت نہیں تھی۔ اعتراض اور انکار تو بہت دور کی بات ہے۔ میں شہلا کو چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ہم نے زندگی کے بہت سے خواب مل کر دیکھے تھے۔

خدا جانے ایسا کیوں ہوتا ہے کہ زندگی اولاد کو گزارنی ہوتی ہے اور فیصلے والدین مسلط کرتے ہیں۔ اب کیا کروں، ایک امی تھیں ان سے بات کی جا سکتی تھی۔ شاید وہ پاپا کو

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

سمجھانے میں کامیاب ہو جائیں۔

میں نے امی سے بات کی تو انہوں نے اس موضوع پر بات کرنے سے انکار کر دیا۔ ''تمہیں نہیں معلوم کہ جواد صاحب تمہارے پاپا کے کتنے گہرے اور پرانے دوست ہیں۔ انہوں نے تمہارے پاپا کا کتنا ساتھ دیا ہے۔''

''تو اس طرح وہ اپنے احسان کا بدلہ اتارنا چاہتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''یہ بات نہیں ہے۔ یہ شادی بہت پہلے سے طے تھی۔ مجھے بھی نہیں معلوم تھا۔ تمہارے پاپا نے خود ہی بات کر کے رکھی ہوئی تھی۔ مجھے بھی اس کی بھنک نہیں ملی تھی۔ اب پتا چلا ہے کہ یہ سب ہو چکا ہے۔''

''لیکن امی فرض کریں اگر میں کسی اور کو پسند کرنے لگا ہوں تو پھر کیا ہوگا؟''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ہوگا وہی جو تمہارے پاپا چاہیں گے۔ اس لیے بیٹا دیوار سے سر مت ٹکراؤ۔ وہ لاہور جانے کے لیے کہہ رہے ہیں۔ چلے جاؤ، ہاں ایک کام ہو سکتا ہے۔'' امی کچھ سوچنے لگی تھیں۔

''بتائیں امی، جلدی بتائیں۔''

''تم لاہور جاؤ، اس لڑکی کو دیکھو، اس کے بعد کوئی بہانہ بنا کر انکار کر دینا۔ اس سے کم از کم یہ ضرور ہوگا کہ تمہارے پاپا کو اس بات کا یقین ہو جائے گا کہ ان کے بیٹے نے ان کی بات مان لی تھی۔ ان کے کہنے پر لاہور چلا گیا جا کر لڑکی سے بھی مل لیا۔ اب وہ پسند ہی نہیں آئی تو اس کا کیا ہو سکتا ہے۔''

''ہاں، یہ ٹھیک ہے۔'' میں نے امی کی تائید کی۔

''یہی راستہ بہتر ہے۔''

''تو میں تمہارے پاپا سے جا کر کہہ دوں کہ تم لاہور جانے کے لیے تیار ہو۔''

''ہاں، بتا دیں۔ کیونکہ اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے۔''

پھر میری اس کہانی میں ایک اور موڑ آ گیا۔ لاہور سے شہلا کا فون آ گیا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''نسیم! تم جلد سے جلد لاہور آ جاؤ، ورنہ قیامت ہو جائے گی۔''

''کیوں، کیا بات ہو گئی؟''

''گھر والے فوری طور پر میری شادی کر رہے ہیں۔'' اس نے ایک اور خبر سنا دی۔ ''جلدی آ جاؤ۔ دیر ہو گئی تو میں کہیں اور چلی جاؤں گی۔''

''ایسا تو میں ہونے ہی نہیں دوں گا۔'' میں نے کہا۔

''لیکن یہ بتاؤ کہ ہم کیا کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ میرے ساتھ بھی ایک پرابلم ہو گئی ہے۔''

''وہ کیا ہے؟''

''وہ بھی بہت عجیب ہے شہلا۔'' میں نے بتایا۔

''میں نے اسے ساری سچویشن بتا دی۔''

''میرے خدا۔'' وہ حیران رہ گئی تھی۔ ''یہ تو عجیب بات ہوئی۔ تم نے انکار نہیں کیا؟''

''انکار تو کرنا ہے۔ لیکن ابھی نہیں۔ میں لاہور آ کر اس لڑکی سے ملوں گا۔ اس کے بعد انکار کر دوں گا۔ یوں سمجھ لو کہ فارمیلٹی پوری کر کے انکار کروں گا۔''

''نہیں، ایسا مت کرنا۔ ایک بار اس گھر میں پہنچ گئے تو پھر وہاں سے نکلنا مشکل ہو جائے گا۔ تم یہ بتاؤ، تم نے اس لڑکی کو دیکھا ہے؟''

''نہیں، نہ تو اس کو دیکھا ہے اور نہ ہی اس کی کوئی تصویر دیکھی ہے۔''

''میری یہ بات یاد رکھنا نسیم کہ تمہارے پاپا ہر حال میں اپنی دوستی نبھانا چاہتے ہیں۔ اسی لیے تم نے اگر لڑکی کو دیکھ لیا تو اس کے بعد اور پھنس جاؤ گے۔''

''تو پھر تم بتاؤ، کیا کروں میں؟''

''تم لاہور اتر کر سیدھا میرے پاس آ جانا۔'' اس نے کہا۔

''یعنی تمہارے گھر آ جاؤں۔''

''نہیں میرے گھر نہیں۔ میرا گھر لبرٹی مارکیٹ کے پاس ہے۔ تم نے وہ مارکیٹ دیکھی ہے؟''

''ہاں کئی بار۔''

''وہاں ایک ریستوران ہے۔ شملہ ریستوران۔ وہاں آ جانا۔ تم لاہور کس وقت پہنچو گے۔''

''تین بجے۔''

''ٹھیک ہے۔ چار بجے تک لبرٹی پہنچ جانا۔ اور جہاں تم کو جانا ہے۔ ان کا فون نمبر تو ہوگا تمہارے پاس۔''

''ہاں فون نمبر ہے۔''

''بس ان کو فون کر کے بتا دینا کہ تم لاہور اتر کر اپنے کسی دوست کے پاس آ گئے ہو۔''

میں ہنس پڑا۔ ''لگتا ہے تم ساری پلاننگ کر کے بیٹھی ہو۔''

''اور بھی بہت کچھ ہے۔ تم ملو تو بتاتی ہوں۔'' اس

WWW.PAKSOCIETY.COM

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف

ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ

کتاب کی مُختلف سائزوں میں اپلوڈنگ

ایڈ فری لنکس

ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر

ناولز اور عمران سیریز کی مُکمل رینج

Click on http://paksociety.com to Visit Us

پاک سوسائٹی کو فیس بُک پر جوائن کریں http://fb.com/paksociety

پاک سوسائٹی کو ٹوئٹر پر جوائن کریں http://twitter.com/paksociety1

پاک سوسائٹی کو گُوگل پلس پر جوائن کریں https://plus.google.com/112999726194960503629

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بُک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بُک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

http://paksociety.com

Downloaded From Paksociety.com

نے کہا۔

یہ کہانی کا ایک اور موڑ تھا۔ مجھے اپنے پاپا کے دوست کے گھر جانے کے بجائے شہلا کے پاس جانا تھا اور اس نے نہ جانے کیا سوچ رکھا ہوگا۔ بہرحال یہ تو طے تھا کہ مجھے اپنا جیون ساتھی شہلا ہی کو بنانا ہے۔ امی بھی نیم رضامند تھیں۔ بس پاپا کو کسی طرح اطمینان دلانا تھا کہ میں نے ہر طرح حکم کی تعمیل کی۔ لیکن کیا کیا جائے کہ وہ لڑکی ہی مجھے پسند نہیں آئی۔

پاپا نے ریل کا ٹکٹ بھی منگوالیا اور میں لاہور کے لیے روانہ ہوگیا۔ اس دوران شہلا سے رابطہ ہوتا رہا تھا۔

میں نے اسے بتا دیا کہ میں اگلے دن لاہور پہنچ رہا ہوں۔ ٹرین اپنے مقررہ وقت پر لاہور پہنچی تھی۔ میرے پاس سامان کے طور پر صرف ایک مختصر سا بیگ تھا۔ میں وہ اٹھا کر لاہور آگیا جن لوگوں نے لاہور دیکھا ہے۔ انہیں یہ اندازہ ہوگا کہ لبرٹی مارکیٹ لاہور کا ایک خوب صورت علاقہ ہے۔

شملہ ریستوران ایک خوب صورت پُرسکون ریستوران ہے۔ میں وہاں جاکر بیٹھ گیا۔ میں نے تھکان دور کرنے کے لیے چائے کا آرڈر دے دیا تھا۔

دس پندرہ منٹ کے بعد شہلا بھی آگئی۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس نے ایک بڑا سا بیگ اٹھا رکھا تھا جیسے سفر پر جارہی ہو۔

ہم کئی دنوں کے بعد ملے تھے۔ اسی لیے بہت دیر تک ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر جب ہم بیٹھ گئے تو میں نے پوچھا۔ ''تم اس بیگ میں کیا لائی ہو؟''

''اس میں میرے کپڑے ہیں۔'' اس نے بتایا۔

''اور کچھ ضروری کاغذات ہیں۔ کیونکہ ہم ابھی اور اسی وقت پنڈی جارہے ہیں۔''

''پنڈی۔'' میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''کیوں ہم پنڈی کیوں جارہے ہیں؟''

''سب بتا دوں گی۔ پہلے یہ بتاؤ، تم نے فون کرکے ان لوگوں کو بتا دیا کہ تم ایک دو دنوں کے لیے اپنے کسی دوست کے پاس رک گئے ہو۔''

''نہیں، اس کا وقت ہی نہیں ملا۔'' میں نے بتایا۔

''چلو، ابھی فون کرو۔ میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گی۔''

میں نے فون کرکے پاپا کے دوست کے گھر والوں کو اطلاع کردی۔ انہوں نے کہا کہ میں نے فون کرکے اچھا کیا ورنہ وہ میرا انتظار کرتے رہتے۔

''ہاں اب بتاؤ، کیا کہنا ہے، ہم پنڈی کیوں جارہے ہیں؟''

''پنڈی میں میری ایک دوست ہے نائلہ۔'' شہلا نے بتایا۔ ''وہ پہلے لاہور ہی میں تھی۔ پچھلے سال اس کی شادی ہوئی ہے۔ میں اس کے شوہر کو بھی جانتی ہوں۔ بہت کھلے دل کا اور ساتھ دینے والا آدمی ہے۔''

''تو پھر، اس سے کیا ہوگا؟''

''سنتے تو رہو۔ ہمیں دو تین دن ان ہی کے گھر رہنا ہے۔ اس دوران وہ ہمارے سارے ڈاکومنٹس تیار کروا دے گا۔''

''کیسے ڈاکومنٹس؟''

''اس لیے کہ ہم پنڈی جاکر کورٹ میرج کرلیں گے۔'' شہلا نے بتایا۔

''کیا؟ کورٹ میرج! کیا پاگل ہوگئی ہو، یہ کیسے ہوسکتا ہے؟''

''کیوں نہیں ہوسکتا۔ کیا ہم دونوں ایک دوسرے کے بغیر رہ سکتے ہیں؟ کیا ہم نے ایک ساتھ جینے مرنے کی قسمیں نہیں کھائیں؟ کیا ہم دونوں ایک دوسرے کے مزاج سے واقف نہیں ہیں؟ جس طرح ہم نے ایک دوسرے کا ساتھ دیا ہے کیا اور کوئی دے سکتا ہے؟''

''نہیں، ایسا تو نہیں ہوسکتا۔ کوئی بھی اس خلا کو پُر نہیں کرسکتا۔''

''تو پھر کس بات کی گھبراہٹ ہے؟ میں لڑکی ہوکر سب کچھ فیس کرنے کو تیار ہوں۔ کیا تم نہیں کرسکتے۔''

میں سوچ میں پڑ گیا۔ شہلا نے ایک الجھن میں ڈال دیا تھا۔ وہ لڑکی میری خاطر اپنا گھر بار چھوڑ آئی تھی اور میں سوچ ہی رہا تھا کہ کیا کروں کیا نہ کروں۔

اگر میں اس کی بات مان لیتا تو یہی ہوسکتا تھا کہ پاپا بہت بری طرح ناراض ہوجاتے۔ لیکن کب تک۔ میں نے ایسے کئی کیسز دیکھے تھے کہ والدین پسند کی شادی کرنے پر ناراض بھی ہوئے پھر کچھ دنوں کے بعد ان کی ناراضگی ختم بھی ہوجاتی ہے۔ اولاد پھر اولاد ہوتی ہے۔

اور اگر میں شہلا کی بات نہیں مانتا تو پھر زندگی بھر اس بات کا قلق رہتا کہ میں نے اپنی محبت کم کردی۔ لہٰذا میں نے شہلا کا بلکہ محبت کا ساتھ دینے کا فیصلہ کرلیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

بادامی باغ کے اڈے سے ہمیں پنڈی جانے والی بس مل گئی۔

اس وقت ایک عجیب سی خوشی بھی ہو رہی تھی اور ایک افسوس سا بھی تھا۔ شہلا میرے ساتھ چلتی ہوئی ایسی لگ رہی تھی۔ جیسے دو میاں بیوی لاہور سے پنڈی جا رہے ہوں۔

بس میں بیٹھ کر اس کے انداز ہی بدل گئے تھے۔ جیسے وہ واقعی میری بیوی ہو۔ میں اس طرح اس کی دیکھ بھال کر رہا تھا جیسے شوہر اپنی بیوی کی کرتا ہے۔

میں نے اس کو جوس لا کر دیا۔ اس کے لیے بسکٹ منگوائے۔ بس میں طرح طرح کے مسافر تھے۔ ہمارے برابر والی سیٹ پر ایک نوجوان لڑکی تھی جو ایک نوجوان کے ساتھ سفر کر رہی تھی۔

میں اس کا ذکر اس لیے کر رہا ہوں کہ وہ ایک خوب صورت لڑکی تھی۔ بلکہ شاید شہلا سے بھی زیادہ خوب صورت تھی۔ شہلا کے حسن میں مغربیت کی جھلک ہے جبکہ اس لڑکی کے چہرے اور اس کے انداز میں مشرقیت تھی۔

ایک صاحب ایسے بھی تھے جو ہماری پچھلی سیٹ پر تھے اور وہ مسلسل موبائل پر فون کیے جا رہے تھے۔ کچھ سیدھے سادے دیہاتی لوگ تھے۔ عام طور پر اس قسم کی بسوں میں جس قسم کے مسافر ہوا کرتے تھے، ویسے ہی مسافر تھے۔

سفر شروع ہوا۔

زندگی کو ایک نئے موڑ اور ایک نئے زاویے کی طرف ایک نیا سفر۔ نہ جانے کیا ہونے والا تھا۔ لیکن جب محبت ہم سفر ہو تو پھر انجام پر کہاں نظر ہوتی ہے۔

مغرب کے بعد اندھیرا چھا گیا تھا۔ اس لیے باہر کے مناظر دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ بس کے اندر روشنی تھی اور ریکارڈنگ ہو رہی تھی۔ بے تکے قسم کے گانے مسافروں کو بہلانے کے لیے سنائے جا رہے تھے۔

میں اور شہلا جس طرح ایک دوسرے میں مگن تھے۔ اسی طرح وہ جوڑا بھی مگن تھا جس کا ذکر کر چکا ہوں۔ دونوں کا تعلق اچھے گھرانوں سے لگتا تھا۔ نہ جانے دونوں کے درمیان کیا رشتہ ہوگا۔ خدا جانے میں ان دونوں کے بارے میں کیوں سوچے جا رہا تھا۔

بہت دیر کے سفر کے بعد بس گجرانوالہ کے ایک ہوٹل پر رک گئی۔ یہاں بس کو بیس منٹ رکنا تھا۔

''کچھ کھانے کے لیے لا دوں؟'' میں نے شہلا سے پوچھا۔

''نہیں۔ میں نیچے اتر کر تھوڑا سا واک کرنا چاہتی ہوں۔'' اس نے بتایا۔ ''ٹانگیں سن ہو گئی ہیں۔''

''آجاؤ۔'' میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

ہم نیچے آ گئے۔ کچھ دیر تک بس کے آس پاس ہی ٹہلتے رہے اور اسٹاپ کی رونقیں دیکھتے رہے۔ کنڈیکٹر نے جب آواز لگائی تو ہم پھر بس میں آ کر بیٹھ گئے۔

گجرانوالہ کی روشنیوں سے نکل کر بس پھر اندھیرے میں سفر کرنے لگی۔ دونوں طرف شاید کھیت تھے۔ اسی لیے مکمل اندھیرا چھایا ہوا تھا۔

شہلا کو شاید نیند آ رہی تھی۔ اس نے اپنا سر میرے شانے سے ٹکا دیا۔ بالکل کسی بیوی کی طرح بڑے چاؤ اور مان کے ساتھ۔

بالکل ایسی ہی حرکت سامنے بیٹھے ہوئے نوجوان نے بھی کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس خوب صورت لڑکی نے اس کا سر اپنے شانے سے ہٹا دیا تھا۔

میں یہ سب دیکھتا رہا تھا۔ اور سفر جاری تھا کہ بس کو ایک جھٹکا لگا اور وہ اچانک رک گئی۔ حالانکہ وہ جہاں رکی تھی وہاں ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔

''بھائیوں، ڈاکوؤں نے ہمیں گھیر لیا ہے۔'' ڈرائیور نے بلند آواز میں بتایا۔ ''اللہ پر بھروسا رکھو، وہ ہماری مدد کرے گا۔''

پوری بس میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔

کچھ عورتوں نے رونا شروع کر دیا تھا۔ کچھ مرد جلدی جلدی کلمہ وغیرہ کا ورد کرنے لگے۔

''یہ کیا مصیبت آ گئی؟'' شہلا نے رونا شروع کر دیا۔

''حوصلہ رکھو، یہ لوگ پیسے ویسے لے کر چلے جائیں گے۔'' میں نے کہا۔

بس سے باہر سات آٹھ افراد ٹارچ روشن کیے اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ وہی ڈاکو تھے۔ ان میں سے دو ڈاکو بس کے اندر داخل ہو گئے۔ ان کے پاس اسلحہ تھا۔ ایک ڈرائیور کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا جبکہ دوسرا دروازے کے پاس کھڑا تھا۔ اس کی نگاہیں مسافروں پر لگی ہوئی تھیں۔

ایک جھٹکے کے ساتھ بس کے آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ پھر بس کو جھٹکے لگنے لگے۔ اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ لوگ بس کو سڑک سے اتار کر کھیتوں میں لے جا رہے تھے تاکہ کسی کو پتا نہ چل سکے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

بے پناہ خوف نے سب کے اعصاب منجمد کر دیے تھے۔ میں نے اس قسم کی داستانیں سن رکھی تھیں۔ آئے دن ایسی خبریں آیا کرتی تھیں۔ لیکن یہ اندازہ کہاں تھا کہ ایسا ہی ایک حادثہ خود ہمارے ساتھ ہو جائے گا۔

شہلا نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ وہ واضح طور پر کانپ رہی تھی۔ یہی حال ہم سبھوں کا تھا۔ میں نے سامنے والی لڑکی کی طرف دیکھا۔ اس کا رنگ فق ہو گیا تھا اور اس سے زیادہ برا حال اس کے ساتھی نوجوان کا ہو رہا تھا۔

بالآخر بس ایک جگہ رک گئی۔ ہر طرف گھپ اندھیرا۔ نہ جانے یہ کم بخت ہمیں کہاں لے آئے تھے۔ ڈرائیور نے شاید کچھ کہا تھا۔ جس پر اس شخص نے جو ڈرائیور کے ساتھ کھڑا ہوا تھا ڈرائیور کو ایک تھپڑ رسید کر دیا۔ اب بس میں پھیلی ہوئی دہشت اور زیادہ ہو گئی تھی۔

بس کے رکتے ہی چار پانچ اور آ گئے۔ ان میں سے دو کے ہاتھوں میں بڑے بڑے تھیلے تھے۔ بس کے ڈرائیور اور کنڈیکٹر کو سروں پر ہاتھ رکھ کر ایک طرف بٹھا دیا گیا تھا۔

ان ڈاکوؤں کا ایک سرغنہ تھا۔ ان میں سے کسی نے نقاب نہیں لگا رکھی تھی۔ یعنی اتنی دلیری تھی کہ وہ جانتے تھے کہ کوئی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔

سرغنہ پینتیس اور چالیس کے درمیان کا ایک قوی ہیکل شخص تھا۔ جس کی چڑھی ہوئی مونچھیں اس کی شخصیت کو اور خوفناک بنا رہی تھیں۔

''سنو، تم لوگ میری بات سنو۔'' سرغنہ نے مسافروں کو مخاطب کیا۔ ''جس کے پاس جو کچھ بھی ہے۔ وہ تھیلے میں ڈالتا جائے۔ اگر کسی نے کچھ چھپانے کی کوشش کی یا کوئی ہوشیاری دکھائی تو اس کی خیر نہیں ہوگی۔''

تھیلا پکڑے ہوئے ایک ڈاکو نے مسافروں کے سامنے اپنا تھیلا پھیلانا شروع کر دیا۔ مسافر جلدی جلدی اس میں کچھ نہ کچھ ڈالنے لگے۔

پرس، موبائل سیٹ، گھڑیاں، عورتوں سے زیورات بھی لے لیے گئے۔ سرغنہ کی آنکھیں اپنی اس کامیاب کارروائی پر چمکنے لگی تھیں۔

ایک ڈاکو تھیلا لیے ہمارے پاس آ گیا۔ شہلا نے بے بسی سے میری طرف دیکھا۔ ''مجبوری ہے شہلا۔ دے دو ان کو۔''

اس نے اپنا موبائل سیٹ اور اپنے بیگ سے ایک والٹ نکال کر اس تھیلے میں ڈال دیے۔ وہ اب اس خوب صورت لڑکی کے پاس پہنچ گیا۔

لڑکی نے اپنا والٹ اس کے تھیلے میں ڈالنا چاہا کہ اسی وقت سرغنہ کی آواز گونجی۔ ''رک جاؤ۔ نہیں لڑکی، تم کچھ نہیں دو گی۔ تمہیں کچھ نہیں دینا ہے۔''

ہم سب حیران رہ گئے۔ اس لڑکی پر یہ کیسی مہربانی تھی۔

''تمہیں میں نے اپنے لیے پسند کر لیا ہے۔'' سرغنہ کی آواز گونجی۔ ''میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔''

''نہیں۔'' لڑکی پر لرزہ طاری ہو گیا تھا۔ وہ بری طرح رونے لگی تھی جبکہ اس کے ساتھ کے نوجوان کی حالت اس سے بھی زیادہ خراب تھی۔

''چلو میرے ساتھ۔ اترو نیچے۔'' وہ سرغنہ لڑکی کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے لڑکی کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ ''جلدی کرو۔''

لڑکی نے روتے ہوئے بے بسی کے ساتھ اپنے ساتھی نوجوان کی طرف دیکھا۔ وہ خود سناٹے میں تھا۔

پھر اچانک نہ جانے مجھے کیا سوجھی کہ میں اپنی سیٹ سے کھڑا ہو گیا۔ ''نہیں سردار!'' میں نے سرغنہ کو مخاطب کیا۔ ''ایسا مت کرو، چھوڑ دو اس لڑکی کو۔''

''اوہو۔'' سرغنہ نے طنزیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا پھر اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا۔ ''ارے بھائیو، اس بس میں ایک ہیرو بھی بیٹھا ہوا ہے جو مرنے کو تیار ہے۔'' پھر میری طرف دیکھا۔ ''یہ لڑکی کیا لگتی ہے تیری؟''

''کچھ بھی نہیں۔ میں اسے جانتا بھی نہیں ہوں لیکن اس بات پر افسوس ہو رہا ہے کہ تم جیسا ایک دلیر اور شیر جیسا انسان ایک بے بس لڑکی کو اپنے قابو میں کرنے کی بات کر رہا ہے۔''

''اوہو۔'' سرغنہ کے تیور ڈھیلے پڑ گئے۔

نہ جانے کس طرح میرے ذہن میں یہ بات آ گئی تھی۔ شاید خدا ہی کی طرف سے آیا تھا کہ میں جملہ کہہ جاؤں۔ میں نے اوکھلی میں سر تو دے ہی دیا تھا۔

شہلا کا یہ حال تھا کہ اس نے بہت سختی سے میرا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے کہہ رہی تھی۔ ''خدا کے لیے بیٹھ جاؤ، کیا کر رہے ہو یہ گولی مار دیں گے۔''

وہ لڑکی اس وقت جن نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ میں بتا نہیں سکتا۔ کیا کیا نہیں ہو گا ان نگاہوں میں۔ احترام، عقیدت، محبت اور پتا نہیں کیا کچھ۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

خدا اس وقت ہماری مدد کرنے پر مائل تھا۔ حالانکہ ایسا ہوتا نہیں ہے لیکن ہوگیا تھا۔ میری باتوں نے اس سرغنہ پر اتنا اثر کیا کہ اس نے لڑکی کا ہاتھ چھوڑ دیا اور میری طرف دیکھ کر بولا۔ ''جوان، مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ بیجڑوں کی اس بھیڑ میں ایک مرد کا بچہ بھی بیٹھا ہے۔ جا تیرے صدقے میں نے چھوڑ دیا سب کو۔'' پھر اپنے ساتھیوں سے بولا۔ ''چلو، جس جس سے جو سامان لیا ہے، وہ سامان واپس کردو۔''

اب پوری بس کی فضا ہی کچھ اور ہوگئی۔ خوف اور دہشت کا جو غلبہ تھا۔ وہ ختم ہو چکا تھا۔ اب سب کے رنگ بحال ہو چکے تھے۔

جس ڈاکو نے اپنے تھیلے میں مسافروں کے سامان بھرے تھے۔ وہ سب واپس کرنے شروع کردیے۔ سرغنہ میرے پاس آیا۔ اس نے میرے شانے پر تھپکی دی اور کچھ کہے بغیر بس سے اتر گیا۔ دوسرے ڈاکو چلے گئے تھے۔ ان کے جاتے ہی بس میں ہلچل سی مچ گئی۔

لوگ اپنی اپنی سیٹ سے اتر کر میرے پاس آنے اور معانقہ کرنے لگے۔ ''صاحب، کمال کردیا آپ نے۔''

''باؤجی، میرا گھر آگے ہی ہے۔ آپ ہمارے مہمان رہیں جی، بس دو دن۔''

''صاحب، آپ نے ایسی ہمت دکھائی ہے کہ ایسی ہمت کا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔''

ڈرائیور اور کنڈیکٹر بھی میرے پاس آگئے تھے۔ ڈرائیور مجھ سے ہاتھ ملا کر اپنی سیٹ کی طرف چلا گیا تھا۔ بس روانہ ہوئی تو وہ لڑکی اپنی سیٹ سے اٹھ کر میرے پاس آگئی۔ وہ اظہار تشکر کے طور پر میرے قدموں میں سیٹ کے نیچے ہی بیٹھ گئی تھی۔

''ارے یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟'' میں جلدی سے بولا۔ ''کھڑی ہوجائیں۔''

''نہیں، آپ نے آج میرے لیے جو کچھ بھی کیا ہے، اس کے لیے تو میں آپ کے قدموں میں جان بھی دے سکتی ہوں۔ حالانکہ یہ بھی میرے ساتھ تھے۔'' اس نے اپنے ساتھی نوجوان کی طرف دیکھا۔ ''لیکن یہ ایک لفظ بول بھی نہیں سکے۔''

''کیا کرتا میں۔ تم تو جانتی ہو کہ یہ لوگ ذرا ذرا سی بات پر گولی مار دیتے ہیں۔'' اس نوجوان نے تنک کر کہا۔

''تو گولی کا ڈر تو ان کو بھی ہونا چاہیے۔'' لڑکی نے میری طرف اشارہ کیا۔

نوجوان میرا شکریہ ادا کر کے اپنی سیٹ پر جا کر بیٹھ گیا۔ لڑکی بھی اٹھ کر چلی گئی تھی۔ شہلا کا یہ حال تھا کہ وہ جیسے مجھ پر قربان ہوئی جا رہی ہو۔

میں تو پہلے ہی اس کے لیے بہت کچھ تھا۔ اب اور نہ جانے کیا ہوگیا تھا۔

بس نے اپنا سفر دوبارہ شروع کردیا تھا۔ اس وقت میں یہ سوچ رہا تھا کہ کیا میں نے کوئی حماقت تو نہیں کر دی تھی۔ وہ اس قسم کے بے رحم لوگ ہوتے ہیں۔ وہ مجھے گولی بھی مار سکتے تھے۔ کون پوچھتا ان کو، اس ویرانے میں میری لاش پھینک دی جاتی۔ شہلا واپس لاہور چلی جاتی۔ اور جس لڑکی کو میں نے بچایا ہے وہ دو چار دن مجھے یاد رکھتی، پھر بھول جاتی کہانی ختم ہوجاتی۔

لیکن مجھ سے جو حرکت سرزد ہوگئی تھی۔ اس نے مجھے کتنا مقبول بنا دیا تھا۔ ہر شخص عزت اور احترام سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

آگے جا کر بس ایک اور جگہ رک گئی۔ اس وقت لوگوں کی محبت دیکھنے کے قابل تھی، کوئی میرے لیے جوس لے کر آرہا ہے، کوئی بسکٹ لا رہا ہے، کسی نے چائے کی پیالی پکڑ رکھی ہے۔

یعنی میں اب ایک ہیرو تھا اور دوسرے لوگ ایک ہیرو کی تکریم کر رہے تھے۔ میں نے یہ دیکھا کہ اس لڑکی اور اس نوجوان کے درمیان تناؤ کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔

اس کا اندازہ اس طرح ہوا کہ اسٹاپ پر اتر کر جب وہ نوجوان اس لڑکی کے لیے جوس لے کر آیا تو اس نے انکار کرتے ہوئے اپنا چہرہ دوسری طرف کرلیا۔

نوجوان خفیف سا ہو کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔

بالآخر ہم پنڈی پہنچ گئے۔ اس وقت رات کے گیارہ بجے تھے۔ پیرودھائی کے اسٹاپ پر گہما گہمی تھی۔ مسافر اتر گئے اور میرا شکریہ ادا کر کے اور مجھ سے معانقہ کر کے اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہوگئے۔ ہمیں شہلا کی سہیلی اور اس کے شوہر کا انتظار تھا۔ شہلا نے راستے میں ان سے بات کرلی تھی۔ اس کی سہیلی کا شوہر گاڑی لے کر آنے والا تھا پھر ہم اس کے ساتھ نکل جاتے۔

وہ لڑکی بھی اسٹاپ پر ہی تھی جبکہ وہ نوجوان اس سے کچھ کہہ رہا تھا۔ وہ لڑکی انکار کر رہی تھی۔ پھر وہ لڑکی اپنے ساتھی کو چھوڑ کر ہماری طرف آگئی۔

''پلیز، کیا آپ لوگ میری مدد کریں گے۔ مجھے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

دوسری بس سے واپس لاہور جانا ہے۔'' اس نے بتایا۔

''کیوں نہیں، واپس کیوں جارہی ہو؟'' شہلا نے پوچھا۔

''اس لیے کہ جو شخص ایک مرحلے میں میرا ساتھ نہیں دے سکا، وہ آگے کیا دے گا۔'' اس نے کہا۔

اوہ، میں نے ایک گہری سانس لی۔ اس کے اس جملے نے ساری کہانی واضح کردی تھی۔ وہ بھی شاید اسی راستے کی مسافر تھی جس راستے پر ہم سفر کررہے تھے۔ یعنی وہ بھی شاید گھر سے نکل کر آئی تھی۔

''نام کیا ہے تمہارا؟'' شہلا نے پوچھا۔

''شرمین۔'' اس نے بتایا۔

''شرمین۔'' اب میں نے اسے مخاطب کیا۔ ''دیکھو، رات کا وقت ہے، اس وقت لاہور تک کا سفر خطرناک ہوسکتا ہے۔ ایک بار تو قدرت نے بچالیا۔ کیا ضروری ہے کہ دوسری بار بھی ایسا ہو۔''

''اس حادثے نے میری آنکھیں کھول دی ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''میں بھی بے وقوف ہوں جو اس کی باتوں میں آکر اس کے ساتھ نکل لی۔''

''شرمین، اگر تم کو اعتراض نہ ہو تو پھر تم ایسا کرسکتی ہو کہ رات ہمارے ساتھ گزار لو۔ میری سہیلی اپنے شوہر کے ساتھ آنے والی ہے۔ ہمیں اس کے گھر جانا ہے۔ تم بھی ہمارے ساتھ چلو۔ صبح لاہور واپس چلی جانا۔''

اس دوران وہ نوجوان ہمارے پاس آکر کھڑا ہوگیا۔

''شرمین! چل رہی ہو میرے ساتھ؟''

''نہیں، میں تمہارے ساتھ نہیں جارہی۔'' شرمین دوٹوک لہجے میں بولی۔ ''میں ان لوگوں کے ساتھ جارہی ہوں۔'' اس نے ہماری طرف اشارہ کیا۔

''کیا پاگل ہوگئی ہو۔ اجنبیوں کے ساتھ جانے کی بات کررہی ہو۔''

''کچھ بھی ہو یہ اجنبی تم سے بہتر ہیں۔'' اس نے کہا۔

''تم تو مجھے ڈاکوؤں کے حوالے کرکے جارہے تھے۔''

وہ نوجوان اس کو ایک طرف لے جاکر کچھ کہنے لگا۔ شرمین مسلسل انکار کرتی رہی۔ بالآخر وہ نوجوان شاید برا بھلا کہہ کر اپنے پاؤں پٹختا ہوا ایک طرف روانہ ہوگیا۔ شرمین دوبارہ ہمارے پاس آگئی۔

''میں نے بھگا دیا ہے اس کو۔ اب میں آپ لوگوں کے رحم وکرم پر ہوں۔''

''فکر مت کرو، ہم سے تمہیں کوئی نقصان نہیں ہوگا۔'' شہلا نے کہا۔

''ہاں، اتنا تو یقین ہے مجھے۔''

اسی دوران شہلا کی سہیلی ماہرہ اور اس کا شوہر بھی آگئے۔ اس کا شوہر مجھ سے گلے ملا۔ اس نے اپنا نام جواد بتایا تھا۔ شہلا اور ماہرہ بھی ایک دوسرے سے ملنے لگیں۔

شہلا نے شرمین کا تعارف کراتے ہوئے ماہرہ سے کہا۔ ''ماہرہ یہ میری دوست ہیں شرمین۔ یہ بتا اگر یہ ہمارے ساتھ چلیں تو کیا تیرے گھر میں اتنی گنجائش ہوگی؟''

''ارے کیوں نہیں ہوگی۔'' ماہرہ چہک کر بولی۔ ''میرے دوستوں میں ایک اور دوست کا اضافہ ہوجائے گا۔ اس سے اچھی بات اور کیا ہوگی۔''

دونوں میاں بیوی بہت اچھی نیچر کے تھے۔ شہلا نے جیسا ان کے بارے میں بتایا تھا وہ ویسے ہی تھے۔ صاف دل کے۔ مہمان نواز قسم کے۔

ہم سب ماہرہ اور اس کے شوہر کی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ شہلا ایک سمجھ دار لڑکی تھی۔ اس نے راستے میں شرمین سے کچھ پوچھنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ ویسے وہ سمجھ گئی تھی کہ کہانی کیا ہوسکتی ہے۔

ماہرہ کا گھر سیٹلائٹ ٹاؤن میں تھا۔ یہ ایک اچھا صاف ستھرا علاقہ تھا۔ گھر پہنچ کر ہم سب فریش ہوئے۔ کھانا کھایا۔ اس کے بعد ماہرہ نے شرمین اور شہلا کے لیے ایک کمرا مخصوص کردیا۔

جبکہ میں اور ماہرہ کا شوہر جواد ایک کمرے میں تھے۔ ہم بہت دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے تھے۔ بہت دیر بعد شہلا ہمارے کمرے میں آگئی۔ اسے مجھ سے کچھ باتیں کرنی تھیں۔

ہم دونوں ڈرائنگ روم میں آگئے۔

''کوئی خاص بات ہے کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''شرمین کی ساری کہانی پتا چل گئی ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''وہ جو بندہ تھا۔ وہ اس کے ابو کے دوست کا بیٹا ہے۔ اس نے شرمین سے محبت کے دعوے کیے تھے۔ شرمین اسے بہت بھروسے کے قابل سمجھتی تھی پھر یہ ہوا کہ شرمین کے ابو نے اس کی شادی اپنے کسی اور دوست کے بیٹے سے طے کردی۔ وہ لڑکا کراچی سے آنے والا تھا۔ لیکن اس بندے نے شرمین کو یہ پٹی پڑھائی کہ وہ اس کے ساتھ پنڈی چلے۔ جہاں وہ اس سے کورٹ میرج کرلے گا۔ اس طرح وہ اس

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

شخص کے ساتھ لاہور سے پنڈی کے لیے بس میں بیٹھ گئی اور راستے میں یہ کہانی ہوگئی۔''

''اوہ، یہ تو بالکل ہماری کہانی ہے۔ تم بھی تو اسی طرح میرے ساتھ لاہور سے پنڈی آئی ہو۔''

''اور ایک بات اور سن لو۔ شاید تمہارے ہوش ٹھکانے آجائیں گے۔'' اس نے کہا۔

''وہ کیا ہے؟''

''جولڑکا اس کے لیے کراچی سے آنے والا تھا اس کا نام نسیم ہے۔'' شہلا نے بتایا۔

''کیا؟'' میں تو اچھل ہی پڑا تھا۔ ''کیا کہہ رہی ہو؟''

''اس نے یہی بتایا ہے۔''

''خدا کے لیے اسے لے کر آؤ۔ میں اس سے کچھ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''یہ کہانی تو بالکل عجیب ہوگئی ہے۔''

شہلا شرمین کو لے کر آگئی۔

''شرمین کیا تمہارے والد کا نام حبیب اللہ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں، یہی نام ہے ان کا۔ لیکن آپ کو کیسے معلوم؟''

''کیا تمہارا فون نمبر اور گھر کا ایڈریس یہ ہے۔'' میں نے گھر کا ایڈریس اور فون کا نمبر بتاتے ہوئے کہا۔

''جی ہاں، بالکل یہی ہیں۔ لیکن آپ کیسے جانتے ہیں؟''

میں نے اپنا سر تھام لیا۔ یہ میری کہانی کا ایک اور موڑ تھا۔ بالکل غیر متوقع، حیرت انگیز، نہ سمجھ میں آنے والا الٹ پھیر تھا۔

''خدا کے لیے بتاؤ تو سہی، کیا ہے یہ سب؟'' شرمین نے پوچھا۔

''شرمین تم جس سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھیں اور جس کے خوف سے لاہور سے فرار ہوئی ہو، وہ میں ہی ہوں۔'' میں نے بتایا۔

''کیا؟'' وہ اچھل پڑی تھی۔ ''یہ..... یہ کیسے ہوسکتا ہے؟''

''یہی ہوا ہے۔ اب یہ دیکھو کہ یہ کیسا الٹ پھیر ہے۔ کیا ضروری تھا کہ تم جس بس میں فرار ہو رہی ہو، میں بھی اسی بس میں شہلا کے ساتھ جا رہا ہوں۔ یہ کیسا کھیل ہے، کیسا تماشا ہے۔''

بلوچ کا مفہوم

پنجاب میں لفظ ''بلوچ'' جن افراد کی نشاندہی کرنے کے لیے مختلف انداز میں استعمال ہوتا ہے ان میں مندرجہ ذیل شامل ہیں:

1۔ خاص بلوچ، ایک قوم جو اپنا ماخذ کمران سے ملاتی ہے اور اس وقت کوہ سلیمان کی ترائی میں آباد ہے۔ 2۔ ایک قبیلہ جو تھانیسہ کے نیچے گھنے جنگلوں میں مقیم ہے۔ 3۔ پنجاب کے انتہائی مشرق مغرب کے علاقوں کے علاوہ کوئی بھی اونٹ سوار مسلمان۔ 4۔ ڈیرہ اسماعیل خان کا ایک پٹھان قبیلہ زیادہ تر بلوچ (بل+اوچ-Baluch) کہلاتا ہے۔ یہ امکان بھی ہے کہ یہ محض حقیقی بلوچیوں کا ہی ایک چھوٹا سا گروہ ہو جو پٹھانوں کے ساتھ مسلک ہوگئے لیکن مغربی میدانوں کی بالائی چراگاہوں میں بلوچ پناہ گزینوں نے کاشت کاری کی بجائے اونٹ پالنے اور چرانے کا کام اپنا لیا ہے اور یوں لفظ بلوچ اونٹوں کی پرورش کرنے کے لیے مخصوص ہوگیا۔ یہاں تک کہ سارے پشاور، راولپنڈی، لاہور، امرتسر اور جالندھر اضلاع میں لفظ بلوچ کا استعمال صرف مسلمان اونٹ سوار کے لیے ہی ہوتا ہے، چاہے اس کی ذات کچھ بھی ہو۔ ہر بلوچ کا اونٹ سوار ہونا اور ہر مسلمان اونٹ سوار کا بلوچ ہونا فرض کرلیا گیا ہے۔ سرسا میں ملتان سے آنے والے پنوار راجپوت صرف اونٹ پالنے کی وجہ سے بطور بلوچ جانے جاتے ہیں۔

اقتباس: پنجاب کی ذاتیں

مرسلہ: انیس حیدر، ملتان

ماحول کی آلودگی اور بلند فشارِ خون

امریکن ہارٹ ایسوسی ایشن کے ماہانہ مجلے ''ہائپر ٹینشن'' میں ایک حالیہ تحقیق کے نتائج شائع ہوئے ہیں جن کے مطابق ہائی بلڈ پریشر اور ماحولیاتی آلودگی میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ کوئلے، پیٹرول، ڈیزل اور قدرتی گیس کے جلنے سے پیدا ہونے والی گیسیں اور فضا میں موجود مادی ذرات فشارِ خون بلند کرنے میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ فضائی آلودگی جس قدر زیادہ ہوگی لوگوں میں ہائی بلڈ پریشر کا مرض اتنا ہی زیادہ ہوگا۔ سائنسدانوں نے ہائی بلڈ پریشر کے مریضوں کو مشورہ دیا ہے کہ وہ ایسی جگہوں پر جانے سے احتراز کریں جہاں فضائی آلودگی کی سطح بلند ہو۔ بلند فشارِ خون سے جن گیسوں کا براہِ راست تعلق پایا گیا ہے ان میں سلفر ڈائی آکسائیڈ اور نائٹروجن آکسائیڈز سرفہرست ہیں۔

مرسلہ: کمیل علی، لاہور

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

انڈیا آفس لائبریری

ایسٹ انڈیا کمپنی کے مورخ رابرٹ اورمے نے تقریباً دو سو سال قبل لیڈن ہال اسٹریٹ لندن میں انڈیا آفس لائبریری کے نام سے کتب خانہ قائم کیا جس میں 23 ہزار سے زائد مخطوطے برصغیر کی تہذیب و تمدن علم و ادب پر بے شمار کتابیں جمع ہیں۔ وہ چاہتا تھا کہ مشرقی علوم سے دلچسپی رکھنے والے اس سے استفادہ کر سکیں۔ وہ اگرچہ اپنے خواب کی تعبیر دیکھنے کے لیے زندہ نہ رہا۔ تاہم مرتے وقت کمپنی کے ڈائریکٹروں کی کورٹ کے صدر اور اپنے دوست مسٹر جان رابرٹس کو وصیت کر گیا کہ لائبریری قائم ہو تو اس کی کتابیں اس میں رکھ دی جائیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے 1798ء میں لائبریری قائم کرنے کا فیصلہ کیا اور اس فیصلے کو جامہ عمل پہنانے کی ابتداء 180ء میں ہوئی۔ کمپنی کی طرف سے حکومت بنگال کو لکھا گیا کہ تمام مطبوعہ کتابیں حاصل کی جائیں اور لائبریری قائم کی جائے۔ کتابوں کا ابتدائی اور قیمتی ذخیرہ تین طریقوں سے حاصل کیا گیا۔ اس میں کچھ کتابیں ایسی ہیں جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین سے خریدی گئیں اور کچھ لوگوں نے اپنی طرف سے فراہم کیں۔ لیکن سب سے بڑا ذخیرہ جو درحقیقت انڈیا آفس لائبریری کی بنیاد بنا، ٹیپو سلطان کی لائبریری سے حاصل کیا گیا جو 400 سے زائد جلدوں پر مشتمل تھا۔ اس میں ٹیپو سلطان کے اپنے ہاتھوں کا لکھا ہوا خواب نامہ، ترکی ایران اور فرانس کے ساتھ ٹیپو سلطان کی جو خط و کتابت ہوئی ان کی نقلیں اور ان ممالک سے وصول ہونے والے جوابات پر سلطان کے لکھے ہوئے ارشادات وغیرہ شامل تھے۔ اس لائبریری میں 2000 نادر کتب تھیں۔ ٹیپو سلطان کی لائبریری کی کتابیں آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں اور کلکتے کے فورٹ ولیم کالج میں تقسیم کر دی گئیں۔ 1838ء میں جب فورٹ ولیم کالج ختم ہوا تو اس نے بھی اپنی کتابیں انڈیا آفس لائبریری کو دے دیں۔ اس سے پہلے 1806ء میں لارڈ ولزلے نے کتابوں کی بہت بڑی تعداد لائبریری کے حوالے کی تھی۔ 1819ء میں سنسکرت کے عالم ہنری تھامس کولبروک نے سنسکرت کے دو ہزار مسودے دیے۔ ہندوستان کے سرویئر جنرل سر کولین نے بھی تامل اور دوسری زبانوں کے بیش بہا مسودے اور مخطوطات اور کتابیں فراہم کیں۔ 1870ء میں آرتھر کک نے ویدوں کے بارے میں کچھ مسودے لائبریری کو پیش کیے۔ غرض متعدد مستشرقین

''میں تو پاگل ہو رہی ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''یہ تو حیرت انگیز کہانی ہے۔''

''زندگی کے واقعات کہانیوں سے زیادہ دلچسپ اور حیرت انگیز ہوا کرتے ہیں۔'' شہلا نے کہا۔ ''نہ جانے اس پوری کہانی میں خدا کی کون سی مصلحت پوشیدہ ہو۔ وہ کیا چاہتا ہو۔''

''لیکن آپ دونوں کی کیا کہانی ہے؟'' شرمین نے پوچھا۔

''میں بتاتا ہوں کہ وہ کہانی کیا ہے۔'' میں نے اسے اپنی اور شہلا کی محبت سے لے کر لاہور سے پنڈی کے سفر کی پوری کہانی اور مقصد سے آگاہ کر دیا۔

شرمین بھی اپنا سر تھام کر رہ گئی۔ سب کچھ بہت حیرت انگیز ہو گیا تھا۔ میں جس لڑکی سے شادی کے لیے جا رہا تھا۔ وہ کسی اور کے ساتھ بھاگ رہی تھی اور میں خود بھی کسی اور کے ساتھ تھا۔ عجیب طرح کی شرمندگی، عجیب سا احساس۔ پتا نہیں کیا غلط تھا، کیا صحیح تھا۔

شرمین رو رہی تھی۔ وہ ڈرائنگ روم سے اٹھ کر کمرے میں چلی گئی۔ یہ میری کہانی کا ایسا زبردست موڑ تھا کہ سمجھ سے بعید تھا۔

میں اور شہلا ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہی رہ گئے تھے۔

''اب بتاؤ شہلا، یہ کیسا ڈراما ہے۔ یہ کیسا ٹرننگ پوائنٹ ہے۔ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟'' میں نے پوچھا۔

''شرمین کو اس کے گھر بھیج دیں۔'' شہلا نے کہا۔ ''ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔ وہ گھر پہنچ کر کوئی بھی بہانہ بنا سکتی ہے۔ ویسے اس نے اپنے گھر والوں کو فون تو کر دیا تھا کہ وہ کل دوپہر تک آجائے گی۔ اس کی کسی دوست کے ساتھ کوئی ایمرجنسی ہو گئی ہے۔''

''مجھے اس پر افسوس ہو رہا ہے۔'' میں نے کہا۔

''ظاہر ہے لڑکیاں تو اسی طرح کی بے وقوف ہوتی ہیں۔''

اسی دوران شرمین پھر ڈرائنگ روم میں آگئی، اس کی آنکھیں سوجی ہوئی اور سرخ ہو رہی تھیں جیسے وہ یہاں سے جانے کے بعد روتی رہی ہو اور اب خود کو کسی طرح سنبھال کر ہمارے پاس آگئی ہو۔

''نسیم صاحب، میں آپ سے معافی مانگنے آئی ہوں۔'' اس نے کہا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

نے لائبریری کو مختلف مشرقی علوم سے متعلق بڑی نادر اور قیمتی کتابیں مہیا کیں۔ لائبریری کو سر چارلس ولکنز ایسا لائبریرین میسر آ گیا جو سنسکرت کا بہت بڑا عالم تھا۔ اس نے پہلی مرتبہ بھگوت گیتا کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ 36 برس تک لائبریری سے منسلک رہا اور 86 برس کی عمر میں ریٹائر ہوا۔ 1836ء میں وفات پائی۔ دہلی کے مغل بادشاہوں کی کتابوں کا ایک حصہ بھی اس لائبریری میں شامل ہے۔ سترھویں صدی میں مینڈل سلو نے ہندوستان کا سفر کیا تھا۔ اس نے اپنے سفرنامے میں مغل بادشاہوں کی لائبریری کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ اس لائبریری میں 24 ہزار کے قریب کتابیں ہیں جن کی قیمت 64 لاکھ روپے سے زائد ہے۔ مغلوں کے زوال تک ان کتابوں کا تین چوتھائی حصہ ضائع ہو گیا تھا۔ اس میں اودھ کے کتب خانے کا بڑا حصہ وراجا سندھیا (جس کا دہلی پر قبضہ تھا) کا کتب خانہ، کرناٹک کے نواب کا کتب خانہ، نیز شاہی قلعہ لاہور کے کتب خانے کا بھی کافی حصہ شامل ہے جس میں قرآن پاک کے کچھ نادر نسخے بھی تھے۔ ان میں ایک نسخہ حضرت علیؓ اور ایک نسخہ حضرت امام حسینؓ سے منسوب ہے۔ 1867ء کے بعد کاپی رائٹ ایکٹ شروع ہوا جس کے مطابق اس لائبریری کو یہ حق حاصل تھا کہ ہندوستان سے اردو اور دوسری زبانوں میں شائع ہونے والی ہر کتاب کی ایک جلد انڈیا آفس لائبریری میں منگوائی جانی چاہیے۔ برٹش میوزیم کا اورینٹل شعبہ جس کا کام مشرق کے ہر موضوع پر اہم کتابیں اور مخطوطات جمع کرنا تھا ان کے پاس بھی اردو اور دوسری زبانوں کی کتابوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا تھا۔ 1983ء میں برٹش میوزیم کا یہ شعبہ بھی انڈیا آفس لائبریری کو دے دیا گیا۔ اس طرح انڈیا آفس لائبریری اور برٹش میوزیم کا اورینٹل ڈیپارٹمنٹ مل کر اورینٹل اینڈ انڈیا آفس کہلانے لگا۔ 1994ء میں برٹش میوزیم سے اردو اور دوسری کتابوں کا تمام ذخیرہ انڈیا آفس لائبریری میں منتقل کر دیا گیا۔ اس وقت لائبریری میں مخطوطات کی تعداد 900 ہے۔ لائبریری میں اردو کی پہلی مطبوعہ کتاب کا سیٹ موجود ہے جو 1743ء سے 1798ء تک شائع کی گئی جس کی اشاعت کا مقصد عیسائیت کی تبلیغ تھا۔ 1743ء میں ڈیوڈ ملک کی اردو گرامر شائع ہوئی جو اردو کی پہلی مطبوعہ گرامر ہے۔ اس کا اصل نسخہ انڈیا آفس لائبریری میں محفوظ ہے۔ اس طرح ہیرس کی جوڈکشنری جو 1790ء میں خط نستعلیق میں چھاپی گئی تھی یہ بھی وہاں موجود ہے۔

مرسلہ: عطیہ اکبر۔ کوئٹہ

''مجھ سے کس بات کی معافی؟''

''یہی کہ میں نے آپ کے اعتماد کو دھوکا دیا۔''

''ارے، تم نے میرے اعتماد کو کس طرح دھوکا دیا ہے۔ یہ سمجھ لو کہ میں تو ابھی تم سے ملا ہی نہیں ہوں۔''

''پھر بھی، آپ کو یہ کیسا لگ رہا ہوگا کہ آپ جس کے لیے کراچی سے لاہور آئے، وہ لڑکی کسی اور کے ساتھ فرار ہو رہی تھی۔''

''اور یہ بھی تو دیکھو کہ جو تمہارے لیے آیا تھا وہ خود کسی اور کے ساتھ فرار ہو رہا تھا۔''

پہلی بار اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی تھی۔

اسی دوران ماہرہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ وہ ہم لوگوں کو وہاں دیکھ کر حیران ہو گئی تھی۔ ''ارے کیا ہوا ہے تم لوگوں کو، کیا نیند نہیں آ رہی؟''

''ماہرہ، ہم ایک بہت بڑے گورکھ دھندے میں پھنس گئے ہیں۔'' شہلا نے کہا۔

''خدا خیر کرے، کیسا گورکھ دھندا؟''

شہلا نے ماہرہ کو ساری کہانی سنا دی۔ ماہرہ حیرت سے سکتے میں رہ گئی تھی۔

''او مائی گاڈ، یہ تو بالکل فلمی کہانی ہے بلکہ ٹی وی کا ایک سوپ بھی بن سکتی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''اتفاق در اتفاق، در اتفاق۔''

''یہی تو ہو رہا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اب چکرا کر رہ گئے ہیں کہ کیا ہو۔''

''میں ایک مشورہ دوں۔''

''اسی لیے تو آپ کو بلایا ہے۔''

''آپ کی جو پلاننگ تھی۔ آپ اس پر عمل کر جائیں۔'' اس نے کہا۔ ''یعنی آپ جس مقصد کے لیے پنڈی آئے تھے، وہ پورا کریں۔''

''یعنی شہلا سے کورٹ میرج کر لوں۔''

''میں کورٹ میرج کی نہیں۔ میرج کی بات کر رہی ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''آپ ہمت کر کے لاہور واپس جائیں، شرمین اپنے گھر کو چلی جائے اور آپ شہلا کے گھر شہلا کے ساتھ پہنچ جائیں۔''

''تم کیا کہہ رہی ہو؟'' شہلا چونک اٹھی۔

''بالکل مناسب مشورہ دے رہی ہوں۔ تم دونوں اس پر غور کرو۔'' اس نے کہا۔ ''وہاں جا کر ہمت سے کام لے کر آپ دونوں یہ بتا دیں کہ آپ ایک دوسرے کو پسند

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کرتے ہیں اور شادی کرنا چاہتے ہیں۔ اگر گھر والوں کا خیال نہیں ہوتا تو کورٹ میرج بھی کر سکتے تھے لیکن کورٹ کے دروازے پر پہنچ کر صرف آپ لوگوں کے خیال سے ہم واپس آگئے ہیں اور آپ کا فیصلہ چاہتے ہیں۔''

''میرا کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔'' شہلا نے کہا۔

''میں انہیں یہ بتا کر آئی ہوں کہ میں اپنی ایک دوست کے پاس جارہی ہوں۔ میں کئی بار پہلے بھی اس کے پاس اسی طرح اپنے کپڑے وغیرہ لے کر جا چکی ہوں۔''

''چلیں، یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ اس کے بعد نسیم صاحب وہاں پہنچ جائیں۔ تم اس دوران اپنے گھر والوں کو نسیم صاحب کے لیے رضامند کر لینا۔''

''میرا خیال ہے کہ یہ تجویز مناسب ہے۔'' میں نے کہا۔

''لیکن اس سے پہلے ایک اور کام کرنا ہوگا۔'' ماہرہ، شرمین کی طرف دیکھ کر بولی۔ ''آپ کل شرمین کے یہاں جائیں گے، اپنے پروگرام کے مطابق۔ گھر والوں کو راضی کرنے کے لیے۔''

''اور اس کے بعد یہ کہہ دوں کہ شرمین پسند نہیں آئی۔''

''نہیں، بلکہ یہ کہیں گے کہ شرمین بہت پسند آئی ہے اور آپ اس سے شادی کرنے کو تیار ہیں۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں ماہرہ؟''

''ہاں، میں جو سمجھ رہی ہوں وہی کہہ رہی ہوں۔ آپ شرمین سے شادی کریں گے۔ اس کے بعد یہ شرمین کا حوصلہ ہوگا کہ وہ شہلا کو سوتن کے طور پر قبول کرتی ہے یا نہیں۔''

''کیا؟'' میں یہ تجویز سن کر پریشان ہوگیا تھا۔ ''یعنی تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ میں دونوں سے شادی کرلوں۔''

''ہاں دونوں سے۔ شہلا سے اس لیے کہ آپ دونوں کو ایک تو ہونا ہی تھا۔ آپ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور شرمین سے اس لیے کہ یہ اپنے کیے پر شرمندہ ہوگی۔ اسے احساس ہوگیا ہے کہ اس نے ایک ناکارہ اور بزدل انسان کے ساتھ فرار ہو کر ایک بہت بڑی حماقت کی تھی۔''

میں نے شرمین کی طرف دیکھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ خدا جانے کیسے کیسے خیالات اس کے ذہن میں آرہے ہوں گے۔

ماہرہ نے پھر کہا۔ ''دوسری بات یہ ہے کہ شرمین کی نگاہوں میں نسیم صاحب کی بہت اہمیت ہوگئی ہے۔ وہ ان کا احترام کرنے لگی ہے۔ اسے احساس ہوگیا ہے کہ شوہر کو ایسا ہونا چاہیے جو برے وقت پر اپنی بیوی کے آگے ڈھال بن جائے۔ اس کی طرح نہ ہو جس نے ڈاکوؤں کے سامنے بالکل چپ سادھ لی تھی۔ یہ لڑکی اب کسی طرف کی نہیں رہی۔ اب یہ نسیم صاحب کے ظرف کی بات ہے کہ وہ ساری کہانی جان لینے کے بعد بھی اسے اپناتے ہیں یا نہیں۔''

ماہرہ اس وقت کسی منجھے ہوئے سیاست دان یا وکیل کی طرح دلائل دے رہی تھی۔

''اب میں شرمین اور شہلا سے پوچھتی ہوں کہ کیا تم دونوں نسیم صاحب کو شوہر کے طور پر قبول کرنے کو تیار ہو یا نہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ رہ سکتی ہو یا نہیں۔ اور خود نسیم صاحب بتائیں کہ کیا وہ اس نئے موڑ کے لیے تیار ہیں یا نہیں؟''

''ہاں، میں تو تیار ہوں۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

''بشرطیکہ یہ دونوں بھی ایک دوسرے کو قبول کرلیں۔''

''ہاں، میں تیار ہوں۔'' شرمین بول پڑی۔ ''کیونکہ مجھے اتنی دیر میں شہلا سے اچھی خاصی انسیت ہوگئی ہے۔''

''یہی حال میرا بھی ہے۔'' شہلا نے کہا۔

''چلیں نسیم صاحب، یہاں تک تو معاملہ سیدھا ہوگیا ہے۔'' ماہرہ نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ ''اب آگے آپ کی ہمت ہے کہ آپ کس طرح اس سچویشن کو ہینڈل کرتے ہیں۔''

اس سچویشن کو ہینڈل ہوئے ایک سال ہو چکا ہے۔ شرمین اور شہلا سے میری شادی ہو چکی ہے۔ فی الحال میں نے اپنے گھر والوں سے شہلا کو چھپایا ہوا ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ جلدی ہی انہیں بھی راضی کرلوں گا۔ اور جہاں تک شرمین کا تعلق ہے تو وہ ہمارے ساتھ ہی رہ رہی ہے۔

اس کہانی کا حرف آخر یہ ہے کہ کوئی نہیں جانتا کہ آنے والے لمحے میں کیا ہونے والا ہے۔ خدا ملنے اور بچھڑنے کے ایسے اسباب پیدا کر دیتا ہے کہ حیرت ہونے لگتی ہے۔

کیا ضروری تھا کہ میں اسی دن لاہور پہنچتا جس دن شرمین اس شخص کے ساتھ فرار ہو رہی تھی۔ اور یہ کیا ضروری تھا کہ راستے میں ڈاکو بھی مل جاتے اور یہ بھی کیا ضروری تھا کہ مجھ جیسا آدمی ایک ڈاکو کے سامنے سینہ سپر ہو جاتا۔ یہ سب خدا کی پلاننگ ہوتی ہے اور ہم سب وہی کرتے ہیں۔ وہی سنتے ہیں، وہی کہتے ہیں جو وہ چاہتا ہے۔ انسان تو محض مجبور ہوتا ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

ممتا

راوی: سلو

تحریر: سلمیٰ اعوان

محترم مدیر اعلیٰ

السلام علیکم

یہ روداد جسے میں نے رقم کیا ہے یہ سلو کی ہے جسے چاہ کر بھی میں بھول نہیں سکتی اسی لیے میں چاہتی ہوں کہ اسے صفحۂ قرطاس پر آجانا چاہیے۔

سلمیٰ اعوان

(لاہور)

جب میری آنکھ کھلی تو میرا سانس سینے میں اتار اور چڑھاؤ کی اسی کیفیت سے دوچار تھا جو لوہار کے یہاں دھونکنی کی ہوتی ہے۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا اور مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے میں لحد کی خوفناک تنہائی اور مہیب اندھیرے کی چادر میں لپٹی گم صم پڑی ہوں۔ گھبرا کر میں نے ہاتھ بڑھایا اور بتی جلائی۔ ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے میں مجھے اپنا آپ کسی بھوت کی مانند نظر آیا تھا۔ بوائے کٹ بال بھول کے کانٹوں کی مانند کھڑے تھے۔ آنکھیں وحشت زدہ

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

Downloaded From Paksociety.com

ہرنی کی مانند پھٹی ہوئی تھیں۔ میں نے تپائی پر پڑے پانی کے گلاس کو اٹھا کر ہونٹوں سے لگایا۔ گھونٹ گھونٹ پیتے ہوئے اسے کوئی بیس منٹ میں خالی کیا۔ لیکن میرے دل کی وحشت ابھی تک اسی طرح تھی۔ میں نے سر بیڈ کے کنارے پر رکھتے ہوئے کراہ کر کہا۔ ''پروردگار ایسے خواب میرے گلے کا ہار کیوں بن گئے ہیں؟ دنیا سے جانے والے ان لوگوں کا میں نے کیا بگاڑا ہے کہ یہ آئے دن مجھے وحشت زدہ کرنے کے لیے میرے خوابوں میں چلے آتے ہیں۔''

دراصل بات یہ ہے کہ میں کوئی نیک اور پارسا خاتون نہیں ہوں کہ کہوں مجھے الہام ہوتا ہے۔ کشف والی بھی کوئی بات نہیں۔ پر واقعہ یہ ہے کہ مجھے سچے خواب آتے ہیں۔ بچپن سے لے کر عمر کے اس حصے تک کی زندگی میں پیش آنے والے واقعات کا علم مجھے کسی نہ کسی انداز میں ضرور ہوتا رہا ہے۔ گذشتہ چند سالوں سے موت کے ظالم ہاتھوں میں میری ننھیال کھلونا بنی ہوئی ہے۔ مہینوں پہلے پیش آنے والا واقعہ مجھے کسی نہ کسی انداز میں اپنا رخ دکھاتا ہے۔ میں خود فریبی کے جال میں پھنس کر لاکھ کہتی پھروں کہ یہ سب میری سوچوں کا عکس ہیں۔ پر حقیقت چند ماہ بعد خوفناک رخ میں سامنے آجاتی ہے۔ اور یقیناً یہی وجہ ہے کہ میں اپنی سوچوں کے ساتھ ساتھ خوابوں سے بھی خوف زدہ ہوں۔

میرے وہ تمام عزیز اور رشتہ دار جو اس دنیا کو چھوڑ کر دوسری دنیا کے شہری بنے ہوئے ہیں۔ اکثر و بیشتر میری نیندیں حرام کرنے کے لیے میرے خوابوں میں آتے رہتے ہیں۔ آنکھ کھلنے کے بعد رات کا بقیہ حصہ دیکھے ہوئے خواب کا تجزیہ کرنے میں گزر جاتا ہے۔ کبھی کبھی میں زچ آکر کہتی ہوں۔

''خدا کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دو۔ کیوں تنگ کرتے ہو مجھے؟''

کبھی زچ ہو کر، کبھی تلملاتے ہوئے اپنے آپ سے بولے چلی جاتی ہوں۔

''پروردگار یہ حساس ذہن بھی کسی عذاب سے کم نہیں۔''

سچی بات ہے میں نہیں چاہتی کہ خواب میں اپنی عزیز از جان ماں کی صورت دیکھوں۔ باپ کا دیدار کروں۔

جنوری کی خنک ترین اس شب میں میرے ماتھے پر پسینے کی بوندیں تھیں۔ میں نے انہیں صاف کیا۔ قریب پڑے بیٹوں پر نظر ڈالی۔ وہ بچپنے کی نیند میں دھت پڑے سو رہے تھے۔ سر کہیں تھے اور ٹانگیں کہیں۔

آج میں نے خواب میں اسے دیکھا تھا جو میری چھوٹی خالہ کی عزیز ترین سہیلی۔۔۔ جن کا نام ثریا تھا۔ جو میرے ننھیال والے گھر کے پچھواڑے رہتی تھیں اور جنہوں نے جوانی میں ہی موت کا جام پی لیا تھا اور اب قضہ پارینہ بنی بیٹھی تھیں۔

آپا جی ثریا جنہیں میرے مرحوم بڑے ماموں جولی آلار کہتے تھے۔ یہ جولی آلار کون تھیں اور آپا جی کس وجہ سے اس خطاب کی مستحق ٹھہری تھیں۔ بچپنے میں تو خیر کیا سمجھ آتی۔ بڑے ہو کر تاریخ میں جھانکنے اور اسے کھنگالنے پر بھی میرے پلے کچھ نہیں پڑا تھا۔ اتنا سا ضرور جانا تھا کہ مشہور فرانسیسی مصنف دودے کی شریکِ زندگی کا نام تھا یہ۔ پر وہ جولی آلار تو زبردست قسم کی نقاد اور بہترین لکھاری تھی جو شادی کے بعد مصنف پر ہر جہت سے اثر انداز ہوئی تھی۔ آپا جی کا تو لکھنے لکھانے سے کوئی واسطہ تعلق نہ تھا۔ ہاں البتہ مجھے وہ تاریخ کی کتابوں والی نور جہاں کی مانند لگتی تھیں۔

یہ میرے بچپن کا زمانہ تھا۔ جب میں اپنے گھر کی چھت پر بیٹھی تاریخ کو گھوٹا لگانے میں جتی ہوئی ہوتی۔ وہ اپنی چھت سے مشترکہ دیوار کے سوراخوں میں پاؤں رکھتے ہوئے یوں نمودار ہوتی کہ بس یوں محسوس ہوتا جیسے گھور اندھیری رات میں کوئی بے حد روشن چمکدار ستارہ آسمان کے سینے پر اکیلا ایکی نمودار ہو گیا ہو۔ ان کے چہرے پر مہاسے اور کیل بہت نکلتے تھے۔ پر اس کے باوجود ان کی صورت کی دلکشی ذرا ماند نہیں پڑی تھی۔ وہ صحن میں جھانکنے والی دیوار پر اپنی پونی جیسی مخروطی انگلیاں رکھتے ہوئے اک ذرا آنگن میں گردن جھکا کر دیکھتیں اور مجھ سے پوچھتیں۔

''فاطمی کدھر ہے؟'' فاطمی میری چھوٹی خالہ کا نک نیم تھا۔

میں نہایت مؤدب انداز میں اس سرو کے بوٹے کو دیکھتی جو میرے سامنے ایستادہ ہوتا اور جواب میں کہتی۔ ''آپا جی اپنے کمرے میں ہوں گی۔''

گھر کے سارے بچے انہیں آپا جی ہی کہتے۔ میرا جواب سن کر وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے چھوٹی خالہ کے کمرے میں چلی جاتیں۔

ایک طویل عرصے تک مجھے یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ ان کی کوئی اور بہن بھی ہے؟ میرے خیال میں وہ اپنے والدین کی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی تھیں۔ یہ تو کہیں بعد میں پتا چلا کہ ایک بڑی بہن بھی ہیں جو ایک ظالم شوہر کے پلے بندھی ہوئی

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ہیں اور راولپنڈی میں رہتی ہیں۔ ہمارے گھر میں انہیں وہی پیار اور محبت حاصل تھی جو چھوٹی خالہ کو تھی۔ اونچے اونچے عہدوں پر فائز میرے دونوں بڑے ماموں اور ان کی کمائیوں پر مان کرتی میری نانی انہیں بہت عزیز رکھتی تھیں۔ چھوٹی خالہ اور وہ دونوں کلاس فیلو بھی تھیں اور ایک دوسرے کی دیوانی بھی۔

یہ گرمیوں کی ایک سہانی سی شام تھی۔ سارے دن کی جھلسا دینے والی گرمی کے بعد شام کو ایکا ایکی تیز ہوائیں چلی تھیں اور موسم نہایت خوشگوار ہو گیا تھا۔ میں نہا کر ابھی باہر ہی آئی تھی کہ چھوٹی خالہ نے مجھ سے کہا۔

''سنو! تم ثریا کے ہاں جاؤ۔ رات وہیں رہنا۔ اس کی والدہ کہیں گئی ہوئی ہیں، اور وہ گھر میں اکیلی ہے۔''

میری باچھیں کھل گئیں۔ ان کے گھر جانا اور ان کے پاس رہنا بھلا اس سے بڑھ کر خوشی کی کیا بات ہوگی؟ میری تو وہ آئیڈیل شخصیت تھیں۔

چھوٹی خالہ کی کسی بات کو رد کرنا یا اس کی حکم عدولی کرنا گھر بھر میں کسی کے لیے ممکن نہیں تھا۔ ایک تو وہ بڑے بھائیوں کی لاڈلی چھوٹی بہن، دوسرے مزاج کی بھی گرم۔ ہماری اماں تو یوں بھی بے چاری کسی گنتی شمار میں نہ تھیں۔ بھائیوں اور ماں نے ان کی غربت پر ترس کھا کر اپنے محل نما گھر کا ایک کمرا انہیں دے رکھا تھا۔ ایسے میں نہ چاہتے ہوئے بھی ان کی کیا مجال تھی کہ وہ مجھے اس نادر شاہی حکم کی بجا آوری سے روک دیتیں۔

میں نے دیوار کے سوراخوں میں پاؤں رکھے اور دھم سے ان کی چھت پر کود گئی۔ وہ باورچی خانے میں شاید کچھ پکا رہی تھیں۔ میں نے ان کے قریب جا کر کہا۔ ''السلام علیکم آپا جی! میں آ گئی ہوں۔''

انہوں نے شفقت اور محبت سے لبریز آنکھیں اٹھا کر مجھے دیکھا اور بولیں۔ ''یہاں آؤ میرے پاس!''

میں ان کے قریب چلی گئی۔ باورچی خانے میں موڑھے پڑے تھے ایک کی طرف اشارے کرتے ہوئے انہوں نے بیٹھنے اور پھر چائے پینے کو کہا۔

اور جب میں چائے پیتی اور بسکٹ کھاتی تھی وہ بولیں۔

''آج رات میرے پاس رہو گی میں تمہیں کہانی سناؤں گی۔ سسی اور پنوں کی۔''

میں خوش ہو گئی تھی۔ چائے پی کر ہم دونوں صحن میں آ گئے۔ اس وقت ہوا ایسی سبک خرامی سے چل رہی تھی کہ جی چاہتا تھا انسان آنکھیں بند کر کے اس کی لطافت کو اپنے اندر کھینچ لے۔

دفعتاً سیڑھیوں پر دھپ دھپ کی آوازیں آئیں اور پھر ایک خوبصورت دلکش نوجوان جھٹکے کے پاس آ کر رک گیا۔

عجیب سی بات ہے مجھے اس وقت وہ کہانی یاد آئی تھی جس میں شہزادہ سلیم باغ میں آنکلتا ہے اور مہرالنساء کے ہاتھوں میں کبوتر پکڑاتا ہے۔

کہانیاں پڑھ پڑھ کر شہزادوں کے جو بت تراش لیے جاتے ہیں وہ بس ویسا ہی تھا۔ خوب اونچا لمبا، گوراچٹا، خوبصورت۔

میں نے ایک نظر آپا جی پر ڈالی تھی۔ ان کا رنگ تانبے کی مانند سرخ تھا اور وہ سامنے آسمان کی اس سمت پر نظریں جمائے ہوئے تھیں جہاں سورج اپنے شام کے گھر میں ستانے کے لیے جا رہا تھا۔

پھر شہزادہ سلیم ایک ایک قدم اٹھاتا عین اس جگہ آ کر رکا جہاں مہرالنساء کھڑی تھی۔ اس نے ایک نظر ان پر ڈالی۔ دوسری آسمان پر اڑتے پرندوں پر اور پھر بولا۔ ''پھوپی جان کدھر ہیں؟''

''وہ لائل پور گئی ہیں۔ ایجان کے دوست بیمار ہیں۔ دونوں دیر تک گم صم ایک دوسرے کے سامنے کھڑے رہے۔ پھر جیسے انہیں ہوش آیا اور وہ بولیں۔ ''آپ بیٹھیے میں چائے بناتی ہوں۔''

اور وہ خوبصورت رعنا جوان شوخی سے مسکرایا اور بولا۔ ''شکر ہے آپ کو بٹھانے اور چائے پلانے کا خیال تو آیا۔''

میں اس وقت اتنی بدھو نہیں تھی کہ ان کی آنکھوں سے جھانکتے وارفتگی کے جذبوں کو سمجھ نہ سکتی۔ چوتھی جماعت سے ہی عشقیہ کہانیاں پڑھ پڑھ کر خاصی سیانی ہو گئی تھی۔

پھر جب انہوں نے ان کے ہاتھوں میں کپ پکڑایا تو وہ بولیں۔ ''میں نے تمہیں برسوں آنے کا کہا تھا تم آئے نہیں۔ بتاؤ کیوں نہیں آئے؟ کیا تمہیں مجھے انتظار کی صلیب پر چڑھا کر لطف ملتا ہے؟''

وہ ہنسا۔ کتنی دلکش ہنسی تھی اس کی میں ہونقوں کی طرح کھڑی اسے دیکھے چلی جاتی تھی۔

''میں بھی تو اس صلیب پر چڑھتا ہوں۔ تم فاطمی کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

گھر جاتی ہو اور بھول جاتی ہو کہ تمہارا اپنا گھر بھی ہے اور وہاں کوئی بیٹھا سوکھتا ہے انتظار کی دھوپ میں۔"

اور جب کائنات پر سیاہی مائل اندھیرا چھا رہا تھا تو وہ جانے کے لیے اٹھا۔ وہ اسے خدا حافظ کہنے سیڑھیوں تک گئیں۔ میں نے چور آنکھوں سے دیکھا۔ وہ سیڑھیاں اترتے اسے مڑ مڑ کر دیکھتا تھا اور دوسرا میری طرف پشت کیے دیوانہ بنی کھڑی تھی۔ بہت دیر بعد وہ جیسے اپنے حواسوں میں آئیں، لوٹیں اور میرے پاس آکر بولیں۔

"ہاں تو سلو رانی بتائے کہ وہ کیا کھائے گی؟"

"آپا جی یہ کون تھے؟" میں نے کھانے کے سوال کو یکسر نظرانداز کرتے ہوئے کہا تھا۔

"میرے ماموں زاد سلمان حسن ہیں۔"

اس رات انہوں نے مجھے سسی پنوں کی کہانی سنائی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ سسی اور پنوں کے روپ میں خود ہوں۔

اور جب میں کالج جاتی تھی تب ایک دن مجھے ان کے بارے میں کچھ یوں سننے کو ملا۔ میری اماں کہتی تھیں۔

"گلاب کا پھول تھی۔ باپ نے سرسوں کا بنانے کا طے کرلیا تو بیچاری مرجھا کر رہ گئی ہے۔"

دوپہر کے وقت ان کے گھر گئی۔ میں جاننا چاہتی تھی کہ بات کیا ہے؟ چھوٹی خالہ ان دنوں بڑے ماموں کے پاس گلگت گئی ہوئی تھیں۔

انہوں نے مجھے دیکھتے ہی مسکرا کر میرا حال احوال پوچھا۔ کالج کی بعض لیکچرار کے بارے میں دریافت کیا۔ انہوں نے بھی اسلامیہ کالج کوپر روڈ سے ہی پڑھا تھا۔

پھر میں نے کہا۔ "آپا جی آپ پریشان ہیں؟"

انہوں نے ایک لمبی آہ اپنے سینے سے نکالی اور بولی تھیں۔ "تمہیں کیا بتاؤں؟ کاش اس وقت میں انہیں بتا سکتی کہ وہ میرے لیے کیا ہیں؟ مجھے ان کی ذات سے کتنا پیار اور کتنی عقیدت ہے؟"

وہ چھت کو گھورتے ہوئے جانے کہاں گم تھیں۔ میری موجودگی بھی جیسے فراموش کر بیٹھی تھیں۔ بہت دیر بعد ہوش میں آئیں۔ اس وقت ان کی آنکھیں موتیوں کے خزانوں سے مالا مال ہو رہی تھیں۔ رندھی ہوئی آواز میں انہوں نے کہا تھا۔

"میری جان سلو تم دعا کرو۔ میرے ابّی جان سلمان کے لیے رضامند نہیں اور میں سلمان کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔"

مجھ سے وہ کتنی دیر سلمان حسن کی باتیں کرتی رہیں اور میں نے بھی اپنے آپ سے کہا تھا کہ "جہانگیر کو نور جہاں ضرور ملنی چاہیے۔ رانجھے کو ہیر نہیں ملے گی تو کہانی بگڑ جائے گی۔"

اور کہانی بگڑی نہیں سنور گئی تھی۔ لاڈلی بیٹی باپ کو منوانے میں کامیاب ہوئی۔ نکاح دھوم دھڑکے سے ہوا۔ میں ان کے نکاح میں شامل ہوئی۔ سلمان حسن مغل شہزادہ لگتا تھا۔

چھ ماہ بعد رخصتی ہوئی۔ وہ دلہن بن کر صرف ایک رات سسرال ٹھہریں اور اگلے دن واپس اپنے گھر آگئیں۔ یہ فریقین کے درمیان طے ہوگیا تھا کہ وہ اپنے والدین کے پاس رہیں گی۔ سلمان حسن گھر داماد ہوگا۔ ان کے ماموں نے اس شرط پر کوئی تعرض نہیں کیا تھا۔ جانتے تھے کہ بہن کا کوئی بیٹا نہیں۔

یہ ان کی زندگی کا حسین ترین دور تھا۔ وہ ایسی نکھر گئی تھیں کہ چھوٹی خالہ کبھی کبھی کہتیں۔ "ثریا تمہیں تو بیاہ بہت پہلے کرلینا چاہیے تھا۔"

پھر چھوٹی خالہ کی شادی ہوگئی۔ آپا جی کے امی ابو فوت ہوگئے۔ سلمان حسن نے بزنس شروع کیا اور وہ کامیاب ہوا۔

وہ دو بیٹوں کی ماں بن گئی تھیں۔ گول مٹول خوبصورت اوپر تلے کے بیٹے بابر اور ٹیپو جنہیں وہ بابری اور ٹیپی کہتے نہ تھکتیں۔ میں بھی ان کے گھر چلی جاتی۔ ان کی محبت میں اب ممتا کا روپ آگیا تھا۔ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے پیار بھرے انداز میں کہتیں۔

"کہو سلو بیٹے، پڑھائی کیسی جا رہی ہے؟"

ایسا بھی ہوتا کہ میری موجودگی میں سلمان حسن بھی آجاتے۔ عجیب سی بات تھی کہ ان کے آنے کے فوراً بعد میں ایک پل وہاں نہ رکتی۔ وہ لاکھ بھی کہتیں۔ "ارے رکو نا۔ سلمان سے کچھ باتیں کرو۔"

پر میں تیر کی طرح وہاں سے بھاگ آتی۔ میں اس بے حد دلکش اور ڈیشنگ شخصیت سے متاثر تھی۔ ایک دن انہوں نے مجھے کہا کہ "سلمان بہت اچھا ہاتھ دیکھتے ہیں۔ تم انہیں اپنا ہاتھ دکھاؤ۔"

مستقبل کے آئینے میں جھانکنے کا شوق اور تجسس ہر انسان کے اندر موجود ہے۔ میں بھی اس کا شکار تھی۔ پر سلمان حسن کے سامنے بیٹھ کر انہیں اپنا ہاتھ دکھانا مجھے کسی

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

1987ء سے خدمت میں مصروف

LEUCODERMA-VITILIGO

تمام جلدی بیماریوں کا موثر اور بے ضرر علاج

پھلبہری

قابل علاج مرض ہے

STEROIDS FREE MOST PROGRESSIVE TREATMENT

ملٹی ایوارڈ ہولڈر

اجمل زیدی

برص ماہر

کے دورۂ پاکستان کا مستقل پروگرام

ASIAN EXCELLENCE PERFORMANCE AWARD

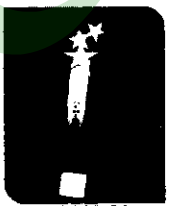

AWARD OF BEST ACHIEVEMENT

AWARD PILLAR OF LEUCODERMA

اسلام آباد

مستقل پتہ

9-اپریل تا 30 مئی
9-اگست تا 30 ستمبر
9-دسمبر تا 30 جنوری

مکان نمبر 62، اسٹریٹ نمبر 20، سیکٹر G-8/1
سریا چوک (تعلیمی چوک)، اسلام آباد
فون (051) 2854595 - 2255880
موبائل 0300-8566188
فیکس 2261636

پشاور

قیام

کیم فروری تا 11 فروری
کیم جون تا 11 جون
کیم اکتوبر تا 11 اکتوبر

ہوٹل امین

جی ٹی روڈ نزد ہشتنگری چوک پشاور
فون (0521) 2218215-9
موبائل 0300-8566188

لاہور

قیام

14-فروری تا 27 فروری
14-جون تا 27 جون
14-اکتوبر تا 27 اکتوبر

گلف سینٹر

آفس نمبر 16
فیروز پور روڈ مزنگ چونگی
نزد مشن مارکیٹ (ٹرید) لاہور
موبائل: 0300-8566188

کراچی

قیام

13-مارچ تا 27 مارچ
13-جولائی تا 27 جولائی
13-نومبر تا 27 نومبر

فورچون سینٹر

آفس 706، 7 فلور شاہراہ فیصل
نرسری اسٹاپ ملحقہ K.F.C کراچی
فون 021-7012068-9
موبائل 0300-8566188

ملتان

قیام

28 مارچ تا 6-اپریل
28 جولائی تا 6-اگست
28 نومبر تا 7 دسمبر

ہوٹل سلور سینڈ

ریلوے سٹیشن روڈ نزد چوک عزیز ہوٹل ملتان
فون (061) 4518061-62
4582803 (0300-8566188)

E-mail: syedajmalzaidi@hotmail.com - syedajmalzaidi@yahoo.co.uk

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

طور بھی منظور نہیں تھا۔

''ارے چھوڑیئے آپا جی میں ان باتوں پر یقین نہیں رکھتی۔'' کہتے ہوئے میں ان کے بیٹے ٹیپو کو اٹھالیتی۔

ایک دن جب میں ان کے گھر گئی۔ وہ خاموش اور آزردہ سی بیٹھی تھیں۔ بیٹوں کے بارے میں پوچھنے پر پتا چلا کہ وہ پھوپی کے گھر گئے ہیں۔ بیٹی پالنے میں سو رہی تھی۔

میں نے جھولے کو ٹانگ سے ہلاتے ہوئے ننھی زہرہ کے گال پر پیار بھری چٹکی لی اور بولی۔

''آپ کس قدر افسردہ نظر آتی ہیں؟ کیا سلمان بھائی پھر کسی بیرونی دورے پر ہیں؟''

انہوں نے لمبی سانس بھری۔ میری طرف دیکھا تھا اور آنکھوں میں آنسو بھر کر بولیں۔ ''سلو تم مجھے اتنی ہی عزیز ہو جتنی ماں کے پیٹ سے نکلی ہوئی بہن کا کوئی بچہ۔ فاطمی تو دکھ سکھ سننے کے لیے رہی نہیں۔ ساری باتیں تم سے کرلوں تو ہلکی ہو جاتی ہوں۔''

میں ان کے قریب بیٹھ گئی تھی۔ وہ زہرہ کے پالنے کو ہلاتے ہلاتے اٹھیں اور الماری سے ایک تصویر نکال کر لائیں۔ ایک حسین و جمیل اور انتہائی ماڈرن لڑکی کی تصویر میرے ہاتھوں میں تھی اور میں ایک نظر اسے دیکھتی اور دوسری نظر ان پر ڈالتی تھی۔ ان کی بولتی آنکھیں مجھ سے کچھ کہتی تھیں۔

''آپ کی آنکھیں جو کچھ بتا رہی ہیں اسے زبان دیں تاکہ میں پوری طرح سمجھ سکوں۔''

''یہ سلمان کی دوست ہے، اس کی محبوبہ ہے۔ اس کے مراسم کس انداز کے ہیں میں نہیں جانتی۔ بس مجھے تو اتنا معلوم ہوا ہے کہ وہ اس کے پیچھے دیوانہ ہو گیا ہے۔ اس کی شامیں اس کے لیے ہیں۔''

اور ساتھ ہی آنکھوں سے رم جھم کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔

میں نے تیزی سے بہتے ان آنسوؤں کو اپنے ہاتھوں سے پونچھا اور کہا۔ ''ایسی دلکش شخصیت ہو، دولت کی فراوانی ہو، وجاہت اور جوانی ہو، مقابل بھی طرحدار ہو تو ایمان اپنے پاس کب رہتا ہے؟''

وہ ٹھنڈی آہیں بھرتی رہیں اور آنکھوں کو پوروں سے بار بار صاف کرتی رہیں۔ پھر وہ کھانسنے لگی تھیں۔ بہت پہلے پلورسی کا اٹیک ہوا تھا تب وہ کنواری تھیں۔ فوری علاج اور خوراک سے بیماری کنٹرول ہو گئی تھی۔

لیکن اب جب اوپر تلے بچوں نے جنم لیا اور غم نے آگھیرا وہ پھر بیمار پڑ گئی تھیں۔ اس بیماری میں دو اور بیٹیاں آگئیں۔ ڈاکٹر نے بہتیرا کہا۔ ''زندگی چاہتی ہو تو بچے پیدا کرنے اور غم کھانا چھوڑ دو۔''

لیکن وہ غم کھانا نہ چھوڑ سکیں۔ اپنی بیماری سے وہ خود آگاہ تھیں۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کو دیکھتے ہوئے وہ کہتیں۔ ''ارے میں مرجاؤں گی، سلمان دوسری شادی کرلے گا اور میرے بچے برباد ہو جائیں گے۔''

پھر وہ میری طرف دیکھتے ہوئے کہتی۔ ''کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ سلمان شادی نہ کرے۔ شاہ جہاں نے بھی تو ممتاز محل کے بعد بیاہ نہیں کیا تھا۔ اگر عورت بچوں کے لیے پوری زندگی تج سکتی ہے تو مرد ایسا کیوں نہیں کر سکتا؟''

میں نے دکھ، تاسف اور ہمدردی سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے صرف اتنا کہا۔ ''دراصل آپا جی آپ بہت جذباتی ہو رہی ہیں۔ ہر ہر فطرتاً ان اوصاف کا متحمل ہی نہیں۔ اکا دکا مثالوں سے اپنے ذہن کو پراگندہ مت کریں۔''

اور جن دنوں میری شادی ہو رہی تھی ان کی حالت بہت خراب تھی۔ وہ گلاب دیوی اسپتال میں تین ماہ رہ کر آئی تھیں۔ گھر کی نچلی منزل میں ڈیرے ڈالے بیٹھی تھیں۔ ان کے دونوں پھیپھڑے ناکارہ ہو چکے تھے۔ وہ جانے کس حوصلے اور کس قوت ارادی پر گاڑی کھینچے لیے جا رہی تھیں۔ میں جانتی تھی کہ ڈاکٹروں نے انہیں چلنے پھرنے سے منع اور مکمل ریسٹ کے لیے کہہ رکھا ہے اس لیے دامی نے انہیں رسمی طور پر دعوت نامہ بھیجنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ پر جب شادی کے کچھ عرصہ بعد میں ایک دن اپنے میکے آئی اور مجھے ان سے ملنے کی ہڑک اٹھی۔ میں ان کے گھر گئی۔ وہ ہنوز اسی حالت میں تھیں۔ دیکھتے ہی بڑی دکھی آواز میں بولیں۔

''تم نے شادی میں ہمیں بلانے کی ضرورت تک محسوس نہیں کی۔''

میں سخت شرمندہ ہوئی۔ ''دراصل آپا جی آپ کی شدید بیماری۔ مجھے کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔''

''کمال ہے میں نہ آتی سلمان تو آتے۔ وہ گلہ کر رہے تھے کہ دیکھو نہیں پوچھا تک نہیں۔ حقیقت ہے تمہاری شادی میں شرکت کی انہیں بڑی خواہش تھی۔''

مجھے دلی طور پر افسوس ہوا کہ میں نے بڑی حماقت کی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کم از کم اصولی طور پر کارڈ بھیجنا چاہیے تھا کوئی آتا نہ آتا یہ اس کی مرضی۔

میں نے اپنی غلطی کی معافی چاہی۔ ایک بار پھر یہ کہا ''مجھے ان کے احساسات کا علم نہیں تھا۔ میرے خیال میں اتنے بڑے بزنس مین کے لیے وقت بھی تو مسئلہ ہوتا ہے اور آپ بیمار تھیں۔''

میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ اپنی بیماری کے سلسلے میں سلمان کی دوڑ دھوپ اور ذہنی پریشانی اٹھانے پر ان کی بہت ممنون تھیں۔ بار بار کہے جاتی تھیں۔ ''دیکھو میں نے اسے کیا سکھ دیئے؟ لمبی بیماری اور تفکرات کی چادر میں لپیٹ دیا۔''

میں نے کسی بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ میری شادی پر چھوٹی خالہ نہیں آئی تھیں وہ اماں سے کچھ ناراض تھیں۔ ان کے لہجے میں حسرت تھی جب انہوں نے کہا۔ ''اے کاش! فاطمی آجاتی اور اس بہانے مجھے بھی مل جاتی۔''

جب میں اپنے گھر واپس آئی میرا دل بڑا بوجھل سا تھا۔ شاید میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ بیماری کی جس اسٹیج پر ہیں وہاں سے تندرستی اور زندگی کی جانب آنے والا ہر راستہ بند ہوگیا ہے۔ شاید مجھے یہ بھی دکھ تھا کہ تپ دق کوئی کینسر تھوڑی تھا اور جسے یہ بیماری چمٹی ہوئی تھی وہ کوئی غریب عورت نہ تھی۔ خود صاحب جایداد اور امیر ترین شوہر کی بیوی جو علاج کے لیے اسے باہر لے جاسکتا تھا۔

کوئی آٹھ ماہ بعد میں نے ان کی فوتیدگی کی خبر سنی۔ انجام یہی ہونا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی میرے دل کو دھکا لگا تھا۔

چاہتے ہوئے بھی میں ان کے گھر نہیں گئی۔ جان سے پیارے ان کے بچوں کو نہیں دیکھا کہ وہ کیسے اور کس حال میں ہیں؟ سلمان بھائی سے پرسے کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ میں نے کبھی ان سے کوئی بات نہیں کی تھی۔

یوں ایک کہانی ختم ہوگئی تھی۔

پر کہانی ختم نہیں ہوئی۔ ان کی وفات کے کوئی ایک سال بعد مجھے پتا چلا کہ سلمان حسن نے شادی کرلی ہے۔ اماں نے شاید ان کی دلہن دیکھی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ وہ اپنی کسی ماڈرن سی دوست کو جن کے ساتھ وہ پیار اور محبت کی پینگیں چڑھاتے تھے، گھر لے آئے ہوں گے۔ پر ایسا نہیں ہوا۔ جو لڑکی ان کے گھر آئی وہ بقول اماں کے قدرے زیادہ عمر کی، سانولی، تیکھے نقوش کی مالک، پرکشش لڑکی تھی۔ پانچ بچوں پر آنا دل گردے کی بات تھی۔ بچے بھی وہ جو کم عمر اور لاڈ و پیار میں پلے ہوئے۔

اماں کے گھر سینکڑوں بار میرا جانا ہوا۔ پر کبھی میں نے دیوار پھاند کر اس گھر میں جھانکنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ شاید میں اپنے آپ سے خوفزدہ تھی کہ کہیں میرا اندر پھوٹ پھوٹ کر رونے نہ بیٹھ جائے۔ بس اماں سے کبھی کبھار سنتی کہ نہایت نیک لڑکی ہے بچوں کو بہت اچھی طرح رکھتی ہے۔

پھر سننے میں آیا کہ انہوں نے شامی روڈ پر نئی اور عالیشان کوٹھی بنالی ہے۔ سلمان حسن کا کاروبار بہت عروج پر ہے۔ سارا گھر اس نئی کوٹھی میں شفٹ کرگیا ہے۔

اور جنوری کی اس خنک ترین شب میں میں نے انہیں خواب میں دیکھا تھا۔ وہ میرے گھر آئی تھیں۔ میں نے انہیں سیڑھیاں چڑھتے دیکھ کر فوراً لپک کر پکڑا۔ ہنستے ہوئے وہ بولیں۔ ''میں نے سوچا میں تمہیں نئے گھر کی مبارکباد دے آؤں اور تم سے مل بھی آؤں۔''

میں انہیں ڈرائنگ روم میں لے آئی تھی۔ صوفے پر میرے پاس ہی بیٹھ کر انہوں نے محبت بھری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔ ''تم اپنے گھر میں خوش و خرم ہو نا۔''

میں ہنس پڑی تھی۔ ''آپا جی آپ کی محبت اور دعائیں ہیں۔''

''اس وقت میں تمہارے پاس بہت ضروری کام سے آئی ہوں۔ یہ کام تم نے ضرور کرنا ہے!''

''حکم کیجیے۔ بتایئے میں حاضر ہوں۔'' میں ہمہ تن گوش ہوگئی۔

''سلمان فہمیدہ سے بہت لڑائی جھگڑا کرتا ہے۔''

میں نے فی الفور ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''آپا جی فہمیدہ کون؟''

''میرے بچوں کی ماں۔ وہ سچ مچ میرے بچوں کی ماں ہے۔ اس نے جس طرح انہیں اپنی بانہوں میں سمیٹا، جیسے ان کی پرورش کی، میں اس سے باخبر ہوں۔ اس نے میرے بابر اور ٹیپو کو ممتا میں نہلا دیا۔ اس نے زہرہ کے بہت ناز اٹھائے اور وہ میرا بھی خیال رکھتی ہے۔ دیکھو تم سلمان کے پاس جاؤ۔ وہ تمہارا بڑا مداح ہے۔ تمہاری بات سنے گا۔ اسے بتاؤ اسے سمجھاؤ اس سے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

مت الجھے چھوٹی چھوٹی باتوں پر۔ میرے بچوں کو اس کی ضرورت ہے۔ بیٹیوں کو ابھی بیاہنا ہے۔ میں فہمیدہ سے بہت خوش ہوں۔''

انہوں نے میرے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا تھا اور میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی تھیں۔ ''وعدہ کرو۔ جاؤ گی؟ اسے سمجھاؤ گی؟ بچوں سے کہو گی کہ ماں کی عزت کریں؟''

اور میری آنکھ کھل گئی تھی۔ میں انہی کیفیات سے دوچار ہوئی جن کا ذکر میں نے شروع میں کیا ہے۔

یہ رات کا آخری پہر تھا۔ دوبارہ آنکھ لگنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا۔

خداوند! وہ میرے پاس کیوں آئیں؟ اس آزمائش کے لیے میں ہی کیوں نظر آئی؟

کیا واقعی روحیں دنیا میں اپنے پیاروں کے پیچھے آتی ہیں اور ان کے بارے میں مضطرب رہتی ہیں۔ میں نے خود سے سوال کیا۔

یہ سچ ہے کہ ایسا ہوتا ہے پر میں اس گھمبیر مسئلہ میں الجھ گئی تھی۔ یہ کس قدر مشکل تھا کہ ایک انتہائی کلچرڈ، اونچی سوسائٹی میں موو کرنے والے حد درجہ وجیہہ مرد کو جا کر یہ کہوں کہ تم اپنی بیوی سے لڑنا جھگڑنا چھوڑ دو۔ تمہاری مرحومہ بیوی بہت مضطرب ہے۔ کتنا مشکل کام تھا۔

پر جانا بھی ضروری تھا کہ پیغام ایک روح کا تھا۔

آپا جی کی نند بازار میں ملی ان سے پتا پوچھا۔ ایڈریس ایک ایسی جگہ کا تھا جہاں سواری کے بغیر جانا بہت مشکل تھا۔ سوچا کہ میاں کے ساتھ گاڑی میں چلی جاؤں پر میاں کے ساتھ جانے میں مجھے سخت اعتراض تھا۔ ذمہ دار پوسٹ پر بیٹھنے والے مرد ضرورت سے زیادہ خود اعتماد ہوتے ہیں اور کسی بھی جگہ، کسی محفل میں بیٹھ کر بیوی باتیں کرے اور وہ خاموش تماشائی بن کر بیٹھیں، یہ انہیں گوارہ نہیں۔ میرے میاں بھی اسی مرض کا شکار ہیں۔ لہٰذا دیور کی موٹر بائیک پر بیٹھی اور رات کی تاریکی میں گھر ڈھونڈتی ہوئی منزل پر پہنچ گئی۔

دروازہ ایک نوجوان لڑکے نے کھولا۔ اندر داخل ہوئی۔ ایک خوبصورت اور جدید آسائشوں سے پُر گھر میرے سامنے تھا۔ ٹی وی لاؤنج میں صوفے پر سلمان حسن نیم دراز تھے۔ پاس ایک سلونی سی دلکش خدوخال والی خاتون بیٹھی تھی۔ خوبصورت سی ایک لڑکی ہوبہو آپا جی کا عکس صوفے کی بیک تھامے کھڑی تھی۔ یہ یقیناً زہرہ تھی۔ دونوں چھوٹی لڑکیاں بھی کتابیں ہاتھوں میں پکڑے قالین پر بیٹھی تھیں۔

ان کے بچے میرے سامنے تھے۔ وہ بچے جنہیں میں جھولے جھلاتی تھی۔ گود میں کھلاتی تھی۔ خوبصورت اور من موہنے بچے۔ اس وقت میرے کانوں میں وہ آواز گونجی تھی۔ حسرت و یاس سے بھرپور آواز۔ ''ارے سلو میں نہیں دیکھوں گی تم لوگ دیکھوگی۔''

اور میں دیکھ رہی تھی۔ وہ بچے جو ماضی کو نہیں جانتے تھے جو ماضی سے کٹے ہوئے تھے۔

میں نے صوفے کی طرف ایک بار پھر دیکھا اور پوچھا۔

''آپ نے مجھے پہچانا؟''

''کیوں نہیں۔'' ان کی آواز خلوص اور اپنائیت کی مہک لیے ہوئے تھی۔ میں ان کے قریب پڑے صوفے پر بیٹھ گئی۔

ماضی کی وہ گلیمرس شخصیت حال کے گرد و غبار میں کچھ کچھ اَٹی ہوئی تھی۔

''آپ خاصے بدل گئے ہیں۔''

وہ ذرا سا مسکرائے اور بولے۔ ''درمیان میں وقت کا بھی تو سوچئے۔ حالات اپنا اثر دکھائے بغیر تو نہیں ٹلتے۔''

کیسی دشوار گھڑی تھی۔ کیسے وہ پیغام انہیں دیتی۔ بہرحال جب ان کی باتیں ختم ہوئیں تو دبے دبے لفظوں میں اپنے خواب کا ذکر کیا۔ وہ چونکے میری طرف دیکھتے رہے پھر بولے۔ ''خداوندا اس عورت ذات کو سمجھنا کس قدر دشوار ہے؟ جب زندہ تھی تو یہ غم کھاتی تھی کہ میرے مرنے کے بعد تم نے دوسرا بیاہ رچا لینا ہے اور میرے بچے برباد ہو جائیں گے۔ اور آج وہ سوت کا غم کھاتی ہے کہ میں اس سے احسن سلوک نہیں کرتا۔''

پھر مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر پھیل گئی اور وہ بولے۔ ''تم بتاؤ۔ عورت کو سمجھنا واقعی بہت دشوار ہے نا۔''

''آپ سمجھے نہیں۔ عورت پریشان نہیں ہے۔ ممتا پریشان ہے۔ جب زندہ تھی تب بھی اور قبر میں اتر گئی ہے تب بھی!''

اور یہ کہتے ہوئے میں جانے کے لیے اٹھ گئی تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

نیکی

جناب معراج رسول
السلام علیکم
میں نے اپنی زندگی کا ایک اہم واقعہ جس نے میری زندگی بدل دی ہے اور میری سوچ کو تقویت بخشی ہے اسے صرف اس خیال سے لکھ کر بھیج رہا ہوں کہ اگر یہ شائع ہو گئی تو لوگ سبق حاصل کریں گے۔
جمیل بٹ
(لاہور)

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اپنا سر پیٹ لینے کو دل چاہتا ہے۔ یا پھر سامنے والے کا گلا گھونٹ دینے کی خواہش ہونے لگتی ہے۔

ہم ملازمت پیشہ لوگوں کی زندگی میں ایک دن کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ اور وہ ہے اتوار کا دن۔ جس کے خواب ہم سارا ہفتہ دیکھتے رہتے ہیں۔ اور اس بار کا آنے والا اتوار تو ہم میاں بیوی کے لیے بہت خاص تھا۔

ہماری شادی کی سال گرہ تھی۔ ہم سال گرہ بہت

WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM RSPK.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

Downloaded From Paksociety.com

جوش و جذبہ سے مناتے ہیں۔ یہ ایک نازک رشتہ ہوتا ہے۔ پیار کا رشتہ ہوتا ہے۔ ایک دوسرے کی قربت کا رشتہ ہوتا ہے۔ ہم نے یہ پروگرام بنایا تھا کہ ہم سارا دن گھر سے باہر گزاریں گے۔ خوب سیر کریں گے۔ اس کے بعد دوپہر کا کھانا کسی اچھے سے ہوٹل میں کھائیں گے۔ پھر شام کے وقت سی ویو کی سیر کو جائیں گے اور رات کو کوئی فلم دیکھ کر واپس آجائیں گے۔ یعنی یہ اتوار پوری دلچسپی کا ہوگا لیکن ایسا ہو نہیں سکا۔

میں بستر ہی پر تھا کہ موبائل کی گھنٹی بول اٹھی۔ نمبر دیکھا تو وہ نمبر باس کا تھا۔ اب دو راستے تھے، یا تو میں نظر انداز کر جاؤں یا پھر فون سن لوں۔ نظر انداز کرنا بھی غلط تھا۔ کیوں کہ اسی کی بدولت مجھے اتنی اچھی جاب ملی تھی۔ اتنی اچھی سیلری تھی۔ ایک گاڑی تھی میرے پاس، وہ بھی اسی کمپنی نے دے رکھی تھی۔ ایسی حالت میں اس کے فون کو نظر انداز کر دینا حماقت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

میں نے فون سن لیا۔ ''یس باس'' میں نے کہا۔

''جمیل صاحب۔ آپ فوراً دفتر آجائیں۔'' اس نے کہا۔ ''ایک بہت ضروری کام آگیا ہے۔''

''لیکن باس'' میں نے کہنا چاہا کہ آج تو اتوار ہے۔ لیکن میرے کہنے سے پہلے ہی اس نے کہا۔ ''میں جانتا ہوں کہ آج اتوار ہے۔ لیکن یہ کام ایسا ہے کہ آپ کا آنا بہت ضروری ہے۔ اور زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے کا کام ہے۔ پھر آپ فارغ ہو جائیں گے۔''

اس کے بعد کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہیں رہی تھی۔ میں نے جب یہ بات ثمرین کو بتائی۔ تو وہ ناراض ہو گئی۔ ''یہ کیا بات ہوئی۔ اتوار کے دن بھی فرصت نہیں ہے۔ اپنے باس سے کہا کیوں نہیں کہ آج شادی کی سال گرہ ہے۔''

''ثمرین معاملہ کچھ اہم معلوم ہوتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ورنہ باس نے آج تک اتوار کے دن نہیں بلایا ہے۔ اور وہ یہ بھی کہہ رہے تھے کہ زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں فارغ ہو جاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے تو پھر دیکھیں جا کر۔ کیا معاملہ ہے؟''

میں نے جیسے تیسے ناشتہ ختم کیا اور اپنی گاڑی نکال لی لیکن ایسا لگتا تھا کہ وہ پورا دن ہی منحوس تھا۔ تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ گاڑی نے چلنے سے انکار کر دیا۔ حالانکہ پیٹرول بھرا ہوا تھا۔ کوئی بڑی ہی خرابی تھی اور کسی کو دکھائے بغیر کام نہیں چل سکتا تھا۔

یہ بھی اتفاق تھا کہ گاڑی جہاں خراب ہوئی تھی اس کے سامنے ہی ایک گیراج تھا۔ جہاں گاڑیوں کی مرمت ہوا کرتی۔ کسی نہ کسی طرح میں نے گاڑی کو ایک طرف کیا اور گیراج والے کے پاس پہنچ گیا۔ اس بے چارے نے فوراً اپنے بندے بھیج دیے جو گاڑی کو دھکیل کر گیراج لے آئے۔ مکینک نے کچھ دیر تک معائنہ کرنے کے بعد اعلان کیا۔ ''کم سے کم تین چار گھنٹوں کا کام ہے۔''

کیا پریشانی تھی۔ باس نے مجھے جلدی بلایا تھا اور میں گاڑی کے چکر میں پھنس گیا تھا۔ میں نے گاڑی وہیں چھوڑی اور رکشا ٹیکسی کے انتظار میں کھڑا ہو گیا۔ بہت دیر تک تو کوئی سواری نہیں ملی۔ جو رکشا یا ٹیکسی آتی تو وہ یا تو خالی نہیں ہوتی یا پھر اس کا موڈ ہی نہیں ہوتا اس طرف جانے کا۔ جہاں میرا دفتر تھا۔ نہ جانے یہ لوگ کیوں رکشا یا ٹیکسی چلاتے ہیں۔ وہ اس طرف جاتے ہی نہیں ہیں جس طرف آپ جانا چاہتے ہیں۔

بہر حال بہت دیر بعد ایک ٹیکسی ملی اور میں دفتر پہنچ گیا۔ دفتر میں کوئی نہیں تھا۔ ایک چوکیدار ہوا کرتا تھا جس کی رہائش بھی اسی دفتر میں تھی۔ وہی دفتر کھولا کرتا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ حیران رہ گیا تھا۔ ''ارے جمیل صاحب۔ آپ۔ خیر تو ہے نا۔ آج کیسے آگئے؟'' اس نے پوچھا۔

''یہ بتاؤ۔ کوئی آیا تو نہیں تھا؟''

''نہیں تو صاحب۔ آج تو اتوار ہے۔ آج کون آئے گا؟'' اس نے حیرت ظاہر کی۔

ہو سکتا ہے کہ باس آجائیں۔ میں نے بتایا۔ ''ان کا فون آیا تھا اسی لیے میں یہاں آیا ہوں۔ تم ایسا کرو میرے لیے دفتر کھول دو۔''

اس نے دفتر کا دروازہ کھول دیا۔ میں اپنے کمرے میں جا کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد موبائل کی گھنٹی بج اٹھی۔ ثمرین نے فون کیا تھا۔ وہ صورت حال معلوم کر رہی تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ میں تو دفتر پہنچ گیا ہوں لیکن باس ابھی تک نہیں آئے ہیں۔

''تو پھر کچھ دیر انتظار کر کے واپس آجائیں۔'' اس نے کہا۔

''ہاں ایسا ہی کروں گا۔'' میں نے کہا۔

بے چارے چوکیدار نے میرے لیے چائے بنا کر دے دی تھی۔ میں نے اسے بھی اپنے سامنے بیٹھا لیا۔ ہم باتیں کرنے لگے۔ وہ اپنے گاؤں کی کہانیاں سنا رہا تھا۔ وہ ایک سیدھا سادا غریب آدمی تھا۔ ایسے لوگ پریشان ہی

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

رہتے ہیں۔ وہ بھی بہت پریشان تھا۔ اس نے بتایا ''جمیل صاحب۔ اس طرف گاؤں میں میری ماں بیمار ہے۔ اس کو کینسر ہے جی۔ آپ کو تو معلوم ہے نا کہ یہ کیسی بیماری ہے۔''

''ہاں جانتا ہوں میں۔'' میں دکھ سے بولا۔ ''اس کا خرچ بھی بہت ہوتا ہے۔ یہ سب کہاں سے ہوتا ہے؟''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا۔ میں سمجھ گیا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے ہیں۔ پتا نہیں کچھ لوگوں کو اتنے دکھ کیوں مل جاتے ہیں۔

''تم نے باس سے بات نہیں کی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایسی حسرت تھی کہ میں کانپ کر رہ گیا۔ اور اس کے ہونٹوں پر ایک تلخ سی مسکراہٹ تھی۔ ''جانے دیں جمیل صاحب۔ کوئی اور بات کریں۔'' اس نے کہا۔

میں سمجھ گیا کہ کیا ہوا ہوگا۔ اس بے چارے نے باس سے بات کی ہوگی۔ اس نے صاف انکار کر دیا ہوگا۔ یہ اس کے مزاج میں شامل تھا۔ اس وقت میں اس کی تھوڑی سی مدد ضرور کر سکتا تھا۔ میری جیب میں اس وقت پانچ ہزار روپے تھے۔ وہ میں نے نکال کر اس کی طرف بڑھا دیے۔ ''کریم یہ اپنے پاس رکھو۔''

''یہ کیا ہے صاحب؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''دیکھو کریم۔ میں خود ایک ملازم پیشہ ہوں۔ باس کی طرح امیر نہیں ہوں۔ لیکن اتنا ضرور ہو سکتا ہے کہ تمہاری بیوی کے لیے ہر مہینے تین ہزار روپے ضرور دے سکتا ہوں۔ وہ مجھ سے لے لیا کرنا۔ تمہیں تھوڑی سی آسانی ہو جائے گی۔ اور اس وقت یہ پانچ ہزار ہیں۔ ان کو تو بھیج دو۔''

وہ انکار کر رہا تھا۔ لیکن میں نے زبردستی اس کو پیسے دے دیے۔ اس وقت ایک خوشی ہوئی تھی۔ ایک سکون سا ملا تھا۔ کسی کی مدد کرنے کا سرور ہی اور ہوتا ہے۔ جب وہ دعائیں دیتا ہے۔ جب وہ شکر گزار ہوتا ہے۔ جب وہ اطمینان کی سانس لیتا ہے۔ تو یہ سب خدا کو بھی قبول ہوتا ہے۔

وہ کچھ دیر میرے پاس ہی بیٹھا رہا۔ پھر اپنے آنسو پونچھتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔ اب مجھے پھر باس کا انتظار تھا۔

سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ باس مجھے دفتر بلا کر خود کہاں رہ گئے تھے۔ کچھ دیر بعد بور ہو کر میں نے باس کو فون کیا۔ ''سر میں دفتر میں آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔'' میں نے بتایا۔

''میں ابھی تم ہی کو فون کرنے والا تھا۔'' باس نے کہا۔ ''تم ایسا کرو گھر چلے جاؤ۔''

''جی۔'' میں یہ سن کر حیران رہ گیا تھا۔ ''گھر چلا جاؤں؟''

''سوری جمیل صاحب۔ میں نے بلایا تو تھا لیکن جس پارٹی کو دفتر آنا تھا۔ وہ ایک ایمرجنسی میں سنگاپور چلی گئی ہے۔ اس نے میٹنگ کینسل کر دی تھی۔ اب یہ اگلے مہینے ہو گی۔''

''کوئی بات نہیں سر۔'' میں گویا خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا تھا۔

میں نے چوکیدار سے کہا کہ وہ دفتر بند کر لے۔ باس نہیں آرہے۔ دفتر سے نکل کر میں دوبارہ گیراج پہنچ گیا۔ میری گاڑی اتنی دیر میں تیار ہو چکی تھی۔ میں نے گاڑی لی اور گھر واپس آگیا۔ ثمرین نے مجھے دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا تھا۔

''اتنی جلدی جان کیسے چھوٹ گئی؟'' اس نے پوچھا۔

''باس ہی نہیں آئے۔'' میں نے بتایا۔

''بس اب جلدی سے تیار ہو کر چلیں۔ ہمیں پہلے ہی دیر ہو چکی ہے۔''

ہم تفریح کے لیے چلے گئے۔ رات کو اپنے پروگرام کے مطابق ہم نے وہ سب کچھ کیا جس کا ہم نے سوچا تھا۔

اس وقت رات کے دو بجے ہوں گے۔ جب دروازے پر زوردار دستک ہونے لگی۔ دستک اتنی زوردار تھی کہ ہم گھبرا کر رہ گئے۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ ثمرین دہشت زدہ ہو کر مجھ سے لپٹ گئی تھی۔ ''گھبراؤ نہیں۔'' میں نے اسے تسلی دی ''میں دیکھ کر آتا ہوں۔''

میں گیٹ پر پہنچا۔ ''کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''پولیس'' دوسری طرف سے ایک کرخت آواز سنائی دی۔ ''گیٹ کھولو۔''

میں نے بوکھلا کر گیٹ کھول دیا۔ گیٹ کے باہر پولیس والے کھڑے تھے۔ ایک پولیس موبائل بھی تھی۔ ''کیا بات ہے؟'' میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ''کیوں آئے ہیں آپ لوگ؟''

''کیا آپ ہی جمیل ہیں؟'' ایک انسپکٹر نے پوچھا۔

''جی ہاں۔ میرا ہی نام جمیل ہے۔ لیکن بات کیا ہے؟''

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

''آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔ آپ کے خلاف ایف آئی آر ہے۔''

''ایف آئی آر؟ کیسی ایف آئی آر۔ کیا کیا ہے میں نے۔''

''یہ سب تھانے جا کر معلوم ہو جائے گا۔'' اس نے کہا۔

''پلیز آپ ایک معزز آدمی ہیں۔ آپ ہمیں مجبور نہ کریں۔''

''اوکے۔ میں چل رہا ہوں۔ بس دو منٹ دے دیں۔ میں گھر میں بتا دوں۔''

ثمرین نے تو رونا دھونا شروع کر دیا تھا۔ ''آخر کیوں؟ کیا کیا ہے آپ نے؟''

''وہ ابھی کچھ نہیں بتا رہے۔ تھانے جا کر معلوم ہوگا۔'' میں نے کہا۔ ''تم ایسا کرو۔ فون کر کے جواد بھائی کو بتا دو۔'' میں نے ہدایت کی۔ وہ ایک بڑے وکیل ہیں۔ معاملہ سنبھال لیں گے۔

جواد ثمرین کے بڑے بھائی تھے۔ اور ایک کامیاب اور مشہور وکیل بھی تھے۔ ثمرین روتی رہی۔ باہر آ کر میں نے اسی انسپکٹر سے کہا۔ ''کیا تم یہ بتاؤ گے کہ تمہارا تعلق کس پولیس اسٹیشن سے ہے؟''

''کیوں نہیں؟ ہم گلبرگ پولیس اسٹیشن سے آئے ہیں۔'' اس نے کہا۔

ثمرین بھی پریشان ہو کر میرے ساتھ ہی گیٹ سے باہر چلی آئی تھی۔ اسے بھی معلوم ہو گیا تھا کہ آنے والی پولیس کا تعلق کس پولیس اسٹیشن سے تھا۔

وہ لوگ مجھے لے کر پولیس اسٹیشن آ گئے۔ میرے ساتھ جو بھی ہو رہا تھا۔ وہ بہت حیران کن تھا۔ مجھے یاد نہیں آ رہا تھا کہ میں نے آخر ایسا کون سا جرم کر دیا تھا کہ کسی نے میرے خلاف ایف آئی آر لکھوا دی تھی اور پولیس والے مجھے اٹھا کر لے آئے تھے۔

مجھے ایک کمرے میں لے جا کر بیٹھا دیا گیا۔

''انسپکٹر۔ کم از کم اب تو بتا دیں کہ کیا معاملہ ہے۔ کس نے میرے خلاف شکایت کی ہے؟''

''چلیں بتا دیتا ہوں'' انسپکٹر مسکرا دیا۔ ''آپ جس فرم میں کام کرتے ہیں۔ اس کے باس نے رپورٹ لکھوائی ہے۔'' اس نے بتایا۔

''باس نے؟'' میں حیران رہ گیا تھا۔ ''کیا کہہ رہے ہیں؟ باس نے ایسا کیوں کیا؟ میرا تو ایسا کوئی معاملہ ہی نہیں ہے۔''

''مسٹر جمیل۔ یہ سچ ہے۔ ہمیں آپ کو گرفتار کرنے کا کوئی شوق تو نہیں ہے کہ ہم بلاوجہ کسی کو اٹھا کر لے آئیں۔''

''میں یہ نہیں کہہ رہا۔ مجھے تو اس بات پر حیرت ہو رہی ہے کہ باس نے ایسا کیوں کیا؟ کیا میں اپنے باس سے بات کر سکتا ہوں؟''

''وہ آپ سے بات نہیں کریں گے۔'' انسپکٹر نے بتایا۔

''کیوں؟''

''بہت بھولے بادشاہ ہو تم۔ جس نے تمہارے خلاف ایف آئی آر کٹوائی ہے۔ وہ تم سے کیا بات کرے گا؟''

''مجھے اتنا تو معلوم ہو کہ چکر کیا ہے۔ میں نے اس کا کیا بگاڑا ہے۔ کیا جرم کیا ہے میں نے؟''

ابھی اس سے باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ جواد بھی آ گئے۔ جواد ایک مشہور وکیل تھا۔ تھانے والے بھی اس کو جانتے تھے۔ بہرحال کچھ دیر بعد اصل بات سامنے آ گئی۔ باس نے یہ الزام لگایا تھا کہ میں اتوار کے دن دفتر میں داخل ہوا۔ چوکیدار سے میں نے دفتر کھلوایا۔ جبکہ وہ بے چارہ بہت حیران بھی ہو رہا تھا۔ پھر میں اپنے کمرے میں گیا اور میں نے کچھ دیر بعد چوکیدار کو کسی کام سے دفتر سے باہر بھیج دیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے ایک ضروری فائل غائب کر دی۔ وہ فائل ایکسائز وغیرہ کے حوالے سے تھی۔

چوکیدار جب واپس آیا تو میں اپنا کام کر چکا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ باس کے مخالفین نے مجھے رشوت دے کر اس فائل کو غائب کرنے کا ٹاسک دیا تھا۔

''جواد'' میں حیران رہ گیا تھا۔ ''باس نے مجھ پر یہ کیسا الزام لگایا ہے؟ بات تو دراصل یہ ہے کہ خود باس نے مجھے فون کر کے اتوار کے دن دفتر آنے کو کہا تھا۔'' میں نے بتایا۔

''پرابلم یہ ہے کہ چوکیدار نے بھی یہ گواہی دی ہے کہ تم نے دفتر کھلوایا تھا اور اسے باہر بھیج دیا تھا۔''

''لیکن یہ بالکل غلط ہے'' میں نے کہا۔ ''ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔''

''اب یہ فیصلہ تو عدالت ہی میں ہوگا۔ میں کوشش کروں گا کہ کل ہی تمہیں عدالت میں پیش کر دیا جائے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

تاکہ تمہارا کیس چل سکے اور الزام ختم ہو۔ ویسے باس نے چوکیدار کو ڈرا دھمکا کر یا لالچ دے کر اس بیان کے لیے آمادہ کیا ہوگا۔ خیر تم فکر مت کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ایک رات تو تمہیں یہاں گزارنی ہوگی۔''

وہ رات میرے لیے عذاب کی تھی۔

سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ سب ہو جائے گا۔ سوال یہ تھا کہ باس نے میرے کندھے پر بندوق رکھ کر کیوں چلائی تھی۔ اسی نے مجھے بلایا تھا۔ اسی نے وقت دیا تھا اور خود وہی مجھ پر اتنا بڑا الزام لگا گیا تھا۔

آخر کیوں؟ مجھے چوکیدار کریم پر بھی افسوس ہو رہا تھا۔ میں نے اس کے ساتھ تو کوئی برائی نہیں کی تھی۔ بلکہ اس کے دکھوں کو محسوس کیا تھا۔ اور اس کا صلہ یہ ملا تھا کہ اسی نے میرے خلاف گواہی دے دی تھی۔

اس فائل کا سلسلہ اب سمجھ میں آ گیا تھا۔

وہ ایک اہم فائل تھی۔ اس میں لاکھوں کے ایسے حساب تھے جو باس نے ٹیکس اور ایکسائز والوں کی نگاہوں سے چھپا کر رکھے تھے۔ اب بڑی آسانی سے یہ کہا جا سکتا تھا کہ مجرم نے (یعنی میں نے) اس فائل کو غائب کر کے کسی پارٹی کے حوالے کر دیا ہے۔ باس پر سے شک ختم ہو جاتا۔ میں ایک عام سا انسان تھا۔ لہٰذا میری گردن میں پھندا پڑ جاتا۔

دفتروں میں اس قسم کے گھپلے ہوا کرتے ہیں۔ ریکارڈ غائب کر دیے جاتے ہیں۔ یا انہیں جلا دیا جاتا ہے۔

خدا ہی جانتا ہے کہ میں نے وہ رات کس طرح گزاری ہوگی۔ اپنی بے بسی پر افسوس ہو رہا تھا۔ مجھے ثمرین کا خیال آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ کیا گزر رہی ہوگی۔ ویسے جواد نے جا کر اسے اطمینان تو دلا دیا ہوگا۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔

ایک دن اور رہنا پڑا۔ اس دن جواد ثمرین کو مجھ سے ملوانے لے آیا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''ثمرین کیا تمہیں یقین ہے کہ میں بے گناہ ہوں۔ میں نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی ہوگی؟''

''یہ کیوں پوچھ رہے ہیں۔ کیا میں آپ کو نہیں جانتی؟ آپ کوئی غلط کام کر ہی نہیں سکتے۔''

''تو بس خدا سے دعا کرتی رہو۔ میں صاف بری ہو جاؤں گا۔ یہ میرا دل کہہ رہا ہے۔''

دوسرے دن میرا چالان پیش کر دیا گیا۔ عدالت میں باس بھی تھا اور وہ چوکیدار بھی۔ اور وہ دونوں ہی مجھ سے

تاج بیگم

شہاب الدین شاہجہان کی ماں کا نام تاج بیگم المشہور رجگت گسائیں تھا۔ وہ اپنی دانشمندی، خوش بیانی اور حاضر جوابی میں مشہور تھی۔ تاج بیگم موٹا راجا اودھے کی چہیتی بیٹی تھی۔ تاج بیگم کی وفات شاہجہاں کے والد جہانگیر ہی کی زندگی میں ہو گئی تھی۔ اس لیے شاہجہان اپنی بادشاہت کے زمانے میں اپنی ماں کی سرپرستی سے محروم رہا لیکن شاہجہان نے اپنی حکومت میں اپنی ماں کا لقب ''بلقیس مکانی'' رکھا۔

مرسلہ: مرسلہ: اشفاق حسین، گجرات

جہانگیر کی رضاعی ماں

جہانگیر کا خود بیان ہے کہ وہ شروع سے اپنی حقیقی ماں کی بجائے اپنی رضاعی ماں کی گود میں پلا جو حضرت شیخ سلیم چشتی کی صاحبزادی اور قطب الدین کوکہ کی ماں تھی۔ جہانگیر ان کا بڑا احترام کرتا۔ ان کا انتقال جہانگیر کے دوسرے سال جلوس میں ہوا۔ اس بارے میں جہانگیر اپنی تزک میں لکھتا ہے کہ ''ذی قعدہ کے مہینے میں قطب الدین خاں کوکہ کی والدہ رحمت ایزدی میں پیوست ہو گئیں۔ انہوں نے مجھ کو دودھ پلایا تھا اور میری والدہ کی جگہ پر تھی بلکہ ماں سے زیادہ مہربان رہیں۔ میں نے بچپن سے ان ہی کی گود میں پرورش پائی میں اپنے کاندھے پر ان کا جنازہ اٹھا کر کچھ دور لے گیا اور ان کی وفات سے ایسا رنج و الم طاری ہوا کہ کچھ روز تک نہ کھانے اور نہ لباس تبدیل کرنے کی خواہش ہوئی۔'' جہانگیر نے اپنی رضاعی ماں کی محبت میں اس کے بیٹے قطب الدین کو اپنی حکومت کے زمانے میں بہت سی عنایتوں سے نوازا اور پنج ہزاری منصب دار بنا کر بنگال کا صوبہ دار بنایا۔ جہاں وہ مہرالنساء (یعنی نور جہاں) کے پہلے شوہر شیر افگن خاں سے لڑائی میں مارا گیا۔

مرسلہ: اشفاق حسین، گجرات

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

نظریں چرا رہے تھے۔ ان کی طرف سے جو وکیل تھا۔ اس کی تو کوشش یہی تھی کہ کسی طرح بھی ہو۔ مجھے لمبی سزا مل جائے اور سارا الزام میرے سر آجائے۔

وکیل نے گواہ کے طور پر چوکیدار کو پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''جناب عالی۔ اس مقدمے کا یہ واحد اور سب سے اہم گواہ ہے۔ ملزم نے اسی کی معصومیت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس بے چارے کو دفتر سے باہر بھیج دیا تھا تاکہ اطمینان سے اپنا کام کر سکے۔''

کریم گواہوں کے کٹہرے میں آکر کھڑا ہو گیا۔ اس سے پوچھا گیا ''کیا تم جو کہو گے سچ کہو گے؟''

''جی حضور۔ میں جو کہوں گا۔ سچ کہوں گا۔'' کریم نے کہا۔

''تو پھر بتاؤ۔ کیا ہوا تھا؟''

''کچھ بھی نہیں ہوا تھا جناب۔ جمیل صاحب پر یہ ایک جھوٹا الزام لگایا گیا ہے۔''

سب کے سب حیران رہ گئے تھے۔ ذرا سی دیر میں بازی ہی الٹ گئی تھی۔ خاص طور پر باس کا چہرہ دیکھنے کے قابل تھا۔

''یہ ٹھیک ہے کہ جمیل صاحب دفتر آئے تھے۔ کیوں کہ انہیں باس ہی نے دفتر بلایا تھا۔''

''یہ تم کس طرح کہہ سکتے ہو کہ انہیں دفتر کے باس ہی نے بلایا ہوگا؟''

''میرے سامنے جمیل صاحب نے باس سے اپنے موبائل پر بات کی تھی۔ کیوں کہ جمیل صاحب باس کا انتظار کر کے پریشان ہو گئے تھے۔ میں نے باس کی آواز سنی تھی۔ وہ یہ کہہ رہے تھے کہ تم گھر واپس چلے جاؤ۔ جو میٹنگ ہونی ہے وہ اگلے ہفتے ہوگی۔ آواز بالکل صاف سنائی دے رہی تھی صاحب۔ اسی لیے میں یہ کہہ رہا ہوں کہ ان کو باس ہی نے دفتر بلایا تھا۔''

عدالت میں ایک لمحے کے لیے سناٹا سا چھا گیا تھا۔

''کریم۔ پھر تم نے تھانے میں جا کر جھوٹی گواہی کیوں دی تھی؟''

''میری مجبوری تھی صاحب۔ میری بیوی کینسر کی مریضہ ہے۔ اس کے علاج کے لیے پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں نے ایک بار باس سے بات کی تو انہوں نے انکار کر دیا تھا۔ باس کو یہ بات یاد تھی۔ انہوں نے مجھے بلا کر یہ کہا کہ میں ایسا بیان دے دوں تو وہ مجھے پچاس ہزار روپے دے دیں گے۔ بس صاحب۔ میں نے اسی لیے تھانے جا کر یہ بیان لکھوا دیا تھا۔ جمیل صاحب نے مجھے کہیں نہیں بھیجا تھا۔ وہ کمرے میں میرے سامنے بیٹھے رہے تھے۔ پھر باس کے فون کے بعد واپس چلے گئے تھے۔ اتنی ہی کہانی ہے صاحب۔''

باس اپنی پیشانی سے پسینا صاف کر رہا تھا۔

''کریم اب تم ایسا بیان کیوں دے رہے ہو؟'' اس سے پوچھا گیا۔

''جمیل صاحب کو دیکھتے ہی میرے اندر کچھ ہل چل سی ہونے لگی ہے صاحب۔ یہ جب دفتر میں بیٹھے تھے تو باتوں باتوں میں میں نے ان کو اپنی بیوی کی بیماری کے بارے میں بتایا تھا۔ ان کی جیب میں پانچ ہزار روپے تھے جو انہوں نے اسی وقت نکال کر دے دیے تھے۔ تو بس صاحب۔ مجھے یہ اچھا نہیں لگا کہ جس نے میرے ساتھ نیکی کی تھی۔ میں اسی کے خلاف جھوٹی گواہی دوں۔ حقیقت یہ ہے صاحب۔''

اس کے بعد کا کیس بالکل صاف تھا۔ باس کے خلاف کیس بنا دیا گیا تھا۔ میں باعزت بری ہو گیا تھا۔

اس وقت جواد نے میرے پاس آکر کہا۔ ''جمیل جانتے ہو یہ سب کیوں ہوا؟''

''نہیں جواد۔ میں تو خود حیران ہوں۔''

''اس میں حیران ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔ خدا نیکی کو ضائع نہیں ہونے دیتا۔ تم نے اپنے چوکیدار سے نیکی کی تھی۔ وہ نیکی اس مشکل وقت میں تمہارے کام آگئی۔ نیکی چھوٹی یا بڑی نہیں ہوتی۔ صرف نیکی ہوتی ہے۔ اور اس کا اجر خدا کے پاس ہوتا ہے۔ چاہے یہاں ملے یا چاہے وہاں ملے۔ تم خوش نصیب ہو کہ تمہاری یہ نیکی اسی دن تمہارے کام آگئی۔''

میری آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ میرا خدا کتنا رحیم اور مہربان تھا۔ اس نے نہ صرف میرے دامن کو اپنی رحمتوں سے دھو ڈالا تھا بلکہ مجھے اپنے ہونے کا احساس بھی دلا دیا تھا۔ اللہ اکبر۔

اب میں کسی اور فرم میں ہوں۔ اور میں نے کریم کو بھی اسی فرم میں جاب دلوا دی ہے۔ اور میں نے اس سے جو وعدہ کیا تھا کہ میں ہر ماہ اس کی بیوی کے علاج کے لیے کچھ رقم دیتا رہوں گا۔ وہ میں ابھی تک نبھا رہا ہوں۔

آپ بھی نیکی کے کسی موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ نہ جانے کس مشکل میں کام آجائے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

ناجو

محترمی
سلام شوق
ناجو کی سرگزشت ارسال کررہا ہوں۔ گر غور کریں تو ناجو ایک استعارہ ہے۔ ماں باپ کی بے توجہی کس طرح بچوں کی زندگی برباد کردیتی ہے اسی کا یہ شاخسانہ ہے۔

شمیم الدین غوری
(کراچی)

بے چارے بشیر اور خیراں کو دس سال ہو گئے مراد بر نہ آئی۔ دوا دارو کا تو خیر سے دیہات میں رواج ہی نہ تھا۔ مسجد کے ملا جی سے دعائیں اور جامع مسجد کے امام صاحب کے تعویذ سے ہی کام چلایا، آگے اللہ پر چھوڑ دیا۔ گاؤں میں اس کا کوئی روزگار تو تھا نہیں بس لوگوں کے کام کاج کر دیے تو فصل پر کچھ دانے مل گئے کہیں بھی کوئی مزدوری کر لی تو کچھ مل گیا۔ گاؤں کے سارے لوگ عید پر سائیں بوٹے والی سرکار کے مزار پر عرس میں جارہے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

http://paksociety.com

Downloaded From Paksociety.com

تھے۔ بشیر کبھی اپنے گاؤں سے باہر ہی نہ گیا تھا۔ کسی نے کہا سرکار کے در پر جا کر دعا کرو شاید مراد بر آئے۔ بشیر اور خیراں بس میں بیٹھ کر لوگوں کے ساتھ سائیں بوٹے والی سرکار کے مزار پر عرس میں چلے گئے۔ جا کر دعا مانگی۔ تین دن کا عرس ختم ہوا۔ سب لوگ واپس آگئے۔ کسی نے کہا کہ سرکار کے دربار پر نوچندی جمعرات کو لنگر کرو۔ مراد بر آئے گی بشیر نے جمعرات تک رکنے کا ارادہ کیا۔ اس کے پاس لنگر کے لیے کوئی خاص رقم نہ تھی۔ ایک متولی سے پوچھا کہ کیا کیا جائے۔ اس نے کہا کہ نیت ہونی چاہیے لنگر پوری دیگ کا کر دیا ایک ایک ہنڈیا کا کرو۔ بشیر نے خیراں سے پوچھا کہ کچھ رقم ہے؟ اس نے جو پاس تھا وہ نکال کر دے دیا۔ ملا جلا کر اتنے پیسے ہوئے کہ بھینس کے دو پائے آجائیں۔ ان تین چار دن میں مزار کے مستقل باسیوں سے سلام دعا ہو گئی جن میں فقیر قلندر، پہنچے ہوئے بزرگ، دعائیں دینے والے دھاگا تعویز والے مزار کے متولی وغیرہ شامل تھے۔ نوچندی جمعرات کو خیراں نے اپنے ہاتھ سے بہت مزیدار پائے پکائے۔ اس کا خیال تھا کہ معاملہ اولاد کا ہے پورے خلوص اور دل سے پکائے گی تو بوٹے والی سرکار کچھ کرم کر دے گی۔ اپنے ہاتھ سے روٹیاں پکائیں، بشیر نے پتیلا سر پر رکھا اس پر رومال میں روٹیاں رکھیں، دونوں میاں بیوی سب کے پاس گئے سالن روٹی نکال کر دی اور ایک اللہ والے کے چھپر میں بیٹھ کر اسے بھی کھلایا اور خود بھی کھایا۔ یہ بزرگ جلالی مشہور تھے۔ بہت کم بات کرتے تھے اس بزرگ نے خوش ہو کر کہا کہ جاؤ اسی میں تمہارے لیے برکت ہے۔ اسی طرح پکاؤ اور کھلاؤ۔ بشیر بیچارہ سیدھا آدمی تھا۔ کچھ نہ سمجھا اور رات کو جلالی بزرگ سے پوچھا کہ کیا کل پھر پکا کر کھلاؤں۔ انہوں نے کہا کہ اس کو روزگار بنا لو اسی میں برکت ہے۔ بشیر نے یہ بات پلے باندھ لی۔

بشیر شہر میں کسی رشتہ دار کے شفٹ ہو گیا۔ گھر سے پائے روٹی پکوا کر سر پر رکھ کر بازار میں آتا اور دکان دکان جا کر بیچتا۔ واقعی بڑی برکت ہوئی۔ دو پائے سے چار ہوئے چار سے آٹھ۔ اب پتیلا بڑا ہو گیا اور کاروبار پیدل سے سائیکل پر ہونے لگا۔ ایک دن تانگے والے کا گھوڑا اجو بدکا اور سائیکل سے ٹکرایا تو سارا پتیلا زمین پر دھڑام اور بشیر بیچارہ الگ زخمی۔ لوگوں نے اسے اسپتال لے جا کر مرہم پٹی کرائی اور گھر پر چھوڑا۔ سارے بازار کو اس بات کا پتا چلا۔ اگلے تین چار دن دکاندار اس کے گھر آتے رہے مزاج پرسی کے ساتھ حوصلہ افزائی اور کچھ امداد بھی کرتے رہے۔ ایک مہربان نے مشورہ دیا کہ گھوم پھر کر فروخت کرنے کی بجائے کوئی ٹھکانہ بازار میں بنا لو۔ کوئی لڑکا رکھ لو جو دکانوں پر جا کر دے آئے گا۔ بشیر ٹھیک ہو کر ایک بار پھر بوٹے والی سرکار کے مزار پر گیا۔ بڑا لنگر کیا اور جلالی بابا کو اپنے ہاتھ سے لے جا کر کھلایا۔ جلالی بابا جلال میں آئے اور آواز لگائی خوشی آئے گی اور دولت کے ساتھ آئے گی۔ دولت کے ساتھ ہی جائے گی۔ شہر آ کر ایک دکان کرائے پر لے لی اور کام چلنے لگا۔ دکان دکان جانے کی بجائے اب لوگ خود ہی اس کے ہوٹل سے آ کر کھانا لے جاتے۔ کچھ کرسیاں باہر ڈال دیں اس طرح یہ ایک چھوٹا سا ہوٹل بن گیا۔ جسے لوگوں نے بشیر کا ڈھابا نام دے دیا۔

بشیر کے گھر خوشخبری آئی سارے بازار میں بڑا لڈو بانٹا گیا اور نام جلالی بابا کے کہنے پر نذیر احمد رکھا گیا جسے سب پیار سے ناجو کہتے تھے۔ وقت کے ساتھ اس کا ڈھابا بڑے ہوٹل میں تبدیل ہو گیا۔ اب خوشخبریوں کی لائن لگ گئی بڑا بیٹا پھر اس کے بعد تین بیٹیاں اور دو بیٹے۔ ادھر ہوٹل اپنی نئی بڑی بلڈنگ میں شفٹ ہو گیا۔ بشیر اور خیراں نے اپنے بڑے بیٹے کو بڑے لاڈ پیار میں رکھا۔ اسکول میں اس کی دلچسپی کم ہی ہوتی تھی۔ جب جی چاہتا بوٹے والی سرکار کے مزار پر جانے کی خواہش کرتا جس سے کسی کو انکار نہ ہوتا۔ ہر بات میں ماں کہتی میرے ناجو کو کچھ نہ کہنا یہ بوٹے والی سرکار کا تحفہ ہے۔

اسی طرح دن گزرتے رہے۔ ذرا بڑا ہوا تو خود ہی ماں سے پیسے لے کر بس سے بوٹے والی سرکار کے پاس چلا جاتا۔ خیراں جب اس کو لینے آتی تو جلالی بابا ایک ہی بات کہتا۔ خیراں خوشی دولت کے ساتھ جائے گی۔ اسے کچھ سمجھ نہ آتا کہ اس کا کیا مطلب ہے۔ مزار پر دم لگانے کے پورے لوازمات موجود تھے۔ ناجو دم لگاتا جوان ہو رہا تھا۔ والدین اب ادھیڑ عمر کی طرف جا رہے تھے ناجو ہوٹل سنبھالنے کی بجائے دوسری سرگرمیوں میں مصروف تھا۔

مزار پر ہر عرس پر لاکھوں کا معاملہ ہوتا تھا۔ تھیٹر کے نام پر تماش بینی، لاٹری کے نام، سرکس کے ساتھ ساتھ طوائفیں، عارضی ہوٹل چڑیا گھر پھولوں کے اسٹال چوڑیوں کے اسٹال کھانے اور دیگر مختلف اسٹالوں سے علاقے کی انتظامیہ... پولیس اور مزار کے متولی لاکھوں کماتے تھے۔ تین شہروں سے جو راستے آتے تھے ان سے پولیس کی الگ آمدنی تھی ایک سال تو ناجو نے دس اسٹال اپنے نام سے لے کر بیچے اور دو اسٹالوں پر لاٹری لگائی۔ سات دن ہن برستا رہا تھا۔ ایک ہفتے میں اتنی دولت کہ شمار مشکل۔ اس کے نتیجے میں اس کے اردگرد

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

جرائم پیشہ لوگ اکٹھے ہو گئے۔ ایک گینگ سا بن گیا جس میں چور ڈاکو، نشے کے عادی اور اچکے شامل تھے۔ ناجواب نذیر بن گیا تھا۔

اگلے سال اس کا مطالبہ تھا کہ لاٹری کے سارے اسٹال اور مزید پچاس اسٹال اسے دیئے جائیں۔ معاملہ جب با اثر متوالیوں کی حد سے باہر ہو گیا تو انتظامیہ کے پاس آیا۔ علاقہ ایس ایچ او سے چلتا ہوا ڈپٹی کمشنر تک آیا اور پھر طے ہوا کہ ایسے لفنگوں کو مزار سے دور ہی رکھا جائے تو بہتر ہے۔ نذیر کو ڈپٹی کمشنر کے حکم پر پندرہ دن کے لیے مزار بدر کرنے کے احکامات جاری کر دیے گئے۔ نذیر کے شرابی دوستوں میں ایک وکیل بھی تھا اس کے مشورے سے نذیر ان کے ایک دوست وکیل کے پاس کراچی آ گیا۔ بوٹے والی سرکار کے اس عرس پر پہلے ہی دن رات کو جب راگ رنگ کی محفل عروج پر تھی ایک مشہور ڈانسر کی محفل میں ساری انتظامیہ اپنی ڈیوٹیاں انجام دے رہی تھیں تو اسٹالوں پر ایسی آگ لگی جو چاروں طرف اس طرح پھیلی کہ مزار بھی اس کی زد میں آ کر جل گیا۔ لاکھوں کے خواب پر پانی پھر گیا۔ بوٹے والی سرکار اپنا مزار نہ بچا سکی سچ ہے یہ اللہ والے لوگ اپنی ذات کے لیے اللہ سے کچھ نہیں مانگتے۔ اسٹال والوں نے اپنا بقایا دینے کی بجائے ایڈوانس واپس مانگا۔ کمانے والوں کو لینے کے دینے پڑ گئے۔ اب انتظامیہ نے جانا کہ مل بانٹ کر نہ کھانے کا انجام کیا ہوتا ہے۔ نذیر کے خلاف پرچہ کاٹا گیا۔ وکیل کے کہنے پر اس نے گرفتاری دے دی۔

ایک ہفتہ جیل میں رہا، وہاں اپنے جیسے اور لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ دو پیشیوں میں ضمانت ہو گئی۔ مزید کچھ پیشیوں میں بری ہو گیا۔ بری ہونے کے بعد اس کے وکیل دوست نے نذیر احمد کے نام سے ایک درخواست ہائی کورٹ میں دی کہ سائیں بوٹے والی سرکار کے واقعے کی ذمہ دار انتظامیہ ہے۔ انتظامیہ میں ڈپٹی کمشنر، ایس پی۔ ایس ایچ او اور تھانے کا سارا عملہ شامل ہے۔ یہ لوگ بجائے ڈیوٹی کے ڈانس دیکھنے میں مصروف تھے۔ اور تھانے کا عملہ آنے والی گاڑیوں سے پیسے بٹورنے میں مصروف تھا۔ پورے ضلعے میں کھلبلی مچ گئی۔ افسران کے وفد آ کر نذیر احمد سے ملے۔ پولیس افسران گھر پر آئے۔ ڈپٹی کمشنر جا کر شہر میں بشیر احمد سے ملا۔ نذیر احمد نے ایک اور درخواست دی کہ اس کو پرانے کیس میں ہراساں کیا جا رہا ہے اور اس کے ماں باپ کو بھی پریشان کیا جا رہا ہے۔ پولیس اور افسران کے آنے جانے کے فوٹو درخواست میں لگائے۔ مک مکا کے لیے آنے والے وفد کو نذیر احمد نے ایک گھنٹے دروازے کے باہر انتظار کرایا۔ مک مکا اس طرح ہوا کہ دونوں وکیل پیشیاں لیتے رہیں گے۔ جب تک سب کا ٹرانسفر نہیں ہو جاتا کیس واپس نہیں لیا جائے گا۔ چاہے اس میں بیس دن لگیں یا بیس سال لگیں یہ کیس خود بخود عدم پیروی کی بنا پر خارج ہو جائے گا۔ اس طرح نذیر احمد ایک انتہائی اہم شخصیت کے طور پر جانا جانے لگا۔ اب مزار کے احاطے میں بھنگ کا کنٹرول اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ پولیس کی مجال نہ تھی کہ کسی کو چھیڑ سکے اب کے عرس پر تمام کنٹرول نذیر احمد کے ہاتھ میں تھا۔ ٹریکٹر لگا کر مزید جگہ صاف کرا کر اسٹال بڑھائے۔

.... باقاعدہ کچھ ضابطے نافذ کیے۔ چوکیدار مقرر کیے۔ اسٹالوں کے درمیان کھلی جگہیں رکھیں سات دن کے اس میلے کو دیکھنے والوں نے خوب سراہا اس مرتبہ پشاور اور کراچی کے ہول سیلرز کو مکمل آزادی سے کام کرنے کا موقع دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ان کو مستقل ٹھکانے بھی فراہم کر دیے گئے۔ میلے کے اختتام پر افسران کا حصہ ان کو پہنچا دیا گیا۔

نذیر احمد کے پاس اب اتنی دولت ہو گئی تھی کہ زمین کا ایک ٹکڑا لے کر اپنے لیے ایک مکان بنا لے۔ دو ہزار گز پر کراچی کے آرکیٹیکٹ سے نقشہ بنوایا۔ لاہور کی معروف کنسٹرکشن کمپنی کو کنسٹرکشن کا ٹھیکا دیا۔ ایک سال میں وہ شاندار کوٹھی تیار ہوئی کہ دنیا دیکھے۔ اس پر نام لکھوایا گیا نذیر احمد خان۔ اس سال عرس پر اس نے لاہور کی مشہور طوائف بانو بائی کی لڑکی لاڈو سے شادی کر لی بانو بائی کی لڑکی لاڈو کا حسن ایسا کہ زاہدوں کی بھی قسم ٹوٹ جائے۔ بشیر اور خیراں نے اس میں شرکت نہ کی۔ بھائی بہن شادی میں شریک ہوئے۔ جلالی بابا نے ایکبار پھر بشیر سے کہا خوشخبری دولت کے ساتھ جائے گی۔ اپنے بیٹے سے کہو کہ توبہ کر لے ورنہ خوشخبری دولت کے ساتھ جائے گی۔

وقت گزرا بہنوں کی شادیاں ہو گئیں۔ دونوں چھوٹے بھائی پڑھتے رہے۔ بشیر نے اپنی محنت کی کمائی میں ناجو کی کمائی کا پیوند نہ لگنے دیا۔ بہت سمجھایا۔ لیکن دولت کا نشہ چڑھتا گیا۔ ادھر کوئی افسر ایسا نہ تھا جو کسی نہ کسی بہانے لاڈو کو دیکھنے اور گھر پر آنے کی دعوت نہ دے۔ افسران اور زمینداروں کے گھر سے دعوتیں آنے لگیں۔ لاڈو کے جوں جوں اولاد ہو رہی تھی اس کا حسن اور نکھرتا جا رہا تھا۔ کوہاٹ کے حنیف اللہ سے لے کر کراچی کے خیر و دادل اور جاسم بھٹی سے تعلقات میں لاڈو کا ایک کردار تھا۔ افسران کے تعلقات اس سے بڑھتے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

گئے۔ناجائز معاملات میں خطرات کے تحت وکیل بڑے کام کی چیز تھا۔زمینیں جائداد بچوں بہن بھائیوں کے نام سے لیتا رہا۔پورے پنجاب کی سپلائی کے بعد بین الاقوامی کام کی سوجھی۔اس میں خیر دادل کا تجربہ اور تعاون کام آیا۔

منشیات چیک کرنے والے کتے نذیر احمد خان کے کراچی کے بنگلے میں رکھ کر تجربے ہونے لگے۔آخر ماہر حیوانات نے ایسا کیمیکل دیا کہ جس کو اگر ہلکا سا اسپرے کر دیا جائے تو کتے ادھر منہ ہی نہیں کرتے۔اور ایک ایسا کیمیکل دیا کہ جس پیٹی پر اسپرے کر دیں کتوں کا رخ بس اُدھر ہی ہوگا اندر سے کچھ برآمد نہ ہوگا۔ایئر پورٹ کے عملے سے لے کر ایف آئی اے۔اینٹی نارکوٹک فورس۔امیگریشن پولیس سی آئی اے کے افسران کو حسب مراتب ہر کامیاب لانچنگ کے بعد ٹیپو سلطان روڈ سے گلشن اقبال تک کے بنگلے تحفے میں دیے جاتے۔کراچی میں نذیر احمد خان کے بنگلے میں ہفتہ کی شب تمام ہی ایجنسیوں کے افسران کا ایک میلہ لگا ہوتا تھا۔بزنس عروج پر تھا۔کاروباری مصروفیات میں کبھی دبئی کبھی جنوبی افریقا کبھی چلی کبھی مصر کے دورے ہوتے،غرض دھندا عروج پر تھا۔زمینیں خریدی گئیں،مارکیٹیں لی گئیں،بنگلے بنائے گئے، پیٹرول پمپ اور فارم ہاؤس بنائے گئے۔اپنے بیوی بچوں بھائی بہنوں کے نام پر ہی سب کیا کہ کسی برے وقت میں ضبط نہ ہو جائے ہزاروں ایکڑ زمین ہونے پر نام کے ساتھ اب چودھری لگ گیا۔بچے وقت سے پہلے ہی بڑے ہو گئے دولت کی وجہ سے چھوٹی عمر میں ہی بڑوں والی حرکتیں شروع کر دیں۔بشیر اور خیراں نے بڑی کوشش کی کہ کوئی بیٹا ہوٹل سنبھال لیکن دونوں بیٹے اچھی تعلیم حاصل کر کے امریکا میں اسکالر شپ پر چلے گئے۔بڑھاپے کی وجہ سے ہوٹل بند کیا شہر سے ساری جایداد فروخت کر کے پیسے بینک میں رکھے اپنے آبائی مکان کو کچھ صاف ستھرا کر کے واپس اپنے گاؤں میں آبسے کبھی کبھی بوٹے والی سرکار پر جا کر حاضری دیتے تو جلالی بابا ایک ہی بات کہتا خوشخبری دولت کے ساتھ جائے گی۔

جلالی بابا کے بے حد اسرار پر بشیر نے بیٹے کو بلایا۔جلالی بابا بہت کم بات کرتا تھا اس کی باتیں مکمل جملے نہیں ہوتے تھے۔اس نے اپنا جلال دکھایا اور نذیر سے کہا ناجو بہت ہو گیا۔جا اللہ کے گھر جا۔چوہدری کو خیال آیا کہ اب کیا حسرت باقی رہ گئی۔کیوں اس قدر بھاگا دوڑی کر رہا ہوں۔کس چیز کی کمی ہے۔اولاد کے پاس سات پشتوں تک کے لیے دولت ہے۔اپنے پاس سب کچھ ہے۔سب کاروبار چھوڑ کر حج کرنے چلا گیا۔بیوی کو ساتھ چلنے کو کہا وہ شمع محفل تھی اسے اس سے کیا دلچسپی۔جو کچھ وعدے اور بیرونی ممالک کے دفاتر تھے ان کو بند کرنے میں دو سال لگ گئے۔ان دو سالوں میں کاروبار بس نام کو ہی تھا لیکن افسران اپنا حصہ پورا مانگتے تھے۔جواب بند کاروبار سے پورا کرنا اصولی طور پر غلط تھا۔ان دو سالوں میں اب یہ الحاج چوہدری نذیر احمد خان ہو گئے۔

ایک دن نذیر احمد نے بچوں کے ٹیوٹر کو کہا کہ بچے کو مٹھو دلا لاؤ۔ڈرائیور ساتھ تھا۔پیسے اس کے پاس ہوتے تھے۔ٹیوٹر اسے لے کر ایمپریس مارکیٹ گیا۔وہاں جو مٹھو بچے کو پسند آیا وہ ایک ہزار روپے کا تھا۔ویسے ہی مٹھو مارکیٹ میں بیس تیس روپے کے بھی تھے۔ایمپریس مارکیٹ کے دکاندار ایسے دولت والوں کی نفسیات اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ٹیوٹر کی اپنی مہینے بھر کی فیس تین سو روپے تھی۔اس نے سوچا کہ ایک ہزار روپے کا مٹھو اگر لے کر دیا تو سیٹھ کیا کہے گا۔صاف کہے گا کہ تمہیں آخر کس لئے بھیجا تھا کہ لٹ کر آجاؤ۔بچہ تو بچہ ہے تم تو سمجھدار تھے۔اس نے یہ مٹھو نہیں لیا۔واپس گھر آئے بچے نے ماں سے شکایت کی اس نے بڑبڑ کی کہ کیا ہوا ہزار روپے کیا بچے کی پسند سے اچھے ہیں۔تم غریب لوگوں کو بچوں سے محبت نہیں ہوتی کیا۔

بیچارہ غریب ٹیوٹر دوبارہ ان کے ساتھ ایمپریس مارکیٹ آیا،ایک ہزار کا مٹھو اور پانچ سو کا پنجرہ لے کر اس خیال سے واپس آیا کہ اب لازمی سیٹھ سے جھاڑ پڑے گی۔جیسے ہی بنگلے میں داخل ہوئے سیٹھ کو سامنے ہی موجود پایا ٹیوٹر کی جان نکل گئی۔سیٹھ نے پوچھا کہ کتنے کا ہے۔جب قیمت بتائی تو سیٹھ نے خوش ہو کر کہا واہ کیا چیز دلائی ہے۔اسی لیے تو آپ کو ساتھ بھیجا تھا۔بہت اچھا ہے۔

ٹیوٹر بیچارے نے سوچا واقعی بڑے لوگ بڑے ہی ہوتے ہیں۔غریب لوگوں کو اپنے بچوں کی محبت سے زیادہ ان کے پیٹ کی فکر ہوتی ہے۔ٹیوٹر کیا جانے دولت کا نشہ۔

لاڈو میں طوائف کا خون تو تھا ہی پرورش بھی اسی ماحول میں ہوئی تھی۔اسے وہ تمام آسائشات حاصل تھیں جن کی ایک طوائف تمنا کر سکتی ہے۔نذیر جب باہر ہوتا تو اس پر کوئی روک ٹوک نہ ہوتی۔موجودگی میں بھی افسران کے گھر جانا ان کو رام کرنا ان کی دعوتیں کرنا اس کے کاروباری فرائض میں شامل تھا۔اندرون ملک پروازوں میں اس کا مصروف شیڈول ہوتا تھا۔وقت کے ساتھ اس کی پروازیں بیرون ملک بھی ہونے لگیں۔اس کے پر پرزے بھی نکلنے لگے۔اب وہ نذیر کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کہے میں بھی کم ہی آتی۔ بیرونِ ملک کی رقومات اسے ہی لینی ہوتی تھیں۔ آہستہ آہستہ ایکسپورٹ کا تمام کام اسی کے ہاتھ میں آگیا تھا۔ نذیر اس پر بھروسا کیسے نہ کرتا اس کی شریکِ حیات تھی اس کے چار بچوں کی ماں تھی۔ اس کے کاروبار کی اہم رکن تھی۔ لاڈو کا واسطہ دنیا کے بھانت بھانت کے لوگوں سے رہا۔ اس کی سدا بہار خوبصورتی اور طوائفی ادائیں اسے ہر محفل میں ممتاز اور ہر مرد کے لئے قابلِ کشش بنائے رہیں۔ کئی لوگوں نے تو اسے شادی کی آفر بھی کی۔ اس نے اپنے آپ کو مضبوط کیا۔ دولت کی ریل پیل میں زرعی زمین کو خریدا اپنے نام سے لیں اور ڈالر اکاؤنٹ کی مالک بنی۔ شرابی وکیل اور دوستوں سے جائز کاروبار کا طریقہ سیکھا۔ اس کی ایکسپورٹ امپورٹ کی فرم کی رجسٹریشن کرائی۔ نذیر کے علم میں لائے بغیر دبئی میں اپنا دفتر قائم کیا۔ پاکستان سے چاول اور مصالحوں کی ایکسپورٹ کا کام شروع کیا۔ سمجھدار تھی، اس کا خاندان نسل در نسل نوابوں راجوں مہاراجوں سیٹھوں، بیوپاریوں اور اسمگلروں کی تباہی اور دولت لٹانے کے بعد کے انجام دیکھتا آیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ نذیر جیسے تماش بینوں اور اسمگلروں کا انجام آخر کیا ہوتا ہے۔

الحاج چوہدری نذیر احمد خان نے حج کرنے کے بعد اپنے کاروبار کو لپیٹنے کی جو کوشش کی اس سے افسران سے تعلقات میں کچھ تناؤ سا آگیا۔ ادھر لاڈو بھی دبئی سے نہیں آ رہی تھی۔ الحاج چوہدری نذیر احمد خان نے آخری بار چرس کی ایک بہت بڑی کھیپ فرنیچر میں پیک کر کے بھیجنے کی تیاری کی۔ جواری کی آخری بازی، رند کا آخری جام اور مچھلی کے شکاری کی آخری ڈور کبھی نہیں ہوا کرتی جب تک کوئی دوسرا اس میں دخل اندازی نہ کرے۔ جنوبی افریقا کے لیے اس کھیپ کو تیار کر کے کنٹینر میں لادا جا رہا تھا کہ بروقت آگیا۔ چھاپہ پڑا تمام مال تمام کارندے پکڑے گئے۔ تمام اخباروں اور ٹیلیویژن پر خبریں آئیں۔ لاڈو نے بھی دیکھیں۔ تمام خاندان کو پتا چلا۔ نذیر نے تمام افسران کا ایک خفیہ اجلاس اپنے خفیہ آفس میں طلب کیا۔ اس میں جواب طلب کیا گیا کہ آخر کس نے یہ کام کیا ہے۔ ان کو گالیاں دے دے کر پوچھا گیا کہ آخر کس کی مجال ہوئی۔ سب لاتعلقی کا اظہار کرتے رہے اور آگے کے مشورے دیتے رہے۔ چوکیدار زمان خان کے نام پر پچھلے دنوں کا کرایہ نامہ اس مکان کا بنایا گیا۔ سارے دھندے کا الزام اس پر ڈال کر تمام لوگوں کو چھڑایا گیا۔ زمان خان کو جیل اور گھر میں تمام اخراجات پہنچتے رہے۔ تفتیش اس ایک چھاپے کی نہیں تھی۔ سارے کچے چٹھے کا علم سب کو تھا۔ اب افسران کو انٹرپول کے دباؤ پر اس معاملے کو دیکھنا پڑا۔ نذیر کی تلاش میں چھاپے پڑنے لگے۔ کراچی لاہور فیصل آباد سب جگہ اس کے لیے غیر محفوظ ہوگئی۔ پریشان ہو کر بوٹے والی سرکار پر دیگ چڑھانے گیا۔ جلالی بابا نے پھر کہا خوشخبری دولت کے ساتھ جائے گی۔ والدین بچے شادی شدہ نہیں سب ہی پولیس کی زد میں آئے۔ بوڑھے والدین کے پاس گیا وہاں سے ڈانٹ پڑی۔ کراچی میں اپنی گاڑی چھوڑ کر ٹیکسی میں سفر کرتا۔ سارے بینک اکاؤنٹ سرکار نے بند کر دیے۔ جو جایداد اس کے نام سے تھی وہ ضبط ہوگئی۔ اخبار میں اشتہاری ملزم کے انعام کے اشتہار آگئے۔ ایک دن لسبیلہ کے سگنل پر کسی گاڑی نے نذیر کی گاڑی کو روک کر اسے پکڑنے کی کوشش کی وہ نکل کر بھاگا سفید کپڑوں والے پیچھے تھے آخر کار گندے پانی کے نالے میں چھلانگ لگائی کپڑے پانی میں تیرتا ہوا دوسری جانب نکلا۔ سفید کپڑوں والے اس گندے پانی میں نہ گھس سکے۔ کسی کے گھر میں گھس گیا۔ عورتوں نے شور مچایا تو ان کو بتایا کہ پولیس اس کے پیچھے ہے۔ وہ شریف آدمی ہے کسی کو ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ جیب سے بڑی رقم نکال کر ان کے حوالے کر کے انہیں رام کیا۔ نہا دھو کر انہی سے لے کر کپڑے تبدیل کیے۔ عورتوں نے شور سن آنے والوں کو بتایا کہ بچوں کے ماموں پہلی مرتبہ آرہے تھے اندھیرے میں راستہ بھول کر نالے میں گر گئے تھے۔ عورتوں کو اتنا دیا کہ انہوں نے اس کو دوبارہ آنے کی بھی دعوت دی۔

گھر تو چھوٹ گیا۔ بیوی باہر، بچے اپنے پکڑے جانے پر ناراض بینک اکاؤنٹ منجمد۔ جیب میں کتنا پیسا ہوگا جو چلے گا۔ ہر شخص جس سے تعلق تھا وہ خوف سے چھوڑ گیا کہ مبادا وہ بھی کہیں زد میں نہ آجائے۔ ہوٹل میں جانا خطرے سے خالی نہ تھا اور اب جیب بھی خالی۔ کہیں سے بیوی کو فون کیا تو اس نے کہا کہ کیا مجھے بھی بند کراؤ گے۔ ایک لاکھ جا کر میری ماں سے لے لو اور آیندہ مجھے فون نہ کرنا۔ وہ الحاج چوہدری نذیر احمد خان جس نے لوگوں کو ڈیفنس کے بنگلے اور پراڈو جیسی کاریں تحفے میں دیں۔ جو جہازوں کا ماڈل دیکھ کر ٹکٹ بک کراتا تھا۔ اسے لاہور کے کرائے کے لیے ایک بیرے کی منت کرنی پڑی۔ لاہور اپنی ساس بانو بائی کے پاس گیا اس سے رقم لے کر باہر نکلا۔ پوری انٹی نارکوٹک فورس اس کے تعاقب میں تھی۔ لاڈو کا فون ٹیپ ہوا اور انٹی نارکوٹک فورس کی

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

بیسی کھل گئی۔ لاہور میں بانو بائی کے گھر پر نا کہ لگا دیا۔ باہر نکلتے ہی شناسا چہرے نظر آئے۔ سلام دعا کے بعد انہوں نے اپنی مجبوری ظاہر کی۔ شرافت سے لے کر آئے اور دفتر میں بٹھا دیا۔ اگلے دن سارے اخبارات اور ٹیلیویژن اس کی گرفتاری کی خبر سے بھرے ہوئے تھے۔ کسی نے لکھا منشیات کا بے تاج بادشاہ گرفتار۔ کسی نے لکھا منشیات کا بین الاقوامی اسمگلر گرفتار۔ ہر ایجنسی نے بار بار ریمانڈ لیا۔

بھلا ایسی آفت اور پریشانیاں اس نے کب دیکھی تھیں۔ ریمانڈ، حوالات، تفتیش، جیل اور اکیلا پن سب نے مل کر ایسا اثر کیا کہ دل کا دورہ پڑ گیا۔ ساری عمر کے ساتھی شرابی وکیل سے کسی نہ کسی طرح رابطہ کیا تو اس نے کہا کہ میں اب پاکستان میں نہیں ہوں، دو دن کے لیے آیا تھا رات کو جا رہا ہوں۔ بشیر اور خیراں جیل میں ملنے آئے۔ سلاخوں کے پار سے ملاقات ہوئی۔ ماں تو میرا بچہ کہہ کر ایسی گری کہ اسپتال پہنچ گئی اور تین دن میں انتقال کر گئی۔ باپ نے وکیل کیا۔ لیکن اتنے کیس اور ایسے کیس کہ جن میں ضمانت ہی نہ ہو سکی۔ وہ بچے جن کے لیے اتنا کچھ کیا وہ اپنی مستی میں مگن۔ بیوی نے شرابی وکیل سے شادی کر لی۔ کیس چلے سزائیں ہوتی گئیں۔ دل کا مرض بڑھتا گیا۔ ایک دن جیل کے اسپتال سے باپ کو فون کیا کہ ابا میرے لیے دودھ کے دس ایک پاؤ والے ڈبے لا دو مجھ سے کھانا نہیں کھایا جاتا۔ دس میں سے پانچ مجھے ملیں گے اور پانچ اہلکار رکھ لیں گے۔ طبیعت بہت خراب ہے، اس کے بعد میں آپ کو کوئی تکلیف نہیں دونگا۔ بس مجھے معاف کر دینا اور میری ماں کے قریب دفن کر دینا۔ ملاقات میں ابھی تین دن باقی تھے۔ اس دوران بشیر پریشانی میں سائیں بوٹے والی سرکار کے مزار پر چلا گیا، وہاں جلالی بابا کے پاس جا کر چپ ہو کر بیٹھ گیا۔ انتظار کرنے لگا کہ بابا کب وہ پرانا جملہ دہرائے گا۔ لیکن آج بابا نے وہ جملہ نہیں بولا۔ بشیر نے آج پہلی مرتبہ بابا کے سامنے کھل کر زبان کھولی۔ کہ بابا خوشخبری آئے گی اور خوشخبری دولت کے ساتھ جائے گی کا کیا مطلب ہے۔

بابا کچھ نہ بولا۔ بس بشیر کے گلے لگ کر رو دیا، انتار دیا کہ دیکھنے والے بھی پریشان ہو گئے۔ اگلے دن بشیر دودھ کے بیس ڈبے لے کر جیل گیا۔ نام لکھوایا۔ ڈبے اندر بھیجے اور بلائے جانے کا انتظار کرنے لگا۔ بعد والوں کو بلایا جا رہا تھا اور بشیر کی باری نہیں آ رہی تھی۔ جب ملاقات کا وقت ہی نکلنے لگا تو بشیر نے جا کر سپاہی سے کہا کہ کیا بات ہے۔ اس نے مزید انتظار کرنے کو کہا۔ پھر بلا کر کچھ کاغذات پر انگوٹھا لگوایا اور ایک کاغذ دے کر ایدھی سینٹر جانے کو کہا۔ اس نے پوچھا کہ وہاں کیا ہے؟ بتایا کہ تمہارے بیٹے کا انتقال ہو گیا ہے اور لاش ایدھی سینٹر میں ہے۔

وہ ایدھی سینٹر پہنچا۔ وہاں جا کر پوچھا پرچہ دکھایا تو انہوں نے کہا کہ لاوارث لاشوں کا رجسٹر جس کے پاس ہے وہ ابھی چھٹی کر کے گیا ہے۔ ہفتے بھر کی لاوارث لاشیں اتوار کو دفناتے ہیں۔ کل اتوار کو دفنائی ہیں۔ آج کی لاشیں رکھی ہیں ان میں شناخت کر لو۔ چھ سات لاشوں کو دیکھا اور اپنے لاڈلے کو نہ پایا۔ اسے لاوارث کا لفظ بار بار دل چیرتا ہوا معلوم تھا۔

جس شہر میں بشیر نے ساری جوانی ہوٹل چلایا جہاں اس کے نام کو دنیا جانتی تھی وہاں وہ اکیلا کھڑا سوچ رہا تھا کہ وہ رات کہاں گزارے گا۔ ایک مجرم کے باپ کی حیثیت سے وہ کس کا دروازہ کھٹکھٹائے۔ بس پکڑ کے بوٹے والی سرکار آ گیا۔ جلالی بابا کے پاس آ کر رو رو کر سو گیا۔ فجر میں جلالی بابا نے اسے اٹھایا اور کہا کہ جاؤ۔ بشیر ایدھی سینٹر گیا تو پتا چلا کہ جمعے کو اس نمبر کی لاش آئی تھی اور اتوار کو دفنا دی گئی۔ اس کا نمبر لکھ کر دے دیا اور کہا کہ جا کر ایدھی قبرستان میں تلاش کر لو۔ وہاں گیا تو بانس کی ڈنڈیوں پر گتے لگے تھے ان پر نمبر تھا اور ان گتوں سے بچے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ شکر ہے اس کے بیٹے کا نمبر مل گیا۔ معلوم اس میں اس کا بیٹا ہے یا کوئی اور۔ بیٹھا رہا فاتحہ پڑھی روتا رہا، اس کی پیدائش سے پہلے کی باتیں، دعائیں تعویذ، منتیں اور دعا سے سب یاد آئے۔ جلالی بابا کی باتیں یاد آئیں۔ اب وہ بات بھی سمجھ آئی کہ دولت کے ساتھ خوشخبری جانے کا کیا مطلب تھا۔ نہ بیٹا رہا نہ اس کی دولت۔ کس حال میں مرا، بھوکا تھا یا کچھ کھایا تھا دودھ ملا تھا یا نہیں روٹی تو اس سے کھائی نہیں جا رہی تھی۔ کیا کیا اس کے ناجو نے اپنی اولاد کے لیے کیا اور کیا انجام ہوا۔ کوئی بیٹا قبر پر فاتحہ پڑھنے کے لئے بھی آنے کو تیار نہ تھا۔ خیراں اگر زندہ ہوتی تو کچھ دکھ بشیر کا بانٹ لیتی۔ اب اس بڑھاپے میں سارا غم اکیلے ہی برداشت کرنا پڑ رہا تھا۔ سارا دن گذر گیا۔ قبر سے اٹھ کر جانا اسے ایسے لگ تھا رہا تھا جیسے چھوٹے سے ناجو کو گھر روتا چھوڑ کر کسی کام سے جا رہا ہو اور ناجو اسے بابا نہ جاؤ کی آوازیں مار رہا ہو اور جانا بھی ضروری ہو۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

www.paksociety.com

راہِ پُرخار

محترم ایڈیٹر سرگزشت
السلام علیکم
ایک اور سچ بیانی ارسال خدمت ہے۔ یہ روداد پیکر کی ہے۔ اس کی بیچاری ماں پر کیسے کیسے الم ٹوٹے یہ سوچ کر ہی میرا دم گھٹنے لگتا ہے۔ ان کی روداد میں نے اپنے مخصوص انداز میں لکھی ہے۔ بالکل کہانی کا انداز ہے اس لیے قارئین ضرور پسند کریں گے۔

آصفہ ضیاء احمد
(حیدرآباد)

پیکر کو میں ایک کھلنڈری لڑکی سمجھتی تھی مگر یکا یک وہ حد درجہ سنجیدہ ہوگئی تھی۔ میری طرح کلاس کی دوسری لڑکیوں نے بھی یہ بات نوٹ کی تھی۔ وہ میرے زیادہ قریب تھی اس لیے میں نے ایک دن اسے گھیر لیا۔ وہ پیریڈ خالی تھا۔ اس لیے میں نے اسے اپنی قسم دے کر راز جاننا چاہا اور تب اس نے جو کچھ بتایا تو میں دنگ رہ گئی۔ اس کا آنسو بہانا مجھے فطرتی لگا۔ انسان کی زندگی میں ایسے ڈرامائی موڑ بھی آتے ہیں یہ میں نے اب جانا تھا۔ پیکر نے جو کچھ بتایا اسے میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

Downloaded From Paksociety.com

کہانی کے انداز میں بیان کررہی ہوں۔

.....☆.....

پرانے اور بوسیدہ سامان لوٹتے ہوئے اچانک پیکر کے ہاتھ ایک پھٹا پرانا گھسا پٹا فوٹو البم لگ گیا۔ البم کی ورق گردانی کرتے ہوئے چہرے پر تجسس اور تفکر کے سائے لہرانے لگے۔ سوچ میں ڈوبی ہوئی آنکھوں کو پٹپٹاتے ہوئے اس نے تیزی سے اوراق پلٹنا شروع کیے اور پھر ایک گہری سانس خارج کی۔ البم بند کر کے منہ پھلائے اسے گھورتی رہی اور پھر البم اٹھا کر تنتناتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ جیسے ہی ڈرائنگ روم میں اس کی انٹری ہوئی مانو بھونچال آ گیا۔ حماد اور ثنا کھانے سے فارغ ہو کر کافی پی رہے تھے۔ بیٹی کا بگڑا ہوا موڈ دیکھ کر دونوں کے چہروں پر مسکراہٹ دوڑ گئی اور دونوں نے یک زباں ہو کر سوال کیا۔ ''اب کیا ہوا ہے۔ کسی نے کچھ کہہ دیا کیا۔''

پیکر نے ہونٹ کاٹتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا۔ ''کسی نے کچھ نہیں کہا۔ نہ میرا کسی سے کوئی جھگڑا ہوا ہے نہ لڑائی۔ مجھے دراصل آپ دونوں سے کچھ پوچھنا ہے۔''

دونوں میاں بیوی اسے حیران پریشان نظروں سے تکنے لگے۔ کیوں کہ وہ انتہائی سرکش لہجے میں بات کررہی تھی۔ ثنا نے اپنا کپ میز پر رکھا اور بیٹی کو اپنی بانہوں میں بھرتے ہوئے بڑے لاڈ سے کہا۔ ''کیا ہوا ہے میری لاڈو کو کچھ بتاؤ تو سہی۔''

پیکر نے ماں کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے آپ کو ماں سے الگ کیا اور براہِ راست حماد سے مخاطب ہو کر استفسار کیا۔ ''پاپا یہ عورت کون ہے آپ کے ساتھ۔ ہر جگہ آپ کے پہلو سے لگی بیٹھی ہے اور مما کس طرح اسے برداشت کرتی رہیں۔ آپ کے ساتھ بیٹھ کر کس بے حیائی کے ساتھ دانت نکال رہی ہے۔ میں ہوتی ناں تو اس کلموئی کا منہ.....'' پیکر کا جملہ نامکمل ہی رہا۔

ثنا نے فوراً اس کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ کر اس کی زبان بند کردی اور اشتعال انگیز لہجے میں بولی۔ ''بس پیکر آگے کچھ نہ کہنا ورنہ اللہ بھی شاید تمہیں معاف نہ کرے۔''

حماد دونوں ماں بیٹی کے درمیان ہونے والی گفتگو سن رہا تھا۔ فوٹو البم دیکھ کر ہی اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔ زبان سے کچھ نہیں کہا لیکن چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ البم میں چسپاں ان تصاویر میں اس کے ماضی کی ایسی چنگاریاں دبی ہوئی ہیں جو ہوا لگتے ہی شعلوں کا روپ اختیار کرلے گی۔ پیکر ماں کو چھوڑ کر باپ کی طرف پلٹی اور خفگی بھرے انداز میں کہا۔ ''پاپا آپ مجھے بتانے کی زحمت گوارا کریں گے کہ مما کے اس رویے کا مطلب کیا ہے اور آپ کیوں خاموش ہیں۔''

حماد نے اپنی نشست چھوڑتے ہوئے بیٹی کے گالوں کو تھپتھپایا اور بولا۔ ''میری گڑیا اپنے پاپا اور مما کے بارے میں کوئی غلط رائے مت قائم کرو۔ تمہیں علم ہے آج رات میری لاہور کی فلائٹ ہے اور مجھے تھوڑی ہی دیر میں گھر سے نکلنا ہے۔ اس عورت کا ہمارے خاندان سے کیا رشتہ ہے اس کی ساری تفصیل تمہاری مما تمہیں سنائے گی۔ سب کچھ جاننے کے بعد پتا نہیں تم میرے اور اپنی مما کے بارے میں کیا سوچو لیکن میری بچی میں بس تم سے یہی کہوں گا کہ یہ مرحلے یہ مقام یہ اونچ نیچ زندگی کا حصہ ہے۔ غم اور خوشی کے راستے خود بنتے ہیں اور ان راستوں پر، سب کو چلنا ہے۔ چاہے پیروں تلے پھول ہوں یا کانٹے، راستے مخملی ہوں یا پتھریلے عبور تو کرنا ہی پڑتا ہے۔'' چند لمحوں کے بعد حماد سانس لینے کے لیے رکا اور پھر بیوی سے مخاطب ہوا۔ ''ثناء اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنی بیٹی کو وہ سب بتا دیں جو ابھی تک اس سے مخفی رکھا ہے کیونکہ آج نہیں تو کل خاندان کا کوئی نہ کوئی فرد ضرور اس کے کان میں یہ سُر پھونکے گا۔ اس لیے بہتر ہے کہ اس راز پر سے ہم خود پردہ ہٹا دیں۔ میرے پاس وقت نہیں ہے۔ ورنہ ساری سرگزشت میں اپنی زبانی اسے سناتا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اٹیچی اٹھائی اور بیوی بیٹی سے رخصت ہو کر باہر کی طرف قدم بڑھائے۔

ڈرائیور اس کی آمد کا منتظر تھا۔ اس نے فوراً اٹیچی اس کے ہاتھ سے لے کر عقبی سیٹ پر رکھی اور حماد کے لیے گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔ ثناء اور پیکر نے ہاتھ ہلا کر اسے الوداع کہا اور گاڑی تیز رفتاری کے ساتھ وہاں سے روانہ ہوگئی۔ دونوں ماں بیٹی برآمدے میں پڑی ہوئی کرسیوں پر ہی ٹک گئیں۔ موسم بے حد خوب صورت اور سحر انگیز تھا۔ آسمان جھلمل ستاروں سے بھرا ہوا تھا۔ ٹھنڈی ہوا کے خوشگوار جھونکے اٹکھیلیاں کررہے تھے۔ پیکر چند لمحے تو اس روش کو دیکھتی رہی جس سے گزر کر حماد کی کارگزری تھی پھر ماں کی جانب رخ کرتے ہوئے ٹھوس لہجے میں بولی۔ ''مما، پاپا جو کچھ کہہ کر گئے ہیں۔ آپ کو ہر صورت اس پر عمل کرنا ہوگا۔ آخر ایسا کون سا راز ہے جو مجھ سے اب تک پوشیدہ رکھا گیا۔ میں آج ہر حال میں جان کر رہوں گی۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

حجاب نے الجھن آمیز نظروں سے بیٹی کی طرف دیکھا اور اسے تسلی دیتے ہوئے بولی۔ ''کوئی راز ہے نہ کوئی اسرار ہے۔ یہ تمہارے پاپا بھی ناں مذاق کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ اب جاتے جاتے تمہیں یہ شغل دے گئے کہ رات بھر تم رتجگا کرتی رہو خود بھی جاگتی رہو اور مجھے بھی سونے نہ دو۔''

پیکر نے تیوری پر بل ڈال کر قدرے تیز آواز میں کہا۔ ''کیا..... کیا کہہ رہی ہیں آپ..... ہوں میں سمجھ گئی پاپا کے جاتے ہی آپ ٹال مٹول پر اتر آئی ہیں اور مجھے بہلانے کی کوشش کر رہی ہیں کہ پاپا نے یہ بات مذاقاً کہی ہے لیکن مجھے یقین ہے وہ ابھی جو کچھ کہہ کر گئے ہیں وہ سو فیصد سچ اور حقیقت پر مبنی۔ مما آخر کیا سیکرٹ ہے جو آپ مجھ سے اتنی پردہ داری برت رہی ہیں۔ جائیے میں آپ سے آئندہ نہیں بولوں گی۔ پاپا کے آنے پر ان سے ہی استفسار کروں گی اس سارے معاملے پر۔'' یہ کہتے ہوئے وہ پیر پٹختی ہوئی اندر کی جانب بڑھ گئی۔

ثناء اس کے پیچھے بھاگی اور روٹھی ہوئی بیٹی کو مناتے ہوئے بولی۔ ''ایک تو غصہ تمہاری ناک پر رکھا ہوتا ہے۔ ماشاء اللہ جوانی میں قدم رکھ چکی ہو مگر حرکتیں وہی بچوں والی ہیں۔ چلو آج تم میرے کمرے میں ہی سو جاؤ۔ وہیں پر ساری داستان تمہیں سناتی ہوں لیکن ساری روداد سننے کے بعد اپنے پاپا کی اس بات کو ضرور یاد رکھنا کہ یہ سب زندگی کا حصہ ہے۔ دل و دماغ پر اس کے اثرات لے کر اپنی زندگی کو جہنم مت بنانا۔ اچھا برا نفع نقصان کا سب تقدیر جو ہمارے لیے لکھ دیتا ہے، وہ ہر حال میں ہوتا ہے۔ غم اور خوشی دھوپ چھاؤں کی مانند ہیں جو آتے جاتے رہتے ہیں۔''

پیکر نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ ''آپ اطمینان رکھیں۔ سب کچھ دل کی اتھاہ گہرائیوں میں دفن کرلوں گی۔ کسی کو ہوا نہیں لگنے دوں گی۔ نہ کوئی اثرات اپنے پر یا آپ پر یا پاپا پر مرتب نہیں ہونے دوں گی بعد میں بھی آپ مجھے اسی طرح نارمل پائیں گی۔ بس اب آپ شروع ہو جائیے۔'' ثناء نے بیٹی کا ہاتھ کھینچ کر اسے اپنے بیڈ پر بٹھایا اور ممتا بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''ہو بڑی ہٹ دھرم اپنی بات منوا کر ہی رہتی ہو۔''

پیکر مسکراتے ہوئے ماں کے قریب کھسک آئی اور ماں کے بولنے کا انتظار کرنے لگی۔ ثناء کے ہونٹوں پر چپ کا تالا تھا اور نظریں کھڑکی کے بندشیشوں کے پار دور افق پر ٹکی ہوئی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد اس کے ہونٹ ہلے اور اس نے گفتگو کا آغاز کیا۔

☆.....☆

شہریار خان کے والدین اور بہنیں بضد تھیں کہ اب انہیں شادی کرلینی چاہیے لیکن وہ اپنی شادی میں محض اس لیے ٹال مٹول سے کام لے رہے تھے کہ خاندان کی جس لڑکی کو وہ پسند کرتے تھے وہ ابھی زیر تعلیم تھی اور جب تک وہ گریجویشن نہیں کرلیتی۔ اس کے والدین اس کی شادی نہیں کریں گے اس لیے وہ خاموش تھے لیکن جب سیماب بی ایس سی کر چکی تو انہوں نے اپنی مرضی گھر والوں پر ظاہر کردی کہ وہ سیماب سے شادی کرنا چاہتے ہیں اور پھر جلد ہی سیماب ان کی بیوی بن کر ان کے گھر آگئی۔ شروع کے دو سال تو دونوں میاں بیوی کے یوں ہنستے مسکراتے گزرے کہ پتا ہی نہیں چلا۔ دونوں کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہر طرف بہاریں رقصاں ہیں اور پھول ہی پھول کھلے ہیں۔ لیکن جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا بہو کی خالی گود گھر کے تمام افراد کو کھٹکنے لگی۔ بذات خود سیماب کو بھی اس بات کا بخوبی احساس تھا۔ اپنے کاموں سے فارغ ہو کر اپنے وجود کو چھپائے چھپائے پھرتی۔ سارے گھر میں تناؤ اور کشیدگی کا راج قائم ہو جاتا۔ دبی دبی زبانوں میں ماں بہنوں نے شہریار پر دوسری شادی کے لیے زور ڈالنا شروع کردیا تھا لیکن شہریار نت نئے بہانے تراش کر معاملے کو ٹالے جا رہا تھا۔ جب معاملہ زیادہ طول پکڑ گیا تو شہریار نے ایک دن ایک دھماکا خیز خبر سنائی کہ اس کا ٹرانسفر ملک سے باہر ہو گیا۔ وہ ایک انٹرنیشنل فرم میں انجینئر تھا اور اس فرم کی شاخیں خلیجی ممالک میں بھی تھیں۔ شہریار کے ٹرانسفر کی خبر سب پر بجلی بن کر گری ماسوائے سیماب کے، ماں کی تجربہ کار نگاہیں تاڑ گئیں کہ اچانک کمپنی والوں کی طرف سے یہ پروانہ کس طرح آیا۔ بہنوں میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ سب اچھی طرح جان گئے تھے کہ شہریار بے اولادی بھگت لے گا لیکن سیماب سے جدائی اسے گوارا نہیں۔ دونوں کے جاتے ہی گھر اور ویران ہو گیا لیکن گھر میں اس وقت خوشی کی لہر دوڑ جاتی جب باہر سے اس کا ڈرافٹ آتا جو کہ بھاری بھرکم رقم پر مشتمل ہوتا۔ ماں باپ اگر نہال ہوتے تو بہنیں بھی شاداں و فرحاں ہوتیں کیوں کہ تینوں بہنوں کی بھی حصے داری ہوتی اس پیسے میں۔ بھائی بھاوج کی بے اولادی کو بھول کر بہتی گنگا میں سب ہاتھ دھو رہے تھے کہ شہریار نے پھر دوسرا دھماکا کیا اور!

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ماں کو خاص الخاص یہ خوش خبری سنائی کہ سیماب کا پیر بھاری ہے۔ سب کے دلوں میں شک کا سانپ رینگ گیا۔ اتنے برسوں کے بعد وہاں جاتے ہی اُمید بندھ گئی جب کہ وطن میں اتنے علاج معالجوں کے بعد بھی ہمیشہ مایوسی ہی ہاتھ لگی۔ ماں بیٹیوں کی آپس میں سرگوشیاں ہوئیں اور پھر سب نے چپ سادھ لی۔ اس وقت گھر میں جیسی خوشی ہونی چاہیے تھی اس کا نام ونشان نہیں تھا۔ شہریار اور سیماب جب ایک پیاری سی بچی کو گود میں لے کر گھر میں داخل ہوئے تو کسی نے ان کا والہانہ استقبال نہیں کیا نہ بچی کے لیے کسی کی مامتا جاگی۔ دونوں میاں بیوی نے اس رویے کو محسوس کیا لیکن زبان نہیں ہلائی۔ جب خاندان والوں کا شک ہونٹوں تک آیا تو شہریار نے بھی تلخی آمیز لہجے میں کہا۔ ''ہاں ہاں تم لوگوں کی سوچ صحیح ہے۔ یہ میرا خون نہیں ہے۔''

اس کے اس جملے نے شکوک اور شبہات کو اور ہوا دی اور اس طرح ایک ننھی سی جان اپنے ہی گھر میں پرائی بن کر پلنے لگی۔

لایعنی سوچوں نے سیماب کو بھی تھکا ڈالا تھا۔ یہ اس کی خام خیالی تھی کہ صاحبِ اولاد ہوتے ہی سسرال میں اس کی قدر ومنزلت میں اضافہ ہوجائے گا۔ یہاں تو پانسہ ہی الٹا پڑا تھا۔ ان سب باتوں نے اس کی صحت پر اتنے خراب اثرات مرتب کیے کہ وہ آئے دن بیمار رہنے لگی۔ اس کی مسلسل بیماری دیکھ کر شہریار کی پریشانیوں میں اضافہ ہوگیا۔ چھٹیاں ختم ہوتے ہی اس نے ابوظہبی کی راہ لی۔ یہاں آکر سیماب کو بھی سکون نصیب ہوا۔ قدرت نے جو اسے ایک خوب صورت کھلونا دیا تھا۔ وہی اس کی زندگی اور جینے کا سہارا تھا۔ شہریار جیسے محبت کرنے والے شوہر نے ہر موڑ پر اس کا ساتھ نبھایا تھا۔ سکھ دکھ میں ہمیشہ شانہ بہ شانہ چلا تھا۔ اس لیے وہ اپنی ہر فکر وپریشانی کو اندر ہی اندر دباتی رہی تھی۔ جب دباؤ حد سے زیادہ بڑھا تو وہ بیماری کی شکل میں ابھر کر سامنے آیا۔ اس وقت شہریار کے سامنے اس کی میڈیکل رپورٹ رکھی تھی جس میں اس کے دل کے دو والو بند تھے۔ رپورٹ دیکھ کر اس پر قیامت گزر گئی۔ اس نے علاج میں کوئی کسر نہیں چھوڑی لیکن مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ قدرت نے شاید ان دونوں کا ساتھ یہیں تک لکھا تھا۔

اس بار جب وہ لوٹا تو تنِ تنہا اپنی بیٹی کے ساتھ جو اپنی توتلی زبان میں بار بار اپنے بابا سے سوال کرتی۔ ''ممی مما کہاں ہیں، وہ ہمارے ساتھ کیوں نہیں آئیں بابا۔''

شہریار کا کلیجہ ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا۔ بدقت تمام وہ اپنے آپ کو سنبھالتا۔ بیٹی کا نام اس نے ثانیہ رکھا تھا لیکن دونوں ثناء کہہ کر پکارتے تھے۔ سیماب کی زندگی میں ہی بچی کا کوئی پرسانِ حال نہیں تھا اور اب تو مزید اس کے لیے مخالف ہوائیں چلنے لگی تھیں۔

حالات نے اسے وقت سے پہلے ہی سنجیدہ اور بردبار بنا دیا تھا۔ اپنی خداداد ذہانت کی بناء پر کلاس میں ہی وہ سمجھ گئی تھی کہ باپ کی نظروں کے علاوہ خاندان میں تمام لوگ اسے زہریلی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ اسکول سے واپسی کے بعد وہ سارا دن شہریار... کا انتظار عید کے چاند کی طرح کرتی۔ پھر ایک دن اسے گھر میں بڑی خوب صورت چہل پہل اور ہنگامہ آرائی نظر آئی۔

شور شرابہ اور رونق اپنے عروج پر تھی لیکن وہ ہونق سی بنی سارے گھر میں اپنے بابا کو تلاش کر رہی تھی۔ آخر تھک ہار کر روتی بسورتی وہ اپنے بیڈ پر پڑ کر سو گئی۔ بابا کو نہ آنا تھا نہ آئے۔ پھر دوسری صبح جب اس کی اپنے بابا سے ملاقات ہوئی تو ان کے پہلو میں سرخ زرتار لباس میں ملبوس ایک لڑکی نظر آئی۔ وہ دوڑ کر اپنے بابا سے لپٹنا چاہ رہی تھی لیکن بابا کے اتنے قریب ایک غیر اور انجان عورت کو دیکھ کر وہ بری طرح ٹھٹکی اور سہمی ہوئی فاختہ کی طرح دروازے کا پردہ پکڑ کر کھڑی ہوگئی۔ اسے اپنے بابا کافی بدلے بدلے نظر آئے۔ وہ ٹکر ٹکر حیران کن نظروں سے دیکھے جا رہی تھی کیونکہ بابا بھی اس کے بغیر ناشتا نہیں کرتے تھے لیکن آج وہ اس عورت کے ساتھ کافی خوش اور مسرور نظر آرہے تھے۔ کمرے میں اشتہا انگیز خوشبو بتا رہی تھی کہ آج ناشتا بھی اسپیشل ہے۔ وہ دور کھڑی ناک سکوڑتی رہی۔ پدرانہ محبت جوش میں آئی اور شہریار بیٹی کی طرف کھنچے چلے آئے۔ وہ باپ سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے برسوں کے بعد باپ بیٹی کا ملن ہوا ہے۔ شہریار محبت سے اس کا سر سہلاتے رہے اور پھر شفقت آمیز لہجے میں کہا۔ ''آج ہم آپ کو ایک سرپرائز دیں گے۔''

وہ روتے روتے ہنس پڑی۔ ساری پژمردگی اور افسردگی پل میں دور ہوگئی۔ وہ اشتیاق آمیز لہجے میں چہکی۔ ''بابا کیا سرپرائز ہے۔''

بابا نے اپنی بانہوں میں بھرا اور اس اجنبی خاتون کے قریب بٹھا کر ایک گہری مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''یہ ہیں آپ کی مما۔ آپ روزانہ یاد کرتی تھیں ناں اپنی مما کو۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

نادان ناسمجھ ہونے کے باوجود ثناء کو اپنی ماں کا چہرہ اچھی طرح یاد تھا۔ وہ اپنی نشست پر اچھل پڑی اور منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''میری مما تو ابوظہبی میں ہیں۔ آپ ہی تو کہتے ہیں جب ہم واپس جائیں گے تو ان سے ملیں گے۔ یہ کسی اور کی مما ہوں گی۔ میری مما تھوڑی ہیں۔''

شہریار کو سانپ سونگھ گیا۔ نئی سنوری دلہن بھی کھسیا کر رہ گئی لیکن بولنا مناسب نہیں سمجھا۔ شہریار نے ملازم کو آواز دی اور وہ بہلا پھسلا کر ثناء کو وہاں سے لے گیا۔ بات چھوٹی سی تھی لیکن نفیسہ کے دل میں تیر ہوگئی۔ حالانکہ شہریار نے بچی کی جانب سے معافی مانگ کر بیوی کو خوش کرنے کی کوشش کی۔ اس کے ناز نخرے اٹھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ نفیسہ نے بھی تیل دیکھا تیل کی دھار دیکھی اور پھر اسے اسی میں بہتری نظر آئی کہ سوتیلی اولاد کو کلیجے سے لگا کر شوہر کا دل جیت لے کیونکہ وہ سیماب کی طرح حسین و جمیل نہیں تھی۔ مرد کو بدلتے دیر نہیں لگتی۔ اس لیے نئی نویلی دلہن نے دوسرے دن ہی ساری شرم وحیا کو بالائے طاق رکھ کر ثناء کو گلے لگایا اور اس کا ہر کام دوڑ دوڑ کر خود کرنے لگی۔ محبت اور ممتا کی بھوکی ثناء، نفیسہ سے ایسی لپٹی جیسے سیماب دوبارہ جنم لے کر اس کے پاس چلی آئی ہے۔ نفیسہ کی قربت میں وہ شہریار کو بھی بھول چکی تھی۔ مما مما کہتے ہوئے اس کے لب خشک ہوتے۔ ماں بیٹی کو یوں شیر و شکر دیکھ کر کچھ لوگ جلے تو کچھ نے دعائیں بھی دیں کہ خدا سب کی نیا ایسے ہی پار لگائے۔ شہریار نے بھی سکون کی سانس لی۔ ان کے ذہن سے ایک بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا۔ انہیں محسوس ہوا اب ان کی بیٹی اکیلی نہیں ہے بلکہ نفیسہ جیسی چاہنے والی ماں ہے جو قدم قدم پر اس کا خیال رکھے گی۔

وقت کی چرخی گھومتی رہی اور رنگ برنگی دھاگے کاتتی رہی۔ ثناء کے بعد سحرش اور نازش کے آنے سے گھر کی رونق میں اور اضافہ ہوگیا۔ جب شہریار اپنی تینوں بیٹیوں کو ساتھ کھیلتے کودتے دیکھتا تو اس کی خوشی کی انتہا نہیں رہتی۔ تعلیمی میدان میں تینوں بہنوں کی کارکردگی لائق ستائش تھی لیکن اسی اثناء میں وقت نے ایسی کروٹ لی جس سے گھر کی بنیادیں ہل گئیں جس سال شہریار خان کی ریٹائرمنٹ تھی اس ہی سال ان پر فالج کا اٹیک ہوا۔ ثناء ماسٹر کر رہی تھی۔ اس کا فائنل ایئر تھا کہ اچانک یہ افتاد آن پڑی۔ مردانہ وار آگے بڑھ کر اس نے حالات کا مقابلہ کیا۔ باپ کے علاج معالجے سے لے کر دونوں بہنوں کے تعلیمی اخراجات اور خاندان

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 800 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 9,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 8,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہوسکتا ہے

بیرونِ ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: شمع عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز III ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 021-35802551 فیکس: 021-35895313

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کے تمام افراد کی ضروریاتِ زندگی کے لیے روپے پیسے کی فراہمی اب شناء کی ذمہ داری تھی۔ ہاتھ میں ایم اے کی ڈگری تھی اور دور تک مسائل ہی مسائل بکھرے ہوئے تھے۔ اس کا ناتواں وجود گھر کے لیے بیک بون بنا ہوا تھا۔ شہریار کی پنشن نفیسہ بیگم کے ہاتھ میں آتی۔ وہ کیا سیاہ سفید کرتیں کبھی نہ اس نے پوچھا اور نہ انہوں نے بتایا۔ دفتری مصروفیات کے بعد اس کا سارا وقت باپ کی تیمارداری کے لیے وقف ہوتا۔

شہریار کی زبان مفلوج ہو چکی تھی۔ اس کی گفتگو کسی کے پلے نہیں پڑتی۔ شناء کی ذات تھی جو باپ کی زبان اور اشارے بخوبی سمجھ لیتی اسی لیے جسے بھی ان سے بات کرنی ہوتی وہ شناء کا سہارا لیتا۔ شناء کی آمد پر شہریار کی بے رونق آنکھیں چمکنے لگتیں۔ اپنے فالج زدہ ہونٹوں کو کھینچ کھانچ کر وہ مسکرانے کی کوشش کرتا۔ نفیسہ بھی شناء کی موجودگی میں شوہر کے پاس ٹک جاتی ورنہ وہ اس کے سائے سے بھی خوف کھانے لگی تھی۔ اس طرح کی ملتی جلتی صورتِ حال سحرش اور نازش کے ساتھ بھی تھی۔ وہ دونوں بھی تیوریوں پر بل ڈال کر تلخ و ترش لہجے میں یہی کہتیں۔ ''ہمیں تو پاپا کی کہی ہوئی بات سمجھ ہی نہیں آتی۔ سب سر پر سے گزر جاتا ہے اس لیے کیوں فضول وقت ضائع کریں۔''

ماں بیٹیوں کی ان باتوں پر اس کے دل و دماغ کی نسیں چٹخنے لگتیں لیکن دانش مندی کا تقاضا یہی تھا کہ خاموش رہا جائے کیونکہ شہریار نے اسے یہی سکھایا تھا۔ ایک چپ لاکھ سکھ۔ باپ کی اس نصیحت پر وہ ہمیشہ عمل کرتی۔

آج دفتر سے آکر باپ کے لیے یخنی بنائی اور تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی دروازے تک پہنچی تھی کہ یکا یک وہ ٹھٹک گئی کمرے میں موجود افراد کسی خاص موضوع پر بات کر رہے تھے۔ درمیان میں بار بار اس کا نام لیا جا رہا تھا۔ اس کے کان کھڑے ہو گئے لیکن کچھ پلے نہ پڑا۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد شناء کمرے میں داخل ہوئی تو نفیسہ بیگم گہری سوچوں میں غلطاں تھیں۔ اس نے نرمی سے ماں سے استفسار کیا۔ ''مما یہ لوگ کون تھے اور آپ سے اور پاپا سے کیا باتیں کر رہے تھے۔''

نفیسہ بیگم ٹالنے والے انداز میں بولی۔ ''ارے بیٹا تمہارے دور دراز کے رشتے دار تھے۔ تمہارے پاپا کی عیادت کے لیے آئے تھے۔''

شناء نے نفیسہ کے لب و لہجے سے ہی شناخت کر لیا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہیں لیکن اس بار بھی اس نے خاموش رہنے میں ہی عافیت جانی۔ نفیسہ نے اپنی نشست چھوڑتے ہوئے شہریار کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ سے تو کسی مسئلے پر بات کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے اس لیے بہتر یہی ہے کہ میں تحریر کی زبان استعمال کروں۔ کل میں آپ کو ایک خط دوں گی اسے پڑھنے کے بعد آپ مجھے جواب سے آگاہ کیجیے گا۔ پھر میں ویسا ہی قدم اٹھاؤں گی۔''

شہریار نے آہستہ سے اپنے سر کو جنبش دی اور شناء کی بنائی ہوئی یخنی پینے لگا۔ دوسرے دن جب شناء دفتر سے لوٹی تو گھر میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ نفیسہ اور دونوں لڑکیاں شاپنگ کے لیے گئی ہوئی تھیں۔ معمول کے مطابق شناء آتے ہی باپ کے کمرے کی جانب گئی تو دیکھا کہ شہریار اپنے بیڈ پر بہت زیادہ بے چین اور مضطرب ہیں۔ غصے سے چہرہ تمتما رہا ہے۔ اس کا دل دھڑکنے لگا اور اس نے آہستہ سے سرگوشی کی۔ ''بابا کیا ہوا، خیر تو ہے۔''

''شہریار نے نہایت طیش کے عالم میں ایک خط اس کے حوالے کر دیا۔ تحریر نفیسہ کی تھی جو شہریار کے نام لکھی گئی تھی اور فوری جواب بھی طلب کیا گیا تھا۔ نفیسہ نے شہریار کو مخاطب کر کے لکھا تھا کہ پچھلے دنوں خاندان کی ایک شادی میں ایک خاتون نے شناء کو دیکھا اور اپنے بیٹے کے لیے پسند کر لیا۔ ان کا بیٹا ویل کوالیفائیڈ اور برسرِ روزگار ہے۔ تصویر بھی ساتھ رکھ رہی ہوں۔ شناء کی نگاہیں بے ساختہ تصویر پر چلی گئیں اور پھر وہ خود ہی جھینپ گئی۔ شرم سے چہرہ گلنار ہو گیا۔ اب پھر اس کی نگاہیں خط پر دوڑنے لگیں لیکن آگے جو کچھ لکھا تھا وہ اتنا اذیت ناک اور دلخراش تھا کہ اسے اپنا آپ سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ اپنے حواسوں کو قابو میں رکھ کر اس نے اپنے گرتے ہوئے وجود کو سنبھالا اور ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے پھر خط پڑھنے لگی۔ آگے نفیسہ نے لکھا تھا۔ شہریار فی الفور ہم شناء کی شادی نہیں کر سکتے کیونکہ اس کے ذریعے ہی ہمارے حلق گیلے ہو رہے ہیں۔ اس وقت وہ کئی مردوں پر بھاری ہے اس لیے میری رائے یہ ہے کہ بجائے شناء کے ہم سحرش کو اس رشتے کے لیے راضی کریں اور لڑکے والوں کی بھی مرضی معلوم کر کے جلدی سے اس فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔ سحرش گریجویشن کر چکی ہے اور میں نہیں چاہتی کہ وہ روزی روٹی کے چکر میں پھنسے کیونکہ ملازمت کرنے والی لڑکیاں وقت سے پہلے اپنا رنگ و روپ کھو دیتی ہیں اور میں چاہتی ہوں میری سحرش دنیا کی حسین ترین دلہن

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

بن کر سب کے سامنے آئے۔ مجھے فوراً آپ کا جواب درکار ہے تاکہ میں تیاری کر کے اس کار خیر سے فراغت حاصل کروں۔ براہ مہربانی یہ خط ثناء کو نہ دکھایئے گا۔''

زہر میں بجھے ہوئے الفاظ ثناء کے دل میں پیوست ہو گئے۔ بے اختیار باپ کے سینے پر سر رکھ کر وہ رو پڑی۔ شہریار کی بھی آنکھیں چھلک پڑیں۔ کچھ آنسو اپنی بے بسی اور لاچاری پر تھے اور کچھ بیٹی کے شکستہ ارمانوں پر بہہ رہے تھے۔ دونوں باپ بیٹی خاموش اشک بہاتے رہے۔ انہیں دلاسہ تسلی دینے والا بھی کوئی نہیں تھا اور بالآخر ہوا وہی جو نفیسہ نے چاہا۔ جب کہ شہریار نے اپنے طور پر اپنی آڑی ترچھی زبان سے احتجاج بھی کیا لیکن ثناء نے فوراً باپ کو خاموش کروادیا۔ بلکہ شادی کے سارے کام یوں دوڑ دوڑ کر کرتی رہی جیسے اسے کسی بات کا علم ہی نہیں۔ نفیسہ دل ہی دل میں خوش تھی کہ ثناء کو ہوا بھی نہیں لگنے پائی اور سارا معاملہ خود بخود سلجھ گیا۔ سحرش کی رخصتی کے بعد پھر وہی شب و روز تھے۔ وہی سب کی مصروفیات، وہی کام دھندے، ہاں البتہ شہریار اس لمبے بیڈ ریسٹ سے بری طرح اکتا گیا تھا۔ اس لیے ثناء فارغ اوقات میں باپ کو وہیل چیئر پر بٹھا کر باہر لان میں آجاتی۔ کبھی کبھی شام میں مناسب موقع دیکھ کر قریب کے پارک میں لے کر چلی جاتی۔ ڈاکٹرز کی ہدایات پر بھی وہ برابر عمل کروا رہی تھی۔ اس لیے اب شہریار کے چہرے پر زندگی کے آغاز رواں دواں تھے۔ باپ کو دن بدن روبہ صحت ہوتا دیکھ کر وہ اپنے سارے دکھ بھول گئی تھی۔ تھراپی کے بعد اس میں حیرت انگیز تبدیلی آئی تھی۔ ثناء کے لیے یہ سب نہایت دل خوش کن تھا کہ اس کی محنت رنگ لا رہی تھی۔

ایک سہانی شام جب وہ باپ کو لان کی سیر کروا رہی تھی کہ اچانک کال بیل بجی۔ پھر بجتی چلی گئی۔ وہ جھلاہٹ میں خود ہی گیٹ کھولنے دوڑی۔ گیٹ کھولتے ہی اسے ایک خوبرو نوجوان کھڑا نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک درمیانی سائز کا سوٹ کیس نظر آیا۔ ثناء نے مشتعل لہجے میں کہا۔

''اے مسٹر یہاں کوئی بہرا نہیں ہے سب کو اللہ نے کان دیئے ہیں۔ اطلاع دینے کا بھی ایک طریقہ ہوتا ہے۔ ویسے آپ ہیں کون؟''

اجنبی بھی سٹپٹا گیا لیکن اس کے ہونٹوں پر شوخ اور شریر مسکراہٹ کھل اٹھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس نے یہ سب جان کر کیا ہے۔ وہ یک ٹک ثناء کو دیکھ رہا تھا۔ ثناء گھر کے کپڑوں میں ملبوس، پیروں میں معمولی سی جوتیاں تھیں اور سیاہ بکھرے بالوں کو جوڑے کی شکل دے رکھی تھی۔ حالات کی تیز دھوپ نے اسے کچھ ایسا جھلسا دیا تھا کہ سانولا رنگ اب سیاہی مائل ہو گیا تھا۔ اس لیے پہلے تو یہ ہوتا تھا کہ جس نے ڈالی نظر بری ڈالی لیکن اب ایسا کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن اس وقت نوجوان کی گرم نگاہی سے وہ قطرہ قطرہ پگھلنے لگی۔ فوری اس نے اپنے دوپٹے سے سر ڈھانکا۔ پسینے سے تربتر چہرے کو صاف کیا اور بولی۔ ''جی فرمایئے آپ کو کس سے ملنا ہے؟''

نوجوان نے محتاط انداز میں ایک طائرانہ نظر ڈالی اور نپے تلے انداز میں پوچھا۔ ''جی شہریار خان کا گھر یہی ہے ناں؟''

ثناء نے جھنجلا کر کہا۔ ''باہر لگی نیم پلیٹ پڑھ تو لی ہوگی پھر بھی سمجھ میں نہیں آیا۔'' وہ سمجھی اجنبی شرمندہ اور نادم ہوگا لیکن اس نے کاری جوابی وار کیا۔

''محترمہ باوا آدم کے زمانے کی تختی ہے۔ اب تو یہ آثار قدیمہ والوں کے ہی کام کی رہ گئی ہے۔ کچھ پلے پڑے تو پڑھوں گا ناں۔''

اس دوران شہریار کی وہیل چیئر کو ملازم چلاتا ہوا برآمدے میں لے آیا تھا۔ نووارد کو دیکھ کر ان کی آنکھوں میں شناسائی کی لہر ابھری اور اس نے بے ربط اور ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں ثناء کو آگاہ کیا کہ آنے والا ان کے عزیز ترین دوست سجاد احمد کا بیٹا ہے۔ سجاد ابوظہبی میں ان کے کولیگ تھے۔ دفتری اوقات کے بعد بھی جو فرصت کے لمحات ملتے وہ ایک ساتھ گزارتے۔ سجاد کا بیٹا حسان چند سال پیشتر بھی ان سے ملنے کے لیے آیا تھا۔ اس لیے انہوں نے فوراً پہچان لیا جب کہ ثناء نے ابھی تک سجاد احمد اور ان کے خاندان کا تذکرہ ہی سنا تھا کبھی ان لوگوں سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ ثناء اسے اندر آنے کا کہہ کر وہاں سے ہٹ گئی۔ چند گھنٹوں بعد اس کی ملاقات حسان سے کھانے کی میز پر ہی ہوئی۔ حسان نے ایک مرتبہ بھی نظر اٹھا کر اس کی جانب نہیں دیکھا۔ ثناء مجوب سی بیٹھی کھا کم رہی تھی۔ پلیٹ اور چمچے سے زیادہ کھیل رہی تھی۔ شہریار اپنا اور سجاد کا ماضی کریدرہے تھے۔ حماد کی سمجھ میں کوئی بات آجاتی تو وہ زور زور سے سر ہلانے لگتا۔ نفیسہ نے شوہر کو خاموش رہ کر کھانے کی تلقین کی اور حسان کی طرف قورمے کی قاب بڑھاتے ہوئے اسے مزید کھانے کے لیے اصرار کرنے لگی لیکن حماد نے نہایت

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

مہذب انداز میں انکار کرتے ہوئے ہاتھ کھینچ لیا۔ اب نفیسہ نے سوالات کا سلسلہ شروع کیا۔ ثناء اور نازش بھی ہمہ تن گوش ہوگئیں۔ کیوں کہ گھر میں آنے والے اس مہمان کے بارے میں جاننے کے لیے دونوں بے تاب تھیں۔ جب ڈیٹا سامنے آیا تو دونوں پوری دلچسپی کے ساتھ کنکھیوں سے اسے دیکھ بھی رہی تھیں اور سن بھی رہی تھیں۔ بس ڈر اس بات کا تھا کہ بابا دخل در معقولات کر کے ڈسٹرب نہ کردیں۔ حسان اپنے بارے میں نفیسہ کو بتا رہا تھا کہ والدہ تو پہلے ہی اس دنیا سے کوچ کر چکیں تھیں۔ پچھلے سال بابا بھی اسے تنہا چھوڑ کر ملک عدم سدھارے۔ نفیسہ نے متاسف الفاظ میں تعزیت ادا کی۔ حسان نے ٹشو سے اپنے ہاتھ صاف کرتے بات آگے بڑھائی۔ پاکستان آیا تو سوچا کہ انہیں ان کے دوست کی وفات کی اطلاع دیتا چلوں۔ مکمل طور پر اس علاقے سے واقفیت تو نہیں ہے لیکن پھر بھی آپ کے گیٹ تک پہنچ گیا اور پھر گیٹ پر اس کے ساتھ کیا ہوا۔ یہ قصہ چھیڑنے ہی والا تھا کہ اچانک لائٹ چلی گئی اور میز پر موجود سارے افراد محکمۂ بجلی کی شان میں قصیدے پڑھنے لگے تو ثناء نے ایک پُرسکون سانس لی اور پانی کا گلاس اٹھا کر غٹا غٹ چڑھا گئی۔

شہریار کے پُرزور اصرار پر حسان کا قیام ابھی ان ہی کے گھر تھا۔ حسان بحرین میں آئل کمپنی میں پیٹرولیم انجینئر تھا اور وہاں سے چند ماہ کی رخصت پر آیا تھا کیونکہ اس کے والد کی کئی ایکڑ اراضی پر ایرے غیرے قبضہ کیے بیٹھے تھے۔ اس لیے اس کے چچا اور پھوپی نے خصوصی طور پر یہاں اسی لیے مدعو کیا تھا کہ وہ اپنی موجودگی میں قانونی طور پر جایداد کی تقسیم کا فریضہ انجام دیں تاکہ جو ان کا اپنا حصہ بنتا ہے وہ انہیں مل جائے اور جو اس کا اپنا حق بنتا ہے اسے مل جائے۔ وہ کسی مناسب ہوٹل میں اپنے قیام اور طعام کا بندوبست کرنا چاہتا تھا۔ اس کے تمام ددھیالی عزیز سندھ کے ایک نواحی علاقے میں رہائش پذیر تھے۔ وہاں جانا اس کے لیے اشد ضروری تھا لیکن شہریار کے اصرار پر وہ ٹھہر گیا تھا کہ شہریار اس کے باپ کے حوالے سے اپنا گزرا ہوا وقت اس سے شیئر کررہے تھے۔ یوں بھی وہ تنہائی اور اکیلے پن سے اکتا گئے تھے۔ اس لیے کسی کو قریب بیٹھا دیکھ کر انہیں روحانی سکون محسوس ہوتا۔

حسان اچھی طرح جان گیا تھا کہ اندر سے یہ بوڑھا اور ضعیف انسان کس قدر اکیلا اور دکھی ہے۔ اس لیے جب تک ثناء دفتر سے نہیں آجاتی وہ شہریار کے قریب ہی رہ کر ان سے سارے زمانے کی باتیں کرتا اور سنتا تھا۔ حالانکہ یہ کام کٹھن تھا لیکن ایسے وقت اسے اپنا مجبور اور بیمار باپ یاد آجاتا جسے بیماری اور تنہائی نے ادھ موا کردیا تھا۔ جسے وقت دینے والا کوئی نہیں تھا۔ نفیسہ نے بھی اطمینان کی سانس لی کیونکہ میاں کی بیماری کے بعد اس کی باہر کی ایکٹی ویٹیز بری طرح ڈسٹرب ہورہی تھیں اب حماد کو میاں کے پاس چھوڑ کر وہ کسی نہ کسی بہانے نکل جاتیں لیکن آزاد فضا میں اڑنے والی تتلی نازش اب بجائے باہر جانے کے گھر میں رہنے کو ترجیح دیتی۔ یہ بات گھر میں سب ہی نے محسوس کی۔ حماد کے ارد گرد رہنے کے لیے باپ کی خدمت اور تیمار داری کے سارے ریکارڈ توڑ دیئے تھے۔ نفیسہ فوراً چوکنا ہوگئی اور دوبدو اس مسئلے پر بیٹی سے بات کی۔ نازش شروع سے منہ پھٹ اور سرکش تھی۔ ماں کے استفسار پر ذرا سی بھی نہیں گھبرائی بلکہ بغیر کسی پس وپیش کے اس نے بہانگ دہل منہ پھاڑ کر کہا تھا۔ ''مما آپ کو علم ہے ناں جو چیز مجھے پسند آجاتی ہے۔ وہ میں ہر حال میں حاصل کر کے رہتی ہوں۔''

وہ پُرسوچ انداز میں بیٹی کو تکتی رہی اور پھر خشمگیں لہجے میں بیٹی کو وارننگ دی۔ ''مجھے نہیں لگتا کہ تیری دال گلے گی۔ اس کی آنکھوں میں تو مجھے کچھ اور ہی نظر آرہا ہے۔''

نازش اچھل پڑی۔ دھڑکتے دل کے ساتھ آنکھیں چمکاتے ہوئے بولی۔ ''میں کچھ سمجھی نہیں آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں۔''

نفیسہ نے ایک گہری سانس خارج کی اور بولی۔ ''اس کی آنکھوں میں تم نہیں بلکہ ثناء بسی ہے۔ میری چھٹی حس نے مجھے خبردار کردیا ہے کہ وہ اس کے لیے سنجیدگی سے سوچ رہا ہے۔ وہ بیٹھتا ہے ہم لوگوں کے پاس لیکن منتظر ہوتا ہے ثناء کا۔ حالانکہ وہ اس کی طرف دیکھتی بھی نہیں ہے۔ بات بھی نہیں کرتی ہے۔ تم دیکھ لینا ایک دن وہ تمہارے بابا کے سامنے یہ پروپوزل ضرور رکھے گا۔''

''اور وہ دن میری اور اس کی زندگی کا آخری دن ہو گا۔ اس گھر سے پھر ایک نہیں تین جنازے نکلیں گے۔ میں آپی کو بھی نہیں چھوڑوں گی۔'' نازش ناگن کی طرح پھنکاری۔

نفیسہ بیٹی کی فطرت سے اچھی طرح واقف تھی۔ اس نے فوراً پینترا بدلا اور پان سے رنگین دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بولی۔ ''میری شہزادی ناراض نہیں ہوتے۔ ماں زندہ ہے تیری۔ سحرش کی بھی شادی میری کوشش سے ہوئی ہے۔ تیرے لیے بھی کچھ سوچنا پڑے گا۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

ماں کی تسلی تشفی سے اس کے بے قرار دل کو قرار آ گیا اور اس رات وہ بے فکری کی نیند سوئی تھی۔ ساری رات حسان کے خواب دیکھتی رہی لیکن حسان کے خوابوں میں کوئی اور تھا۔ نفیسہ کی آنکھوں نے جو کچھ دیکھا تھا وہ حقیقت تھی۔ جوں جوں اس کے جانے کے دن قریب آ رہے تھے۔ اس کا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔ شہریار خان کے سامنے بات چھیڑنے سے پہلے وہ ثناء سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن ثناء ہر بار بڑی خوب صورتی سے کنی کاٹ جاتی۔ وہ ہوا کا رخ پہچان رہی تھی۔ حسان کی آنکھوں میں چھپی تحریر وہ پڑھ چکی تھی لیکن انجان بنی ہوئی تھی۔ وہ جب بھی اس کے قریب آنے کی کوشش کرتا وہ نظریں چرا کر اپنے کاموں میں یوں منہمک ہو جاتی جیسے یہ کام دنیا کا اہم ترین کام ہے اور حسان دانت پیس کر رہ جاتا۔ وہ مناسب موقع کی تلاش میں تھا۔ اسی دوران سحرش کے یہاں بیٹے کی پیدائش کی خبر ملی۔ نفیسہ اور نازش خوشی میں دیوانا وار میٹرنٹی ہوم بھاگیں اور اس دیوانگی میں انہیں یہ بھی یاد نہیں رہا کہ گھر میں ایک نحیف اور نزار ہستی کے بعد دو جوانیاں تنہا ہیں اور اگر دونوں کی قربت بڑھی تو پھر کچھ بھی ہو سکتا ہے لیکن ہونی ہو کر رہتی ہے۔ اس رات شٹلنے جب باپ کو دوا دینے کے بعد لحاف اوڑھاتے ہوئے اللہ حافظ کہا اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی کمرے سے نکل کر اپنے بیڈ روم کی طرف جانے لگی تو حسان اسے کچن سے نکلتا نظر آیا اس کے ہاتھوں میں کافی کے دو مگ تھے۔ سرعت کے ساتھ وہ اس کے قریب آیا اور معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ ''فرسٹ ٹائم آپ کا کچن بغیر کسی کی اجازت کے استعمال کیا۔ صرف اس لیے کہ آپ کو گرما گرم کافی پلا سکوں۔''

ثناء نے بھنوئیں اچکاتے ہوئے روکھے لہجے میں کہا۔ ''لیکن حسان صاحب میں رات کے کھانے کے بعد چائے یا کافی کو ہاتھ بھی نہیں لگاتی کیونکہ اگر میں نے چائے یا کافی پی لی تو رات بھر بستر پر کروٹیں بدلتی رہتی ہوں۔ اس لیے مجھے تو معاف.....'' درمیان میں ہی حسان بول پڑا۔ ''اتنی حسین رات اور آپ اسے سو کر گزارنا چاہتی ہیں۔ ارے اسی لیے تو یہ شراب الصالحین پیش کر رہا ہوں۔ دراصل یہ نیک لوگوں کی شراب ہے۔ اس لیے میں نے اسے یہ نام دیا ہے۔ آج ہم اور آپ مل کر رتجگا منائیں گے۔''

ثناء نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''میں کیوں اپنی نیند غارت کروں اور مجھے تو یہ عام سی رات لگ رہی ہے۔ آپ کو اس میں کیا حسن نظر آ رہا ہے۔''

حسان بھی ڈھیٹ مٹی کا بنا ہوا تھا۔ اس نے زبردستی مگ اس کے ہاتھ میں پکڑایا اور خود وہیں کھڑے ہو کر آرام سے چسکیاں لینے لگا۔ پھر شوخی بھرے لہجے میں بولا۔ ''ویسے آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اس سے زیادہ خوب صورت رات میری زندگی میں پہلے کبھی نہیں آئی۔ انکل گہری نیند سو رہے ہیں۔ آنٹی اور آپ کی چھوٹی بہن گھر سے غائب ہیں۔ کیسی دلکش خاموشی اور سناٹے کا راج ہے۔ اب دیکھئے ناں وطن جس کام سے آیا تھا وہ بھی بخیر و خوبی انجام پا گیا۔ آپ لوگوں نے جو میری پذیرائی اور مہمان نوازی کی ہے۔ اس کے لیے میں آپ سب کا مشکور ہوں۔ اب واپسی کے دن قریب ہیں۔ بہت جلد بحرین چلا جاؤں گا۔ پھر پتا نہیں کب آپ سے ملاقات ہو۔ اس لیے آپ کے حضور ایک عرضداشت ہے؟''

حسان نے بغیر کسی جھجک کے نہایت شگفتہ انداز میں کہا۔ ''دیکھئے مجھے شاعرانہ تشبیہات دینا تو آتا نہیں۔ ہاں البتہ اچھے شاعروں اور ان کی شاعری کا دلدادہ ہوں۔ آپ کے سامنے حقیقت بیان کر رہا ہوں۔ دل مضطر کی تو میں مانتا نہیں۔ کیونکہ سائنس کہتی ہے۔ دل نہ سوچ سکتا ہے اور نہ سمجھ سکتا ہے اور نہ ہی تو اس کے پاس بصارت ہے اور نہ سماعت ہے۔ صرف میرا دماغ کہہ رہا ہے کہ آپ میری بہت اچھی بیوی ثابت ہو سکتی ہیں اور دماغ ایک اور مشورہ دے رہا ہے کہ ابھی اور اسی وقت آپ بھی اپنا حال دل بیان فرمائیے تو بہتر ہوگا تاکہ میں انکل سے بات کر کے چٹ منگنی پٹ.....''

ثناء جھنجلاہٹ بھرے انداز میں بولی۔ ''کیا بے سروپا باتیں کر رہے ہیں آپ۔ مجھے زندگی بھر اپنے بابا کے قدموں میں رہنا ہے۔''

اس نے بھی نہایت ہٹ دھرمی سے کہا۔ ''تو اس کے لیے کون منع کر رہا ہے آپ کو۔ ماں باپ کے قدموں میں رہنے کی بھنگ تو انسان پیدا ہوتے ہی کروا لیتا ہے۔ میں کون سا ابھی آپ کو رخصت کروا کر لے جا رہا ہوں۔ نکاح کے بعد تو کاغذی کارروائی.....''

وہ پھر بولی۔ ''ارے ارے یہ کیا ہو رہا ہے آپ تو نکاح تک پہنچ گئے۔''

حسان نے معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ ''محترمہ اتنی زبردست جمپ لگائی ہے کہ آپ کے اندر اتر کر آپ کی دھڑکنوں سے جواب بھی پوچھ لیا ہے۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اب ثناء کے لیے وہاں کھڑا ہونا محال ہوگیا تھا کیونکہ زبان جو نہیں کہہ پا رہی تھی وہ نگاہوں نے کہہ دیا تھا۔ اس رات کے بعد دونوں اپنی اپنی جگہ بے انتہا خوش اور مسرور تھے۔ نفیسہ بیگم اڑتی چڑیا کے پر گننے والی خاتون تھیں۔ وہ سارا معاملہ بھانپ گئیں اور جب حسان حرف مدعا شہریار کے روبرو زبان پر لایا تو شہریار کے مردہ جسم میں زندگی کی رو دوڑ گئی۔ اس نے فوراً نفیسہ سے تذکرہ کیا۔ وہ آج بہت خوش تھا۔ ویسے بھی حسان سے اسے ایک جذباتی لگاؤ اور محبت ہو گئی تھی۔ نفیسہ نے پورے صبر و تحمل کے ساتھ شوہر کی بات سنی اور دل جلے انداز میں ہاتھ نچا کر بولی۔ ''ایک غیر اور جوان لڑکے کو آپ نے اپنے گھر میں رکھ کر بہت بھاری غلطی کی ہے۔ آپ کو یقیناً اس بات کا علم نہیں ہوگا کہ آپ کی چھوٹی لاڈو بھی اس لڑکے پر فدا ہے اور صاف کہہ دیا ہے کہ اگر اس سے شادی نہیں ہوئی تو وہ کچھ بھی کر سکتی ہے۔

شہریار نے گھبرائی ہوئی نگاہوں سے بیوی کو دیکھا۔ لڑکھڑاتی زبان سے کچھ بولنا چاہا۔ لیکن پل ہی پل میں زبان اکڑ گئی تھی۔ ہاتھ پیر ٹھنڈے پڑ گئے تھے۔ نفیسہ کو فوراً حالات کی سنگینی کا احساس ہوا۔ وہ دہشت زدہ انداز میں چلائیں۔ ''ثناء دیکھو تمہارے بابا کو کیا ہوگیا ہے۔''

اس چیخ پر گھر کا ہر فرد دوڑتا بھاگتا شہریار کے کمرے میں پہنچ چکا تھا۔ ثناء باپ سے لپٹ کر ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی۔ حسان کے فون پر ڈاکٹر نے آکر معائنہ کیا اور موت کی تصدیق کردی۔ حسان نے استعجاب انگیز اور پریشان کن لہجے میں کہا۔ ''لیکن ڈاکٹر صاحب میں ابھی چند لمحوں پہلے ان کے پاس بیٹھا ان سے باتیں کر رہا تھا تب تک یہ بالکل ٹھیک تھے۔ پھر اچانک یہ سب کیسے ہوگیا۔''

ڈاکٹر نے تاسف کے ساتھ کہا۔ ''جی بس یہی کہا جاسکتا ہے کہ غیر متحرک لائف اپنی جگہ بذات خود موت کے مترادف ہے لیکن آپ کہہ رہے ہیں کچھ دیر پہلے یہ بالکل ٹھیک تھے تو پھر یقیناً کوئی گہرا ذہنی دھچکا یا صدمہ انہیں ایسا لگا کہ یہ جانبر نہ ہو سکے اگر زندگی کی ڈور فوراً نہ ٹوٹتی تو ہم اپنی سی کوشش کرتے لیکن مرضی مولا کے آگے کس کی چلی ہے۔''

ڈاکٹر کے رخصت ہوتے ہی گھر میں کہرام مچ گیا۔ حسان بار بار ایک ہی بات سوچ رہا تھا۔ ''کیا میری باتوں کا اتنا خطرناک ری ایکشن ہوا ہے کہ انکل زندگی کی بازی ہی ہار بیٹھے وہ اپنے آپ کو مجرم تصور کر رہا تھا۔ اس کی آنکھیں غور و فکر میں ڈوبی ہوئی تھیں کہ اچانک دماغ میں بجلی سی کوندی۔ اب وہ کھلی آنکھوں سے ایک منظر دیکھ رہا تھا۔ جب وہ انکل کے کمرے سے نکل کر راہداری میں مڑ رہا تھا تو نفیسہ آنٹی کمرے میں داخلہ ہو رہی تھیں۔ یقیناً آنٹی ہی اسے مسئلے کو حل کر سکتی ہیں۔ وہی اس بات پر روشنی ڈال سکتی ہیں کہ زندگی کے آخری لمحات میں ان کے ساتھ کیا ہوا لیکن ابھی صورت حال ایسی نہیں تھی کہ وہ یہ ذکر لے کر بیٹھتا۔ وہ موقع محل دیکھ کر بات کرنا چاہتا تھا کیونکہ وفات کی خبر پاتے ہی عزیز و اقارب اور ملنے جلنے والوں کا تانتا لگا ہوا تھا۔''

تجہیز و تکفین سے فارغ ہونے کے بعد بھی وہ اندر نہیں جا سکا۔ دل میں طرح طرح کے خدشات اور وسوسے سر اٹھاتے رہے لیکن فی الفور ماحول اس قسم کی باتوں کے لیے موزوں نہیں تھا۔ سارا معاملہ موخر ہوگیا اور پھر نفیسہ کی عدت شروع ہوگئی۔ اب سے مسئلہ اور بھی گمبھیر ہوگیا تھا۔ ثناء اپنے حواسوں میں نہیں تھی۔ بدقت تمام جب گھر کی سوگوار فضا میں تبدیلی آئی اور آنے جانے والوں کا اژدھام کم ہوا تو اس نے ملازم کے ذریعے نفیسہ سے بات کرنی چاہی لیکن اس نے انکار کر دیا۔ بات پھر آئی گئی ہوگئی۔ حماد چاہتا تو اپنی رخصت میں توسیع کروا سکتا تھا لیکن اس نے تمام باتوں کو التواء میں ڈال کر اپنی ڈیوٹی کو اہمیت دی۔ ثناء اور نازش کو ہمت حوصلہ اور صبر کی تلقین کرنے کے بعد اداس اور بھاری دل کے ساتھ انہیں الوداع کہا اور وہاں سے رخصت ہوا۔ چند دن اپنے رشتے داروں کی معیت میں گزارے اور پھر عازم سفر ہوا۔ بحرین پہنچ کر سیٹ ہونے میں اسے کافی دقت کا سامنا کرنا پڑا۔ کیونکہ اسے اب تنہائی اور اکیلے پن سے بے زاریت محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ فطری طور پر سکون پسند تھا لیکن اب شور شرابہ اور ہنگامہ آرائیاں اچھی لگتیں۔ شہریار کے گھر گزارے ہوئے ایام اس کے لیے سرمایۂ حیات تھے۔ ثناء کی یادیں اس کی سانسوں میں بسی ہوئی تھیں۔

جوں توں کر کے اس نے سال مکمل کیا اور چھٹیاں شروع ہوتے ہی نئے جوش اور ولولے کے ساتھ وطن عزیز کی راہ لی۔ آج پھر نئے جوش و جذبے اور امنگوں بھرے دل کے ساتھ وہ شہریار خان کے گھر کے گیٹ پر کھڑا تھا۔ آج اسے یقین آگیا تھا دنیا گول ہے۔ اس جگہ پر آکر اسے بے اختیار ماضی کا وہ باپ یاد آگیا جب وہیل چیئر پر بیٹھے ہوئے ایک نحیف و ناتواں شخص نے نہایت خلوص سے اس کا ہاتھ تھاما تھا اور اسے خوش آمدید کہا تھا۔ شہریار انکل کی یاد آتے ہی آنکھوں میں دھندسی اتر آئی اور پھر خیالوں میں دبے

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

قدموں شاء چلی آئی۔ جس سے اسی جگہ اس کی پہلی ملاقات ہوئی تھی اور کھٹی میٹھی باتیں ہوئی تھیں۔ یہ سب سوچتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھلنے لگی اور اس نے گیٹ کھول کر آگے کی طرف قدم بڑھائے۔ اس نے اپنے آنے کی اطلاع نہیں دی تھی۔ سب اچانک اتنا بڑا سرپرائز پا کر نہال ہو گئے۔ نفیسہ نے دوڑ کر گلے لگایا اور ڈھیروں دعاؤں سے نواز دیا۔ شاء کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں لیکن اس نے دور سے صرف سلام کرنے پر ہی اکتفا کیا۔ بظاہر حسان کی آمد پر اس میں کوئی نمایاں تغیر محسوس نہیں ہو رہا تھا کیونکہ وہ اپنے جذبات اور کیفیات کو کنٹرول کرنا بخوبی جانتی تھی۔ ہاں البتہ نازش اس وقت پاگل بنی ہوئی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا۔ اٹھ کر ناچنا شروع کر دے اور سب کے سامنے لپک لپک کر گائے میرا پیا گھر آیا او رام جی۔ وہ حسان پر سے واری صدقے ہو رہی تھی۔ شاء دور کھڑی تماشا دیکھ کر مسکراتی رہی پھر اس نے ملازم کو اشارہ کیا اور رسانیت سے کہا۔ ”صاحب کے ہاتھ سے سامان لے کر اوپر کے روم میں رکھو اور ان کے باتھ روم کی فوری صفائی کر کے ان کے کپڑے اور تولیہ بھی رکھ دو۔ تاکہ وہ فریش ہو جائیں۔“

ملازم نے فوراً دوڑ لگا دی۔ اس گھر کے تمام ملازمین ہی حسان سے بہت خوش رہتے تھے۔ کیونکہ وہ نہایت خوش مزاجی سے ان سے گفتگو کرتا اور اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً انہیں بھاری ٹپس بھی دیتا۔ اس لیے اس کے آنے سے ان کے بھی دل کی کلی کھل گئی تھی۔ ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد حسان نے نفیسہ اور نازش کے سامنے قیمتی اور امپورٹڈ گفٹس کے انبار لگا دیئے۔ دونوں ماں بیٹی کی خوشی دیدنی تھیں۔ جیولری دیکھ کر تو دونوں کی آنکھیں جگمگ کرنے لگیں۔ اچانک نازش نے سوال داغ دیا۔ ”آپ آپی کے لیے کچھ نہیں لائے؟“

حسان نے چہکتے ہوئے لہجے میں کھلی کھلی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”آپ کی آپی کے لیے جو کچھ لایا ہوں وہ آنٹی کی اجازت کے بعد ہی ان کی خدمت میں پیش کر سکتا ہوں۔“

نفیسہ نے پھر اپنی رنگین بتیسی کو چمکایا اور کہا۔ ”لو بھئی اس میں اجازت کی کیا ضرورت۔ جیسے مجھے اور نازش کو دیا اسی طرح ہماری بڑی بیٹی کو بھی دو۔“

حسان نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ نفیسہ اور نازش کا شوق تجسس اپنے عروج پر تھا۔ دونوں آنکھیں جھپکائے بغیر حسان کو دیکھ رہی تھیں۔ حسان نے ننھی سی مخملی ڈبیہ نکالی اور پھر اس میں سے ایک قیمتی اور جگمگاتی ہوئی انگوٹھی نکال کر ٹھوس اور مستحکم لہجے میں کہا۔ ”آنٹی میں شاء کو انگیج منٹ رنگ پہنانا چاہتا ہوں۔“

ایک لرزہ خیز دھماکا تھا جو اس روز شہریار خان کے گھر میں پھٹ پڑا۔ نازش اپنے آنسو نہ روک سکی۔ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی۔ وہ بلی کی سی سرعت کے ساتھ اوپر کی طرف بھاگی۔ نفیسہ ابھی تک ورطۂ حیرت میں ڈوبی پھٹی پھٹی آنکھوں سے حسان کو دیکھے جا رہی تھی اور حسان حیران پریشان کھڑا یہ سوچ رہا تھا کہ یہ اچانک کیا ہو گیا۔ نازش روتی ہوئی کیوں چلی گئی اور آنٹی کے چہرے کا رنگ کیوں فق ہو گیا۔ شاء اپنی نشست پر بے حس و حرکت بیٹھی تھی۔ چہرہ پھیکا پڑ گیا تھا۔ بالآخر حسان نے آگے بڑھ کر نفیسہ کا ہاتھ پکڑا اور انہیں صوفہ چیئر پر بٹھایا۔ وہ اپنے بھاری بھرکم وجود کو لے کر دھم سے بیٹھ گئی۔ ایک کرسی کھینچ کر وہ خود بھی ٹک گیا اور ہلکے پھلکے لہجے میں نہایت نرم آواز میں استفسار کیا۔ ”ہاں اب بتائیے کیا بات ہے؟“

پہلے پہل تو نفیسہ خاموش رہی لیکن حسان کے مسلسل اصرار پر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی اور آنسوؤں سے بھیگی آواز میں نہایت درد انگیز لہجے میں کہا۔ ”حسان بیٹا! آج میں بہت بڑے سربستہ راز پر سے پردہ ہٹانے جا رہی ہوں۔ شاء دراصل میرے شوہر کی اولاد نہیں، اس کی گواہ میری تین نندیں ہیں جو آج بھی زندہ ہیں۔ تم ان کے پاس جا کر انکوائری کر سکتے ہو۔“

حسان نے تلخ اور تیز لہجے میں الفاظ چباتے ہوئے کہا۔ ”آنٹی مجھے کسی کے پاس جا کر کوئی تفتیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ شاء بھلے ہی شہریار انکل کی اولاد نہیں لیکن ہے تو کسی کلمہ گو کی اولاد، اس کے سارے قبیلے کا شجرۂ نسب دیکھنے کے لیے نہ میرے پاس وقت ہے اور نہ میں ان خرافات کو مانتا ہوں۔ میں اب رسم منگنی نہیں بلکہ سیدھے نکاح کروں گا اور اسی وقت شاء کو یہاں سے لے جاؤں گا۔“

”یہ حماقت بھول کر بھی نہ کرنا۔“ نفیسہ ناگوار انداز میں بڑبڑائی۔ ”شاء کے پورے خاندان کی جانچ پڑتال بھلا ہی نہ کرو لیکن مجھ سے اس کے باپ کا نام تو پوچھو۔“

حسان نے زہر خند لہجے میں کہا۔ ”ذرا میں بھی سنوں۔“

نفیسہ نے شانے اچکاتے ہوئے سخت برہم لہجے میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کہا۔ ''اس کے باپ کا بھی وہی نام ہے جو تمہارے باپ کا ہے۔ یہ مت سمجھنا کہ شناء کا باپ اور تمہارا باپ ہم نام تھے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے باپ سجاد احمد نے شہریار اور سیماب پر ترس کھا کر اپنی اکلوتی بیٹی جو نوزائیدہ تھی شہریار اور سیماب کے گود میں ڈال دی تاکہ ان کی شادی کو دھکا نہ لگے۔ اسے معلوم تھا دونوں میں بہت زیادہ محبت ہے اگر جدا ہو گئے تو دونوں خوش نہ رہ سکیں گے۔ اس لیے اس بے اولاد جوڑے کو اپنی بیٹی دے کر انہیں صاحب اولاد بنایا اور پھر دونوں جب اپنے خاندان میں اسے لے کر پہنچے تو تاڑنے والوں نے سب کچھ تاڑ لیا۔''

''نان سینس۔'' حسان دہاڑا۔ ''میں نہیں مانتا اس بات کو اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو میرے والدین اتنی اہم بات میرے کانوں تک ضرور پہنچاتے تاکہ میں اپنی بہن سے مل سکوں۔ آپ کیا سمجھ رہی ہیں کیا میں شناء کا ڈی این اے نہیں کروا سکتا۔ جھوٹ پر جھوٹ بولے جا رہی ہیں آپ۔''

''اے! یہ ڈی این اے کیا ہوتا ہے۔'' نفیسہ بولی۔

حسان نے ان ہی کے لہجے میں جواب دیا۔ ''جی یہ کیا ہوتا ہے نہ میں سمجھا سکتا ہوں اور نہ آپ سمجھ سکتی ہیں۔ بس اتنا بتا دوں کہ یہ وہ اہم جزو ہے جو ہر جاندار کے جسم میں ہوتا ہے۔ جس کے ذریعے وراثتی معلومات منتقل ہوتی ہے۔''

نفیسہ نے بلا خوف و خطر فوراً کہا۔ ''کروا لو کروا لو جو بات ہم نے سن رکھی ہے وہی کہا کوئی اپنی طرف سے من گھڑت کہانی نہیں سنائی ہے۔''

حسان نے جز بز ہوتے ہوئے جواباً کہا۔ ''آپ نے جو انکشاف کیا ہے اگر اسے سچ مان بھی لیا جائے تو یہ بات مجھے انکل نے کیوں نہیں بتائی۔ ان کی رحلت سے چند گھنٹے پیشتر میں نے اپنے دل کی بات انہیں بتائی۔ جسے سننے کے بعد ان کے چہرے پر نہایت خوشگوار تاثرات ابھرے۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ وہ بہت خوش تھے۔ بھلا ہی وہ زبان سے کچھ نہیں کہہ پائے لیکن خوشی اور مسرت سے ان کا چہرہ چمک رہا تھا۔ ان کے پاس سے میں بات کر کے ہٹا ہوں اور فوراً ہی آپ داخل ہوئیں۔ تب انہوں نے آپ سے کیا کہا۔''

نفیسہ نے سٹپٹا کر اسے دیکھا پھر اپنے آپ کو سنبھالا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''ارے بیٹا! انہوں نے تمہاری باتوں کا ہی تو اثر لیا تھا۔ انہوں نے اپنی ٹوٹی پھوٹی لڑکھڑاتی زبان میں فقط اتنا کہا۔ شناء اس کی سگی بہن ہے لیکن اس غریب کو علم نہیں۔ تم اسے بھی سمجھاؤ اور نازش کو بھی اس رشتے کے لیے تیار کرو۔ دونوں کی جوڑی چاند سورج کی جوڑی لگے گی۔''

حسان کی لمبی طنزیہ ''ہوں'' کمرے میں گونجی۔ اپنی نشست چھوڑتے ہوئے اس نے خود کلامی کے انداز میں آہستگی سے کہا۔ ''تو اس لیے محترمہ روتے ہوئے سرپٹ بھاگی۔ اب سارا گیم سمجھ میں آ رہا ہے۔''

نفیسہ کے کانوں تک حسان کی بات نہیں پہنچنے پائی اس لیے وہ چہک کر بولی۔ ''اے بیٹا جو بولنا ہے ذرا زور سے کہو تاکہ مجھ غریب کے پلے بھی کچھ پڑے۔''

حسان نے مشتعل لہجے میں کہا۔ ''جی مجھے آپ سے کچھ نہیں کہنا ہے۔ بس میں شناء کو اپنے ساتھ لیے جا رہا ہوں۔''

شناء ابھی تک صم بکم کی عملی تفسیر بنی بیٹھی تھی۔ حسان کے اس جملے پر وہ اچھل پڑی اور خوفزدہ آواز میں کہا۔ ''نہیں نہیں میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ یہ میرے بابا کی دہلیز ہے۔''

حسان کا غصہ اب آسمان سے باتیں کر رہا تھا۔ اس نے نہایت طیش آمیز لہجے میں کہا۔ ''اصل میں تمہیں بھی ظلم سہنے کی عادت ہو گئی ہے۔ تم ساری زندگی یوں ہی تڑپتی سسکتی رہو گی۔ بہر حال میں جا رہا ہوں۔''

وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اس گھر سے نکل گیا۔ جس گھر میں داخل ہوتے وقت اس کے پاس اُمیدوں اور آرزوؤں کا ایک خزانہ تھا۔ اسی گھر سے اب وہ بالکل تہی دست اور تہی دامن جا رہا تھا۔ اس کے نکلتے ہی شناء اپنے کمرے میں جا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

سارے گھر میں موت کا سناٹا طاری تھا۔ نفیسہ نازش کے سرہانے بیٹھ کر اس کا سر سہلا رہی تھی اور نازش کا سوگ ابھی تک جاری و ساری تھا۔ نفیسہ جو تیر چلا کر آ رہی تھی۔ وہ کارگر ثابت ہوئی تھی لیکن حسان کے جانے سے اسے احساس ہو گیا تھا کہ اسکیم ساری چوپٹ ہو گئی اور ذلت اور سبکی الگ گلے پڑی۔ اس کا ذہن اب نئے تانے بانے بن رہا تھا۔ وہ سوچوں میں غرق رہی اور نازش پیر پھیلا کر خواب خرگوش کے مزے لیتی رہی۔ شناء کے وہی شب و روز تھے۔ اپنے غموں سے وہ اپنے کمرے کی چہار دیواری میں باتیں کر لیتی۔ بظاہر اپنے آپ پر ضبط کا پہرہ لگائے بیٹھی تھی۔ حسان کو بھلانا اس کے لیے بھی آسان کام نہیں تھا۔ اس کے پاس اس کا نمبر بھی تھا۔ دل چاہا اس کی

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

خیریت ہی دریافت کرلیں لیکن دماغ نے فوراً مزاحمت کی کہ کہیں یہ مواصلاتی گفتگو گھر میں نئے فتنے نہ کھڑا کردیں۔ صبر کا گھونٹ پی کر اپنے آپ کو مصروفیات میں غرق کرلیا لیکن اچانک ایک ایسے سانحے سے یہ خاندان دوچار ہوا کہ ثناء نے نہایت پریشانی اور گھبراہٹ کے عالم میں حسان کو فون کردیا۔ اس نے بمشکل حسان کو اتنا بتایا۔ ''حسان ابھی ہم لوگ بابا کی موت کے غم سے سنبھلنے نہیں پائے تھے کہ..... کہ کل اچانک کار حادثے میں سحرش بھی ہم لوگوں کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلی گئیں۔ مما اور نازش کی حالت ناقابلِ بیاں ہے۔ میں بالکل تن تنہا ہوں۔ تمہیں بابا کا واسطہ پلیز مما کی ساری باتوں کو درگزر کرکے دلاسہ تسلی کے چند الفاظ ہی ان سے کہہ دو۔''

اچانک رونما ہونے والی سحرش کی جواں موت نے حسان کو ہلا کر رکھ دیا۔ چند ثانیے کے لیے اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی مفلوج ہوکر رہ گئی۔ ایک سرد آہ بھر کر اس نے غمناک لہجے میں کہا۔ ''ثناء مجھے نہیں معلوم تھا کہ مکافاتِ عمل اتنی جلد شروع ہوجائے گا۔''

جواب میں اسے ثناء کی سسکیاں سنائی دیں اور پھر رابطہ منقطع ہوگیا۔ سحرش کی موت نے نفیسہ کو زندہ درگور کردیا تھا۔ وہ ہوش وحواس سے بیگانہ خالی خالی نگاہوں سے سب کو دیکھ رہی تھی۔

نازش جی جان سے ماں کی خدمت میں لگی ہوئی تھیں۔ حسان نے اس کڑے وقت میں اس خاندان کے لیے وہ سب کچھ کیا جو ایک بیٹا کرسکتا ہے لیکن نفیسہ کی حالت دن بدن بگڑتی جارہی تھی۔ دونوں بہنیں اس سلسلے میں حد سے زیادہ متفکر تھیں۔ حد سے زیادہ ناتوانی اور کمزوری نے انہیں بستر سے لگا دیا تھا۔ ایک رات ثناء نے انہیں کھانا کھلاتے ہوئے کہا۔ ''مما! سحرش کا غم بھلا کر آپ کو ہم دونوں بہنوں کے لیے جینا ہے۔''

چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہ جائے۔ نفیسہ فوراً ہی حرفِ مطلب زبان پر لے آئیں۔ ثناء کو دلار کرتے ہوئے بولیں۔ ''میری بچی اپنی ماں کو تو ہی زندگی دے سکتی ہے۔''

ثناء نے فوراً بھانپ لیا کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہیں۔ اس نے توبہ استغفار کرتے ہوئے کہا۔ ''نعوذ باللہ حیات اور موت کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ میری اپنی زندگی پر میرا اختیار نہیں تو بھلا کسی اور کو کیا زندگی دوں گی۔ بہرحال جو بھی آپ

قربانی

دنیا کے تمام مذاہب میں قربانی سب سے زیادہ مشترک وظائف میں سے ایک ہے۔ پوری تاریخ میں لوگوں کو دیوتاؤں، روحوں، بدروحوں اور آباؤ اجداد کے لیے تقریباً ہر قابل تصور چیز کی قربانی دیتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ اکثر قربانیاں حیوانات کی ہوتی ہیں جنہیں ذبح کیا جاتا ہے اور پھر دیوتاؤں کے سامنے پکایا اور کھایا جاتا ہے۔ تاہم، ہر قابل قدر چیز کی قربانی بھی کی جاتی ہے۔ گندم، شراب، دودھ، پانی، لکڑی، اوزار، ہتھیار اور زیور دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھاتے ہیں۔ بعض اوقات مذاہب انسان کی قربانی کا مطالبہ کرتے ہیں مگر ایسا شاذ و نادر ہوتا ہے۔ عموماً قربان کیا جانے والا انسان کسی جنگ میں قید ہوجانے والا دشمن ہوتا ہے لیکن اکثر اوقات بچہ یا نوجوان انسان بھی ہوتا ہے جسے خصوصاً قربانی کے لیے منتخب کیا جاتا ہے۔ انسانی قربانی کا ذکر مذہبی ادب میں شاذ ہی ملتا ہے اور اسے دیوتاؤں کو مائل کرنے کا انتہائی مگر موثر طریقہ خیال کیا جاتا ہے۔

مرسلہ: ارشاد الحسن، کوئٹہ

عرب اور مسلمان

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ایک صدی کے اندر ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیرو ایک ایسی وسیع و عریض سلطنت کے مالک بن گئے جو رومیوں کو ان کے انتہائی عروج کے وقت بھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ اس سلطنت کے دامن اگر ایک طرف خلیج بسکے (Biscay) سے دریائے سندھ اور چین کی سرحدوں تک پھیل گئے تھے تو دوسری طرف بحیرہ خوارزم اور دریائے نیل کے شمالی آبشاروں کو انہوں نے اپنے اندر سمیٹ لیا تھا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نام اللہ کے نام کے ساتھ دن میں پانچ دفعہ ان سینکڑوں ہزاروں مسجدوں کے بلند میناروں سے پکارا جارہا تھا جو جنوبی یورپ اور شمالی افریقا سے لے کر مغربی اور وسطی ایشیا تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اپنی اس بے نظیر وسعت پذیری کے دور میں مسلمان عربوں نے اپنی دینی عقائد، طرزِ کلام، حتیٰ کہ اپنے جسمانی خدوخال کے اعتبار سے بھی غیر قوموں کے افراد کی جتنی تعداد کو اپنے اندر جذب کرلیا تھا اتنی بڑی تعداد میں دنیا کی کوئی قوم آج تک جذب نہ کرسکی۔ نہ یونانی، نہ رومی، نہ اینگلو سیکسن، نہ روسی۔

مرسلہ: قرۃ العین حیدر۔ اقراء سٹی، کراچی

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کا منشا ہے میں اچھی طرح سمجھ رہی ہوں۔ آپ اطمینان رکھیے۔ میں حسان سے بات کروں گی۔''

نفیسہ خوش ہوگئی۔ ثناء نے دل پر پتھر رکھ کر ماں سے جو وعدہ کیا تھا اسے ایفا کرنے کے لیے اسے ایک پل صراط سے گزرنا پڑا۔ اس نے منت سماجت کی۔ حسان کے ہاتھ پاؤں جوڑے۔ محض اس لیے کہ نازش کی شادی ہوگئی تو ماں کو نئی زندگی مل جائے گی۔ ورنہ اس گھر کا شیرازہ اور بکھر جائے گا۔ حسان نے بہت مجبور ہو کر اپنا عندیہ تو دے دیا لیکن اسے نازش سے کوئی لگاؤ تھا اور نہ محبت۔ ایک فارمیلٹی تھی جو اس نے ثناء کے لیے پوری کی تھی۔ نازش جب دلہن کے روپ میں بھی اس کے سامنے آئی تو نہ دل میں امنگوں کا طوفان اٹھا نہ آرزوؤں کے دیئے جھلملائے۔ نفیسہ نے رخصتی کے وقت حسان کو مخاطب کر کے کہا۔ ''بیٹا میری بچی سب گنوں پوری ہے اس کا ہمیشہ خیال رکھنا۔''

ثناء اس کے وجود سے یوں غافل کھڑی تھی جیسے کوئی شناسائی نہ ہو۔ حسان بھی منجمد اور ساکن تھا چلتے وقت اس نے آہستہ سے ثناء سے کہا۔ ''اپنے دل کا نگر تباہ کر کے تمہارے گھر کو بچایا ہے۔'' اس کے انداز گفتگو میں تلخی اور بیزاری تھی۔

نازش کے چہرے پر فتح مندی اور کامرانی کے آثار تھے۔ دونوں کو رخصت کرتے وقت نہ چاہتے ہوئے بھی ثناء کی نگاہیں حسان کی نگاہوں سے جا ٹکرائیں۔ وہاں صحراؤں کی پیاس اور تشنگی براجمان تھی۔ اس کی زخمی نگاہیں حسان کے قدموں سے لپٹ گئیں۔

نازش شادی کے بعد کچھ دن حسان کے عزیز و اقارب کے ساتھ رہی۔ اس کے بعد حسان نے ضروری کاغذات تیار کرائے اور اسے بحرین لے گیا۔ وہاں شفٹ ہونے کے بعد پہلے پہل تو نازش ماں کو کالز کرتی رہی لیکن اس کے بعد رفتہ رفتہ اس نے رابطہ کم کر دیا۔ نفیسہ بے چین اور بے قرار ہوگئی۔ وہ بار بار ثناء سے تقاضا کر کے کہتیں۔ ''ثناء! ذرا تم حسان سے بات کرو۔ کیا بات ہے۔ نازش فون کیوں نہیں کر رہی ہے۔''

بادل نخواستہ طوعاً و کرہاً اس نے حسان کا نمبر ڈائل کیا۔ فوراً رابطہ ہوگیا۔ بات کرنے میں حسان نے پہل کی۔ شکستہ سی آواز ابھری۔ ''کیسی ہو؟''

ثناء نے خفت بھری آواز میں بالکل مختصر جواب دیا۔ ''ٹھیک ہی ہوں۔''

پھر جلدی سے وہ مطلب کی بات پر آ گئی۔ اسے خوف تھا کہ اگر بات چیت کا دورانیہ بڑھا تو حسان کچھ بھی کہہ سکتا ہے اور کچھ سننے کا اس میں یارا نہیں تھا۔ اس نے گھبرا کر فوراً کہا۔ ''وہ مما! نازش کو بہت یاد کر رہی ہیں۔ اس سے کہیے کہ مما سے بات کریں۔''

حسان نے فوری جواب نہیں دیا بلکہ ایک گہری سانس خارج کرنے کی آواز سنائی دی پھر اس کے بعد اس نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔ ''ثناء تم نے مجھ سے یہ بات کیوں چھپائی کہ نازش کینسر کی مریضہ ہے۔''

ثناء کے قدموں تلے زمین کھسک گئی۔ اپنا واہمہ سمجھ کر اس نے دوبارہ پوچھا۔ حسان نے پھر وہی بات دہرائی۔ ثناء کو زمین آسمان گھومتے محسوس ہو رہے تھے۔ فون پر حسان نے سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ اتنی بڑی بیماری اور پھر ڈاکٹر نے پیچیدگی کی خبر بھی سنا دی۔ بہرحال آنٹی بات نہ ہی کریں تو بہتر ہے۔ ڈلیوری کے بعد ہم لوگ شاید مستقل پاکستان آ جائیں۔'' یہ کہتے ہوئے حسان نے فون بند کر دیا۔

ثناء کو سمجھائی نہیں دے رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ قوت فیصلہ جواب دے چکی تھی۔ بمشکل اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور نفیسہ کو صرف یہ خوش خبری سنانے پر اکتفا کیا کہ عنقریب نازش یا تو کسی گڈے کو یا گڑیا کو اپنی گود میں لے کر آئے گی۔ نفیسہ ایک عرصے سے اس خوش خبری کی منتظر تھیں۔ ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔

آج اسے شدت سے احساس ہوا کہ نفیسہ اتنی دور بیٹھی ہوئی بیٹی کے لیے کس قدر بے تاب ہے۔ مری ہوئی بیٹی سحرش کو بھی آج تک نہیں بھول سکیں لیکن مجھ پر زمانے کے سرد و گرم سب گزر گئے۔ کبھی مجھے جھوٹوں بھی نہ پوچھا۔ میرے نصیب کی پہلی بارش سحرش کی چھت پر برس گئی۔ پھر جسے دل کے سنگھاسن پر بٹھایا اس کے لیے حکم صادر کیا کہ وہ نازش کی پسند ہے۔ اس لیے اپنی محبت کا گلا گھونٹ دو۔ جس نے اسے ٹوٹ کر چاہا اسے ہی اس کا ماں جایا بنا دیا گیا۔ کسی اور کی بیٹی بنا کر اس سے اس کی خودی اور اعتماد بھی چھین لیا گیا۔ اسے اپنے بچپن کی ایک بات یاد آئی۔ جب وہ تینوں بہنیں کھیلنے کودنے میں گر پڑتیں تو نفیسہ دوڑ کر سب سے پہلے اسے اٹھاتیں۔ سحرش اور نازش کو بعد میں اٹھاتیں۔ شہریار خان یہ منظر دیکھ کر باغ باغ ہو جاتے لیکن اسی نفیسہ نے زندگی کے کھیل میں صرف اپنی بیٹیوں کو سہارا دیا اسے تو صرف روندا گیا ہے۔ آج اسے شدت سے اپنی ماں یاد آئی

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

اور وہ دیر تک آنسوؤں سے اپنا تکیہ بھگوتی رہی۔

چند مہینوں بعد حسان نے بیٹی کی پیدائش کی خبر سنائی اور یہ بھی بتایا کہ وہ لوگ عنقریب آنے والے ہیں اور پھر بغیر کسی اطلاع کے اچانک دونوں مع بچی کے آدھمکے۔ ثناء، نازش کو دیکھ کر سکتے میں رہ گئی۔ اس کے حسن کا آفتاب غروب ہو چکا تھا۔ سر کے تمام بال اڑ چکے تھے۔ سرخ و سفید گالوں پر موت کی سیاہی اتر آئی تھی۔ آنکھیں ویران کھنڈر بنی ہوئی تھیں۔ گود میں ننھی سی جان محض گوشت کا ایک لوتھڑا تھی۔ بچی کا وزن بہت ہی کم تھا۔ حسان کے چہرے پر فکروں اور پریشانیوں نے اپنا ڈیرا ڈال رکھا تھا۔ نفیسہ بیٹی کو دیکھ کر لق دق رہ گئی۔ گلا خشک ہو گیا۔ گلوگیر آواز میں تھرتھراتے لبوں سے فقط اتنا کہا۔ ''میرے مالک میرے کیے دھرے کی سزا مجھے دیتا۔ میری بیٹیوں کو کیوں گرفت میں لے لیا۔'' وہ زاروقطار رو رہی تھیں۔

ثناء کی عقل جواب دے گئی تھی کہ تڑپتی ہوئی ماں کو سنبھالے یا بیمار بہن یا بھانجی کی طرف دیکھے۔ ملازمہ کی مدد سے اس نے جلدی سے حسان اور نازش کے لیے کمرا سیٹ کروایا۔ اس کے بعد کھانے پینے کے انتظامات میں لگ گئی لیکن اس کا دل بری طرح بیٹھا جا رہا تھا۔ نازش اسے کچھ مہینوں کی نہیں بلکہ کچھ دنوں کی مہمان لگ رہی تھی۔ بچی بھی بیمار ماں کی کوکھ کی پیداوار تھی۔ اس لیے حد درجہ لاغر اور کمزور تھی۔ ثناء رات گئے جب تمام کاموں سے فارغ ہوئی تو نازش کے کمرے کا رخ کیا۔ نفیسہ بھی وہیں تھی۔ نازش کو حسرت بھری نگاہوں سے تکے جا رہی تھی۔ ثناء نے بہن کی پیشانی پر اپنا ہاتھ رکھا اور کہا۔ ''تم ابھی تک جاگ کیوں رہی ہو۔ سفر سے آئی ہو، تھکی ہوئی ہو کچھ دیر سو لو گی تو طبیعت بہتر ہو جائے گی۔''

پژمردہ اور مرجھائے ہوئے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری پھر مدھم لہجے میں بولی۔ ''آپی مجھے ابھی بہت لمبے سفر پر جانا ہے۔ بس وہیں جا کر آرام کی نیند سو جاؤں گی۔'' نفیسہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی شروع ہو گئی۔

ثناء نے سرزنش کرتے ہوئے قدرے تیز لہجے میں کہا۔ ''اس طرح کی باتیں نہیں کرتے جب سے مما نے تمہیں دیکھا ہے۔ وہ مسلسل روئے جا رہی ہیں۔ نازش نے اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ یہ وقت بڑا اہم ہے آپ میرے پاس بیٹھیں مجھے آپ سے

معراج محمد صفی شہید

کپتان معراج محمد صفی شہید پاکستان آرمی کے ایک بہادر آفیسر تھے۔ مہمند ایجنسی کے صافی قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے دادا نے مردان کے علاقے تخت بھائی کے لیے ہجرت کی تھی۔ ان کے والد دوست محمد خان صافی (مرحوم) واپڈا میں افسر تھے اور سروس کی وجوہات اور بچوں کی تعلیم کے لیے پشاور منتقل ہو گئے۔ معراج محمد 1997ء میں کیڈٹ کالج رزمک میں منتخب ہوئے اور کیڈٹ کالج رزمک میں اپنے قیام کے دوران انہوں نے بہت شہرت حاصل کی۔ کالج کی سرگرمیوں میں حصہ لینے والے ایک ہنس مکھ اور ذہین کیڈٹ کے طور پر پہچانے جاتے تھے۔ کھیلوں، ڈراموں اور ہر قسم کی سرگرمیوں میں حصہ لیتے تھے۔ انہوں نے 850 سے 764 نمبر سے بی آئی ایس سی پاس کیا۔ بنوں کے ایس ایس سی امتحان میں 4th پوزیشن حاصل کی۔ انہیں جناح ہاؤس کا نوستارہ کمانڈر مقرر کیا گیا تھا اور وہ بھی بہت اچھی طرح منظم رہے۔ کیڈٹ کالج رزمک سے پاس ہونے کے بعد انہیں 112 لانگ کورس میں پاکستان ملٹری اکیڈمی میں 2003ء کے پی ایم اے کاکول میں شامل کیا گیا۔ کاکول میں دوران تربیت تمام شعبوں میں بہترین کیڈٹ رہے اور اکیڈمی کے اعلیٰ ترین اعزاز سینئر انڈر آفیسر (ASUO) سے نوازے گئے۔ پی ایم اے میں تربیت کے دو سال میں ان کی مجموعی بہترین کارکردگی پر انہیں 2005ء میں اعزازی شمشیر سے نوازا گیا۔

مرسلہ: نوشین ملک، لاہور

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

کچھ باتیں کرنی ہیں۔''

ثناء اس کے بیڈ پر ٹک گئی۔ اپنی الجھی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے وہ بولی۔ ''آپی تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔ ایک وقت وہ تھا جب بابا نے آپ کو مما کی گود میں ڈالا تھا اور کہا تھا کہ یہ تمہاری بیٹی ہے۔ مما نے کبھی آپ سے بیٹیوں والا سلوک نہیں کیا لیکن میں اللہ کے بعد اپنی بیٹی کو صرف اور صرف آپ کے سپرد کر رہی ہوں اور مجھے یقین ہے آپ اسے نفیسہ بن کر نہیں بلکہ نازش بن کر پالیں گی۔ حسان بہت اچھے انسان ہیں۔ میں ان کی پسند نہیں تھی لیکن اس کے باوجود کبھی کوفت یا بیزاری کا اظہار نہیں کیا۔ میں تو ان پر زبردستی مسلط کی گئی تھی۔ ورنہ ان کے دیار دل میں صرف آپ کی تصویر ہے۔ آپی میری عاجزانہ درخواست ہے۔ حسان کو اپنا لینا پھر کوئی میری بیٹی کو بن ماں کا سمجھ کر ترس نہیں کھائے گا۔'' اتنا کہنے کے بعد اس کی سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگی۔ ثناء نے جلدی سے اسے پانی پلایا اور مزید بولنے کے لیے منع کیا۔ نفیسہ کو اس کے پاس بٹھا کر وہ بھاگی بھاگی حسان کے پاس گئی۔ حسان کسی کام میں مصروف تھا۔ آہٹ پاکر فوراً مڑا۔ ثناء کو حواس باختہ دیکھ کر گھبرا کر اپنی نشست سے کھڑا ہو گیا۔ ''کیا بات ہے تم اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟''

ثناء نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور بمشکل لڑکھڑاتی زبان میں بولی۔ ''حسان ثناء کی حالت صحیح نہیں لگ رہی ہے۔''

حسان نے میز پر رکھی ہوئی فائل دکھاتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اس کی تمام رپورٹس کو یکجا کر کے فائل کر لیا ہے اور ڈاکٹر سے بات بھی کر لی ہے۔ کل بارہ بجے کا اپائنٹمنٹ ہے۔''

ثناء پر دیوانگی طاری تھی۔ اس نے حسان کو جھنجوڑ کر رکھ دیا اور اشکوں بھری آواز میں کہا۔ ''پتا نہیں آنے والا کل وہ دیکھ بھی سکے گی یا نہیں۔ آپ میری بات نہیں سمجھ پا رہے ہیں۔''

اب ساری صورتِ حال حسان کے سمجھ میں آئی لیکن ان دونوں کے پہنچنے سے پہلے ہی بقول اس کے وہ لمبے سفر پر روانہ ہو چکی تھی۔

☆......☆☆

ثناء کی ذمہ داریاں بجائے کم ہونے کے مزید بڑھ گئی تھیں۔ نوزائدہ بچوں کو کس طرح لٹایا جاتا ہے۔ نہ اسے تجربہ تھا نہ سمجھ۔ بولائی بولائی وہ کبھی نحیف و نزار ماں کو دیکھتی جو ہڈیوں کا پنجر بن چکی تھی۔ کبھی اسے ننھی سی گڑیا کو سنبھالتی جسے نازش اس کی گود میں ڈال کر گئی تھی۔ آج کل وہ دو ماہ کی رخصت پر تھی اور گڑیا کا دودھ بناتے ہوئے یہی سوچ رہی تھی کہ آنے والے دنوں میں وہ ماں کی تیمارداری اور دفتری امور تو بخوبی نمٹا لے گی لیکن گڑیا کو کس کے سہارے چھوڑے گی۔ کیونکہ حسان بھی اپنے رشتے داروں میں ملنے گیا تھا۔ ان لوگوں کو نازش کی وفات کی خبر ہی نہیں کی گئی تھی اس لیے وہاں سے کوئی آیا بھی نہیں تھا۔ حسان چند روز کا کہہ کر گیا تھا لیکن ابھی تک آیا نہیں تھا۔ ان ہی سوچوں میں غلطاں اس نے جلدی جلدی گڑیا کی بوتل بنائی تو اپنے عقب میں آہٹ پاکر فوراً پلٹی۔ اس کے بالکل قریب حسان کھڑا تھا۔ معاً اسے احساس ہوا کہ وہ ثناء کے بہت قریب آ گیا ہے۔ خفت اور خجالت اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ بغیر زبان کھولے ثناء بھی پرے سرک گئی۔ دونوں کی پیشانیاں پسینے سے عرق آلود تھیں۔

گڑیا مسلسل روئے جا رہی تھی۔ کبھی اسے حسان لے کر ٹہلتا، کبھی نفیسہ اپنی آغوش میں تھپکیاں دیتی لیکن اس کا رونا کم نہیں ہو رہا تھا۔ چھٹیاں ختم ہو چکی تھیں اس لیے آج ہی ثناء نے ڈیوٹی جوائن کی تھی۔ دفتر میں کام کرتے ہوئے اچانک اس کی طبیعت گھبرائی اور وہ خرابی طبیعت کا کہہ کر گھر چلی آئی۔ گھر پہنچ کر گڑیا کی آواز سن کر وہ دیوانہ وار بھاگتی ہوئی نفیسہ کے کمرے میں داخل ہوئی اور حسان کے گود سے چھین کر اپنی بانہوں کی حصار میں اسے چھپا لیا۔ اس کی آغوش کی حرارت پاتے ہی گڑیا نے رونا بند کر دیا۔ نفیسہ اور حسان نے سکون کی سانس لی۔ نفیسہ نے ثناء کا ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب بٹھایا اور حسان کو مخاطب کر کے اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔

غموں اور آنسوؤں میں نفیسہ غرق ہو چکی تھی۔ سارا طنطنہ ختم ہو چکا تھا۔ اس وقت بھی آنسو ضبط کرنے کی کوشش میں آنکھیں انگارہ بنی ہوئی تھیں۔ بولنے کے لیے منہ کھولا لیکن پھر کچھ سوچ کر زبان روک لی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے الفاظ ترتیب دے رہی ہو۔ خالی الذہنی کے ساتھ دونوں کو دیکھتی رہی۔ گڑیا ثناء کے شانے سے لگ کر سو گئی تھی۔ چند ثانیے بعد نفیسہ نے دل گرفتہ آواز میں کہا۔ ''ثناء میری جان میں نے تجھ پر بہت ظلم ڈھائے۔ میری بچی دل کی میں بھی بری نہیں تھی لیکن تو نے اپنے بچپن میں ایک جملہ کہا تھا ''آپ

WWW.PAKSOCIETY.COM

Downloaded From Paksociety.com

میری ممانہیں ہیں'' تیری زبان سے نکلی ہوئی وہ بات میں نے دل پہ لکھ لی تھی اور یہ سوچا تھا کہ میں دنیا دکھاوے کے لیے ضرور تیری ماں ہوں لیکن کبھی تجھے ماں کی ممتا، پیار اور محبت نہیں دوں گی بلکہ تجھ سے ہر وہ چیز چھین لوں گی جو تجھے اچھی لگتی ہے۔ جسے تو پسند کرتی ہے اس چیز سے تجھے محروم کردوں گی اور وہی میں نے کیا۔ بازار میں شاپنگ کرتے وقت بھی جو چیز تیرے دل کو بھاتی وہ میں سحرش اور نازش کو خرید کر دیتی اور اس طرح اپنے سفلی جذبات کو تسکین دیتی رہی۔ جب شادی بیاہ کے معاملات اٹھے تو تجھے کولہو کا بیل بنائے رکھا اور اپنی بیٹیوں کو خوشی خوشی رخصت کیا۔ تو شہریار خان کی پہلی اولاد ہے لیکن میں نے تجھے سجاد احمد کی اولاد ظاہر کر کے حسان کو اس شادی سے اس لیے روکا کہ میری بیٹی کو حسان پسند تھا۔ میری بچی میرے گناہوں کی لمبی فہرست ہے پیدا کرنے والے سے بھی معافی مانگتے ہوئے شرم آرہی ہے اور تجھ سے اور حسان سے بھی کہتے ہوئے لاج آرہی ہے۔ کس طرح کہوں کہ مجھے معاف کردو'' اتنا کہہ کر نفیسہ زار و قطار رونے لگی۔ اشکوں کے درمیان مدھم لہجے میں بولی۔ ''نازش جو تمہیں کہہ کر گئی ہے اس پر ٹھنڈے دل سے ضرور سوچنا، گڑیا تم دونوں کے سائے میں پرورش پائے گی تو نازش کو قبر میں چین آجائے گا۔''

ثناء کی آنکھیں بھی آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ کچھ کہنا چاہا لیکن آواز حلق میں ہی اٹک گئی۔ بدقت تمام اس نے لرزیدہ آواز میں کہا تھا۔ ''میرے دل میں آپ کے لیے کوئی کدورت یا بغض نہیں۔ مجھے اور حسان کو دور کرنے کے لیے آپ نے جو چال چلی اس پر ہم دونوں نے ہی یقین نہیں کیا۔ ہم دونوں نے اپنے بڑھتے ہوئے قدم محض نازش کی وجہ سے روکے۔ خدائے برتر کی بارگاہ میں سربسجود ہو کر آپ اپنے گناہوں کی معافی طلب کریں۔ اس کی قہاری، غفاری میں بدل جائے گی۔ آپ کی خطا سے اس کی عطا کئی گنا بڑی ہے۔ میں نے آپ کو معاف کیا۔ صدق دل سے بلکہ میری دعا ہے کہ آپ کی ساری خطائیں ساری غلطیاں وہ آب رحمت سے اس طرح دھوئے کہ آپ کا دامن پاکیزہ اور معطر ہو جائے۔''

نفیسہ، ثناء کی باتیں سن کر اور زیادہ رونے لگی۔ اس کی آنکھیں ساون بھادوں بنی ہوئی تھیں۔ حسان نے رسانیت سے کہا۔ ''آنٹی آپ نے رو رو کر اپنا برا حال کرلیا ہے۔ آپ چند دن پہلے کیا تھیں اور اب کیا ہو گئیں۔ خدارا اپنے آپ کو سنبھالیے۔ جس طرح ثناء کا دل آپ کے لیے صاف وشفاف ہے اسی طرح میرے دل میں بھی آپ کے لیے کوئی برائی نہیں۔ شہریار انکل کی بیوہ اور میری بیوی کی ماں کی حیثیت سے ملیں تو ہمیشہ آپ کا ادب واحترام کیا ہے۔ آپ میرے لیے ویسے ہی قابل تعظیم ہیں جیسے میری اپنی ماں تھی۔'' دونوں کی تسلی آمیز باتیں سن کر نفیسہ کو دلی سکون نصیب ہوا۔ ثناء نے انہیں تکیے کا سہارا دے کر لٹا دیا اور اوپر سے لحاف اوڑھا دیا۔ ایک طویل عرصے بعد بے خواب

قارئین متوجہ ہوں

پرچا نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پر چا دستیاب نہ ہو۔

☆ شہر اور علاقے کا نام۔

☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل نمبر۔

رابطہ اور مزید معلومات کے لیے

ثمر عباس 0301-2454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

سسپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت

C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، کراچی

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

پاک سوسائٹی پر مُوجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایت اللہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

http://paksociety.com

Downloaded From Paksociety.com

آنکھوں میں نیند اتری تھی۔ اب وہ بے خبر سو رہی تھی۔ ثناء اور حسان دبے پاؤں بغیر آہٹ کیے وہاں سے اٹھ کر باہر چلے آئے۔ ثناء نے گڑیا کو بھی اپنی گود میں اٹھا رکھا تھا کہ مبادا اس کے رونے کی آواز سے نفیسہ کی نیند میں خلل نہ پڑے۔

پورے چاند کی رات تھی۔ دونوں برآمدے میں چلے آئے اور لان چیئرز پر آ کر بیٹھ گئے۔ گڑیا کا بے بی کارٹ قریب رکھ لیا تھا۔ برآمدے کے گول ستونوں سے بیلیں لپٹی ہوئی تھیں۔ ہوا کے جھونکوں سے پھول ٹوٹ کر گرتے تو یوں لگتا جیسے کوئی پھول نچھاور کر رہا ہو۔ وسیع وعریض لان کا منظر اس وقت اتنا دلکش تھا کہ دونوں کچھ لمحوں کے لیے اس میں گم ہو گئے۔ دونوں طرف مکمل خاموشی تھی لیکن خاموشی کی بھی اپنی زبان ہوتی ہے۔ حسان نے بہت دیر کی روکی ہوئی سانس خارج کی اور مدھم آواز میں استفسار کیا۔ ”ثناء بغیر کسی جھجک اور تکلف کے ایک بات سچ سچ بتاؤ۔“

ثناء کی سرسراتی آواز گونجی۔ ”پوچھو کیا پوچھنا ہے۔“

حسان نے منجی لہجے میں بڑی لجاجت سے کہا۔ ”وہ یادگار لمحے یاد آتے تھے۔ جب ہم دونوں صرف اور صرف ایک دوسرے کے بارے میں سوچتے تھے۔“ جواب میں صرف ثناء کی سانسوں کی بازگشت سنائی دی۔ اس کے بعد طویل سناٹا۔ حسان نے لمحاتی توقف کے بعد پھر اپنا سوال دہرایا۔ ثناء نے سرسراتی آواز میں بجائے جواب دینے کے الٹا اس سے سوال کر دیا۔

”آپ کے خیالوں میں کہیں میرا گزر تھا؟“

حسان نے کھنک دار آواز میں ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بولا۔ ”لمبی چوڑی تشریح تو نہیں کروں گا بس تمہیں چند خوب صورت اشعار سناتا ہوں تم خود سمجھ جاؤ گی کہ میرے احساسات اور جذبات کس نہج پر تھے۔“

کہیں ایک معصوم نازک سی لڑکی بہت خوب صورت مگر سانولی سی
مجھے اپنے خوابوں کی بانہوں میں پا کر کبھی نیند میں مسکراتی تو ہو گی
اسی نیند میں کسمسا کسمسا کر سرہانے سے تکیے گراتی تو ہو گی
وہی خواب دن کی منڈیروں پر آ کر اسے من ہی من میں لبھاتے تو ہوں گے
کئی ساز دل کی خاموشیوں میں میری یاد سے جھنجھناتے تو ہوں گے

ٹھنڈی دودھیا چاندنی مسحور کن ہوائیں اور روح پرور شاعری ثناء اپنے سارے رنج والم بھول گئی۔ صدیوں کے غم پل میں ڈھل گئے۔ اپنا بھیگا سا ہاتھ اس نے حسان کے ہاتھ پر رکھ دیا اور حسان نے اس ہاتھ کو ہمیشہ کے لیے تھام لیا۔

☆......☆

ثناء نے اس داستان کو ختم کرتے ہوئے کہا۔ ”پیکر میری بچی اس کہانی کے کچھ کردار اس جہاں سے رخصت ہو چکے ہیں اور کچھ آج بھی جیتے جاگتے اور زندہ ہیں۔ اب تمہیں بوجھنا ہے کہ ان تصاویر میں تمہارے پاپا کے ساتھ وہ عورت کون ہے۔“

پیکر نے اپنی ڈبڈبائی آنکھوں کو صاف کیا اور روہانسی آواز میں بولی۔ ”اس کہانی کا اہم کردار ثناء میرے سامنے ہے اور حسان دراصل میرے پاپا حماد احمد ہیں اور گڑیا اب پیکر کے نام سے جانی جاتی ہے اور پاپا کے ساتھ وہ عورت میری ماں نازش ہے۔“

ثناء کے چہرے پر خوشی کے آثار نمودار ہوئے اور وہ بولی۔ ”بہت ذہین ہے میری بیٹی۔“

پیکر نے آہستہ سے کہا۔ ”مما مجھے دکھ صرف اس بات کا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے آپ کی کوکھ سے کیوں نہیں پیدا کیا۔ میری پرورش میری نشوونما میں آپ کو کتنے کٹھن مراحل سے گزرنا ہوا ہوگا۔“

ثناء نے آنکھوں ہی آنکھوں میں سرزنش کرتے ہوئے سمجھاتے والے انداز میں کہا۔ ”بس اس قسم کی آئندہ کوئی بات نہ کرنا۔ میں تمہاری ماں ہوں اور تم میری بیٹی۔ یہ سرد گرم یہ دھوپ چھاؤں اولادِ آدم کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ یہ لو تمہارے پاپا کی کال آ رہی ہے پہلے تم بات کر لو بعد میں میں کرتی ہوں۔“ یہ کہہ کر ثناء نے سرہانے تکیہ رکھا اور اطمینان سے لیٹ گئی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک ملکوتی مسکراہٹ تھی۔ ایسا لگ رہا تھا اپنی بیٹی کے ساتھ اپنے سارے دکھ سکھ شیئر کر کے وہ ہلکی پھلکی ہو گئی ہو۔

شمارہ مارچ 2017ء کی منتخب سچ بیانیاں
ہماری پیش کش...... آپ کا انتخاب
☆ اول: شطرنج کی چال...... مسز راشد (لاہور)
☆ دوم: تھکن...... اختر شہاب (کراچی)
☆ سوم: میں ہوا کافر...... روزینہ (سیالکوٹ)
پہلے دوسرے اور تیسرے انعام کے لیے آپ بھی منتخب کیجیے
ہم آپ کی رائے کا احترام کریں گے

WWW.PAKSOCIETY.COM